آئیے ایک منصفانہ معاشی نظام کے لئے
مل جل کر کام کریں۔ یہ مشترکہ نصب العین
باہمی تعاون اور سخت محنت سے ہی
حاصل ہو سکتا ہے۔

ایک
ملک
ایک قوم

وہ آگ لگائی کہ شری رام چندر کے سیوک ہنومان راون کی لنکا میں آگ لگانے پر شرمندگی محسوس کر رہے ہوں گے۔ سکندر بخت صاحب کا تو ساتھی بخت کھل گیا تھا۔ مگر وزارت کی گرمی نے ان کے لب و لہجہ میں بھی تبدیلی کر دی تھی۔ غرضیکہ کس کس کی جان کو رو دیا جائے۔ ان مختلف الخیال اور مختلف سیاسی عقیدے کے لوگوں نے ہر طرح سے ملک کی ترقی میں روڑے اٹکائے اور آخر کار ملک کے دانشوروں نے محترمہ اندرا گاندھی سے استدعا کی کہ وہ ملک کی حکومت کی باگ ڈور پھر سے سنبھالیں اور دوسری طرف ملک کو تباہی اور رسوائی کی غار میں گرتے دیکھ کر عوام نے الکشن میں جنتا پارٹی کو ایسے غارِ ملامت میں پھینکا کہ جس سے اس کا پھر سے نکلنا ناممکن ہے اور حکومت کی باگ ڈور پھر سے اندرا گاندھی کے ہاتھوں میں تھما دی۔ لیکن اس سیاسی تبدیلی سے پہلے حالات بے حد بگڑ چکے تھے۔ کسی چیز کے بنانے میں تو وقت لگتا ہے اور سرمایہ بھی صرف ہوتا ہے لیکن کسی چیز کے برباد و تباہ کرنے میں نہ وقت لگتا ہے اور نہ ہی زیادہ سرمایہ اور دوبارہ تعمیر کے سلسلے میں ملبے کو صاف کرنے کا مزید بوجھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

پچھلے دو سال میں اندرا گاندھی صاحبہ نے عوام کی طرف سے دوبارہ ذمہ داری سونپے دینے پر اتنا تو کر لیا ہے کہ جنتا پارٹی کے جمع کردہ ملبے کے ڈھیر کافی حد تک صاف کر دیئے ہیں۔ اور قومی عمارت کی جو بنیادیں جنتا پارٹی نے کھوکھلی کر دی تھیں انہیں مضبوط کرنا شروع کر دیا ہے۔ محترمہ اندرا گاندھی اور ان کے ساتھی پھر سے ملک کو ترقی کی راہ پر لے جانے کے لئے سر توڑ کوشاں ہیں۔ اور اسی لئے وزیر اعظم صاحبہ کو بیس نکاتی ترقیاتی پروگرام قوم کے سامنے پیش کرنا پڑا ہے۔ ۱۹۷۵ء کے ترقیاتی پروگرام اور حالیہ نئے ترقیاتی پروگرام میں کچھ باتیں مشترک ہیں۔ اور کچھ باتیں بالکل نئی ہیں۔ نئے پروگرام میں قدرتی طور سے پیداوار پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے کی مختلف ضمنی نکات کی وضاحت مطلب وزیر اعظم صاحبہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ ہر کھیت، ہر کارخانہ، ہر کاریگر، ہر مزدور کی پیداوار بڑھ جائے اور ہر روپیہ سے جو خرچ کیا جائے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا جائے۔ جو لوگ زیادہ پریشان ہیں اُن کی ضرورتوں پر زیادہ دھیان دیا جائے۔ سیلنگ کے قانون کا سختی سے نفاذ اور اراضی کی تقسیم گندی بستیوں کی صفائی اور کمزور طبقوں کے لئے مکانوں کی تعمیر دیہات میں پینے کے پانی کی فراہمی، ضروری اشیاء کی تقسیم کے سرکاری نظام کی توسیع اور بہتری جنوب، قبائلیوں اور اقلیتوں کے مکمل ترین تحفظ کی یاد دہانی بعض اہم کڑیاں ہیں۔ عام فائدے کی بعض دوسری قابل توجہ باتیں جو وزیر اعظم نے کہی ہیں وہ یہ کہ توانائی کے وسائل میں اضافہ کیا جائے، صنعتوں میں سرمایہ لگانے کے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ صنعتی پروجیکٹوں کو جلد سے جلد مکمل کرنے پر زور دیا جائے گا۔ قومی ملکیت والی صنعتوں کی کارگزاری بہتر بنائی جائے گی اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور ٹیکس چوری کرنے والوں کے خلاف سخت تر اقدامات کئے جائیں گے۔ زمین کے داموں میں اضافے کو روکا جائیگا۔ چھ سال سے چودہ سال تک کے سب بچوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جائیگا۔ لڑکیوں اور بالغوں کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے گی۔ دوا علاج اور حفظانِ صحت کے نظام کو پھیلایا جائے گا۔ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں جو کام اور مقدمے باقی ہیں اس کو جلد سے جلد نپٹانے کی کوشش کی جائے گی۔ اور سرکاری اخراجات میں زیادہ سے زیادہ کفایت کی جائے گی۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں کے لئے سرکاری مشینری کا زیادہ اور ہمہ وقت چوکس رہنا ضروری ہے۔ لیکن یہ سب کچھ تبھی ہو سکے گا جب عوام جو اصل حکمران ہیں سرکاری مشینری پر کڑی نگاہ رکھیں اور اسے ٹھیک سے چلنے میں حکومت سے تعاون کریں اور ان لوگوں کے بہکاوے میں نہ آئیں جو اقتدار کی ہوس میں قومی مفاد کو نظر انداز کر کے اپنے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

حکومت کو اس کی غلطیوں پر روکئے۔ لیکن تعمیری نکتہ چینی سے نہ کہ تخریبی ہنگاموں اور ہڑتالوں سے۔ وزیر اعظم پر پورا بھروسہ کیجئے۔ اور ان کے قدم کے ساتھ قدم ملا کر ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن رکھئے۔ یاد رکھئے کہ ۱۹۸۲ء پیداوار کا سال قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا چیزوں کی پیداوار کے علاوہ ہر مفید چیز کی پیداوار میں اضافہ ہم سب کا قومی فرض ہے۔

— — —

سرور تونسوی صاحب حادثہ میں شدید مضروب

سرور تونسوی صاحب مدیر شانِ ہند کیتھل (ہریانہ) میں ایک حادثہ کے باعث ۳؍فروری ۸۶ء کو سخت مضروب ہوئے انہیں ٹیکسی سے ۵؍فروری کو دہلی لایا گیا۔ ڈاکٹری مشورے کے مطابق اپریل کے پہلے ہفتہ میں سرور صاحب کو آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت مل سکے گی۔ اسی وجہ سے آن کے روزمرہ کے علاوہ دفتری کاروبار میں بھی خاصی رکاوٹ آئی ہے سینکڑوں خطوط جمع ہو گئے ہیں جن کے جوابات سرور صاحب کے پوری طرح سے صحت یاب ہونے پر ہی دیئے جاسکیں گے۔
رسالہ شانِ ہند کی اشاعت حسبِ سابق ہوتی رہے گی جنوری اور فروری کے شمارے حاضرِ خدمت ہیں۔ مارچ کا شمارہ بھی ۱۵؍ مارچ تک بھجوا دیا جائے گا اور اپریل کا شمارہ یکم اپریل کو حوالہ ڈاک ہو سکے گا۔ اشد ضروری خطوط کے جوابات سرور صاحب لکھوا رہے ہیں۔ اور شانِ ہند کے لئے اداریہ اور یہ کوچہ یار .... بھی وہ لکھوا رہے ہیں۔ ماہ فروری اور ماہ مارچ کی مالی ادائیگیاں بھی اسی وقت ہو سکیں گی جب سرور صاحب آسانی سے چیکوں پر دستخط کر سکیں گے۔
سرور صاحب کے احباب، بہی خواہوں اور عزیز و اقارب سے استدعا ہے کہ سرور صاحب کی صحت کے لئے دعا فرمائیں۔

نیازمند: ساحر دہلوی

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

تلک نگر دہلی کا ایک ڈاکو لدھا رام اپنی ناپسندیدہ حرکات کے باعث اپنی نوجوان لڑکی کا رشتہ تلاش کرنے میں جب ہر طرح سے ناکامیاب ہو کر مایوس ہو گیا تو میرے ایک واقف کار کی معرفت میرے پاس آیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا کہ میری بیٹی کا رشتہ کہیں کرا دیجیے کیونکہ میں ایک چور اور ڈاکو ہوں اس لئے میری لڑکی سے شادی کرنے کو کوئی بھی لڑکا تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ میں جہیز بھی کافی حد تک قیمتی دینے کو تیار ہوں مگر کوئی بھی جہیز وغیرہ کے لالچ میں نہیں آتا۔ کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ میں جہیز میں چوری کا لوٹا ہوا مال ہی دوں گا۔ جسے گھر میں رکھنا خطرے کو دعوت دینا ہوگا۔

لدھا رام کی گڑگڑاہٹ اور میرے واقف کار کی سفارش پر میں نے وعدہ کر لیا کہ بہت جلد رشتہ کرا دیا جائے گا۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں ہندوستان ٹائمز پریس میں کام کرنے والے ایک نوجوان سے لدھا رام کی لڑکی کا رشتہ کرا دیا گیا۔ یہ رشتہ کئی خطرناک موڑوں سے گزرتا ہوا یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ اب لدھا رام کی لڑکی دادی نانی ہو گئی ہے مگر لدھا رام نے اپنے داماد کو بھی نہ بخشا اور اسے بھی بدنامی کی گہری کھائی میں گرا دیا۔

رشتہ کے بعد لدھا رام کا میرے ہاں آنا جانا رہا اور ایک دن اس نے درخواست کی کہ اس کا ایک عزیز گوڑگاؤں کی جیل میں زیر سماعت قیدی ہے اگر میں آپ کی ضمانت دے دوں تو وہ جیل سے باہر آ کر اپنے مقدمہ کی پیروی کر سکے گا۔ میں ٹالتا رہا مگر لدھا رام کبھی اس ملزم کی بوڑھی ماں کو میرے پاس لا کر اور کبھی کسی معزز کو لا کر مجھ پر دباؤ ڈالتا رہا کہ میں ضمانت دے دوں۔ آخر کار جب لدھا رام نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو میں گوڑگاؤں اس کے ساتھ گیا۔ متعلقہ عدالت میں ضمانت کی درخواست دی تو مجسٹریٹ نے میرا بیان حلفی پڑھا اور ضمانت منظور فرماتے ہوئے ۵ ہزار کی ضمانت کا آرڈر دے دیا۔ اور ملزم اسی شام جیل سے باہر آگیا جو دوسرے دن لدھا رام کے ساتھ میرا شکریہ ادا کرنے میرے مکان پر آیا۔

اس واقعہ کو چھ ماہ گزر گئے کہ ایک دن ریواڑی سے ریلوے پولیس کا ایک سب انسپکٹر آیا اور مجھ سے ایک نوٹس پر تعمیل کرا کے لے گیا کہ فلاں تاریخ کو ملزم کو سیشن جج گوڑگاؤں کی عدالت میں پیش کیا جائے۔ میں ملزم کے گھر گیا تو وہ اپنی ماں کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا اور اس کی بیوی کھانا پکا رہی تھی۔ ملزم اور اس کی ماں نے میری بڑی آؤ بھگت کی اور وعدہ کیا کہ ملزم مذکور کل وقت مقررہ پر گوڑگاؤں پہنچ جائے گا۔ احتیاطاً خود بھی گوڑگاؤں سیشن جج صاحب کی کورٹ میں چلا گیا تو وہاں ایک میلہ لگا ہوا تھا ہندوستان کے قریباً ہر حصہ سے گواہان آئے ہوئے تھے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ جس ملزم کی میں نے ضمانت دی ہے اس نے چلتی گاڑی میں ڈاکہ ڈالا تھا اور ایک پولیس آفیسر کو لوٹا مگر چلتی گاڑی سے چھلانگ لگائی تو اس کے پاؤں میں ایسی چوٹ لگی کہ وہ بھاگنے میں ناکام رہا۔ اب عدالت کے اہلکار نے آواز لگائی تو ملزم مذکور غیر حاضر تھا مگر میں عدالت کے روبرو پیش ہو گیا۔ سردار لہنا سنگھ ایڈیشنل سیشن جج فرمانے لگے کہ آپ جانتے ہیں ملزم کے حاضر نہ ہونے کے باعث سرکار کو ان تمام گواہان کے اخراجات ادا کرنے میں ہزاروں روپیہ دینا ہوگا۔ میری خاموشی پر عدالت نے اسی وقت ملزم کو مفرور قرار دے کر مجھ سے اس نوٹس کی تعمیل کرائی گئی کہ وجہ بیان کی جائے کہ کیوں نہ زر ضمانت ۵ ہزار آپ سے وصول کیا جائے۔ میں نے ملزم کو پیش کرنے کی اجازت چاہی اور تاریخ مل گئی مگر ملزم نے اب کہاں ملنا تھا اور میں اپنے وکیل مسٹر سوہن سنگھ کی معرفت

تاریخ پر تاریخ لیتا رہا۔ یہ وکیل صاحب میرے ساتھ دہلی سے گوڑگاؤں ہر پیشی پر جاتے اور آمدورفت کے ٹیکسی اخراجات کے علاوہ معقول فیس بھی لیتے تھے۔ لدھا رام سے ملاقات ہوتی تو وہ محض زبانی ہمدردی کرکے چُپ ہو جاتا اور میں نے سمجھ لیا کہ اب یہ ضمانت کی رقم ادا کرنی ہی ہوگی۔

اچانک لدھا رام ایک دن آیا اور کہنے لگا کہ وہ اپنے ہاں شیراں والی ماتا رانی کا رت جگا کر رہا ہے آپ بھی معہ اہل و عیال شرکت کیجئے۔ ان دنوں میری والدہ صاحبہ بھی ہمارے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ رات کو میں اور میری بیوی دونوں لدھا رام کے گھر جو ان دنوں جھیل کالونی میں تھا پہنچے دیکھا تو لدھا رام ہر واقف کار اور دوست احباب معہ اہل و عیال وہاں موجود تھا۔ اور دیوی کا رت جگا اس شان سے ہونے لگا کہ جیسے ماتا دیوی پرگٹ ہو گئی ہوں۔ رات کے ایک بجے کے قریب جب انٹرول ہوا اور جملہ حاضرین کو چائے وغیرہ پلائی جا رہی تھی چونکہ میں زیادہ رات گئے تک جاگنے کا عادی نہیں ہوں لہذا میں نے لدھا رام سے کہا کہ میرے لیٹنے کا انتظام ہو جائے تو جب تک انٹرول ہے میں ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ وہ مجھے اپنے گھر کے اندر لے گیا اور ایک پلنگ پر لٹا دیا میری آنکھ لگ گئی۔ انٹرول کے بعد ماتا کی گان شروع ہو چکا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو میں مکان کے پچھواڑے پیشاب کرنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لدھا رام تو ہیں ڈنڈا لئے دس بارہ لڑکوں کو پیٹ رہا ہے میں یہ سین دیکھ کر دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ لدھا رام ان لڑکوں کو پیٹتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ حرام زادو میرے ایک ہزار روپئے لگ گئے میرے رت جگے پر اور تم ایک پیسہ بھی کما کے نہیں لائے ہو۔ لڑکے مار کھاتے ہوئے کہہ رہے تھے استاد ہم بیس بائیس گھروں میں ہو آئے مگر ہر جگہ کوئی نہ کوئی جاگ رہا تھا۔ فلاں گھر میں لڑکی پڑھ رہی تھی۔ سرور صاحب کے گھر ان کی ماں کھانس رہی تھیں کہ آدھی رات کو تم کون ہو جو دیواریں پھاند رہے ہو۔ پریم ترس کے گھر گئے تو وہاں پڑوسی جاگ پڑے۔ یہ سب سن کر میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا اور میں بغیر

پیشاب کئے ہی واپس آ گیا اور بیوی کو اشارے سے بلا کر سب ماجرا سنایا کہ اس رت جگے میں بلائے گئے سب حضرات کے گھروں میں چوری کرنا مطلوب تھا۔ میری بیوی کی حیرت کی انتہا نہ رہی مگر وہ کہنے لگیں کہ ارداس ہونے تک تو اب رہنا ہی ہوگا ماتا رانی خود ہمارے گھروں کی حفاظت کریں گی۔ تڑکے جب ارداس ہونے لگی تو حاضرین اپنی توفیق کے مطابق نذرانہ پیش کرتے ہوئے۔ ماتا رانی کے حضور میں سر جھکاتے اور منتیں ماننے لگے میں نے بھی سوا روپیہ کی حقیر رقم ماتا کے چرنوں میں رکھتے ہوئے دل ہی دل میں یہ منت مانگی کہ اگر ملزم مذکورہ پکڑا جائے تو میں بھی ماتا کا رت جگا کراؤں گا۔

صبح پانچ بجے پرشاد لے کر ہم اپنے گھر آ گئے اور لحاف اوڑھ کر سو گئے ساڑھے آٹھ بجے فون کی گھنٹی مسلسل بجنے لگی تو بے دلی سے بستر سے اٹھ کر رسیور اٹھایا تو وکیل صاحب کی آواز سنائی دی فرما رہے تھے سرور صاحب مبارک ہو آپ کا ملزم پکڑا گیا ہے اور اس وقت سرائے روح اللہ تھانے میں بند ہے۔ سردار پرتاپ سنگھ کیروں وزیر اعلیٰ پنجاب کے قتل کے سلسلے میں پولیس مختلف مشکوک بد قماش لوگوں کو تلاش کر رہی تھی کہ پرتاپ باغ کے باہر ایک باغ میں یہ ملزم پکڑا گیا اور اس نے پولیس پر گولی بھی چلائی۔ میں یہ خبر سنتے ہی سکوٹر لے کر سرائے روح اللہ تھانے پر گیا تو ملزم مذکورہ کو حوالات میں دیکھا اور بھاگا بھاگا کشمیری گیٹ جنرل پوسٹ آفس سے ریواڑی ریلوے پولیس کو ارجنٹ ٹیلی گرام کیا اور پورے دس بجے عدالت میں حاضر ہو کر درخواست گزاری کہ ملزم مذکورہ سیشن جج گوڑگاؤں کی عدالت میں مطلوب ہے یہ مفرور تھا اور میں اس کا ضمانتی تھا لہذا اسے ضمانت پر رہا نہ کیا جائے۔ تب تک ریواڑی پولیس وغیرہ آ چکی تھی۔ اور ملزم جیل بھجوا دیا گیا۔

سردار نوجان سنگھ [illegible] ایڈیشنل سیشن جج گوڑگاؤں نے بعد میں مجھے ایک سو روپیہ جرمانہ کی سزا دی اور ضمانت کا یہ قضیہ ختم ہوا۔ میں نے منت کے مطابق ماتا کا رت جگا [illegible] اب بھی جب کہیں ماتا کا رت جگا ہو رہا ہوتا ہے تو مجھے [illegible] کے رت جگے کی یاد آ جاتی ہے اور میرا سر عزت و احترام [illegible] ماتا کے

بے سہاروں اور اپاہجوں کے لئے اُمید کی نئی کرن

دلی میں سماج بہبودی سرگرمیوں میں توسیع

دلی میں ضرورت مند، عدم توجہ کا شکار، مفلس اور اپاہج لوگوں کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں خدمتِ خلق انجام دینے والے ادارے اور خدمات دستیاب ہیں۔ اس وقت دلی انتظامیہ کے تحت ۶۰ ادارے، مراکز اور خدمات چلائی جارہی ہیں جو سماج بہبودی سے متعلق ہر قسم کی سرگرمیاں انجام دے رہی ہیں۔ ان سے لگ بھگ تین لاکھ افراد فیضیاب ہو رہے ہیں۔ ان اداروں میں ضرورت مند بچوں عورتوں، ضعیف و ناتواں لوگوں، گداگروں، کوڑھی مریضوں، اپاہجوں اور دماغی طور پر معذور افراد کو کھانا اور رہائش کے علاوہ سماجی تحفظ دیا جاتا ہے۔ معاشی طور پر خود کفیل بنانے کے لئے انھیں تربیت بھی دی جاتی ہے۔

گداگری کی روک تھام کے لئے ایک زوردار مہم چلائی گئی ہے۔ گداگروں کی سماجی بحالی کے لئے نو محتاج گھروں میں اُنھیں تربیت دی جارہی ہے۔

رواں مالی سال کے دوران سماج بہبودی سرگرمیوں پر منصوبہ جاتی مصارف گزشتہ سال کے ایک کروڑ دس لاکھ روپے سے بڑھا کر دو کروڑ ۲۵ لاکھ روپیہ یعنی دوگنے کر دیئے گئے ہیں۔ آئندہ سال کیلئے راجیہ سیکٹر کے منصوبہ جاتی مصارف تین کروڑ ۳۸ لاکھ روپیہ ہوں گے۔

دلی انتظامیہ نے گزشتہ سال عالمی اپاہج برس میں شروع کی گئی اسکیموں کی عملدرآمد کی رفتار کو برقرار رکھنے کے لئے ۱۹۸۲ء کو بھی اپاہج برس کی شکل میں منانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اس سال شروع کی گئی کچھ اسکیمیں اس طرح ہیں:-

* جمنا پار علاقے میں دماغی طور سے معذور بچوں اور بہروں کے لئے الگ الگ اسکولوں کا قیام۔
* نابینا بچوں کے لئے سرکاری اسکول کا درجہ بڑھا کر ہائی اسکول کر دیا گیا ہے۔
* کالج جانے والے نابینا طلبا کے لئے دلی یونیورسٹی کے نزدیک ہوسٹل کا قیام۔ * کوڑھی مریضوں کو ۹۶ رہائشی الاٹمنٹ کی الاٹمنٹ۔ * شاہدرہ طاہر پور میں کوڑھی میں مبتلا ۸۰۰ افراد کیلئے کام و تربیت دینے کے لئے سایہ دار ورکشاپ اور سماجی بحالی مرکز کا قیام۔ * اپاہجوں کیلئے رہائشی ادارے کے قیام کی اسکیم تیار۔ * سماجی امداد کے مراکز کھولنے کی اسکیم * جسمانی طور سے اپاہجوں کی بحالی کے لئے ۷۰ کیوسکوں اور اسٹالوں کی الاٹمنٹ * جسمانی طور سے معذور ۳۰۰ طلبا کو ۳۰ روپے اور ۴۰ روپے ماہانہ کے حساب سے وظائف * تغذیہ بخش خوراک پروگرام کے تحت لگ بھگ ایک لاکھ بچے اور ۲۰ ہزار حاملہ عورتیں و دودھ پلانے والی مائیں فیضیاب ہو رہی ہیں۔ * اخلاقی اور دوسری طرح کی مصیبتوں میں گرفتار عورتوں اور لڑکیوں کیلئے ایک علیحدہ سے مختصر قیام کیلئے گھر کا بندوبست۔

دلی انتظامیہ ۱۹۸۲ء کے دوران بھی اپاہجوں اور ضرورت مندوں کی مدد کیلئے مستعد ہے

جاری کردہ:- محکمۂ اطلاعات واشاعت، دلی انتظامیہ دلی

ڈی آئی پی/اطلاع - ۸۲/۳

گوشۂ عقیل صدیقی

سردار توانسوی

یومِ سپرو کا مشاعرہ

اُردو کے مستند محسن عالیجناب سر تیج بہادر سپرو کا جنم ماہ جنوری میں ہوا تھا۔ لہٰذا ان کی سالگرہ کے موقع پر یومِ سپرو سنہ ۱۹۵۱ء کا مشاعرہ پیشِ خدمت ہے۔ تیس سال پیشتر دہلی میں یومِ سپرو منایا گیا تھا اس کے بعد دلّی کے بے حس اُردو دانشور سپرو صاحب کو بھول گئے ہیں۔ جب کسی کو محض اپنی ہی فکر ہوتی ہے تو وہ اپنے ماں باپ تک کو بھول جاتا ہے۔ اگر اردو دانشور سپرو جیسے محسنِ اردو کو بھول گئے ہیں تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اگر اس سلسلے میں اپنے کردار پر نظر ڈالے تو بہتر ہوگا۔ بہرکیف ادارہ شانِ ہند یومِ سپرو کا مشاعرہ پیش کر کے اُردو کے اس عظیم محسن کو خراجِ عقیدت پیش کر رہا ہے۔ (ادارہ)

آج جنوری سنہ ۱۹۵۱ء کی اکیسویں تاریخ ہے اور شام کے ساڑھے آٹھ بجے ہیں میں جناب ظفر ادیب کے ساتھ دلّی کالج پہنچ گیا ہوں مشاعرہ گاہ کے باہر پہنچے تو ہال کو بند پایا۔ دروازوں کے شیشوں سے ہال کے اندر گُن بیر کشور ماتھر نظر آئے جنھوں نے ہمیں دیکھ کر دروازہ کھولا۔ ابھی ہال میں گنتی کے چند اصحاب تشریف فرما ہیں چند منٹ بعد مسٹر ڈو پاس دیو سمرا بار ایٹ لا اور مسٹر جعفری تشریف لائے۔ مسٹر سمرا اور جعفری صاحب کے ساتھ کافی دنوں کے بعد ملاقات ہوئی ہے اس لئے دل کھول کر باتیں ہوتی رہیں۔ پونے نو بجے نواب پٹودی مع بیگم صاحبہ تشریف لائے ہیں۔ بیگم صاحبہ سٹیج سے نیچے اگلی صف میں بیٹھ گئی ہیں اور نواب صاحب ماتھر صاحب کے ساتھ باتیں کرنے لگ گئے ہیں۔ پانچ منٹ کے بعد کنور مہندر سنگھ بیدی سحر مع سردارنی صاحبہ تشریف لے آئے ہیں۔ سردارنی صاحبہ بیگم پٹودی کے پاس بیٹھ گئی ہیں اور ان سے باتیں کر رہی ہیں اور کنور صاحب نواب پٹودی سے مصروفِ گفتگو ہیں نو بجنے والے ہیں اور مرحوم سر سپرو کے خاندان کے کچھ حضرات اور خواتین تشریف لائی ہیں شری چاند نارائن چاند ڈپٹی کمشنر کرنال بھی تشریف لے آئے ہیں اور کنور صاحب اور نواب پٹودی سے نہایت بے تکلفانہ انداز میں بات چیت کر رہے ہیں۔ نواب پٹودی کنور صاحب کو نہایت بے تکلفانہ اور پیار سے انداز میں بار بار "مہندر" کے نام سے پکارتے ہیں۔ جشنِ جمہوریت والے شور اے بہادر بھی تشریف لے آئے ہیں سوا نو بجنے والے ہیں اور ابھی تک ہال میں حاضرین کی تعداد چالیس سے صرف ایک زیادہ ہو سکی ہے۔ مسٹر شنکر لال اپنے پیٹنٹ لباس میں تشریف لائے ہیں اور چند اصحاب سے علیک سلیک کرنے کے بعد بیگم پٹودی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے ہیں اور ان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ کنور صاحب نے شعرا سے کہا ہے کہ وہ سٹیج پر تشریف لے چلیں تاکہ مشاعرہ کی کارروائی شروع ہو سکے۔ شعرا حضرات سٹیج پر تشریف لے گئے ہیں اور نواب پٹودی بھی سٹیج پہ پہنچے ہوئے غالیچہ پر جلوہ افروز ہو گئے ہیں۔ کنور صاحب لاؤڈ سپیکر کے متعلق منتظمین سے استفسار کر رہے ہیں جس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ابھی تک لاؤڈ سپیکر کا انتظام نہیں ہو سکا۔ ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ کچھ ساڑھے چار ہزار ختم ہو گیا ہے جو لاؤڈ سپیکر کا بھی انتظام نہیں ہو سکتا کنور صاحب بغیر مائیک کے ہی کارروائی شروع کرنے کا اعلان کر رہے ہیں اور صدارت کے لئے نواب پٹودی کا نامِ نامی پیش کر رہے ہیں جس پر شعرا اور حاضرین تالیوں سے تائید کر رہے ہیں۔ نواب پٹودی اور کنور صاحب بار بار اصرار سے کہہ رہے ہیں کہ شعرا کی فہرست بنا کر دو جس کے جواب میں گلزار کہہ رہے ہیں کہ صاحب میں تو فہرست ایک منٹ میں بنا دوں لیکن کیا کروں "سپرو اکیڈمی" کے سکریٹری عتیق صاحب فرماتے ہیں کہ فہرست میں بنا کر دوں گا۔ اس لئے میں فہرست بنانے سے معذور ہوں جس پر نواب صاحب [illegible]

بیگم پٹودی اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی سردارنی کنور مہندر سنگھ اور دیگر خواتین سے اظہارِ پسندیدگی فرما رہی ہیں۔ حضرت نوح ناروی اثر احسنی گنوری بزرگانہ انداز سے داد دے رہے ہیں اور کوثر نہایت اچھے انداز سے کہہ رہا ہے سے

قافلے جرأت آغازِ سفر کر نہ سکے ۔۔۔ اک مسافر کا جب انجامِ سفر دیکھ لیا

جناب دباس دلی مفرا۔ جعفری صاحب۔ شورا ج بہادر نہایت سلجھے ہوئے انداز سے داد دے رہے ہیں سنیئے کوثر کس قدر اچھا شعر کہہ رہا ہے سے

دل کو رہ رہ کے ترا دَورِ وفا یاد آیا
مُسکراتی ہوئی کلیوں کو اگر دیکھ لیا

کوثر دو اشعار اور سُنانے اور بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر چلے گئے ہیں۔ اور اب جناب طالب چکوالی مائیک پر تشریف لائے ہیں اور اپنی کہی مرتبہ کی سنائی ہوئی غزل کا مطلع فرما رہے ہیں سے

نہ اُمیدِ لطف لیکے رنگیں دام آتی ہے ۔۔۔ نہ لب تک آرزوئے خاطرِ ناکام آتی ہے

سنیئے طالب صاحب اس غزل کا ایک بہترین شعر پڑھ رہے ہیں سے

ہمارا نام بھی اب اُن کو یاد آتا ہے مشکل سے
ہماری یاد بھی اُن کو بہ اسے نام آتی ہے

طالب صاحب بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر چلے گئے ہیں اور اب جناب خلیل الرحمٰن اعظمی مائیک پر تشریف لائے ہیں اب وزن کچھ کم ہو گیا ہے۔ مسٹر گوئی بیر کشور ماتھر، منشی عبدالعزیز اور رضوان غازی کالی کو پچھلی صفوں سے اٹھا کر سٹیج پر لائے ہیں۔ سیرٹ اکیڈمی کے سکریٹری مسٹر متین نے بہت دنوں سے شور مچا رکھا تھا کہ ہم اپنے مشاعرہ میں ایسے شعرا کو پیش کریں گے جن کو دلی والوں نے کبھی نہ دیکھا ہو اور نہ سُنا ہو۔ چوں کہ اعظمی صاحب متین کے اس بیان کے مطابق دلی والوں کے دیکھے بھالے نہیں تھے۔ اس لئے شعرا حضرات خاص طور پر متین صاحب کی اس "دریافت" کا کلام سننے کے لئے بیتاب تھے۔ اعظمی صاحب ماشا اللہ چہرے مہرے سے بھی "دریافت" کئے جانے کے مستحق تھے۔ اس لئے خیال تھا کہ اعظمی صاحب "سُرتال" سے کلام سنائیں گے۔ لیکن جب انہوں نے زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا کہ میری نظم کا عنوان ہے "تشنگی" تو پنڈت ہری چند اختر فرمانے لگے "ذاتِ شما معلوم شد" یعنی لو اب ترقی پسند شاعر تشریف لایا ہے۔ اتنے میں اعظمی صاحب فرما رہے تھے سے

نہ تابِ وصل نہ عہدِ جنوں کی سرشاری	ہر اک شبِ خلشِ آرزو سے بیگانہ
عباداتِ تجھے التفات بے معنی	شبو شکستہ، تہی جام بیند دیوان
یہ ایک وادیٔ غمناک ہی سہی ہمدم	مگر ابھی اسی صحرا میں مجھ کو جینے دو
شکست خوردہ نہیں اب بھی میری تشنہ لبی	اگر شراب نہیں زہر کے سمندر ہیں
ہمیں بہ حیات کی یہ تلخیاں ڈبوئیں گا	مگر جہان کے رندوں کی آبرو کیلئے
مئے نشاط کے اک جامِ آتشیں کے بجائے	شرارِ غمِ گیتی ہی مجھ کو پینے دو

ترقی پسندانہ نظموں کو جس حد تک ایسے مشاعروں میں پسند کیا جاتا ہے ویسا ہی اس نظم کو پسند کیا گیا۔ یعنی دو یا تین شعرا اور ایک آدھ سامعین میں سے خوب۔ خوب کہا اور بس۔ اب گلزار دہلوی کو کلام سنانے کی تکلیف دی گئی ہے۔ گلزار کا نام سنتے ہی سامعین نے تالیوں سے خیر مقدم کیا ہے اور گلزار نے ایک تازہ ترین قطعہ جو وہ مجھ ایک روز پہلے سُنا چکے تھے پڑھنا شروع کیا ہے

تم نصیب الہیان زندہ باد ۔۔۔ میرے دل کی زبان ہو جاؤ
تم بیٹے کر نا شرح عرضِ حال ۔۔۔ حال کے ترجمان ہو جاؤ

اس قطعہ پر اچھی داد دی گئی ہے۔ مولانا اثر احسنی "حال کے ترجمان" پر اظہارِ پسندیدگی فرما رہے ہیں۔ اگر سامعین اور شعرا کو اس قطعہ کا شانِ نزول کا بھی علم ہوتا تو یہ قطعہ دوگنا لطف دیتا۔ مجھے اس قطعہ کے شانِ نزول کا علم ہے لیکن اس مضمون میں اس کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔ سنیئے گلزار ایک دوسرا قطعہ فرما رہے ہیں سے

ہماری سرفروشی تن دہی کا جذبہ کام آیا
کہ تھے ہم منتظر جس کے بالآخر وہ مقام آیا
ادھر تو جامِ آزادی سے چھلکی بادۂ لذت
ادھر دو چار ہی چھینٹوں سے ہر شئے پہ نکھار آیا

اس قطعہ پر بھی داد خوب دی گئی ہے۔ اُستاد نوح بہت داد دے رہے ہیں خواتین مسکراہٹوں سے پسندیدگی کا اظہار فرما رہی ہیں اور نواب پٹودی فرما رہے ہیں۔ آپکا کہنا ہی گلزار جیتے رہو عزیز دیگر فی شعرا کو جا دہلا رہے ہیں جس سے گلزار صاحب کچھ

ہوگئے ہیں اور کہہ رہے ہیں عزیز تم جائے بند کرو۔ چنانچہ عزیز نے جائے پانی بند کر دی ہے اور گلزار تیہ قطعہ فرما رہے ہیں ؎

خاص دکھائی دیتا ہے اب عام ہی وہ ''

حضرت عرش بے ساختہ فرمانے لگے ؎

سیب ہی سیب نہ اب آم ہی وہ آم رہے

ے آس پاس ... بیٹھے شعراء ہنس رہے ہیں اور اتنے میں گلزار باقی کے تین مصرعے پڑھ چکے تھے اس کے بعد گلزار نے چار اور ایسے قطعات پڑھے جو وہ اکثر مشاعروں میں سناتے رہتے ہیں۔ اور نہایت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر آ گئے ہیں۔ اور اب جناب رعنا جگی کو کلام سنانے کی دعوت دی گئی ہے۔ خواجہ احمد فاروقی۔ جناب سحر صاحب کے پاس جا بیٹھے ہیں اور یہ دونوں اہلِ ذوق حضرات بہت اچھے سلیقے سے بہترین اشعار پر داد دے رہے ہیں۔ رعنا چار نہایت سلجھی ہوئی رباعیات سنانے کے بعد غزل کا مطلع فرما رہے ہیں ؎

خیال کو ہو نظر کو تابش نفس کو رخشندگی ملیگی
سحر تلک اُٹھا سوزِ غم جو دل میں تو ہر کہیں روشنی ملیگی

مطلع رعنا کی قادر الکلامی کا پتہ دے رہا ہے۔ چنانچہ شعرا اور سامعین کی طرف سے بہت اچھی داد دی گئی ہے اور رعنا شعر فرما رہے ہیں ؎

مقامِ انساں مقامِ یزداں جو فاصلہ ہے تو ایک قدم کا
جہاں ملے گی خودی کی سرحد، وہیں حدِ بے خودی ملیگی

حضرت نوح ناروی۔ مولانا ناہید۔ جناب عرشؔ۔ پنڈت ہری چند اختر بہت داد دے رہے ہیں۔ پنڈت ہری چند اختر جب کسی شعر پر بہت زیادہ داد دیں تو سمجھ لیجئے کہ یا تو اس شعر میں کوئی نہ کوئی سقم ہے اور یا پھر وہ شعر درحقیقت تعریف کے قابل ہے۔ سنئے رعنا کیا فرما رہے ہیں ؎

نہ زیست کو ہے دوام حاصل نہ موت کو ہے ثبات حاصل
خزاں میں مرجھا گئی جو ٹہنی بہار میں پھر ہری ملے گی
نگاہ جتنی بلند ہوگی اسی قدر ارجمند ہو گی
بقدرِ قربِ فلک کرن میں حرارت و روشنی ملے گی

رعنا کو خوب داد مل رہی ہے اور رعنا کچھ شعر اور سنانے کے بعد مقطع فرما رہے ہیں ؎

رہِ طلب کے سفر میں رعنا سکوں ہے، خواب و خیال یکسر
قدم قدم ٹھوکریں لگیں گی نفس نفس بے رہی ملے گی

رعنا بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر چلے گئے ہیں اور اب صاحبِ صدر نے جناب عرش ملسیانی سے کلامِ بلاغت نظام سنانے کی گزارش کی ہے۔ عرش صاحب مائیک کی طرف جانے لگے تو کنور صاحب فرما رہے ہیں ؎

عرش کو فرش پہ بٹھاتا ہوں معجزہ آپ کو دکھاتا ہوں

لیجیے عرش صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور نظم کا بند پڑھنا شروع کیا ؎

چلتی ہے ہوائے روح فزا یہ وقت نہیں اب جانیکا
پر کیف ہے رُت دل کش ہے فضا یہ وقت نہیں اب جانیکا
ہر منظرِ شب ہے ہوش رُبا یہ وقت نہیں اب جانے کا
اے حُسنِ مجسّم پاس تو آ، یہ وقت نہیں اب جانے کا

بند خوب ہے مگر عرش جیسے سنجیدہ سخن گو سے ایسے اشعار کی توقع سامعین کو نہیں تھی۔ اس لیے وہ داد کے بجائے اپنے چہروں سے حیرانی کا اظہار کر رہے ہیں۔ سنئیے دوسرا بند ارشاد فرما رہے ہیں ؎

یہ چرخ یہ لکّہ ابرِ رواں یہ چاند یہ تاروں کا عالم
یہ صحنِ چمن یہ گل بوٹے یہ پھول یہ پھولوں پر شبنم
یہ سرد ہوا یہ سناٹا شاخوں کا گلے ملنا باہم
اے حُسنِ مجسم پاس تو آ، یہ وقت نہیں اب جانیکا

منظر نگاری خوب ہے مگر خواتین ذہنی کشمکش میں مبتلا دکھائی دے رہی ہیں۔ [illegible] انھیں افضل پشاوری ٹائپ کے ان اشعار کی توقع جناب عرش سے نہیں تھی لہذا ان خواتین کی آنکھیں اور چہرے ان کی ذہنی کشمکش کی مجسم ترجمانی کر رہے ہیں اور عرش چوتھا بند فرما رہے ہیں ؎

باقی نہ رہیں جب ضبط و سکوں ایسے میں بھی کوئی جاتا ہے
جب زور پہ ہوں جذباتِ جنوں ایسے میں بھی کوئی جاتا ہے
جب دل پہ بنا دے دردِ دروں ایسے میں بھی کوئی جاتا ہے
اے حُسنِ مجسم پاس تو آ، یہ وقت نہیں اب جانے کا

داد دی جا رہی ہے اور اگلی صف میں بیگم پٹودی کے ساتھ والی کرسی پر ایک نوجوان صاحبزادی جلوہ فرما ہیں اور ان کے ساتھ والی

کرسی پر ایک ادھیڑ عمر کی خاتون تشریف رکھتی ہیں۔ ان محترمہ نے داد دینے کا بہت اچھا طریقہ یوں نکالا ہے کہ داد دیتے وقت اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے بچوں کو خطاب کرتی ہیں
دو بند مزید سنانے کے بعد حضرت عرش سالقان بند ارشاد فرما رہے ہیں ؎

ہے تیز ہوائے عشق مگر کیوں تجھ کو ہوا یہ راس نہیں
کیوں غنچۂ الفت میں تیرے دل جوئی کی بو باس نہیں
پھر دو نہیں جو ضد کرتا کیوں اس کی ضد کا پاس نہیں
اے حُسنِ مجسم پاس تو آ، یہ وقت نہیں اب جانے کا

نوجوانوں کی طرف سے داد کا وہی عالم ہے اور عرش صاحب آخری بند پڑھ رہے ہیں ؎

جس شیشۂ دل کو توڑا ہے اس شیشۂ دل کو جوڑ بھی دے
جس بات سے دل کو ٹھیس لگے اس بات سے رشتہ توڑ بھی دے
جانے کا ارادہ مہلک ہے، جانے کا ارادہ چھوڑ بھی دے
اے حُسنِ مجسم پاس تو آ، یہ وقت نہیں اب جانے کا

نظم ختم کرنے کے بعد جب عرش صاحب اٹھ کر اپنی جگہ پر جانے لگے تو سامعین میں سے ایک صاحب اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہہ رہے ہیں کہ ہاں صاحب واقعی یہ وقت جانے کا نہیں ہے جس پر بیگم بیخودی مسکرا رہی ہیں۔ خان غازی کابلی کو یا تو جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے یا ان کی طبیعت خراب ہے جس کی وجہ سے وہ نہایت بے اعتنائی سے سٹیج پر سو رہے ہیں۔ جس پر پنڈت ہری چند اختر کنور صاحب سے کہہ رہے ہیں کہ کیوں صاحب یہ ہاں کابلی کے نام الاٹ ہو گیا ہے۔ گو یا ل متل کہہ رہے ہیں کہ کنور صاحب کابلی کو پڑھوا دیجیے نہیں تو سٹیج کا انتظام کرنا پڑے گا۔ پاس بیٹھے ایک صاحب کہہ رہے ہیں کہ ہاں جناب ع

دل بہ ست آور کہ حج اکبر است

ہری چند اختر فرما رہے ہیں کہ تم نے تو دل دست میں ڈال دیا ہے اس پر کنور صاحب مسکرا رہے ہیں۔ کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ مترور صاحب کل ہم لوگ علی گڑھ کے مشاعرہ میں گئے تو وہاں انور صابری بھی تھے چونکہ انور صابری دیوبند کے رہنے والے ہیں لہذا پنڈت ہری چند اختر کہنے لگے کہ آ ... رہنے کر بند، دل بند تو سنا تھا یہ "دیوبند" کیا ہے۔ اور پھر خود ہی کہنے لگے کہ اچھا اب سمجھ میں آیا کہ انور صابری کی وجہ سے اس کا نام "دیوبند" رکھا گیا ہے پنڈت جی کے اس لطیفہ کو کنور صاحب کے بیان کرنے پر پاس بیٹھے ہوئے سب لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔ اتنے میں دیکھا تو حضرت خار دہلوی مائیک پر مطلع فرما رہے ہیں ؎

یہ بھی اعجاز ہے الفت کا سب منھ تکتے رہ جاتے ہیں
ہم ایک نظر میں باتیں کیا افسانے تک کہہ جاتے ہیں

مطلع پر اچھی داد دی جا رہی ہے۔ خار صاحب کا شعر سنیے ؎

اک جلوۂ دلبر کی خاطر ہیں اس کوچہ کے پھیرے پھیرے

لفظ پھیرے پھیرے پر بیگم بیخودی مسکرا رہی ہیں۔ اور خار صاحب مصرعۂ اولیٰ کو دوبارہ پڑھنے کے بعد مصرعۂ ثانی فرما رہے ہیں ع

دیوانوں کا سا عالم ہے کچھ آتے ہیں کچھ جاتے ہیں

خار صاحب فرما رہے ہیں ؎

آنسو وہ گوہر ہیں جن کی ہے بطنِ صدف میں ہی قیمت
موتی سی آب گنواتے ہیں جب آنکھوں سے بہہ جاتے ہیں

اس شعر کو بہت زیادہ پسند کیا گیا ہے۔ مولانا ابر احسنی دوبارہ پڑھوا رہے ہیں اور بہت اچھی داد دے رہے ہیں اور جناب خار مقطع فرما رہے ہیں ؎

کیا کیا نہ ستم ٹوٹے ہم پر اب کون سا جور نہیں ہوتا
ہم خار وفا کے بندے ہیں جو پڑتی ہے سہہ جاتے ہیں

خار صاحب کے بعد صاحبِ صدر خان غازی کابلی کو بلا رہے ہیں اور وہ حضرات خراٹے لے رہے ہیں۔ کنور جوہر نے انہیں اٹھایا تو وہ عجیب انداز سے پگڑی گلے میں ڈالے جلدی سے اٹھ بیٹھے ہیں اور کھڑے ہو کر نہایت اطمینان سے پگڑی سر پر لپیٹ رہے ہیں اور شعراء و سامعین ہنس رہے ہیں۔ پنڈت ہری چند اختر فرما رہے ہیں کہ ابھی پگڑی ہی باندھ رہا ہے شکر ہے کہیں پاجامہ باندھنا شروع نہیں کر دیا۔ اس پر سٹیج پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور خاں صاحب مائیکروفون پر تشریف لا کر نہایت طمطراق سے اپنی ایک پرانی غزل ابرِ بہار ہیں کے اٹھو اور یاروں کے یار ہیں کے اٹھو زمین میں سنا رہے ہیں جناب عرش فرما رہے ہیں ؎
برہمن سے یہ کہتے ہیں لو دو جگ بیون ... چار ہیں کے اٹھو اور چار ہیں کے اٹھو

کا بلی کو دو تین شعروں پر اچھی داد ملی ہے اور ان کے بعد جنابِ عشرت کرتپوری مائیک پر تشریف لائے ہیں اور انہوں نے اپنی ایک پرانی نظم پڑھنی شروع کی ہے جس کے ہر بند کا ٹیپ کا مصرع ہے۔ ع

ہائے یہ بیٹھے بٹھائے مجھ کو کیا ہونے لگا

نظم اچھی ہے لیکن جب وہ یہ مصرع پڑھتے ہیں تو سامعین بے تحاشا ہنس پڑتے ہیں اور وہ اس مصرع کو اس نازک مزاجی سے ادا فرماتے ہیں کہ خواتین بھی منہ پر رومال رکھکر ہنسنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ سرکرد صاحب ہائے "اس طرح میں شعر کا راجہ ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہاں صاحب سوامی پارسا ناتھ یہاں موجود نہیں ورنہ وہ اس راجہ کو جلدی پہچان لیتے اس پر کنور صاحب ہنس رہے ہیں۔

اب صاحبِ صدر نے جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحر کو کلام سنانے کی تکلیف دی ہے۔ کنور صاحب مائیک پر فرما رہے ہیں کہ میں مزاحیہ اشعار کہا تو نہیں کرتا لیکن میں نے اس رنگ میں بھی کوشش کی ہے لہذا کچھ شعر پیش کرتا ہوں شاید پسندِ خاطر ہوں۔ کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ گورنمنٹ کا ایک محکمہ دوسرے محکمہ سے یا ایک صوبہ سے دوسرا صوبہ افسروں کو ادھار پیٹہ کے طور پر لے لیا کرتا ہے۔ لہذا ایسا افسر جو ڈیپوٹیشن (DEPUTATION) پر گورنمنٹ آف انڈیا میں آیا ہوا ہے اس کی تعریف میں کہا ہے ؎

خیر سے شاد و مطمئن ہے اب　　اب درِ یار تک رسائی ہے
یہ دلہن وہ ہے جو بشوقِ وصال　　اپنے میکے سے سہاگ آئی ہے

تیسرے مصرع میں "بشوقِ وصال"، اور چوتھے مصرع میں "اپنے میکے سے سہاگ آئی ہے"، نے مشاعرہ کو گرما دیا ہے کنور صاحب کی بیگم صاحبہ کھل کھلا کر ہنس پڑی ہیں۔ بیگم پٹودی اور دوسری خواتین بہت زیادہ ہنس رہی ہیں PARENT OFFICE کو میکے سے تشبیہ دے کر کنور صاحب نے جو مزاح ان اشعار میں پیدا کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔

اب کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ وہ افسر جو ریٹائرڈ ہونے سے پہلے رخصت طلب کرتے ہیں ان کے متعلق عرض کیا ہے ؎

گو نوکری وہ ان کی ختم ہو نہ　　مرد بازار لیو میں بیٹھے ہیں

دم و پیوں کو کھا کے یہ عشرت　　مَا کی تیاریوں میں بیٹھے ہیں

پھر ہنسی کا ایک طوفان ہے جو ذرا تھما تو کنور صاحب فرمانے لگے کہ وزیر بے محکمہ کے متعلق عرض کیا ہے ؎

بارِ غم سے دبا ہوا ہر آن　　ملک و ملّت کا یہ فدائی ہے
ہم پہ لازم ہے احترام اس کا　　گو خدا دندِ بے خدائی ہے

کنور صاحب اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں اور صاحبِ صدر اعلان فرما رہے ہیں کہ اب مشیرِ کلامی تکرا اپنا کلام سنائیں گے۔ لیجئے لالہ جی مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور مطلع فرمایا ہے ؎

جب دردِ طلب بڑھتے بڑھتے خود اپنی دوا بن جاتا ہے
آہوں کے بھی پر لگ جاتے ہیں نالہ بھی رسا ہو جاتا ہے

اوّل تو یہ خوش خبری سنیئے کہ ہمارے "شاعرِ اعظم" اب واقعی "شاعرِ اعظم" ہوتے جا رہے ہیں۔ لہذا انھوں نے آج اپنی ترقی کا اظہار یوں فرمایا ہے کہ خلافِ معمول ترنم سے پڑھ رہے ہیں۔ اور بیگم پٹودی نہایت [illegible] سے دیکھ رہی ہیں کہ آج لالہ جی کو کیا ہو گیا ہے شاعرِ اعظم رسا کو [illegible] "پڑھ رہے ہیں۔ پنڈت ہری چند اختر فرما رہے ہیں کہ سرکرد صاحب رسا [illegible] پڑھنے پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں وہ نالہ کو نالا بمعنی "ازار بند" پڑھ رہے ہیں۔ اور نالا تو رسی یا رسہ کا ہوتا ہے۔ اختر صاحب کی اس تشریح پر میں تسلیم بجا لایا ہوں۔

جناب شنکر فرما رہے ہیں ؎

انسان کو جب کچھ فہم نظر قدرت سے عطا ہو جاتا ہے
ہر شے کی طلب مٹ جاتی ہے راضی بہ رضا ہو جاتا ہے

اختر صاحب فرما رہے ہیں کہ لالہ جی شنکر ایک کم بخت شاعری ہی ایسی ہے جس کی نہ طلب مٹتی ہے اور نہ کوئی راضی بہ رضا ہو کر اس کا پیچھا چھوڑتا ہے۔

درمیانہ قسم کے قابلِ برداشت ترنم سے شنکر صاحب فرما رہے ہیں ؎

منبر سے نہیں کہتا کوئی، لیکن دار پہ کہنے کی باتیں
یہ ذوق تو خودی اللہ اللہ بندہ بھی خدا ہو جاتا ہے

منبر کو شاعرِ اعظم ممبر پڑھ رہے ہیں۔ اس پر داد دینے والے داد دے رہے ہیں اور جناب شنکر فرماتے ہیں ؎

پروں شمع کی لو سے ٹکرانا ہے کام ہی پروانے کا

ہم جانے نہیں دیتے اس پر اک فرض ادا ہو جاتا ہے

ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ آج تو شنکر صاحب اپنے کلام کو ترنم سے بے خود ہی نہیں بلکہ مخمور بنا رہے ہیں۔ دوسرے صاحب فرما رہے ہیں کہ آج صرف ترنم کا ہی اضافہ نہیں بلکہ ان کے کلام میں جو رنگِ قدیم پایا جاتا تھا وہ آج نہیں ہے بلکہ آج تو آپ اپنی غزل میں ان قدیم قسم کے خیالات سے بھی آزاد نظر آ رہے ہیں اتنے میں کان مائیک کی آواز پر لگا ہے تو شنکر صاحب کو یہ کہتے سنا

وہ ان کے تغافل کی باتیں وہ اپنی وفاؤں کا رونا

جب یاد مجھے آ جاتے ہیں ہر زخم ہرا ہو جاتا ہے

اس شعر پر شنکر صاحب کو بہت اچھی داد دی جا رہی ہے۔ اور آپ فرما رہے ہیں

تم مشقِ ستم جاری رکھو بے کار پشیماں ہوتے ہو

ہے اُسکی جگہ میرے دل میں جو تیر خطا ہو جاتے ہیں

ایک صاحب جنکا نام لکھنے کی ممانعت ہے، اپنے ایک دوست سے کہہ رہے ہیں کہ پارٹیشن نے آزاد صاحب اور شنکر لال کو ترنم سے پڑھنے کا مشورہ تو غیر ... دیا ہے اور دوسرے صاحب فرما رہے ہیں کہ محض ترنم کی "ریہرسل" ہی میں آزاد صاحب کو کافی صبر آزما محنت سے کام نہیں لینا پڑا بلکہ معلوم ہوتا ہے۔ انہوں نے شنکر صاحب کے کلام سے رنگِ قدیم کو دور کر کے شاعری میں تبدیلی کرنے میں بڑی محنت کی ہے لیجیے اب "شاعرِ اعظم" سے مقطع بھی سن لیجیے۔ فرماتے ہیں

دنیائے محبت میں شنکر ایسے بھی مقام آ جاتے ہیں

جینے کیلئے جو مرتا ہے جینے سے خفا ہو جاتا ہے

یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ خواہ "شاعرِ اعظم" کو ترنم کی ٹریننگ کیلئے باقاعدہ روم یا نہ معلوم کس کس روم میں ریہرسل کرنی پڑی ہو گی مگر انھوں نے پہلی مرتبہ نہایت اچھے تعلیم یافتہ سامعین کے سامنے نہایت جرأت سے کام لے کر ترنم سے غزل پڑھ ہی دی اور ترنم بھی ماشاء اللہ اچھا خاصا تھا۔ اور جہاں راقم الحروف شنکر صاحب کو اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہے وہاں اس "ماہرِ فن" کو صد ہزار مبارکباد پیش کرتا ہے جس نے کہ "شاعرِ اعظم" ایسے شخص

کو ترنم سے پڑھنا سکھا دیا ہے۔ اب جنابِ صدر اعلان فرما رہے ہیں کہ جس عظیم ہستی کی یاد میں آج یہ مشاعرہ ہو رہا ہے۔ ان کے داماد اس محفل میں موجود ہیں جو کہ ایک شاعر بھی ہیں لہذا میں پنڈت چاند نارائن چاند ڈپٹی کمشنر کرنال کو تکلیف دونگا کہ وہ اپنا کلامِ بلاغت نظام سنائیں۔ چاند صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور رباعیات و قطعات فرما رہے ہیں

زباں میری نہ ہو لیکن تخیل میرا اقبالی   "کلامِ چاند" کی "بانگِ درا" ہی نے بنا ڈالی

میرے پنہائے دل میں دو عالم مقید ہے   نظر میری بصیرت کے مناظر دیکھنے والی

چاند صاحب کو بہت داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں

جہانِ رنگ و بو وہم و گماں ہے   حقیقت کا بہار خوابِ گراں ہے

الہٰی آج تک یہ راز یہ نہ سمجھا   جہاں مَیں ہوں یا مجھ میں جہاں ہے

چاند صاحب قطعات پڑھ رہے ہیں سنیئے فرما رہے ہیں

جبکا مقصودِ نظر تو ہے وہ ارماں ہوں میں   تو ہے پنہاں یہ ترا جلوۂ عریاں ہوں میں

گاہ میں راہِ حقیقت سے بھٹک جاتا ہوں   میری فطرت کا تقاضا ہے کہ انساں ہوں میں

اچھی داد مل رہی ہے اور چاند صاحب فرما رہے ہیں

تو نے یہ مجھ پہ بڑا احساں کیا   دل دیا کو مگر گشتۂ ارماں کیا

تابِ عقل کیا عشق کا جذبہ دیکر   دیکھئے سامان مجھے بے سر و سامان کیا

کنور مہندر سنگھ بیدی اصرار کر رہے ہیں کہ چاند صاحب اپنی وہ مشہور نظم سنائیں جو انہوں نے تقسیمِ ملک کے بعد لکھی لیکن وہ ایک دوسری غزل کا مطلع فرما رہے ہیں۔ سنیئے ارشاد ہوا ہے

میرا دورِ عیش گزر چکا غمِ روزگار سے کام ہے

نہ وہ میری محفلِ عشق ہے نہ وہ بادہ ہے نہ وہ جام ہے

مطلع پر بہت زیادہ داد دی جا رہی ہے اور چاند صاحب نہایت دل پسند انداز میں فرما رہے ہیں

میری چار دن کی ہے زندگی مجھے آرزوئے دوام ہے

مجھے موت کہتی ہے بار بار حیات میرا ہی نام ہے

داد حسبِ سابق مل رہی ہے اور چاند صاحب فرما رہے ہیں

میں وہ تیزگام تھا راہرو کہ کہیں نہ میرا قیام تھا

میں وہ سُست گام ہوا ہوں اب میرا ہر قدم پہ مقام ہے

اچھی داد مل رہی ہے اور چاند صاحب دو اشعار کے بعد فرما رہے ہیں

وہ جو سر بلند و غیور ہے [illegible] بندگی   جسے [illegible] اسی کا غلام ہے

نواب پٹودی کو سلام کیا ہے چونکہ مخمور صاحب ریاست پٹودی کے ملازم رہے ہیں اس لئے وہ اپنے اس سابق ارضی آقائے ولی نعمت کو ریاستی باشندوں کی طرح سلام کرنا ضروری سمجھتے ہیں حالانکہ ایسی محفلوں میں محمود و ایاز میں کچھ فرق نہیں ہونا چاہئے یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ نواب پٹودی نے مخمور صاحب کو جب کلام سنانے کے لئے کہا تو اُنھوں نے ان کا نہایت احترام سے نام لیا۔ اور نواب پٹودی ہوں یا ان سے بھی کوئی بڑا۔ جناب مخمور کا جو مقام ہے وہ تقاضہ کرتا ہے کہ وہ جس احترام کے مستحق ہیں ان کا وہ احترام ہونا ہی چاہئے مخمور صاحب نے رُباعی فرمائی ہے ۔

اس دور کے انساں ایسے دانا ہیں کہ نہیں　دُنیا میں کہیں ان کا پتہ ہے کہ نہیں
وہ سوچ رہے ہیں کہ بتا دیں مجھ کو　میں سوچ رہا ہوں کہ خُدا ہے کہ نہیں

رباعی کے پہلے دو مصرعوں پر بیگم پٹودی مسکرا رہی ہیں۔ اور جناب مخمور اپنے مخصوص ترنم میں غزل کا مطلع فرما رہے ہیں ۔

جنھیں سننے کو سب اپنے بھی بیگانے بھی آئیں گے
وہ آخر زباں پر ایسے افسانے بھی آئیں گے

یہ غزل مخمور صاحب نے گورنمنٹ ہاؤس کے مشاعرہ میں پڑھی تھی اور اس سے پہلے بھی وہ یہ غزل اکثر مشاعروں اور مخصوص محفلوں میں سُنا چکے ہیں لیکن یہ غزل اس قدر بہترین ہے کہ اس کے کچھ شعر نذرِ ناظرین نہ کرنا ظلم ہوگا۔ سنئے مخمور صاحب فرما رہے ہیں ۔

اگر تم شمعِ محفل بن کے آباد گے محفل میں　تو اپنی آگ میں جلنے کو پروانے بھی آئینگے

مخمور اتنی اچھی اور دل پسند لے میں پڑھ رہے ہیں کہ روح تک وجد میں آرہی ہے اور پھر شعر کیا ہیں واردات قلب کو نہایت سادہ الفاظ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر طریق سے ادا ہونا مشکل ہے۔ نہایت اچھی تحسین و آفرین میں مخمور صاحب فرما رہے ہیں ۔

تمہارے ہجر میں بے کیف ہے مینا نہ و ہستی
تمہیں آ ؤ گے تو گردش میں پیمانے بھی آئینگے

ہر شعر پر داد کا تانتا بندھ رہا ہے اور مقطع فرما رہے ہیں ۔

دو عالم دیکھ کر دل کو تو وہ منہ پھیر لیتا تھا　تمہاری راہ میں کم علم جیسے دیوانے بھی آئینگے

حضرت نورِ نارروی۔ امیر احسن۔ ہری چند اختر۔ صاحب عبدو کنود صاحب بہت زیادہ داد دے رہے ہیں اور مخمور رد محبت میں قدر رکھنے والے ہمدرد کو خود دار کرتے ہوئے [illegible] بتاتے ہیں کہ

ملا ان کعبہ دل اس قدر آساں نہیں ہمدرد　ذرا ثابت قدم رہنا صنم خانے بھی آئینگے

مخمور صاحب کچھ اشعار اور سنانے اور ہر شعر پر بے انداز داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور مہدور اعلان فرما رہے ہیں کہ اب شوق دہلوی کلام سنائیں گے۔ شوق صاحب کی داڑھی بالکل سفید ہے مگر ہمدرد دواخانہ میں ملازم ہونے کے باعث کلام میں گرمی موجود ہے لہذا قدیم رنگ میں غزل کے کچھ شعر پر ارمان نکالے ہوئے ہیں اور بال کالے ہوئے اس زمین میں سُنا رہے ہیں۔ ایسے اشعار سفید داڑھی والے کے منہ سے نکلتے ہوئے کچھ بھلے معلوم نہیں دے رہے ہیں جس سے حاضرین ... شعر سننے پر مجبور ہو گئے ہیں شنکر لال نواب صاحب سے مذاق کر رہے ہیں جس بیگم صاحبہ پٹودی بھی مسکرا رہی ہیں۔ اسی زمین میں پنڈت ہری چند اختر فرما رہے ہیں ۔

عزیز انکی خاطر نہ ہو مجھ کو کیونکر　نہ دے کے وہ میرے سالے ہوتے ہیں

اب جناب عزیز وارثی مائیک پر تشریف لائے ہیں۔ عزیز آج سنانے کے موڈ میں نہیں ہے۔ لہذا انہایت بے دلی سے ایک لمبی بحر کی غزل سنا رہا ہے جس کا مطلع ہے ۔

یہ سوچا تھا ہم نے رہِ عاشقی میں شب و روز ان سے ملاقات ہوگی
خبر یہ نہ تھی ان کی فرقت کے غم میں کہیں دن کٹے گا کہیں رات ہوگی

یہاں تک تو خیر کوئی بات نہ تھی لیکن عزیز کے اس شعر نے تو سامعین کو ہنسنے پر مجبور کر دیا ہے ۔

یہ کالی گھٹائیں یہ موسم سہانا یہ ساقی یہ صہبا یہ ساغر یہ مینا
گلے مل گئے جو یہ اک دوسرے سے تو کب تک خدا جانے برسات ہوگی

برسات اگر ہو جاتی تو خدا جانے کب تک ہوتی لیکن ہال میں سامعین نے ہنسی کی اچھی خاصی [illegible] بات کر دی۔ میں نے یہ پہلی مرتبہ دیکھا کہ عزیز نے سننے والوں کے متعلق غلط اندازہ لگایا۔ اس مشاعرہ میں مدعو بھی صاحبِ ذوق حضرات کو کیا گیا تھا اور اہلِ ذوق ایسی غزلیں پسند نہیں کرتے۔ خیر عزیز پانچ شعر سنا کر تشریف لے گئے ہیں اور اب جناب امین سلونوی کو پکارا گیا ہے۔ امین سلونوی ایک اچھے انسان [illegible] اور [illegible] کتب فروش ہیں مگر وہ ایک اچھے شاعر نہیں ہیں لیکن ہمارے عتیق صاحب ان کو بھی دہلی والوں کے سامنے ایک نئی دریافت کی صورت میں لائے ہیں سنئے عتیق صاحب کی یہ نئی دریافت مطلع فرما رہی ہے ۔

وہ مٹ گئے انھیں کدھر جہاں تلاش کر — وفا شعاروں کے نام و نشاں تلاش نہ کر

پڑھنے کے لحاظ سے امین صاحب بھی پنڈت میلا رام وفا سے کچھ ہی مطلب

اچھی ڈگری رکھتے ہیں۔ سنیے کیا فرما رہے ہیں ؂

یہ فکر کر کہ سہے رنجِ ناکامی — خوشی کا نام نہ آسماں تلاش نہ کر

اس پیامِ حیات افروز کے بعد فرماتے ہیں ؂

میں کھو گیا ہوں خود اپنی ہی آرزوؤں میں — مجھے خدا کے لئے مہرباں تلاش نہ کر

میرے ساتھی فرما رہے ہیں کہ حضور آپ کو اب بھی عتیق میاں ہی

تلاش کر کے لائے ہیں۔ ورنہ آپ تو ہمارے لئے پہلے ہی "اعلانِ

گمشدہ" تھے۔ خدا خدا کر کے عتیق میاں کی یہ نئی دریافت دس

اشعار کی غزل سنا کر اپنی جگہ پر چلی گئی ہے اور اب حضرت ابر احسنی

گنوری سے کلام سنانے کی گذارش کی گئی ہے۔ ابر احسنی صاحب

بہت اچھے پڑھنے والوں میں سے ہیں۔ لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ

اہلِ ذوق حضرات "تحت اللفظ" کلام سنا پسند کرتے ہیں اور

اہلِ ذوق حضرات کسی سفید داڑھی والے سے ترنم میں پڑھنے کی

توقع بھی نہیں رکھتے۔ لیکن ابر صاحب نے تو قوالی نما قسم کے ترنم

میں پڑھنا شروع کیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سامعین میں سے

نوجوان طبقہ بھی مصرعِ ثانی کے آخری حصہ کو ابر صاحب کے ساتھ

اسی لے میں دہراتا ہے جس سے بے لطفی سی ہو گئی ہے اور حضرت

ابر پانچ شعر سنانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں۔ اب پنڈت

ہری چند اختر تشریف لائے ہیں اور نہایت اطمینان کے ساتھ

فرما رہے ہیں ؂ یاس و حرماں کی غم و آلام کی باتیں کریں

آ، دلِ ایذا طلب کچھ کام کی باتیں کریں

جناب سحر فرما رہے ہیں کہ پنڈت جی "یہ کام" ہندی والا ہے

یا اردو والا۔ اختر صاحب بغیر جواب دیئے فرما رہے ہیں ؂

دوست سے کہہ دیں دلِ بے مدعا کی داستاں

آج ساقی کی شکستِ جام کی باتیں کریں

جس کی دنیا آپ سے تھی، جس کی دنیا آپ تھے

آؤ اُس بدبخت کے انجام کی باتیں کریں

پنڈت جی کو بہت زیادہ داد دی جا رہی ہے اور ان اشعار

کے بعد پنڈت جی مائیک سے ہٹنے لگے تو سامعین اور شعراء نے

پنڈت جی سے کچھ اور سنانے کے لئے کہا ہے جس پر پنڈت جی

فرما رہے ہیں کہ اچھا پھر آؤ کام کی باتیں کریں۔ سنئے پنڈت جی

فرما رہے ہیں ؂

شیخ و پنڈت کفر اور اسلام کی باتیں کریں — کچھ خدا کے قہر کچھ انعام کی باتیں کریں

یہ سنائیں پاک نغمے اوّلیں الہام کے — وہ خدا کے آخری پیغام کی باتیں کریں

ہم کھڑے سنتے رہیں اور واہ کہتے رہیں — اب یہ رخصت ہوں تو ہم کچھ کام کی باتیں کریں

آخری شعر پر سامعین اور شعراء ہنس رہے ہیں اور پنڈت جی

داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں۔ صاحبِ صدر نغمہ

سخن تاج الشعرا حضرت نوح ناروی جانشینِ داغ کو کلامِ بلاغت

نظام سنانے کی گذارش کر رہے ہیں۔ لیجئے نوح صاحب مائیک پر

تشریف لے آئے ہیں اور نہایت دلفریب انداز سے فرما رہے ہیں ؂

لفظوں کی طرف میری نگاہیں کیوں رہیں — اوزان و قوافی کی فضائیں بھی حسیں

استادِ جہاں ہے تلمذ اے نوح — داغی ہوں مگر مجھ میں کوئی داغ نہیں

داد کا تانتا بندھ گیا ہے اور حضرت نوح یہی رباعی دوبارہ پڑھنے

کے بعد فرما رہے ہیں ؂

دلّی کی فضا میں جب رہنا سیکھا — استادِ جہاں سے شعر کہنا سیکھا

بحرِ تخئیل کیا ڈبوئے اے نوح — طوفانِ سخن میں ہم نے بہنا سیکھا

معصوم بہت رہیں گے دلّی والے — کیا کچھ نہ وہاں سنیں گے دلّی والے

فردوس میں بھی جا کے نکالا — دلّی دلّی کہیں گے دلّی والے

اس رباعی سے تو سامعین اور شعراء ہنس ہنس کر بے حال ہو رہے ہیں

اور قبلہ سے یہ رباعی دوبارہ پڑھوائی گئی ہے۔ اب حضرت نوح فرما

رہے ہیں ؂

دلّی میں نئی غزل سنائی تم نے — جل کے نارہ سے داد پائی تم نے

اے نوحِ جہاں سب الٹی گنگا — الٹی جمنا مگر بہائی تم نے

اس رباعی پر پنڈت ہری چند اختر فرما رہے ہیں ؂

میں ہوں وہی نوح نے کہ اپنی کشتی

اوروں کو ڈبو کے بھاگ جانے والا

اب قبلہ نوح سے کنور صاحب نے کچھ غزلیں سنانے کی فرمائش کی

ہے۔ اور حضرت فرما رہے ہیں ؂

گلزارِ جہاں میں آ کہ خزاں پژمردہ کم سہہ رہے ہیں

پھولوں کا مجھے افسوس نہیں کلیوں کا قلق البتہ ہے

اس مطلع پر بہت زیادہ داد دی جا رہی ہے اور یہ مطلع تین [illegible]

قارئین شانِ ہند کو
جشنِ جمہوریت مبارک
سعودی عرب میں ملازمت کے
خواہشمند حضرات مفید مشوروں اور
تسلی بخش خدمات کے لئے رابطہ قائم
کریں
مہاشکتی ٹریولز اینڈ پرسنل
ڈی۔8۔ ڈیفنس کالونی، نئی دہلی۔24
فون:۔ 623137

۲ عظیم تحقیقی تحفے

۱۔ غالبیات۔ چند عنوانات

۲۔ مقالاتِ چکبست

آفسٹ پرنٹنگ

طباعت کے آخری مراحل میں

وِمل پبلی کیشنز

305۔ چرچ گیٹ چیمبرز، 5 نیو میرین لائینز، بمبئی 400020

رشیدا پتنگیا

(عبد الوحید)

پچھلی بسنت میں اس کی شادی ہوئی تھی اور آج پھر بسنت کا پہلا دن تھا۔ لوہاری دروازے کی پچھلی جانب ایک بڑا میدان ہے۔ رشید اس کے آخری کنارے پر کھڑا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئیگا اُس کا باپ بھلا ایسے میں وہ گھر بیٹھنے والا کب تھا۔

دراصل رشید نے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ شہناز اس کی کلاس فیلو تھی اور اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھی۔ اس کا باپ فوج کا ریٹائرڈ میجر تھا۔ دو بھائی امریکہ میں تھے اور تیسرے کا قالینوں کا کاروبار تھا۔

رشید کی ساری زندگی لوہاری دروازے میں گزری تھی، جہاں اس کے باپ کی برتنوں کی دوکان تھی۔ رشید نے یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیا تھا اور گھر والوں کی مخالفت کے باوجود شہناز سے شادی کر لی تھی۔ اب اس کی دو دلچسپیاں تھیں۔ دفتر اور پھر ریواز گارڈن کے فلیٹ میں شہناز کی محبت سے لبریز زندگی ــــ زندگی خوب صورت تھی ور لوہاری دروازہ بہت دُور۔

رشید لوہاری دروازے میں شیدا پتنگیا کہلاتا تھا۔ یہ شوق سے ورثے میں ملا تھا۔ اس کے باپ حاجی شریف کو پتنگ بازی کا جنون تھا۔ پانچ سال کی عمر میں ہی وہ چرخی پکڑ کر کھڑا ہو جاتا اور حاجی شریف گڈی چڑھاتا۔ اس پورے علاقے میں کوئی نہ تھا جو حاجی شریف کا شوق پورا کرتا۔ مانجھا وہ خود سُوتا کرتا۔ گھر میں رشید کی ماں کانچ کوٹتی ور وہ مانجھا بنایا کرتا۔ کالج آتے آتے رشید بھی پتنگ بازی میں طاق ہو چکا تھا۔ پتنگ دُور فضا میں بھی اس کی انگلیوں پر یوں چلتی جیسے اب وہ شہناز کے ابرو پر چلتا تھا بے بس اور تابع۔

پتنگ بازی میں باپ بیٹے کی جوڑی، مانجھے گڈی کی مانند تھی، لازم و ملزوم، سب کچھ وہی رہا صرف فرق یہ پڑا کہ یونیورسٹی میں ڈور رشید نے تھام لی اور چرخی حاجی شریف نے۔

رشید کی ماں شہناز سے شادی کی شدید مخالف تھی۔ اسی وجہ سے اسے گھر چھوڑنا پڑا۔ اب وہ کبھی کبھار باپ سے دوکان پر جا کر مل لیتا۔ لیکن پتنگ بازی سے پرہیز ہو گیا تھا۔ شہناز کو اس شغل سے سخت چڑ تھی۔

"بھلا یہ CHEAPSTERS والے مشغلے آپ کو زیب دیتے ہیں۔ ایسا ہی کریز ہے تو کلب جا کر بھائی جان کے ساتھ TENNIS کھیل لیا کریں"۔

رشید ہنس پڑتا، ایک سال وہ ہنستا رہا، اور انگلیاں کھاج کرتی رہیں۔

پچھلے بدھ حاجی نے اسے بتایا کہ اس دفعہ وہ ۸ نمبر کی ڈور خاص قسم کے کانچ سے سوت رہا ہے۔ دیکھتا ہوں شہر کا کون سا کھلاڑی میری بَو کرتا ہے، یہ کہتے ہوئے بوڑھے کا چہرہ معصوم شوق سے تمتما رہا تھا۔ رشید کو باپ پر حسد ہوا۔ اور وہ بے صبر بسنت کے انتظار میں بھیگا ہوا کپاس کتتا رہا۔

آج وہ دفتر سے سیدھا ادھر ہی آیا تھا، صبح سے سارے شہر پر پتنگیں ہی پتنگیں تھیں۔ اور رشید کے اندر ہڑ آیا ہوا تھا۔

حاجی کے ساتھ ایک لڑکا اور تھا۔ وہ دونوں میدان کے بیچ آکر ٹھہر گئے، اور حاجی شریف بیٹھ کر پتنگ میں کنیاں ڈالنے لگا۔

رشید نے بھرے ہوئے سانس میں باپ کو مخاطب کیا۔

"ابا میں پکڑوں چرخی"۔

بوڑھے کی آنکھوں میں حیرت امڈ آئی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"رشیدے پتر! تو صاحب آدمی ہے یہ تو ہماری کھیل ہے، آوارہ اوباشوں کا۔ پتنگ سارے شہر پر اڑتی ہے، پر کیا پتہ کٹ گئی تو کہاں گرے۔ پتر یہ وہ کھیل ہے جس کا میدان آزاد فضا ہے۔ تو بابو ہے، بشر ہے، جا کرکٹ کھیل، ہاکی کھیل"۔

رشید یوں تھا جیسے تیز آندھی میں گرا نیم کا درخت۔ ٹھنڈا اور مایوس، تھپیڑے کھاتا ہوا۔

دوسرے دن حاجی نے اسے سمجھایا۔

"بیٹا تو میری اکلوتی اولاد ہے جب تیری گھر والی اسے بُرا

[illegible] THE KE[illegible] ماخوذ

خیال کرتی ہے تو دفع کر، پتنگ کی خاطر کبھی گھر بھی اجاڑے جاتے ہیں"

وہ چپکا ہو رہا، پر بڑھ نہ سکا، اور تیز ہو گیا۔ اندر سے سب کچھ تتر بتر کر دیا۔ شام کو وہ گھر آیا تو ساتھ ایک پنا ڈور کا اور دو پتنگیں تھیں ایک گڈا اور دوسری ڈبّی۔

شہناز نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"رشید آپ ٹھیک تو ہیں خاندانی یادگاریں یہاں کیوں اٹھا لائے"

اُسے تو بھڑوں کا پورا چھتا لڑ گیا۔

"بکواس بند کرو، یہ میرے بچپن کا شوق ہے، میرے باپ کا شوق ہے اور آج بسنت کا پہلا دن ہے"

شہناز چپ ہو گئی۔

دوسرے روز جب وہ چولہے پر لیٹی پکانے لگا تو وہ پھر چلانے لگی۔

"آپ آخر چاہتے کیا ہیں؟"

"پتنگ اڑانا" اس نے سکون سے جواب دیا۔

"میرے ہوتے ہوئے آپ ایسا نہیں کر سکتے"

"میں ایسا کر رہا ہوں"

شہناز کو خدا جانے کیا ہوا۔ تیزی سے باہر گئی اور صحن میں رکھی پتنگوں کو پرزے پرزے کر دیا اور چارپائی پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگی رشید بے قابو ہو رہا تھا۔ بیوی کی بپھری دیکھی اس نے شہناز پر انڈیل دی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

وہ سیدھا لوہاری کے میدان میں گیا۔

حاجی شریف پورے بانکپن سے گڈی چڑھا رہا تھا اور کلّی والا لڑکا چرخی پکڑے کھڑا تھا۔ وہ دور سے انھیں دیکھتا رہا۔

قریب جانے کی ہمت نہ پڑی، اسے اپنا باپ پتنگ کی طرح آزاد لگا اور وہ خود جیسے چرخی تھا کسی کے ہاتھ میں جکڑا ہوا لاچار اور مجبور۔

رات شہناز کی اس سے کوئی بات نہ ہوئی۔

دوسرے دن وہ شام کو اس سے مخاطب ہوئی، بپھری ہوئی۔

"مجھے پتہ ہے یہ اس بڈھے کی شرارت ہے۔ آپ کو وہی یہ سب سکھاتا ہے، مجھ سے زیادہ آپ کو یہ پتنگ بازی عزیز ہے تو مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں"

رشید ضبط کر کے بیٹھا رہا اور پھر گھر سے نکل کر سیدھا لوہاری چلا گیا۔

دوسرے روز وہ بہت سی پتنگیں اور ڈور خرید کر لایا اور بیڈ روم میں انھیں ٹانگ دیا، شہناز یہ سب کچھ دیکھتی رہی، اور پھر جب وہ سویا تو اس کی ہچکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں۔

اگلے روز شہناز کا والد اس کے دفتر آیا، اس نے رشید کو سمجھانے کی کوشش کی،

"بیٹے! شہناز کی ساری زندگی ایک ایسی LOCALITY میں گزری ہے۔ جہاں ایسے شغل اچھے نہیں سمجھے جاتے وہ گلبرگ میں پلی بڑھی ہے۔ اس کا احساس بڑا جائز ہے، تم ایسی ضد کیوں کرتے ہو یہ شوق بیوی سے بڑھ کر تو نہیں، اسے چڑ ہو گئی ہے"۔

اور اسی طرح کی بہت سی باتیں کر کے وہ چلا گیا۔

شام کو رشید گھر آیا تو شہناز غائب تھی، میز پر ایک رقعہ رکھا تھا۔

"میں ابو کے گھر جا رہی ہوں، اگر آپ پتنگ بازی ترک کر سکیں تو مجھے لے جائیں، ورنہ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ"

کمرے میں پتنگوں کے پرزے بکھرے پڑے تھے اور جلی ہوئی ڈور کی راکھ کا ڈھیر تھا۔

رشید نے ایک گہرا سانس لیا، کپڑے تبدیل کئے اور سیدھا لوہاری دروازے پر جا پہنچا۔

حاجی شریف پتنگ اڑا رہا تھا، بسنت جوبن پر تھی۔

لڑکا چرخی پکڑے کھڑا تھا۔

وہ دوڑتا ہوا میدان کے بیچ جا پہنچا۔ چند لمحے دیکھتا رہا پھر تیزی سے آگے بڑھا اور حاجی شریف کے ہاتھ سے ڈور کھینچ لی، پتنگ چڑھ رہی تھی۔ دور تک، بہت دور۔

حاجی نے چرخی سنبھالی، وہ مسکرا رہا تھا۔

پتنگ بہت دور تھی، بہت پرے کھلی فضا میں۔

گلبرگ کے اوپر

غزل

ڈاکٹر تفتہ
کوروکشیتر یونیورسٹی

آلام و غم و حُزن کے کانٹوں کی چھنی ہے
سورج کی تپش ہے تو کہیں چھاؤں گھنی ہے
ہر غمزے میں ظالم کے ہے تلوار کی بُرّش
ہم عشق کے ماروں کو ہے امرت سے بھی بڑھ کر
خیرات میں خود پیش ہوا ان کے سراپا
تقدیر کے ماروں کا نہیں کوئی بھی مونس
جاں سوز ادائیں ہیں وہی تریا چلتر
آکاش میں گنگا ہے کہ سندور بھری مانگ
یہ دورِ تشدّد بھی ہے کیا دورِ تشدّد
اِس دور کی تہذیب ہے! تہذیب سے عاری
اے شیخ حرم! حُرمت مے چاہیئے تجھ کو
گفتار کا اسلوب کوئی آپ سے سیکھے
ہر دل میں ہیں رِستے ہوئے ناسور ہزاروں
اِس دور کے فرہاد بھی کیا خوب ہیں یارو
اب حُسن کا بھی بار سنبھلتا نہیں ان سے
دل چیر کے اپنا ہی نکالو غم اُلفت
امید مروّت کی کسی سے بھی نہ رکھنا

انسان کی ہستی تو فقط ناگ پھنی ہے
دُنیا کی یہ تصویر بہت خوب بنی ہے
ہر بات میں کمبخت کے وعدہ شکنی ہے
وہ حُسن کی مے جو ترے آنچل سے چھنی ہے
دُنیا میں بھلا کون مرے دل سا غنی ہے
منگل کہیں راہو کہیں کُنڈلی میں تنی ہے
کیا زیست ہے بلوا کی اگر چنتامنی ہے
جھومر ہے کہ ماتھے پہ ترے چندرمنی ہے
چادر غم و آلام کی ہر سر پہ تنی ہے
یہ عین حقیقت ہے کہ کیچڑ میں سنی ہے
یہ وعظ ترا رِندوں کی خاطر شکنی ہے
باتیں ہیں محبت کی مگر طعنہ زنی ہے
حالات کے عقرب کی عجب نیش زنی ہے
ہر سمت تشدّد ہی کی اب تیشہ زنی ہے
نازک بدنی سی کوئی نازک بدنی ہے!!
اے عاشقو! یہ دراصل یہی کوہ کنی ہے
اے تفتہ خبردار! یہ دُنیائے دَنی ہے

غزل

(موہن لال جگمت رتلام)

آگ دامن میں اندھیروں کے لگادی جائے
لَو چراغوں کی ذرا اور بڑھادی جائے
میرے بھی جسم میں خوشبو سی بسا دی جائے
شاخِ گُل میری طرف اور جھکادی جائے
پھول تو کھل ہی رہے ہیں چمنِ ہستی میں
غنچوں غنچوں کو مہکنے کی ادا ہی بخشی جائے
شہر کا شہر ہی بہرا نظر آتا ہے مجھے
کوئی سُنتا ہی نہیں کس کو صدا دی جائے
جس نے آنسو تری آنکھوں کو دئے ہیں جگمت
زندگی بھر اُسے ہنسنے کی سزا دی جائے

غزل

(اچاریہ دھرمیندر ناتھ جے پور)

رازِ دل وا نہ کریں آپ کو رُسوا نہ کریں
اور فرمایئے ہم عشق میں کیا کیا نہ کریں
زخم وہ دل پہ لگاتے ہیں اور اس شرط کے ساتھ
ہم شکایت نہ کریں اور مداوا نہ کریں
آتے آئیگا ابھی بزم میں وہ بند انداز
اور اک جام اُٹھالیں ابھی توبہ نہ کریں
یار محفل میں چلا آتا ہے شمشیر بدست
اس پہ سب شرح و فلاح چھوڑدیں غوغا نہ کریں
وہ بھی محشر میں دکھائے گا ہمیں روئے عتاب
ہو کر برگشتہ جو ہم حشر یوں برپا نہ کریں

من کہ مکتوب الیہ

حیدرآباد مرقومہ ۱۵ فروری سنہ ۱۹۸۳ء

محترم سرور صاحب ۔ سلام رحمت

میرے عزیز دوست ڈاکٹر طالب شاہ آبادی صاحب نے آپ کا غائبانہ تعارف کرایا تھا ۔ پھر کرم دوست میر سد نیکوست اکتوبر ۱۹۸۱ء کا ماہنامہ زیر مطالعہ ہے ۔ جو چیز پسند آجائے اور مختصر بھی ہو اسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا ہوں تاکہ جلد ختم نہ ہو آپ کے دو مستقل عنوانات بلبل ہو کر دو، اور بکھرے یار بہت جان دار معلوم ہوئے ۔ جو کام آپ انجام دے رہے ہیں اب اسی کی ضرورت ہے خدا اجر دے ۔ ہم اپنا بہت کچھ کھو چکے ہیں خصوصاً حق پرستی و بے باکی ۔ ایسا کردار کہیں نظر آجائے تو اس کی جگہ دیدہ دل میں ہے ۔ ہم دراصل خدا کی عدولی حکمی اور بے لوث بزرگوں کی نافرمانی کا خمیازہ بھگت رہے ہیں ۔
آج سے ستاون برس پہلے ۱۹۲۵ء میں ہمارے ایک قومی بزرگ نے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے صدارتی خطبہ میں پوری ہندوستانی قوم کے تعلیمی مستقبل کو سنوارنے کی بات کی تھی اور اس شاہراہ تک پہنچنے کے لئے آدھی صدی سے ۲۲ برس بیشتر واضح انداز میں خطوط کھینچ کر منزل کی نشاندہی کی تھی ۔ انھوں نے کہا تھا ۔

"ان دونوں فرقوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے ہم کو اچھے پروفیسر اور اساتذہ کے انتخاب میں بڑی ہوشیاری سے کام لینا چاہئے ۔ وہی کاریگر ہیں اور آئندہ تعمیر ان ہی کے ہاتھوں میں ہوا کرتی ہے ۔ اگر وہ چاہیں تو اپنے طرز عمل اور کیرکٹر کے اثر سے ہندو مسلمان لڑکوں کو شیر و شکر بنا سکتے ہیں یا اس موجودہ فصل کو اور بھی زیادہ عمیق کر سکتے ہیں ..... ان کا فرض اک بہت بڑا اور پاک فرض ہے ۔ انھوں نے اپنی زندگی انسان کی روح کی صلاحیت کو نشوونما دینے اور اشرف بنانے میں وقف کر دی ہے ۔ یہ وہ کام ہے جو انسان کی پیدائش کا مقصد معلوم ہوتا ہے ۔ یعنی ایثار نفسی ایسے کام کے لئے کیا جائے وہ بہت کم ہے ۔ وہ افراد جو ایسے پاک کام میں مشغول نہیں وہ باہمی قومی جھگڑوں و معاشی تنازعات کو حقارت کی نظر سے دیکھ سکتے ہیں ..... اور اس اتحاد کے قائم کرنے اور بگاڑنے میں ہماری قومی تاریخیں اور ہمارے اساتذہ اور پروفیسر کے طریق عمل کو بہت کچھ دخل ہوگا ۔ ... کسی استاد سے جذبات تعصب کا ظاہر ہونا اس کی نااہلیت کی اک وجہ قرار دی جا سکتی ہے ۔" (وغیرہ)

بہرحال یہ ایک طویل داستان ہے جسے پھر کبھی سنئے ۔ محترم لطیف الزماں صاحب نے اپنے خط میں ایک عالم کی جو تصویر پیش کی ہے اسے دیکھ کر نظر نجی ہو گئی ۔ وقتاً فوقتاً اور یہ بھی معلوم ہوتا رہتا ہے ۔ سن کر کچھ ہوا کرتا ہوں یہ سب غیر متوقع نہیں ہے ۔
کوئے یار میں یکے از بلاکشان محبت ہما صاحب میر علی الیہ بھائی پھول شخصیت کا تیا زماں کرکے ایمان جاگ گیا ، مسیح جن کے دل میں اتر جائے اور بانسل جن کی رگوں میں بہنے لگے ایسے دنیا میں ایسے ہی کام سنوار رہے ہیں اس عہد کی مقدس ترین خاتون "مدر ٹریسا" کو یہاں اور ڈاکٹر سسٹر لوئیس کو وہاں (دارالسکون ۔ کراچی) دیکھئے ۔
آپ کا موقر جریدہ دیکھ کر حضرت نجم آفندی کا یہ شعر معاً یاد آگیا ۔

حق بات کہو سن کے جسے کوئی کہ مرجائے
ایسی تو ہو برچھی کی طرح دل میں اتر جائے

انشاء اللہ گاہ گاہ آپ سے باتیں ہوا کریں گی ۔ والسلام

آپ کا مخلص حباب آفریدی

نوٹ :۔ طالب علمی کے زمانہ سے حکیمت میرا پسندیدہ شاعر ہے ۔ راما کن کا ایک سین آج بھی یاد ہے ۔ کرشن کنہیا اور ایک آدھ قومی نظم کے علاوہ کوئی سرمایہ میرے پاس نہیں ۔ کالیداس گپتا رضا صاحب نے بڑا کام کیا کہ ہمارے ملک کے قومی شاعر کو جس کے کلام کے نمونے غالب کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں گمنامی سے بچا لیا ۔ ادب میں افتراق پسندوں کی کوئی گنجائش نہ رکھنی چاہئے ایسے لوگ اپنی فطرت کا مظاہرہ کر [illegible] کا [illegible] کلام کو [illegible]

ہریانہ میں کمزور طبقوں کی معاشی اور اقتصادی ترقی کیلئے کوشش

● ہریانہ سرکار شیڈولڈ کاسٹ اور پسماندہ لوگوں اور جھگی جھونپڑی والوں اور دیگر پسماندہ اور اپاہج لوگوں کی معاشی اور اقتصادی ترقی کیلئے کئی اسکیمیں چلا رہی ہے۔

● پسماندہ لوگوں کو مالی اور دوسری قسم کی امداد دینے کے لئے پسماندہ طبقہ کیلئے کلیان نگم کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

● غریبی کی سطح سے بھی نیچے زندگی گزارنے والی ہریجن اقوام کا معیار زندگی اونچا اٹھانے کیلئے مخصوص ترین اسکیم چلائی جا رہی ہے۔

● مفلس اور نظر انداز کئے ہوئے لوگوں کو قانونی امداد مفت دی جاتی ہے۔

● ہریجن طالبات کو وظیفے، فیس کی معافی اور ان کے امتحان سے پہلے کی تیاری کرانیکے لئے کلاسیں لگاکر خصوصی آسانیاں مہیا کی جاتی ہیں۔

● نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے ہوسٹل اور ہریجن مستورات کے لئے پڑھنے اور روزی کمانے کے سینٹر کھولے گئے ہیں۔

● ہریجن بستیوں کی گلیوں میں روشنی اور گھروں میں ایک پوائینٹ بجلی کنکشن کا انتظام کیا جا رہا ہے۔

● ہریانہ رہائشی بورڈ کے ذریعہ بنائے گئے مکانوں میں پسماندہ اور کمزور طبقات کے لئے ۵، فیصدی مکانات کا ریزرویشن کیا گیا ہے۔

● اپاہج لوگوں کے لئے سرکاری ملازمتوں میں تیسرے اور چوتھے درجوں کی آسامیوں میں ۳ فیصد جگہیں ریزرو ہیں۔

● نابینا افراد کے لئے کئی مراعات دی گئی ہیں جس میں ایک سال تک تسلی بخش کام کرنے والے عارضی ملازمین کو مستقل کرنا اور پورے صوبے میں بغیر کرایہ سفر کرنے کی رعایت اور سرکاری رہائش دینے میں ترجیح دی جاتی ہے۔

"یہ گرو تمہارے ہاتھ نہیں لگا گھوڑوں پر سوار ہے۔ کالا اور گھوڑے کا ساتھ کیا۔ وہ بہت دُور نکل چکا ہے۔ تم اب بے چارے کو لے جاؤ اور اپنا کام کرو۔"

"کیا بکواس کرتا ہے۔ پولیس کی بہت ہتک کرتا ہے۔ بدمعاش سے ڈر گیا جوانی کا نیوز لے رہا ہے۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں صاحب۔ میرے کہنے پر عمل کرو اور ایک کام اور کرو۔"

"کیا؟" تیور چڑھاتے ہوئے سپاہی نے سوال کیا۔

"اس وقت ہمیں بھی یہاں سے لے چلو ورنہ یہ لوگ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو اُن کو ہمارے آنے کا پتہ ہے اور پولیس جس علاقے میں ہو کر نکل جاتی ہے غنڈے وہاں سے بیساکھ کی ملی کی طرح سے ہوا ہو جاتے ہیں۔ تمہارے پاس کوئی بھی نہیں پھٹکے گا۔" بے پروائی سے اُس کی باتوں کی تہہ میں پہنچے بغیر ہی سپاہی نے کہا۔ یہ سنتے ہی کسان کا چہرہ انٹرویو میں فیل امیدوار کی طرح پیلا پڑ گیا اُس نے جھنجلا کے کہا

"چھوڑیئے اِن باتوں کو۔ بدمعاش پولیس کی آنکھوں کے سامنے گھومتے پھرتے ہیں اور پولیس کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اِس خاکی وردی پر اتنے مغرور کیوں ہوتے ہو ذرا دیر میں کرکری ہوتی ہے۔"

"تم گھبراؤ مت ہم لوٹتی بار تم دونوں کو یہاں سے لے چلیں گے۔"

دوسرے سپاہی نے جھوٹا سہارا دیتے ہوئے کہا اور کسان کو کچھ راحت ملی۔ وہ بولا "بھگوان نے کچھ سُنی تو۔"

"کچھ بھی نہیں سُنی۔ یہ پولیس کسی کی میت ہوئی ہے جو تمہاری ہوگی اپنا کام نکالنے تک یہ لوگوں کے پیٹ میں گھس جاتی ہے کام پورا ہوا اور اُس نے آنکھیں دکھائیں۔ تم نے لڑکے کی جان تو بچائی یہ تو دھرم کیا لیا مگر اب اپنی سوچو۔ میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ یہاں سے بھاگ چلو" بیوی نے کہا۔

"عورتیں کائرتا کی بات کرتی ہیں۔ ہم نے پولیس کی مدد کی ہے اُس کے ساتھ احسان کیا ہے وہ اِس احسان کے بدلے میں ہمیں فرور لے چلے گی اور ہماری حفاظت کرے گی۔"

"پولیس اور تمہاری حفاظت کرے گی۔ وہ اپنی ٹوپی تو سنبھالے مان جاؤ بھاگ چلو۔ مجھ کائر کا کہا ہی مان لو۔ کہیں کہیں بھاگ جانا بھی بہادری ہوتا ہے۔ دشمن کے سامنے اکیلے کو کٹ مرنا کوئی بہادری نہیں ہوتی ہے۔ بے وقوفی ہوتی ہے۔ میرا دل دھڑک رہا ہے چلو جلدی چلو مت سوچو مت" بیوی نے خیالوں میں کھوئے ہوئے شوہر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا اور ایک ہاتھ پیٹ پر پھیرنا شروع کر دیا جس میں بچہ آخری اُچھل کود مچا رہا تھا۔

"کیوں بے حرام زادے ہمارے شکار کو کر دیا داماروں کے حوالے غداری سے باز نہیں آیا۔" دونوں کے پیچھے سے ایک کڑک آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہی بدمعاش بندوق سنبھالے مونچھیں مروڑ رہا تھا۔ اُس نے چاقو نکالا دس بارہ انچ پھیلاتے پھل والا اور اُن دونوں کی طرف بڑھا۔

"ہماری روزی چھیننے کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اُس نے چہرہ بھینگر بناتے ہوئے کہا "ویسے تو میں گولی سے مارتا مگر اُس کی آواز سے پولیس کے کتے ادھر بھاگ آئیں گے اس لئے چاقو ہی کا استعمال کروں گا۔ تم نے اُسے تو بچا لیا اب خود کو بچاؤ۔" دانت کٹکٹاتے ہوئے اُس نے آخری الفاظ کہے اور لپک کر کسان کے پیٹ میں چاقو کا پھل اُتار دیا اور وہ بیٹھے ہوئے بائیں پا پیچھے پر گر گیا اُس کے پیٹ سے خون نکل کر پانی میں مل گیا اور بہتا ہوا کیاری تک پہنچ گیا جس سے تمام کیاری سرخ ہو گئی اُس کی بیوی نے یہ دیکھ کر جھونپڑے کی طرف قدم بڑھائے لیکن ابھی وہ کھونپے تک پہنچی بھی نہ تھی کہ ڈولے سے ٹھوکر کھا کر گر گئی اور بدمعاش نے آگے بڑھ کر اُس کا گلا کاٹ دیا۔ وہ تڑپنے لگی اور اُسی بے کلی اور بیزاری میں اُس کا بچہ بھی پیٹ سے باہر نکل آیا جیسے زبان کھانسی کی شدت سے منہ سے باہر نکل آتی ہے۔

پولیس کچھ دُور تک اُن لوگوں کا پیچھا کرتی رہی لیکن وہ اُن لوگوں کو پکڑنے میں ناکام رہی۔ اندھیرا بھی بڑھتا جا رہا تھا اس لئے سب کے سب لوٹ آئے۔ پولیس شکی ہوتی ہی ہے اُس کے دماغ میں آیا کہ ہو سکتا ہے اُسی کٹیا میں وہ بدمعاش آ چھپے ہوں اس لئے سب کے سب آ کر یہیں پھر ٹک گئے۔ کچھ لوگ جیپ سے باہر نکلے اور اُس کٹیا کے پاس گئے مگر وہ خالی پڑی تھی انہوں نے کٹیا کے مالک کو ڈھونڈا تو وہ دونوں زمین پر مرے ہوئے پڑے پائے عورت کی دھوتی میں بچہ رو رہا تھا کلبلا رہا تھا انہوں نے دھوتی چیرے بچے کو نکالا وہ ٹھیک ٹھاک تھا تندرست تھا خوبصورت تھا فوراً نال کاٹا اور فوٹو لیا اور ماں کی آدھی دھوتی پھاڑ

ٹرالی میں بیٹھ کر کار کی طرف لے کر چل دیئے۔

"یا اگر ہم اُسی وقت ان کو یہاں سے لے چلتے تو ان کی جانیں نہیں جاتیں کسان نے صحیح کہا تھا" ایک سپاہی نے چلتے چلتے پچھتاتے ہوئے کہا۔

"ہم نے دُنیا کی جان بچانے کا ٹھیکہ رکھا ہے کیا؟ جس کی جان بھگوان نہ بچا سکا اس کی جان ہم ہی کیسے بچا لیتے؟" دوسرے سپاہی نے جواب دیا۔

"یہاں بھگوان انسان کے کام نہیں آیا تو کوئی بات نہیں لیکن انسان کو تو انسان کے کام آنا چاہیئے۔ ہم اس امتحان میں فیل ہو گئے۔ اس نے اتنی بڑی قربانی کی اور ہم فرض بھی پورا نہ کر سکے تمہیں بھلے ہی اس کا ملال نہ ہو مگر مجھے تو بہت ہی دُکھ ہے"

"مرنے سے ڈرنا۔ مرنے کا ملال کرنا سپاہی کے دھرم میں شامل نہیں ہے۔ سپاہی کو رحم و کرم کی ضرورت نہیں ہے ظالم بننے کی ضرورت ہے رحم کرم کی باتیں کرنے کو تو دھرم گرو ہی کافی ہیں" دوسرے سپاہی نے کہا

"لیکن بزرگوار ان لاشوں کا تازہ خون یہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ لوگ کہیں آس پاس ہی چھپے ہوئے ہیں اور ہم پر گھات لگا کر حملہ کر سکتے ہیں۔ پتہ ہے کھسیانی بلی کھمبا کریدتی ہے۔ جلدی چلو ورنہ جو ان کا حال ہوا ہے وہی اپنا بھی ہو سکتا ہے" جیپ کی طرف بڑھتے ہوئے سپاہی نے کہا اور دونوں چل پڑے۔ جیپ کے پاس پہنچے تو پولیس انسپکٹر نے پوچھا "یہ کہاں سے لے آئے؟" تب سپاہی نے ساری رام کہانی سنائی۔

"یہ کیسے دوگے؟" انہوں نے پھر کہا۔ ابھی کسی نے صحیح جواب تلاش نہیں کیا تھا کہ سب سے پہلے کملیشور (اٹھایا ہوا لڑکا) بول پڑا

"یہ مجھے دے دیجئے۔ میں اس کو اپنی ممی کو دے دوں گا وہ اس کو پال لیں گی۔ ہمارے گھر میں اس وقت کوئی چھوٹا بچہ بھی نہیں ہے ظالموں نے اُس کسان کے خاندان کو مٹانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن بھگوان کو اُس کا نام چلانا تھا۔ وہ میاں بیوی جنہوں نے ہماری رکشا کی اور خود قربان ہو گئے تو کیا ہم اُن کی آخری نشانی کی حفاظت بھی نہیں کر سکیں گے۔ جہاں میں پڑھوں وہاں یہ بھی پڑھیگا۔ بھیا اس کو بھائی کا پیار دوں گا۔ کیا آپ اس کے ماتا پتا کا ایک ایک فوٹو مجھے نہیں دے سکیں گے؟"۔

"ضرور دیں گے بیٹے" پولیس انسپکٹر نے کہا۔

سب لوگ صاحب ساہو کے گھر خیریت سے پہنچ گئے۔ ساہو صاحب نے خوش ہو کر سب کو انعام دیا پولیس اس بچے کو اور فوٹو کو دے کر چلی گئی۔

ایک مہینہ تو ہنسی خوشی بیت گیا لیکن ساہو صاحب اپنے لڑکے کی بہت نگرانی رکھتے تھے۔ ایک نوکر اس کو اسکول لے جاتا تھا اور اسکول سے ساتھ لاتا تھا پھر بھی ایک دن کملیشور کو گولی مار دی گئی۔"

"غنڈوں نے ایسا کیا ہے وہ پکڑے گئے ہیں" پوری بستی میں یہی ایک جملہ بار بار کر رہا تھا۔ سارا خاندان غم میں ڈوب گیا۔ مہینوں تک ملنے والوں کے شوک سندیس آتے رہے لوگ طرح طرح سے سمجھاتے رہے۔ سچ بھی ہے کہ کوئی کسی کے ساتھ مر نہیں سکتا۔ غم دل کو سمجھانے ہی سے ہلکا ہوتا ہے۔ کوئی بھی حالت سامنے آئی مگر اُس نوزائیدہ کی پرورش میں کمی نہیں آئی۔ سب اُس سے پیار کرتے تھے کیونکہ اس بچے کے علاوہ پورے گھر میں کوئی بچہ ہی نہ تھا کھلونے کی طرح ہاتھوں ہاتھ رہنے لگا اور اُن کے دل بہلانے کا ذریعہ بن گیا۔ دھیرے دھیرے سب اُس بچے کو اپنا سا لڑکا سمجھنے لگے۔ یہی نہیں اُس کا نام بھی مرنے والے کے نام پر کملیشور رکھ دیا گیا کچھ لوگوں نے اس بچے کو گود لینے کی رائے بھی دی۔ مگر ساہو صاحب کا سالا اس کے خلاف تھا وہ کہتا تھا

"چچا جی! ابھی آپ بوڑھے نہیں ہوئے ہیں۔ اس لئے دوسرے کے بچے کو اپنی جائداد کا مالک کیوں بناتے ہیں؟"

ساہو صاحب نے کہا "کیا پتہ زندگی کب دھوکا دے جائے اگر کوئی بچہ ہو گیا تو یہ حقوق واپس لے سکوں کا غذات میں ایسی کوئی بات لکھ دوں گا"

اس مستقل مضبوط ارادے کے سامنے ساہو [illegible] کے سالے کی ایک نہ چلی اور بچے کو کوڑے دان سے اٹھایا گیا بچہ کملیشور کر کے ساری ملکیت کا مالک بنا دیا گیا۔ وقت کی بات دیکھئے کہ بچے کو گود لینے کے پانچ سال بعد ساہو صاحب کی اہلیہ حاملہ ہو گئیں اور سالے کی بات بن آئی اور وہ جگہ جگہ اپنی پہلی باتوں کو دہراتا پھرتا رہا۔ ساہو صاحب اب خاموش تھے اور ہارے ہوئے نیتا کی طرح کچھ نہیں کہتے تھے وقت پورا ہوا اور ایک لڑکی نے جنم لیا۔

تیس سال کی عمر میں کملیشور پیدا ہوا تھا گیارہ سال کا ہو کر اس کا قتل کر دیا گیا۔ اُس کی موت کے پانچ سال بعد یہ لڑکی پیدا ہوئی۔ اس طرح اب ساہو صاحب کی عمر چھیالیس سال کی ہو گئی

تھی۔ جیسے کہ اس دان تو ایسی چیزیں ہیں کہ کسی بھی گھر میں کسی بھی حالت میں سانپ کی طرح آدمی کے ساتھ رہتے ہیں لیکن اولاد پیدا ہونے کی امید کمزور نظر آنے لگی تھی۔ ایسے میں انہوں نے سالے کے کہنے کے مطابق لڑکی کو وارث نہیں بنایا اور کملیشور ہی کو ملک بنا رہنے دیا اور سارا پیار اُسی پر انڈیل دیا۔ لڑکا بھی جو بنا بنایا نکلا ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہوتا گیا یہی نہیں ایک اچھے بیٹے کے تمام گن اُس کے اندر موجود تھے اور یہی تمام خوبیاں اُس کی حفاظت کا کارن بنیں۔ پھر بھی جگل کشور اپنی بھانجی گیتا کو پوری ملکیت کا مالک بنانے کی فکر میں رہتے تھے اُن کی اسکیم کامیاب ہوئی یا نہیں لیکن وہ سازشوں سے باز نہیں آئے۔

ایک دن جگل کشور نے ساہو صاحب سے کہا "میں گیتا کو آپ کی جائداد کا مالک بنانا چاہتا ہوں یہ کملیشور کو کیسے معلوم ہو گیا؟"

ساہو صاحب اُس کے بناوٹی سوال کا جواب دینے ہی والے تھے کہ پاس بیٹھا جگل کشور کا دوست بول پڑا "بس تم اسی بات پر تعجب کر رہے ہو مجھے تو ایک ایسی بات کا پتہ چل گیا جو کسی کو بھی معلوم نہ ہو وہ ساہو صاحب کی جائداد کا مالک بننے کے لئے ساہو صاحب کے قتل کی تیاری کر رہا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟ وہ تو ساری ملکیت کا مالک ہے ہی پھر بھلا ایسا کیوں سوچے گا؟"

"یہی سوچ کر تو میں تعجب میں پڑ گیا۔ مگر جب اُس نے مجھ سے اپنا منشا ظاہر کیا تو میں اصلیت کی تہہ تک پہنچا کہ اس کو شک ہے کہ آپ کسی بھی وقت اُس کے حقوق اُس سے چھین کر لڑکی کے نام کر سکتے ہیں۔ کیونکہ آپ نے اُسے جھوٹا سہارا دے رکھا ہے تاکہ وہ کہیں اور کسی سے نہ مل سکے۔ میں آپ کے کانوں میں یہ بات ڈالنے کو کئی روز سے سوچ رہا تھا مگر موقع نہیں مل رہا تھا۔ یہ لڑکا تو آستین کا سانپ ہے ساہو صاحب! کسی دن آپ کی لڑکی کو بھی ڈس دے گا۔ دیکھئے جانے کہیں جانے پوت لئے ہوتے ہو لگے انہیں پرائے گھر کے دیپ سے اپنے گھر میں اجالا ہوتا ہو گا اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے۔ آپ نے اُسے اپنا بیٹا بنا لیا ہے مگر اُس نے آپ کو اپنا باپ بنا لیا ہو یہ ضروری بات نہیں ہے۔" جگل کشور کے دوست نے کہا۔

"سچ بات یہ ہے تب تو بچا بچا وہ کہیں ہے۔ گھر میں چھپا ہوا دشمن ہے۔ گھن کی طرح جس لکڑی میں وہ رہا ہے اُسی کو کتر رہا ہے۔"

ساہو صاحب کے سالے نے ٹھک سے ہاں ملایا۔

"بالکل صحیح بات ہے اگر میرے سامنے ایسی بات ہوئی ہوتی تو میں اس کو ایک منٹ بھی گھر میں نہیں ٹھہرنے دیتا۔" دوست نے کہا

"بات یہ ہے بھئی ساہو صاحب سیدھے ہیں شریف ہیں اور وہ ایسی بھل منساہت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے اگر یہ ذرا بھی ہوشیار ہوتے تو اُس کو مال متاع کا مالک نہ بناتے۔ لڑکیاں کیا ماں باپ کے گھر نہیں رہتیں؟ کتنے لوگوں نے دامادوں کو اپنے گھر رکھ لیا ہے اگر رکھنا ہی تھا اور پوری ہمدردی برتنی تھی تو دس پانچ ہزار روپیہ دے کر کوئی کام شروع کرا دیتے ٹھیک تھا یا نہیں؟ ملکیت کی مالک لڑکی رہتی۔ تھی تو اپنی بچی" جگل نے پھر کہا۔

"مگر سمجھانے کیسے یہ اُس مٹی کے بنے ہوئے ہیں ہی کہاں جو ایسی باتیں اُن پر اثر کریں۔ میں نے بھی کئی بار اشارہ کیا ہے مگر وہی ڈھاک کے تین پات۔ چلو مندر کا کام ہو گیا ہے جانک آئیں ورنہ پجاری جی کہیں گے کہ اکھنڈ کیرتن میں بھی شریک نہیں ہوئے ویسے تو یہ بیکار کی بکواس ہے۔ اس زمانے میں اور بہتر گھنٹے کا اکھنڈ کیرتن ہے نہ سب پاگل پن؟ اگر بہتر گھنٹے کام کیا جاتا تو دیس کا بھی بھلا ہوتا اور اپنا بھی۔ یوں رامائن کی چوپائیوں کو الاپنے سے کیا ہوتا ہے اگر اُن کو عمل میں نہ لایا جائے۔"

"ٹھیک کہتے ہو" دوست نے کہا اور دونوں باہر چلے گئے۔

ساہو صاحب خیالات کے سمندر میں غوطے لگا رہے تھے اُن دونوں کے الفاظ ان کے دل و دماغ میں ڈی سی کرنٹ کی طرح دوڑ رہے تھے انہیں جسم میں چیونٹیاں سی دوڑتی معلوم ہونے لگیں۔ کان گرم ہو گئے دماغ میں لپ لپ سی ہونے لگی "یہ کملیشور جس کو میں نے انگلی پکڑ کر پالا ہے اپنی ملکیت کا مالک بنا دیا ہے الٹا مجھے قتل کرنے کی سوچ رہا ہے۔ میں نے آنگن میں بیر کا پودا لگا دیا۔ کمینہ کہیں کا احسان فراموش بدذات۔ سچ ہے نیچ قوم سے اونچی بات کی آس رکھنا ہی بھول ہے۔ میں اُسے جلدی گھر سے نکال دوں گا۔ کورٹ جاتا ہوں کاغذی کارروائی خارج کراتا ہوں اس سے تو والی اپنی گیتا بیٹی ہی اچھی۔ اب اُسی کو مالک بنا دوں گا۔ مجھے جگل کشور کا کہنا مان لینا چاہئے تھا۔ کبھی کبھی اپنوں کی نصیحت پر عمل نہ کرنا بھی بہت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اچھا ہوا بھگوان نے جلدی آنکھیں

کھول دیں۔" کہتے ہوئے ساہو صاحب نے بیگ اٹھایا اور کورٹ کو چل دیئے۔ اس وقت گیتا کسی سہیلی کے گھر گئی ہوئی تھی اور کملیشور بازار۔

"آج کا ڈرامہ تو بڑھیا رہا۔ دیکھو ساہو صاحب پر کیا اثر پڑتا ہے" جگل کشور نے کہا۔

"بس یا تو یہ چال فوراً کام کر جائے گی یا فیل ہو جائے گی" دوست بولا

ساہو صاحب جب کورٹ سے لوٹے تو کملیشور کھیرا چھیلنے کے لیے چاقو ہاتھ میں لئے ہوئے۔ یہ دیکھتے ہی اُن کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ "سچ مچ یہ میرا خون کرے گا جگل کشور کا دوست صحیح کہتا تھا" انہوں نے سوچا۔ اور اس کے پاس مرکھنے بیل کو باندھنے کے لیے جانے والے کسان کی طرح ہوشیاری سے گئے۔

"چاقو مجھے دیتا۔"

"لیجئے پتا جی! مگر کیا کریں گے چاقو کا۔ کوئی میرے لائق کام ہو تو بتائیے۔" وہ چاقو کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"تو اس چاقو سے میرا گلا کاٹنے کی کوشش میں ہے۔ میں ذرا بہتا لوں گا۔"

"پتاجی! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"نیچ کمینے! پتاجی کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی تجھے۔ دیکھو!" الماری میں سے پولیس کا دیا ہوا فوٹو نکال کر اُس کے سامنے پٹکتے ہوئے ساری کہانی سنانے کے بعد بولے

"اصلیت یہ ہے۔ پہلے جو بتا رکھا تھا وہ من گھڑت کہانی تھی میں نے تجھے پال پوس کے اتنا بڑا اس لئے کیا تھا کہ کیکر کے پیڑ کی طرح تو مالک ہی کی ٹوپی اتار لے۔ میرا گلا کاٹے گا تو۔ نکل جا میرے گھر سے نیچ کہیں کے۔ کتے کی دُم۔ سانپ کو کتنا ہی دودھ پلاؤ وہ زہریلا ہی رہتا ہے۔"

"ساہو صاحب۔ میرے ماتا پتا نے آپ کے لڑکے کی جان بچانے میں اپنی جان دے دی اور آپ مجھے کمینہ بتا رہے ہیں۔ اگر آپ کی نگاہ میں ایسے آدمی نیچ ہیں، کمینے ہیں تو میری نظر میں ایسے لوگوں کے احسان کو بھولنے والا نیچ اور کمینہ ہے مجھے آپ کی جائداد نہیں چاہیئے" کہتے ہوئے اس نے خود کو اٹھا کر ماتھے سے لگائے اور سنبھال کر جیب میں رکھ لئے اور پھر کہا "یہ شان و شوکت، عیش و آرام مجھے پیار کے بغیر سب بے کار ہیں۔ آپ نے جو تعلیم دلائی ہے اگر یہ واپس کی جانے والی چیز ہوتی تو میں اس کو بھی آپ ہی کو دے جاتا۔ میں آپ کی دولت سے الگ ہو کر بھی مزدوری کر کے جی لوں گا۔ لیکن آپ اس دولت سے الگ ہو کر دو پیسے کی مزدوری بھی نہیں کر سکیں گے ساہو صاحب! آنکھوں میں پلا ہوا جسم محنت مزدوری کرنے لائق ہی کہاں رہتا ہے؟ میں سمجھ رہا ہوں کہ آپ کسی کے ورغلانے میں آگئے ہیں۔ بڑے آدمی کانوں کے کچے ہوتے ہیں لیکن جب حقیقت روشنی میں آئے گی تو آپ خود شرمائیں گے پچھتائیں گے مگر پھر بیچارہ کی طرح آپ کا پچھتانا بے کار جائے گا۔ منہ سے نکلی کرلوئی اور بندوق سے نکل کر گولی واپس نہیں آتی ہے۔" کہتے ہوئے کملیشور جیسے کھڑا تھا ویسے ہی باہر چلا گیا۔ پیچھے لوٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ ساہو صاحب دور ہوتی کٹی پتنگ کی طرح اُس کو دیکھتے رہے۔

کچھ دیر بعد گیتا آئی۔ ماں باپ کو سست بیٹھے دیکھ کر اس نے اداسی کا کارن پوچھا۔ جواب سن کر تلملا اٹھی اس نے جگل کشور کو مع اس کے دوست کو فوراً بلا بھیجا۔ وہ آگئے۔ بہت خوش تھے کہ ان کی سازش جیٹھ کی دوپہری میں ماں تاس کی طرح پھول اٹھی ہے مگر جب ان کے آنے پر گیتا کا منہ کھلا تو معاملہ ہی دوسرا تھا وہ کہہ رہی تھی

"ماما جی! تمہارا دوست کہتا ہے کہ کملیشور پتا جی کے قتل کی تیاری کر رہا ہے؟"

"ہاں ایسا تو ہے ہی۔"

"ٹھیک ہے۔ لو یہ گنگا جل ہے۔ یہ رامائن ہے دونوں کو ہاتھ پر رکھ کے گیتا کے سامنے اس اولاد کی قسم کھاؤ کہ تم نے سب کچھ سچ کہا ہے۔"

"میں تو قسم نہیں کھاؤں گا" دوست نے کہا

"تم ابھی قسم کھاؤ گے۔ ابھی سچ بولو گے" کہہ کر گیتا اٹھی۔ اندر گئی اور بندوق لے آئی۔ انہیں کے سامنے دونوں نالوں میں کارتوس ڈالے اور پوزیشن سنبھال کر بولی "تم نے میرے گھر میں آگ لگائی ہے میرے بھیا کو بنواس دلایا ہے میں ان گولیوں سے تمہاری جان لے لوں گی اگر دنیا میں برائی ختم کرنی ہے تو برے ہی کو ختم کرنا چاہیئے" کہتے کہتے اس کا جسم لال پیلا ہو گیا اُس کے ہونٹ پھڑکنے لگے اس کے انگ کانپنے لگے۔ وہ درگا بنی ہوئی تھی۔ ماں باپ نے بھی کان نہیں ہلایا دونوں بیٹھے ٹکر ٹکر دیکھتے رہے۔

"چاہے مارو چاہے چھوڑو مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ جگل کشور

نے مجھے دو ہزار روپئے دے کر اتنی بات کہنے کو تیار کیا تھا۔ یہ تمہیں جائداد کا مالک بنانا چاہتے ہیں اور کلیشور کو ساہو صاحب کی نظروں میں گرا کر گھر سے نکلوانا" دوست بولا

"مجھے کلیشور تو۔ تو بہت بہکا ہے۔ میں نے تیرے بہکائے میں آکر کتنا بڑا پاپ کیا ہے۔ بس جب تک میں زندہ ہوں تو اس دہلیز پر نہیں چڑھے گا۔ نکل جا۔ فوراً نکل جا یہاں سے میں نے اس کتھلن کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اس ہیرے کو اپنے ہاتھ سے دور پھینک دیا۔ گیتا اب تو اس کا پرائشچت ایک ہی طرح ہو سکتا ہے" کہہ کر کچھ دیر ٹھہرے

"کیسے ؟ ؟" گیتا بولی

"اسے ڈھونڈ کر لاؤں۔ اپنی غلطی کی معافی مانگوں اور اس کے ساتھ تیری شادی کر دوں۔ اور میں تم دونوں کو سب کچھ سونپ کر سنیاس لے لوں"۔

"پتا جی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی بہن کی آپس میں کہیں شادی ہوتی ہوگی ؟"

"یوں منہ سے کہنے پر کوئی کسی کا بھائی بہن یا ماں بیٹا نہیں ہو جاتا ہے۔ یہ بہت پاک رشتہ ہے اور سگے خون ہی سے یہ ممکن ہو سکتا ہے۔ "مدر انڈیا" فلم میں سنیل دت اور نرگس نے ماں بیٹے کا رول ادا کیا تھا لیکن اسی فلم کے بعد وہ دونوں میاں بیوی بن گئے تھے اور کامیاب زندگی بتائی" کہتے ہوئے ساہو صاحب گھر سے باہر کلیشور کی کھوج میں چلے گئے۔ ادھر ماں بیٹی ایسی چپ چاپ بیٹھی تھیں جیسے ان کے ارمان پورے ہونے کی دعا کر رہی ہوں۔ • •

غزل

آبدؔ سیمابی سرہندی

شایانِ زیست یہ ہے کہ پیدا کمال کر
ماضی کے تجربات سے تشکیلِ حال کر

کردار کو خلوص کے سانچے میں ڈھال کر
روشن رہِ حیات میں شمعِ مثال کر

ہم ہیں جنہوں نے قوتِ پرواز بخش دی
الفاظ کو حصارِ لغت سے نکال کر

لغزش رہِ طلب میں سوءِ اتفاق ہے
کیفیتِ انبساط سے روحِ ملال کر

اصلاحِ ملحدینِ تری تو نہیں مگر
بہتر ہے دینِ خودی کو رکھئے سنبھال کر

خود شاد کام صاحبِ تدبیر ہو گئے
ہم کو رضائے دوست کے چکر میں ڈال کر

بے غزل سائی کو ہر مقصد نہ پاؤگے
امرت اُبل رہا ہے سمندر کھنگال کے

• • •

"کون کرے"

عبد الغفار خاں کامل۔ سپروائزر نیوی لاک علی گڑھ

بے وفاؤں سے پیار کون کرے
پیرہن تار تار کون کرے

خود ہی بے اعتبار ہے دنیا
پھر ترا اعتبار کون کرے

چند لمحے گراں گزرتے ہیں
عمر بھر انتظار کون کرے

برق پنہاں ہے ان کی زلفوں میں
وا آرزوئے بہار کون کرے

چار سو ظلمتوں کے سائے ہیں
ظلمتوں کا نکھار کون کرے

دل ہی قبضے میں جب نہ ہو اپنے
دھڑکنوں کا شمار کون کرے

خار دامن میں بھر لئے کامل
لالہ و گل سے پیار کون کرے

• • •

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

عالمی اردو کانفرنس

انا للہ و انا الیہ راجعون

دوسری عالمی اردو کانفرنس جو اترپردیش اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام کئی بار التوا کے بعد حتمی طور پر فروری ۱۹۸۲ء کے آخر میں لکھنؤ میں منعقد ہونے والی تھی۔ اب یہ کانفرنس بقول "خبرنامہ" (اترپردیش اردو اکاڈمی کا آرگن) بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر ملتوی کر دی گئی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اب کی مرتبہ یہ کانفرنس ملتوی نہیں بلکہ "کریا کرم" کر دیا گیا ہے۔ "خبرنامہ" میں محض تہذیب کے التوا کا سہارا لیا گیا ہے۔ کیونکہ اترپردیش حکومت نے جزوی طور پر اپنے ہاں اردو کو دوسری زبان تسلیم کرنے کا ابھی تک محض جو اعلان ہی کیا ہے اس پر کافی لے دے ہو رہی ہے یہاں تک کہ کانگریس کے ممبران اسمبلی میں بھی اس سلسلے میں ہم آہنگی نہیں ہے اور وزیر اعلیٰ وی پی سنگھ کے لئے مشکلات پیدا کی جا رہی ہیں۔ عوام میں بھی کچھ ایسے ہیں جو اردو کو دوسری زبان قرار دیے جانے کے خلاف صف آرا ہیں۔ لہٰذا ایسی گرما گرمی میں عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد جلتی پر تیل کا کام کرتا (ہمیں دلی ہمدردی ہے کہ اس کانفرنس کے نہ ہونے سے حضرات کو مالی طور پر نقصان رہا) اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اترپردیش اردو اکاڈمی مالی طور پر دیوالیہ ہو چکی ہے۔ عملے (جو بھائی بھتیجہ پلان کے تحت بغیر ضرورت بھرتی کیا ہوا ہے) کی تنخواہیں ادا ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ جن مسودات کی اشاعت کے لئے اکاڈمی نے جزوی مالی امداد منظور کیا تھا انہیں مسودات کو کتابی شکل میں شائع ہوئے مہینوں ہو گئے لیکن یہ جزوی مالی امداد ادا نہیں کی گئی اور اس مالی بحران کا اثر اکاڈمی کی دوسری سرگرمیوں پر بھی پڑا۔

اکاڈمی کی مالی حالت بہتر کیوں نہیں ہے اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں۔

• اکاڈمی میں جو عملہ تنخواہ دار ہے وہ اتنا زیادہ ہے کہ ان کے لئے یہاں کوئی کام ہے ہی نہیں لہٰذا سوائے گپ بازی، چائے نوشی،

اخبار بینی یا شمع ادبی معمون کے خاکوں کو پُر کرنے کے لئے مسئلہ الفاظ پر بحث کے اور کوئی کام کیا ہی نہیں جاتا۔ یہاں تک کہ آپ اکاڈمی کو جو خطوط لکھئے اور توا ور جوابی خطوط لکھئے کیا مجال ہے کہ آپ کو جواب مل سکے کیونکہ ہر بیکار شخص اپنے آپ کو مصروف سمجھتا ہے گو گھر کے لئے بازار سے سبزی بھی خریدنے کا وقت ان کے پاس نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں ذیل کا ایک حقیقی واقعہ شاید اکاڈمی کے ذمہ دار اراکان کی کچھ رہنمائی کر سکے۔ یہ واقعہ یوں ہے کہ مرحوم مولانا محمد علی کا پریس نقصان میں چل رہا تھا۔ ان کے اخبارات وقت پر شائع نہ ہوتے تھے حالانکہ پریس اور اخبار کے دفتر میں کام کرنے والوں کی تعداد وافر تھی۔ آخر کار مولانا محمد علی مرحوم نے بھیا احسان الحق صاحب کی خدمات مستعار لیں اور ان کے ذمہ یہ تحقیقات لگائی گئی کہ وہ اس امر کی کھوج لگائیں کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ بھیا احسان صاحب نے ایک ہفتہ تک پریس اور اخبارات کے دفتر میں بیٹھ کر جو رپورٹ مولانا مرحوم کی خدمت میں پیش کی وہ یہ تھی کہ اگر فوری طور پر آدھے عملے کو ملازمت سے جواب دیا جائے تو اخبارات وقت پر شائع ہونے شروع ہو جائیں گے اور پریس بھی نقصان میں نہیں رہے گا۔ لہٰذا یہ نسخہ آزمایا گیا تو حالات اعتدال پر آ گئے۔

چنانچہ ہم اور تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر اترپردیش اردو اکاڈمی کے ناخدا اگر چاہیں تو ہمیں ٹھیکے پر اس کا نظم و نسق سونپ دیں۔ اگر ساری اکاڈمی کا کام محض تین چار اصحاب بہتر انداز میں نہ کر سکیں تو ہمارا ذمہ۔

ہم یہ خوب جانتے ہیں کہ اردو اکاڈمیاں حکومت نے بنائی ہی اسلئے ہیں کہ مسلمانوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کچھ از کار رفتہ اشخاص کی معذی روزی کا انتظام بھی ہو جائیگا اور اردو کے کچھ مستحق یا اور نالائق قسم کے ادیبوں اور شاعروں کو لقمہ تر بھی مل جائے گا اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ کتابوں پر ان کے قابل مصنفین کو انعامات بھی دیئے گئے ہیں مگر زیادہ تر تعداد نا اہل لوگوں کی ہی ہے [illegible] ہے کہ اترپردیش اردو اکاڈمی مولانا محمد علی مرحوم کے [illegible] گی۔ ایسا نہ کرنے کی ایک اور اہم وجہ بھی ہے اور وہ یہ [illegible]

اس ٹوٹ میں کسی نہ کسی طرح ملوث ہے۔ جس شخص کو بھی ملازمت سے نکالا جائے گا وہ دوسرے حضرات کی پول کھولے گا۔ لہٰذا شخص اس خوف سے کہ کہیں اپنی پول نہ کھل جائے دوسروں کی بددیانتی (خواہ وہ کسی قسم کی کیوں نہ ہو) برداشت کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اکاڈمی کے ایک صاحب ہزاروں روپیہ ہضم کر کے کویت چلے گئے پھر وہ بمبئی آگئے، بمبئی سے وہ متعدد بار لکھنؤ آئے مگر اکاڈمی کے اراکین نے ان صاحب کو گرفتار کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ گرفتاری تو بہت دور کی بات ہے اسے نوکری سے علیحدہ کرنے کے احکام بھی جاری نہ کئے گئے تاکہ وہ اکاڈمی کے دوسرے حضرات کی پول نہ کھول دے۔ آخرکار کسی شخص کے سمجھانے پر کہ اگر اس شخص کو ملازمت سے الگ نہ کیا گیا تو یہ کویت اور بمبئی میں "مفروری" کے عرصے کی تنخواہ بھی اکاڈمی سے وصول کر لے گا۔ تب اسے ملازمت سے ہٹایا گیا مگر معاملہ پولیس کے سپرد نہیں کیا گیا کیونکہ اکاڈمی کے اراکین اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ جب پولیس اکاڈمی کی بلڈنگ میں داخل ہوگی تو وہ کئی اور حضرات کو بھی نشانۂ تفتیش بنائے گی۔

جناب عزیز الجبار خاں صاحب کو اکاڈمی کا سکریٹری مقرر کیا گیا ہے۔ خاں صاحب انتظامی قابلیت رکھتے ہیں اور اس قسم کے نیم سرکاری اداروں میں جس نیم ایمانداری، نیم دیانت داری اور نیم ذمہ داری سے عملہ کام کرنے کا عادی ہوتا ہے اس سے بھی وہ خوب واقف ہیں۔ ہمیں یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ خاں صاحب اتر پردیش اکاڈمی میں سدھار لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں مگر اکاڈمی کے حالات اس حد تک بگڑ چکے ہیں کہ انہیں سنبھالنے میں خاصا وقت لگے گا اور یہ بھی ہوگا کہ عملے کے وہ لوگ جو اکاڈمی کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے ہیں انہیں اکاڈمی سے جب تک باہر نہیں کیا جاتا اور عملے کے ہر فرد کی دیانت داری کا محاسبہ نہیں کیا جاتا ہمیں انتہائی ذہنی تکلیف ہوتی ہے جب ہم جناب علی جواد زیدی صاحب کو اکاڈمی کے ایک ناکام منتظم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔

اکاڈمی کے غیر ذمہ دار اراکین کی غیر ذمہ داری کا یہ عالم ہے کہ نارویے میں ہر چمن چاولہ کو عالمی اردو کانفرنس میں فروری کے آخر میں شرکت کیلئے دعوت نامہ تو بھجوا دیا مگر انہیں بروقت عالمی اردو کانفرنس کے غیر معینہ مدت کے لئے التوا کی اطلاع ہی نہیں دی گئی اور چاولہ صاحب لکھنؤ آئے جس کی وجہ سے انہیں آنے جانے کے اخراجات وغیرہ کے لئے کئی ہزار روپیہ کا زیربار ہونا پڑا۔

یہ ہے اتر پردیش اردو اکاڈمی کا حال جس کی جنرل کونسل کا ایک حرام زادے ممبر کو یہ کہتے ہوئے شرم تک نہ آئی کہ نشانِ منزل اکاڈمی کو بلیک میل کر رہا ہے۔

چونکہ وزیر اعلیٰ نے عالمی اردو کانفرنس کیلئے نو لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا تھا اس لئے عالمی اردو کانفرنس کے سلسلے میں بغیر سوچے سمجھے اخراجات کئے جانے لگے اور ہوائی جہاز اور ٹیکسیوں کے کرایوں نیز دیگر فضول مدات پر چوروں کا مال لاٹھیوں کے گز کے حساب سے لوگ جنہیں سائیکل کی سواری نصیب نہیں تھی۔ وہ ٹیکسیوں پر اور جنہیں بس کی سواری کے لئے لائن میں لگنا پڑتا تھا وہ ہوائی جہازوں پر اُڑنے لگے اور اکاڈمی کا روپیہ ان اللّوں تللّوں پر خرچ کر دیا گیا جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ عملے کی تنخواہیں تک رُک گئیں۔ جزوی مالی امداد کی منظوری والے مسودے مصنفین نے قرض لیکر چھپوائے اور اکاڈمی حسب اعلان انہیں جزوی امداد کی رقم کی ادائیگی کے لئے آئیں بائیں شائیں کر رہی ہے اور نئے سال کے بجٹ کے پاس ہونے کے انتظار میں ہے تاکہ اگلے سال کے بجٹ سے پچھلے سال کے بقائے ادا کر سکے۔

جب کسی ضابطے کی تکمیل کے بغیر وزیر اعلیٰ کے وعدے کے مطابق نو لاکھ روپیہ سرکاری خزانے سے وصول کئے بغیر اپنے طور پر اکاڈمی نے بے تحاشا عوامی امانت میں خیانت کی ہے تو اس کا صحیح حل یہ ہے اس قومی امانت کے خُرد بُرد کرنے کے الزام میں اکاڈمی کے ذمہ دار لوگوں پر خیانتِ مجرمانہ کا فوجداری مقدمہ دائر کیا جائے اور روپیہ ان کی املاک سے وصول کیا جائے۔ سُنا گیا ہے کہ اس بددیانتی کے بارے میں اکاڈمی سے سرکار نے بازپرس کی ہے۔ وزیر اعلیٰ اگر چاہیں بھی تو اب حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ وہ سرکاری خزانہ سے مفروضہ عالمی اردو کانفرنس کے نام سے جو لوٹ مچائی گئی ہے وہ روپیہ ادا نہیں کر سکتے ہمیں باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ حکومت اتر پردیش نے مفروضہ عالمی اردو کانفرنس کے سلسلے میں کئے گئے کسی قسم کے اخراجات کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

✠ ✠

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

شاعرِ انقلاب جناب جوش ملیح آبادی کو میں نے پہلی مرتبہ تقسیم
کے بعد مولوی سمیع اللہ (مرحوم) کے کتب خانہ عزیزیہ اُردو بازار
امع مسجد میں دیکھا۔ مرحوم سمیع اللہ صاحب نے میرا ان سے تعارف
رایا تو جوش صاحب نے روایتی مُسکراہٹ کے ساتھ ساتھ یو۔پی کی
ہذیبی روایات کے مطابق اظہارِ مسرت فرمایا (حالاں کہ وہ اس قسم کا
ظہارِ مسرت محض دکھاوے کے طور پر ہی فرماتے تھے) مرحوم جناب
ی شنکر آئی۔سی۔ایس جو سردار پٹیل کے پرسنل سکریٹری تھے کی
سفارش پر سردار پٹیل نے جوش صاحب کو پبلی کیشنز ڈویژن کے
ردو ماہنامہ "آج کل" کے دوبارہ ایڈیٹر مقرر فرمایا تو جوش صاحب
ستقل طور پر دہلی تشریف لے آئے اور اُن کا اکثر و بیشتر اپنے دیرینہ
ارِ غار سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست (مرحوم) کے ہاں
آنا جانا رہتا۔ میں بھی سردار صاحب کی محفلِ نشاط کا مستقل رکن
ھا لہٰذا جب بھی جوش صاحب سردار صاحب کے ہاں تشریف لاتے تو
ن سے علیک سلیک ہو جاتی اور رفتہ رفتہ یہ علیک سلیک اچھی خاصی
قفیت میں بدل گئی۔ جوش صاحب اور شراب کا چولی دامن کا
تھا لہٰذا وہ جب بھی کسی مشاعرے میں تشریف لاتے تو شراب
ن کے دورانِ خون کو تیز کیے ہوئے ہوتی اور ان کے چہرے کا رنگ
بھی نکھر آتا تھا۔ سرکاری اور غیر سرکاری مشاعروں میں وہ شراب
ق میں اور شراب بندی کے خلاف رباعیات سناتے بلکہ جناب مرارجی
یسائی اور پنڈت جواہر لال صاحب نہرو کی موجودگی میں وہ شراب بندی کے
ف اور بھی زیادہ اشعار سُناتے جس پر پنڈت نہرو تو مسکرا دیتے
مرارجی ڈیسائی کی روایتی سنجیدگی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔ میں نے
شاعروں کی روداد لکھتے وقت اکثر اوقات جوش صاحب کی مشاعروں میں
ب نوشی کی تشہیر اور خصوصاً پنڈت جی کی موجودگی میں شراب کی تعریف
بندش کے خلاف اشعار سُنانے پر ناپسندیدہ انداز میں لکھا تو یار
لوں نے جوش صاحب کو میرے خلاف کئی بار بھڑکایا مگر پھر انھیں جوش ہی
نا کہتا اگر وہ اسے لگائی بجھائی پر خفا ہونے لگتے۔ لہٰذا انھوں نے
کبھی اس امر کی شکایت تو کجا ذکر تک بھی نہ فرمایا کہ ان کے خلاف لکھا گیا

بسمل شاہجہاں پوری پولیس میں کانسٹبل تھے فقیر و خیر وہ
جیسا تیسا کہتے تھے مگر ناقدانِ فن نے انھیں کبھی شاعر تسلیم نہیں کیا لیکن
بھلا ہو جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا جو ان دنوں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
تھے بسمل صاحب کو "شاعر" ہونے یا بلند و پُرشور ترنم میں کلام سنانے
کے باعث اپنا گن مین مقرر کرا لیا تاکہ یہ "شاعر" پولیس لائن کی پریڈ سے
تو نجات پا سکے۔

لال قلعہ کے سبزہ زار پر سرکاری سالانہ مشاعرہ ہو رہا تھا اور
آل انڈیا ریڈیو سے یہ مشاعرہ براہِ راست ریلے بھی ہو رہا تھا کہ اچانک
بسمل شاہجہاں پوری مائک پر آئے اور جوش صاحب کے خلاف ایک
مہمل اور بے وزن شعر جو ان کے فرمان کے مطابق فی البدیہہ تھا
پڑھا جو ریلے بھی ہوا۔ منتظمینِ مشاعرہ میں جناب گوپی ناتھ امن
صفِ اول میں تھے لہٰذا یہ سمجھا گیا کہ بسمل صاحب کی یہ حماقت امن صاحب
کے مشورہ سے عمل میں آئی ہے۔ گو اس سلسلے میں امن صاحب اور
جوش صاحب میں جواب در جواب نظموں میں تبادلۂ خیالات ہوئے
مگر جوش صاحب کا فرمان یہی تھا کہ بسمل صاحب کی اس حماقت میں
اگر امن صاحب کا اشتراک ہوتا تو بسمل بے وزن شعر نہ پڑھتا۔
بسمل صاحب کی اس حماقت پر کنور مہندر سنگھ بیدی سخت برہم
تھے اور وہ چاہتے تو بسمل کو کسی نہ کسی طرح ملازمت سے بھی
جواب دلوا سکتے تھے مگر انھوں نے اپنی روایتی نرم دلی اور شاعر
نوازی کے پیشِ نظر بسمل صاحب کو یہی سزا دی کہ انھیں اپنا گن
مین رکھنے کے بجائے واپس پولیس لائن بھجوا دیا۔ ان دنوں جوش صاحب
اور کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی ناراضی کو چیلنج کرنا کسی دل گردے
کا ہی کام تھا لہٰذا بسمل شاہجہاں پوری بے یار و مددگار پولیس لائن
میں لیفٹ رائٹ کرنے لگے تو انھیں کنور صاحب کی گن مینی کے دنوں
میں شرکت اور کنور صاحب کی رفاقت کی یاد نے آ گھیرا تو انھوں نے
شروع کیا تو انھوں نے جوڑ توڑ کر کے ہر ممکن کوشش کی کہ [illegible]

کنور صاحب کی قربت نصیب ہو۔ مگر کنور صاحب بسمل کی شکل تک سے بیزار۔ جب ہر طرف سے کنور صاحب پر بسمل کے لئے سفارشات کا دباؤ بڑھا تو انھوں نے یہ شرط رکھی کہ اگر جوش صاحب بسمل صاحب کو معاف کردیں تو میں بھی معاف کردوں گا۔ بسمل شاہجہاں پوری کتنا ہی پھانٹ کیوں نہ ہوں مگر پولیس کی ملازمت اور کنور صاحب کی گن مینی کے طفیل کچھ دنیاداری سے واقف ہو گئے تھے لہذا کچھ دوستوں کے مشورے پر امن صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ جوش صاحب سے کہئے کہ وہ مجھے معاف کردیں اور کنور صاحب سے سفارش کریں کہ مجھے پھر سے وہ اپنی سرپرستی میں لے لیں۔ جناب امن صاحب نے جوش صاحب کے نام ایک خط لکھا اور سارا معاملہ ٹھیک ہو گیا۔

ان دنوں بیگم شاہدہ نکہت صاحبہ بلبلِ ہزار داستان کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ جوش، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ساحر ہوشیار پوری کی تو دل وجان سے عزت کرتی تھیں۔ دلی کی اس امراؤ جان ادا پر دلی کا ہر شاعر اور ادیب کسی نہ کسی طور فدا تھا۔ بسمل سعید ٹونکی تو ان کے عشق میں روتے تھے، اور یہ حقیقت ہے کہ بسمل ٹونکی کی شاعری میں اصل رنگ ہی شاہدہ نکہت صاحبہ کے باعث آیا۔ جگن ناتھ آزاد، دھرم پال گپتا وفا بھی نکہت صاحبہ کے تیرِ نگاہ کے بری طرح شکار ہوئے۔ ظفر ادیب، گوہر دہلوی، گوپال متل صاحب اور کئی دوستوں نے بیگم شاہدہ نکہت کی رہائش گاہ کو عبادت گاہ سمجھا اور کئی من چلے تو حضرت کوثر کاکوروی ثم جے پوری کے اس شعر کی تفسیر بنے ہوئے تھے ۔

گالیاں کھائیں تو ہم مار پڑے تو ہم پر
ہیں ہمیں ایک گنہگار ترے کوچے میں

نواب ٹونک مرحوم اسماعیل علی خاں کے اعزاز میں یا ان کی طرف سے سیسل ہوٹل (جو آج کل ایک اسکول کی عمارت میں تبدیل ہو چکا ہے) میں ایک دعوت تھی۔ بیگم شاہدہ نکہت بھی مدعو تھیں شراب پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ ان دنوں شاہدہ نکہت کو پوری بوتل وہسکی پی جانے کے بعد ایسا احساس ہوتا تھا کہ انھوں نے وہسکی چکھی ہے ۔

جوش صاحب اپنے تمام ہم جلیسوں یا بستہ برداروں سمیت تشریف فرما تھے۔ جوش صاحب کو عورتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی مگر کبھی کبھی رانگ سائیڈ ڈرائیونگ کر ہی لیتے تھے۔ اس روز پتہ چلا کہ جوش صاحب بھی اپنی شاعری کو مزید انقلابی اور نسوانی سراپا سے سنوارنے کیلئے قافیہ پیمائی میں بیگم نکہت کے رہینِ منت رہے ہیں۔

سیٹھ برلا کی طرف سے کلکتہ میں ایک مشاعرہ کرایا گیا۔ جوش، فراق، جگن ناتھ آزاد، مخمور دہلوی اور میں سب مدعو تھے۔ ہوٹل براڈوے میں ہم سب کے قیام کا انتظام تھا۔ جوش اور فراق کے کمرے پاس پاس تھے منتظمین مشاعرہ کی طرف سے بلیک اینڈ وائٹ کی سکاچ وہسکی کا وافر انتظام تھا۔ میں اور مخمور دہلوی ایک کمرے میں تھے۔ مشاعرے کے بعد جب ہوٹل واپس آئے تو جوش اور فراق نے پھر پینی شروع کر دی۔ چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ فراق صاحب کے کمرے میں شور سنائی دیا میں بھاگا بھاگا گیا تو دیکھا کہ جوش صاحب بھی وہیں ہیں اور ایک بیس بائیس سال کے نوعمر خوش رو لڑکے کو دونوں گرسنہ نگاہوں سے گھور رہے ہیں۔ یہ تو مجھے معلوم ہی تھا کہ فراق اور جوش دونوں رام پوری سنبھلی اور ٹونکی ذوق کے دلدادہ ہیں (ایرانی مذاق کی تشبیہ اب متروک ہو چکی ہے) دیکھا تو یہ صاحبزادے بھی اس حد تک پئے ہوئے تھے کہ گر گر پڑتے تھے ایک تو مفت کی شراب پھر سکاچ اور اس پر پلانے والے فراق اور جوش ایسے فراخ دل (جب کہ ہمیشہ دونوں نے دوسروں کی دی ہوئی شراب پر ہی فراخدلی کا مظاہرہ فرمایا) پھر پینے والے کا یہ حال کیوں کر نہ ہو، جگن ناتھ آزاد مشاعرہ کے بعد اپنے کسی مداح کے ساتھ کہیں چلے گئے تھے مگر خوش قسمتی سے وہ بھی اتنے میں تشریف لے آئے مخمور دہلوی بھی یہ ڈرامہ دیکھنے آئے مگر فوراً لاحول ولا کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ہوٹل کے ایک دو آدمی جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے وہ بھی آ پہنچے تھے آخر کار جوش کو ان کے کمرہ میں لایا گیا اور فراق اور جوش کے مشترکہ غلمان کو ہوٹل سے نیچے اتارنے میں گیا تو اس نے بتایا کہ مشاعرہ گاہ میں مشاعرے کے بعد اس نے فراق صاحب سے آٹوگراف مانگا تو فرمانے لگے چلئے ہمارے ہوٹل تک ہمیں پہنچا دیجئے وہیں آٹوگراف بھی دے دیں گے اور یہاں لا کر انھوں نے یہ ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ میں نے کہا کہ خدا کا شکر کرو کہ بچ گئے ورنہ انگوٹھے والا آٹوگراف ملنے میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی۔

مرحومہ بیگم اختر حیدرآبادی جب بھی دہلی تشریف لاتیں تو وہ جناب اپنے خاص خاص احباب سے ملاقات فرماتیں مجھ ایسے نیازمند کو بھی

تشریف لائیں۔ وہ اپنی ایئر کنڈیشنڈ [illegible] کار بنگلور سے ساتھ لاتی تھیں
ان دنوں میرا دفتر ریور ہوٹل میں تھا۔ ایک دفعہ تشریف لائیں اور
کہنے لگیں کہ میرے ساتھ چلئے بہت ضروری کام ہے ان کے حکم کی تعمیل
میں تو پہلے چاندنی چوک میں جوہریوں کے ہاں ہیروں اور جواہرات سے
جڑے زیورات کو آنکوایا (تاکہ میں ان کی دولت مندی کا معترف ہو
جاؤں) اور پھر جوش صاحب کے ہاں دفتر آج کل اردو سکریٹریٹ
لے گئیں۔ دیکھا تو جوش کچھ کھنچے کھنچے سے تھے۔ کہنے لگیں میں اپنا
دس لاکھ روپیہ مانگنے نہیں آئی یوں ہی آپ سے ملاقات کرنے چلی
آئی تھی مجھے کیا خبر تھی کہ شاعرِ انقلاب اپنی خاندانی اور روایتی تہذیب
مہمان نوازی کو بھی بھلا بیٹھا ہے۔ جوش صاحب کھسیانی ہنسی ہنستے
رہے اور کچھ بے تکلف سے فقرات کے بعد یہ کہہ کر اجازت چاہی کہ مجھے
مسٹر کاٹجو کے ہاں جانا ہے۔ بیگم اختر کو جوش صاحب کے اس سلوک
پر اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے بنگلور جاتے ہی جوش کے بیسیوں خطوط
(اصل) میرے ہاں بھجوائے جن میں جوش صاحب نے مختلف بہانوں سے
تقریباً ایک لاکھ روپیہ بیگم اختر سے ہتھیایا تھا۔ ان خطوط
میں سے کچھ خطوط جوش صاحب کے انتقالِ پاکستان کے کئی سال بعد
مضمون کے سلسلے میں شائع بھی کئے گئے تھے۔

جوش صاحب جو بیوک کار اپنے ساتھ پاکستان لے گئے تھے وہ
نواب اسماعیل علی خان آف ٹونک سے ہتھیائی ہوئی تھی۔ تمام
ریاستیں جو ہندوستان میں مدغم ہو گئی تھیں ان ریاستوں کے سابق
والیان کو سالانہ الاؤنس ملتا تھا۔ اور مدغم شدہ ریاستوں کے سابق
والیان کی تکمیل بھی سردار پٹیل کے ہاتھ میں تھی اور جناب وی شنکر
پٹیل کے پرسنل سکریٹری تھے۔ وی شنکر صاحب اور جوش صاحب
کے تعلقات دوستانہ تھے لہذا جوش صاحب کی سفارش پر وی شنکر
نے نواب ٹونک کو معقول رقم حکومتِ ہند سے قرض دلوا دی جو قسط وار ان کے
وظیفہ سے کٹتی رہتی تھی۔ یہ احسان کرنے پر نواب ٹونک نے جوش
صاحب کو ٹونک آنے کی دعوت دی اور یہ دعوت بسمل سعیدی کے
کہنے پر فوراً منظور کر لی گئی کیونکہ بسمل ٹونکی بھی چاہتے تھے کہ
جوش صاحب کے ساتھ جا کر اہل ٹونک کو دکھا سکیں کہ ان کے تعلقات
کتنی بڑی ہستیوں کے ساتھ ہیں چنانچہ جوش صاحب ٹونک تشریف
لے گئے اور پہاڑی والی کوٹھی میں ان کے قیام کا انتظام کیا گیا

جوش صاحب کئی دنوں تک ٹونک میں چھاؤنی ڈالے رہے اور جب انہیں تحفے تحائف
سے لاد کر نواب صاحب نے اپنی بیوک کار میں جے پور کے ہوائی اڈے تک پہنچانے
کیلئے بھجوایا تو جے پور ہوائی اڈے پر اترنے کی بجائے بسمل سعیدی ٹونکی نے
صلاح دی کہ حضور کیوں نہ کار میں ہی دہلی چلا جائے ہوائی جہاز جب تک
احمد آباد سے آئے گا تب تک ہم دہلی پہنچ جائیں گے، چنانچہ ڈرائیور سے
کہا گیا کہ دہلی چلے چلو، اور جب دہلی جوش صاحب اپنے مکان پر پہنچے تو
بسمل فرمانے لگے حضور اب کار دہلی تک آ ہی گئی ہے تو واپس کیا کرنا ہے
ڈرائیور کو ریل کا کرایہ دیکر واپس بھجوا دیجئے اور یہ نواب صاحب سے
کہہ دے گا کہ کار جوش صاحب نے رکھ لی ہے۔ لہذا ایسا ہی ہوا اور نواب
صاحب بیوک کی بجائے جیپ میں آنے جانے لگے۔ چنانچہ جب بھی جوش صاحب
اس بیوک کار پر جناب شنکر پرشاد صاحب چیف کمشنر کے ہاں جاتے تو
شنکر پرشاد صاحب مسکراتے ہوئے فرماتے جوش صاحب جب آپ اس
کار میں تشریف لاتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بلیک مارکیٹیا سیٹھ
آرہا ہے۔ اور جوش صاحب قہقہہ لگاتے ہوئے چیف کمشنر صاحب کی
مسکراہٹ کو طنزیہ ہنسی میں بدل دیتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جوش صاحب کے پنڈت نہرو سے دوستانہ
مراسم تھے۔ پنڈت نہرو اور ہمارے وزیر اعظم صاحب ان کی دل سے
عزت کرتے تھے، یہ بھی ٹھیک ہے کہ پنڈت نہرو جوش صاحب کی باتوں
پر مسکرا کر رہ جاتے تھے، یہ بھی تسلیم کہ جوش صاحب ہندوستان کے
ہوم منسٹر ڈاکٹر کاٹجو سے وقت مقرر کئے بغیر ان سے ملاقات کرنے چلے جاتے
تھے۔ اس کے علاوہ آپ یا کوئی جو کچھ بھی کہے وہ سب تسلیم مگر [illegible]
کی کہ وہ قطعاً سچ نہیں ہے جو کچھ انہوں نے اپنے بارے میں "یادوں کی
برات" میں لکھا ہے۔ آج تک دنیا کی کسی زبان میں ایسی [illegible]
گرانی نہیں لکھی گئی جس میں اس قدر جھوٹ، الزام تراشی، خاندانی
وجاہت کا جھوٹا پروپیگنڈا اور مفروضہ عشق بازی کے من گھڑت قصے
بیان کئے گئے ہوں جس قدر کہ "یادوں کی برات" میں۔ مرحوم دیوان
آنند کمار صاحب بار ایٹ لا اور سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی
(مشہور راجہ نریندر ناتھ آف لاہور کے صاحبزادے) فرماتے تھے کہ
سرور صاحب "یادوں کی برات" میں جوش صاحب نے اگر کہیں سچائی سے
کام لیا ہے تو صرف وہاں جہاں انہوں نے "میرے معاشقے" میں یہ لکھا
ہے کہ ایک دن صبح صبح انہوں نے اپنی گھر والی کو گرا کر لحاف میں دبا

لیا تھا۔ یادوں کی برات میں جوش صاحب نے قصداً اپنے محسنِ اعظم دی شنکر صاحب آئی سی ایس اور لالہ کرشن لال صاحب مالک ہوٹل راج دوت کا ذکر تک نہیں کیا حالانکہ دی شنکر صاحب کی بدولت ہی وہ آجکل کے ایڈیٹر بنے اور بیورک کار بھی ان کے احسانات کے بدلے میں ہتھیائی۔ اور لالہ کرشن لال کی شراب جس قدر جوش صاحب کے جسم میں گئی ہے اس کی بو تو جوش صاحب کی قبر کی مٹی سے بھی برسوں نہ جا سکے گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ "یادوں کی برات" پُرشکوہ الفاظ۔ بہترین تشبیہات۔ لاجواب اندازِ تحریر۔ اور اردو ادب میں اپنی نظیر آپ ہے۔

جوش صاحب کی موت کا افسوس مجھے کسی دوسرے سے کم نہیں۔ مجھے ان کی دوستی تو نہیں البتہ ان کا ایک نیازمند ہونے کا شرف ضرور حاصل تھا۔ انہوں نے پاکستان سے مجھے کئی خطوط لکھے جن میں سے کچھ شانِ ہند میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ جوش صاحب اپنی طرز کے واحد شاعر تھے۔ انگریزی سامراج کے خلاف عوام میں جذبہ پیدا کرنے میں ان کی شاعری نے مدد دی۔ مگر وہ بھی ایک انسان تھے۔ لہٰذا ہر انسان کسی نہ کسی لالچ کے زیر اثر ہوتا ہے۔ جوش صاحب بھی پاکستان لالچ کے تحت گئے اور جب لالچ کسی پر سوار ہو جائے تو پھر وہ انسان صرف لالچ سے حاصل ہونے والے فوائد کو ہی پیش نظر رکھتا ہے۔ لہٰذا ان کے پاکستان چلے جانے پر نہ تو برا منانے کی ضرورت تھی اور نہ کسی افسوس کی۔ یہ غلط ہے کہ پاکستان میں وہ بھوکوں مرے۔ انہیں ہر ممکن طور پر وہاں عزت و احترام کا درجہ دیا گیا اور حکومت نے ان کی ہر طرح مدد بھی کی۔ جوش ہندو پاکستان ہی نہیں تمام دنیائے اردو کے شاعر تھے۔ اور ایسا شاعر صدیوں میں اس دھرتی پر پیدا ہوتا ہے۔ اور اب وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے جس میں وہ خود بھی زندہ رہنا شاید پسند نہ کرتے ہوں گے۔ تاہم جوش کی موت پر میں رسمی نہیں دلی طور پر افسردہ ہوں ـــ خدا اُن کی مغفرت کرے۔

بابِ انتقاد

[illegible] تونسوی

کالیداس گپتا رضا

تحقیق و تالیف اور شعر کی روشنی میں

یہ کتاب پڑھنے کے بعد بے ساختہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ اگر کسی شاعر، ادیب یا نقاد کی تصانیف و تالیفات کا جائزہ لینا ہو یا کسی مصنف و مؤلف کی ادبی تخلیقات کا محاسبہ کرنا ہو تو یہ گر سیکھنے کیلئے جناب ظفر ادیب کی شاگردی کرنی چاہئے، کیونکہ انہوں نے اپنے اس تازہ ترین علمی اور تحقیقی کارنامے میں جناب کالیداس گپتا رضا کی اب تک کی علمی، شعری، ادبی، تحقیقی تصانیف و تالیفات کا پوسٹ مارٹم جس چابکدستی اور فنی سوجھ بوجھ کے ساتھ [illegible] ہے اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے۔

کالیداس گپتا رضا افریقہ سے ہندوستان آنے کے بعد ایک نسیم خوشگوار کی سی سبک روی سے ادبی فضاؤں میں عطر بیزی کرتے کرتے دنیائے ادب پہ یوں چھا گئے کہ ان کی انتھک ادبی کاوشوں، غالب پر عالمانہ انداز میں سلسلۂ تصنیف و تالیف، حقیقت کی نشاۃ ثانیہ۔ کچھ سکہ بند لکھنے والوں کے سہو اور ان کی رہنمائی کیلئے نئے نئے سراغوں کی نشاندہی نے گزشتہ ماہرین غالبیات اور دیوانِ غالب کے نایاب نسخے کو سمگل کر کے ہزاروں روپیہ پانے والے نام نہاد نقادوں کے ریت کی دیواروں سے بنے ہوئے قلعے چشم زدن میں زمین بوس کر دیئے۔

زیر نظر کتاب کو پڑھنے کے بعد قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ جناب گپتا رضا نے ہمارے ادب کو کیا کیا دیا ہے! اور انہوں نے کس قدر بیش بہا ادبی خدمت انجام دی ہے۔

اگر آپ ایک اچھی اور قابلِ مطالعہ کتاب کا اضافہ اپنی ذاتی لائبریری میں کرنا چاہتے ہیں تو یہ کتاب خریدئے اور کتاب کو پڑھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ڈاکٹر نثار فاروقی اور ان ایسے قماش کے دوسرے مخالفینِ رضا کی الزام تراشیاں محض رضا صاحب کی اعلیٰ ادبی خدمات اور قابلِ فخر شہرت و عزت سے حسد کی بنا پر ہی ہیں ـــ کتاب نہایت اعلیٰ ڈھنگ سے شائع کی گئی ہے۔ ناشر۔ [illegible] پبلشرز بمبئی ۵۴۔ حجم ۱۸×۲۲/۸ سائز کے ۲۴۴ صفحے۔ قیمت ۳۵/ روپے۔ دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے طلب فرمائیے۔

سامنے ہی مہندر گھاٹ تھا اس گھاٹ پر اطراف و اکناف سے کشتیاں آتی
ہیں اور لاری بھی یہیں سے ہوتی تھی) گنگا کو بہت قریب سے دیکھا
بات اتنا مختصر تھا کہ مختصر بحر میں کہا ہوا مصرعہ دکھائی دیا۔ معلوم ہو گنگا
کو دیکھنا ہو تو بارش میں دیکھنا چاہیئے (مشتاقین جلسہ کو پہلے ہی سوچنا چاہیئے
تھا) مجھے اطلاع ملی تھی کہ احمد جمال پاشا سیوان کی طرف سے اس گھاٹ پہ پہنچیں
گے ریتہ نہیں احمد جمال پاشا ابھی اور کتنے گھاٹ دیکھیں گے اور ان کے آنے کا
وقت قریب آ رہا تھا میں تھک گیا سوچا میں روڈ سے سفر کروں لیکن گلیوں کی
بھول بھلیاں کا شکار ہو جاتا۔ گلیوں سے ہوتا ہوا یونیورسٹی روڈ (وہاں سے ہی
ایک سڑک جو جاتی ہے نام دیجئے) پر نکل کر بازار کی سیر کی اور پوچھتا پوچھتا خدا بخش
لائبریری پہنچا (پٹنہ میں اگر آپ کسی سے راستہ پوچھیں تو راستہ بتانے والا
شخص اس وقت تک راستہ بتاتا رہے گا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو جائے کہ
آپ منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں)

سڑک پر سائیکلوں کی اور [illegible] کے برابر کی ایک چیز چلتی پھرتی دیکھی،
پوچھا تو معلوم ہوا رکشا ہے۔ رکشا حیدرآباد میں بھی چلتی ہے اور بھوپال
میں بھی۔ ان دو شہروں کی رکشا میں بیٹھئے تو احساس کمتری نہیں بلکہ
احساس پستی ہوتا ہے، پٹنہ کی رکشا میں بیٹھا ہوا آدمی اتنی بلندی پر بیٹھا
نظر آتا ہے جیسے کوئی نقاد ہو۔ مجھے رکشا بہت پسند آئی جس شخص نے
بھی یہ رکشا ڈیزائن بنایا بہت بلند نظر شخص تھا۔ خدا بخش لائبریری بند تھی
(ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے پہلے ہی خطرہ محسوس کر لیا تھا) ان سے ملاقات ہوئی
اچھی تھی لیکن وہ گھر میں آفس ٹیبل پر بیٹھے کام کر رہے تھے (تمنا یہ کہہ نہیں
سکتا کہ وہ مجھے دکھانے کے لئے آفس ٹیبل پر بیٹھے کام کر رہے تھے)
[illegible] رضا بیدار [illegible] لائبریری کے ڈائرکٹر ہیں اور پڑھنے لکھنے سیمینار کرنے
[illegible] سیمینار کے کنوینر بنا دیتے تھے۔ صبح سویرے سے کے
[illegible] پسند نہیں کیا جاتا تھا لیکن [illegible] کا کر
[illegible] ہے، ایک [illegible] گزرا۔

پٹنہ یونیورسٹی کا [illegible] وقت [illegible] تھا جب [illegible] کا اد
[illegible] غلام طیب صاحب اردو
کے [illegible] بہار کے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کے ایم اے کے جوابی
پرچے پٹنہ یونیورسٹی میں (دوسروں کی عبرت کے لئے) اب تک محفوظ
رکھے ہوئے ہیں یہ وہی غلام طیب صاحب تھے جن کی نظم "یادِ نشاط"
سارے ہندوستان میں مشہور ہوئی تھی، مجھے مبالغے کی عادت ہے لیکن
طیب صاحب کے بارے میں میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ غالب کا کلام
پڑھانے میں ان کا جواب نہیں تھا انہیں کی یاد نے پٹنہ یونیورسٹی دیکھنے
پر اکسایا۔ پسند آئی۔ دربھنگہ ہاؤس گنگا سے بالکل لگا ہوا ہے یونیورسٹی
کے کالج دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں غالباً انجینئرنگ کالج میں کرکٹ
میدان ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی اور رانچی یونیورسٹی کا میچ ہو رہا تھا وہیں
ریٹائرڈ کورس پرنسپل سنگھ صاحب سے ملاقات ہو گئی (میں نے اپنے
[illegible] میں ہونے کا رعب گانٹھا) کچھ مونگ پھلی کھائی۔ مونگ پھلی
بمبئی میں بھی کھائی جاتی ہے بلکہ بمبئی میں روزانہ مونگ پھلی کی [illegible]
کھانا ضروری ہے لیکن پٹنہ میں یہ بڑے سلیقے سے کھائی جاتی ہیں۔
ہر پڑیا کے ساتھ ایک چھوٹی سی پڑیا میں نمک (جس پر لیموں چھڑک دیا
جاتا ہے) بھی مفت فراہم کیا جاتا ہے غالب کبھی عظیم آباد نہیں گئے
تھے پھر نمک والی ردیف کی غزل معلوم نہیں انہوں نے کیسے کہہ دی۔

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجد ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

(مقطع تو مجھے اس لئے یاد رہ گیا کہ اردو کے ایک استاد فرماتے
تھے کہ یہ شعر ذوق کا ہے لیکن میں نے یہ کہہ کر کہ یہ شعر وجد کا ہے ان کی
تصحیح کر دی)

بمبئی اور پٹنہ کے لوگوں کے غذائی ذوق کا ذہن میں تقابلی مطالعہ
کیا تو ناگاہ اس نتیجے پر پہنچا کہ دونوں مقامات پر مخلوق خداوندی گھر کے
کھانے کے علاوہ زیر سڑک خوانچے [illegible] نوش کرنے کی کافی شوقین ہے لیکن
اس [illegible] خورد و نوش کے معاملے میں پٹنہ کے لوگ [illegible] کھانے کی بجائے
ڈٹ کر کھانے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ بمبئی میں بھیل پوری، بٹاٹا وڑا،
پانی پوری اور اس قسم کی دوسری گیس آور اور مفرح شکم اشیاء مقبول ہیں
بلکہ سماجی طور پر آدمی مجبور ہے کہ یہ چیزیں روزانہ بکثرت کھایا کرے لیکن
پٹنہ میں سنگھاڑے، امرود، مرمرے، [illegible] رتالو [illegible] اور [illegible]
مستعمل ہیں۔ میٹھے کی مٹھائی اور آٹے کا مربہ بھی جگہ جگہ بامرہ نواز تھا۔
سنگھاڑوں کی کیفیت البتہ یہ دکھائی دی کہ عورتیں انہیں چھیل کر بیچتی ہیں
بغیر چھیلے ہوئے سنگھاڑے بھی بکتے ہیں لیکن ان میں [illegible] اتنی تعداد
میں نہیں ہوتے جتنے چھیلے ہوئے سنگھاڑوں میں ہوتے ہیں [illegible] بہت
ہی کچھ ایسا ہے (لوگ علی الاعلان [illegible] کھاتے ہوئے بھی پائے گئے) گو
میں نے چکھا تو نہیں لیکن یقین ہو گیا کہ بے حد میٹھا ہو گا۔ کھیوں کی

ہے، ہمیں شمع البتہ جلائی جا سکتی ہے تاکہ دال اور چاول کا فرق معلوم
ہو سکے (جشن ظرافت کی وجہ سے بلب کچھ اضافہ گم کر دیئے گئے تھے فرمائش
کی گئی تو پانچ واٹ کے بلب جلائے گئے) سب نے جلدی جلدی ایک دوسرے
کا چہرہ دیکھ لیا اور خوش ہوئے کہ اس وقت کسی کو پہچاننا مشکل ہے۔ کھانا
کھاتے وقت اتنی سہولت تو ہونی ہی چاہیے)

ڈاکٹر قمر رئیس اور مجتبیٰ حسین کو ایک کمرے میں ٹھہرنا تھا لیکن
مجھے چھوڑ کر ڈاکٹر قمر رئیس کی غیبت کرنی تھی اور اس کے لیے مجتبیٰ سے بہتر
اور کوئی رفیق کار نہ ہو سکتا تھا اس لیے مجتبیٰ میرے کمرے میں آ گئے ہم دونوں
رات کے دو بجے تک ڈاکٹر قمر رئیس کو کھتا دیکھ کر خوش ہوتے رہے
بلکہ قیاس کہتا ہے کہ ہمارے سو جانے کے بعد بھی ان کے کمرے سے آوازیں
آتی رہیں اور رات بھر دعا کی شمع جلتی رہی (سیمینار میں مقالہ پڑھنے کا
وعدہ کرنے کا یہی نتیجہ ہوا کرتا ہے)

۱۱ دسمبر ۸۲ء کو صبح ساڑھے دس بجے جشن ظرافت کا آغاز
ہو گیا خدا بخش لائبریری میں سیمینار کا انتظام تھا لیکن غالباً منتظمین
جلسہ کو اتنی کثیر تعداد میں لوگوں کے پہنچ جانے کی توقع نہیں تھی مجھے تو
ہال میں میز بھی ہال سے بڑے نظر آئے، یہ میز نہ ہوتے تو شاید سیمینار
کا لطف زیادہ آتا۔ مائکروفون بھی کچھ بغاوت پر آمادہ تھا لیکن
پٹنہ میں شاید ہر سیمینار کے موقع پر یہی مائکروفون استعمال ہوتا ہے
(اس پر پابندی لگائی ہوگی) پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر
[illegible] نے صدارت کی لیکن مختصر انہیں کسی اور جگہ بھی جانا تھا
تقریباً انہوں نے بڑی عمدہ کی اور اپنی آگاہی کا ثبوت دیا۔ ان کی
تقریر سے اندازہ ہوا کہ یونیورسٹیوں میں اب بھی پڑھے لکھے لوگ وائس
چانسلر ہوتے ہیں تقریر کے بعد انہوں نے معذرت چاہی اور سیمینار
کے کنوینر ڈاکٹر مجاہد رضا بیدار نے رشید الظفر سے بقیہ صدارت
کی فرمائش کی۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر قمر رئیس
چہرے مہرے سے نقاد نظر نہیں آتے ان کے چہرے پر کرختگی کا
نام و نشان نہیں (نقاد کو صوری طور پر بھی نقاد دکھائی دینا چاہیے)
ان کا مقالہ لوگوں نے بڑی توجہ سے سنا بلکہ یوں کہنا چاہیے آنکھیں اور
کان کھول کر سنا۔ سامعین میں مہمانوں کے علاوہ عظیم آباد کے سبھی
بزرگ، متوسط اور نئے ادیب، شاعر، اہل علم دوست اور ادب نواز لوگ
موجود تھے بہار میں چھ یونیورسٹیاں ہیں مگدھ یونیورسٹی نئی ہے،
وہاں سے تو کوئی نہیں آیا لیکن دوسری یونیورسٹیوں اور کالجوں کے
اردو کے سبھی پروفیسر موجود تھے صحافت کی بھی پوری پوری نمائندگی
تھی (ان میں سے میں صرف غبار بھٹی کو جانتا تھا) بہار یونیورسٹی کے
تو کئی ریٹائرڈ استاد بھی شریک محفل تھے اچھا خاصا مجمع تھا مقالے
کے لیے نہایت موزوں محفل میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر قمر رئیس بڑا ہنگامہ
خیز مقالہ پڑھیں گے لیکن وہ رعایت کر گئے اصل میں مقالے کا کینوس
بہت بڑا تھا اور وقت کم۔ بحث بھی اس لیے کم ہوئی۔ ڈاکٹر وہاب
اشرفی کی گفتگو البتہ گرم گرم تھی۔ (ڈاکٹر وہاب اشرفی ایک مرتبہ
بمبئی بھی آئے تھے اور مرحوم تصدق بھائی نے شاید ملاقات کا اہتمام
بھی کیا تھا لیکن ملاقات ہو نہیں سکی اب تلافی ہو گئی) مصطفےٰ کمال
احمد جمال پاشا، شجاعت علی سندیلوی، سرور جہاں اور شاید میں نے
بھی بحث میں حصہ لیا (میں تو ہر بحث میں شریک ہوتا ہی ہوں)
ڈاکٹر قمر رئیس کے مقالے سے پہلے شفیع مشہدی نے اپنا مقالہ "اردو
میں طنز و مزاح" پڑھا، یہ مقالہ غالباً انہوں نے بھوپال کی طنز و
مزاح کانفرنس کے موقع پر لکھا تھا۔ نظر ثانی کرتے وقت ایسا معلوم
ہوتا ہے، انہوں نے میرے بارے میں مبالغے کو اور نکھار دیا ہے)
مجموعی طور پر دونوں مقالے پسند کیے گئے، لوگوں میں جوش و خروش
زیادہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ طنز و مزاح کے بارے میں مزید بلکہ
شدید بحث ہو۔ ڈاکٹر رضا بیدار نے اس لیے اعلان کیا کہ بحث کل
بھی جاری رہے گی صدر محفل رشید الظفر نے بڑی جامع اور دلچسپ
تقریر کی۔ ان کی تقریر کے بعد کافی دیر تک تالیاں بجتی رہیں سیمینار
کے بیچ میں چائے اور فواکہات کی آمد و رفت نے مائکروفون کی خرابی
کے لطف کو دوبالا کر دیا، جلسے کے بعد مہمانوں کو، ایک دوسرے کو
غور سے دیکھنے اور میل ملاپ کا زریں موقع ملا جس سے سب نے کما حقہ
فائدہ اٹھایا (کہیں کہیں تہذیب مانع رہی)

شام میں ۶ بجے جشن ظرافت یعنی اصلی جشن ظرافت شہر کے
سب سے خوبصورت ہال بھارتیہ نرتیہ کلا کیندر میں برپا ہوا اس
ہال کی کئی خوبیاں ہیں سنا گیا کہ یہاں جلسہ کرنے کے نہایت سخت
قاعدے ہیں مثلاً یہ کہ ہال کے باہر لاؤڈ اسپیکر نہیں لگائے جا
سکتے کلا مندر کے کمپاؤنڈ میں نشستوں کا انتظام نہیں کیا جا سکتا
ہال کے اندر کیا ہو رہا ہے اس کی اطلاع ہال کے باہر نہیں جا

رات میں جلسہ ہو تو پرندے پر نہیں مار سکتے دن میں ہو تو ہوا زور سے چل نہیں سکتی یا سورج زیادہ چمک نہیں سکتا وغیرہ وغیرہ ہال کی تنگی کی شکایت سارے شہر میں سُنی گئی لیکن منتظمین جلسہ بے بس تھے موسم سرما میں ہال میں جلسہ نہ کیا جائے تو سردی سے لوگ بے حال ہو جائیں۔

کلامندر کے اسٹیج کو بہت زیادہ خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ (شادی خانہ معلوم ہو رہا تھا) پس منظر میں ظریفانِ اردو کے خلیوں (کارٹون) پر مشتمل ایک طویل و عریض پینٹنگ تھی محمد علی نے اسی تصویر کی نقاب کشائی کی جشن ظرافت کا افتتاح کیا۔ تقریر بھی کی۔ (تقریر میں دلچسپ باتوں کے علاوہ کچھ کام کی باتیں بھی کہیں (حسن کی ضرورت نہیں تھی) لوگ اس سنجیدہ اور نیم مزاحیہ تقریر ہی سے اتنے متاثر ہوئے کہ نثری اجلاس میں حصہ لینے والوں کو اپنے مضامین پر داد ملنے کا یقین ہو گیا۔ محمد حسین آزاد نے صدارتی خطبہ پڑھا ان تقریروں سے پہلے معتمد جشن ظرافت شبیر حسین دناک نے استقبالیہ تقریر کی (جلسے میں استقبال ضروری ہے)

نثری اجلاس میں مہمان ادیبوں میں نریندر لوتھر، وجاہت سندیلوی، سرفراز جمال، احمد جمالی پاشا، مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم نے مضامین پڑھے میزبان ادیبوں میں ایک بزرگ ادیب ماہ نیر خان کا مضمون احمد جمال پاشا نے پڑھ کر سنایا (اصل ادیب شانہ بشانہ کھڑے رہے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حلف اٹھانے کی رسم انجام دی جا رہی ہے) ان کے علاوہ نعمان ہاشمی نے بھی مضمون پڑھا۔

سامعین نے دل کھول کر داد دی (یہ محاورہ غلط ہے انھوں نے اصل میں ہاتھ کھول کر داد دی) مجتبیٰ حسین سے دو مضمون سُنے گئے، نریندر لوتھر کا "کو دھان" بھی بہت پسند کیا گیا۔

پٹنہ میں نثری مضامین پڑھنے اور سُننے کا یہ پہلا موقع تھا کارپردازانِ جشنِ ظرافت سہمے سہمے سے تھے کہ پتہ نہیں، تجربہ کیسا رہے لیکن سامعین نے جس خوش دلی، خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا اس سے کارپردازانِ جشنِ ظرافت کو اپنی بدگمانی پر افسوس ہوا ہو گا نثری اجلاس کے اناؤنسر تھے مصطفےٰ کمال، انھیں جلسے منعقد کرنے، مشاعرے برپا کرنے اور ادیبوں، شاعروں کو معقول بنانے کا گُر آتا ہے۔ (ان کے کنڈکٹ کے بارے میں اظہار خیال کا یہ موقع نہیں) نثری اجلاس کافی طویل اجلاس تھا لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ لوگ ایک جام اور

کے موڈ میں ہیں۔ مہمان تو خیر خوش تھے ہی لیکن رضا نقوی واہی اور شفیع مشہدی کے چہرے ان گلابوں کی طرح کھلے ہوئے تھے جو چیزی گرملو کے ذاکر باغ میں نظر آتے ہیں جشنِ ظرافت کے سرپرست محمد حسین آزاد بھی بے حد خوش پائے گئے انھوں نے سب سے نہایت گرمجوشی سے معانقہ کیا میں تو پانچ منٹ تک اپنا ہاتھ سہلاتا رہا۔

رات میں ہوٹل دی پبلک میں انجمن تجمّی کی طرف سے ڈنر تھا یہ دی پبلک ہوٹل پبلک کے لئے نہیں ہے لیکن ہم تو معزز مہمان تھے ہوٹل کے بینکویٹ ہال میں رونق تھی ہی رونق تھی، داؤدی بوہرہ جماعت کے سربرآوردہ حضرات موجود تھے جو پتہ نہیں کیوں اتنے خوش تھے ہم لوگوں میں تو کوئی خاص بات نہ تھی ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔ کھانا نہ صرف لذیذ تھا بلکہ بکثرت تھا اور اتنا تھا کہ ریاست کے وزیر ٹرانسپورٹ محمد علی کے علاوہ محمد علی کلے بھی وہاں موجود ہوتے تو ہمارے ساتھ شریکِ طعام ہو سکتے تھے میٹھا تو اتنا عمدہ تھا کہ کھانا کھانے کا افسوس ہوا کیا اچھا ہوتا کہ ایسی دعوتوں میں بھی اناؤنسر ہوا کریں جو پہلے ہی سے کھانے کی نوعیت کے بارے میں مطلع کر دیا کریں۔ اس دعوت نے جشنِ ظرافت کو جشنِ ضیافت میں بدل دیا اور طعام) بعدہ کلام کے دیرینہ اصول کا بھی پاس رکھا گیا۔ مائک پہ پہلے تو انجمن تجمّی کے سربراہ۔ نے محمد علی اور محمد حسین آزاد صاحبان کا خیر مقدم کیا بلکہ صرف ایک ہی جملہ کہا جس پر مجھے محسوس کرنا پڑا کہ اس سے مختصر تقریر ممکن نہیں ہو سکتی مائکروفون کافی دیر تک خاموش رہا اور کہیں سے اچانک شفیع مشہدی اس پر نمودار ہوئے انھوں نے تو کھانے سے بھی زیادہ پُرتکلف تقریر کی اور مہمانوں کو کافی شرمندہ کیا۔

مہمان ادیبوں اور شاعروں کی آمد کا انھوں نے کچھ اس طرح ذکر کیا جیسے یہ لوگ اس سے پہلے کہیں گئے ہی نہیں تھے اور پہلی مرتبہ گھر سے پٹنہ کے لئے نکلے تھے اس تقریر کا کچھ نہ کچھ جواب کسی نہ کسی کو دینا ہی تھا میں نے خود ساختہ نمائندے کی حیثیت اختیار کر لی (جب بھی مائکروفون خالی ہو ایسا ہی کرنا چاہیے) اس کے بعد لطیفہ گوئی کی محفل سجی، نریندر لوتھر، مجتبیٰ حسین، شفیع مشہدی، نرگس حیدرآبادی، طالب خوندمیری اور شاید میں نے بھی ایک دو لطیفے سُنائے۔ جب اندازہ ہو گیا کہ اس سے زیادہ ذہنی مضرتا بہتر

تو محفل برخاست ہو گئی کچھ تصویریں بھی ہوئیں اور ایک موقع ایسا بھی
آیا کہ لوگ صرف مسکراتے رہ گئے، کیمرہ فیل ہو گیا۔

۲۲ کی صبح سیمینار کا حصہ دوم در پیش تھا لیکن اس سے پہلے شفیع
مشہدی کے افسانوں کے مجموعے "شاخ لہو" کے اجرا کی رسم انجام دی گئی
آج تو لوگ کل سے بھی زیادہ آئے تھے انہیں شاید یہ اطلاع مل گئی تھی کہ
خدا بخش لائبریری میں جگہ کم ہے جو لوگ کل اندر کھڑے تھے آج انہیں باہر
کھڑے ہونا تھا۔ مائکروفون کی صحت میں بھی کوئی افاقہ نہ ہوا تھا۔ رسم
اجرا محمد علی نے انجام دی۔ تقریریں ہوئیں سہیل عظیم آبادی کی بھی تقریر
سننے کو ملی مجتبیٰ حسین نے ایک مزاحیہ خاکہ پڑھا شفیع مشہدی نے رندھی ہوئی
آواز میں شکریہ ادا کیا۔ اس کے فوراً بعد ہی سیمینار شروع ہو گیا ڈاکٹر لطیف
الرحمان نے مقالہ پڑھا تو ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی نے بھی مقالہ پڑھا، صدارت
مجتبیٰ حسین نے کی ڈاکٹر مجاہد رضا بیدار اناؤنسر تھے دونوں مقالوں پر خوب
بحث ہوئی خاص طور پر ڈاکٹر لطف الرحمان کے مقالے پر سخت بحث
ہوئی۔ احمد جمال پاشا شاید ہوٹل ہی سے غصے میں آئے تھے بہت بولے
اور غالباً تین مرتبہ مائکروفون ان کے حوالے کیا گیا، بہت صحیح بولے۔
مزاح نگاروں کی تائید میں لیکن جوش ذرا زیادہ ہی تھا ڈاکٹر قمر رئیس
نے بھی اظہار خیال کیا اور ثابت کر دیا کہ ظرافت دوسرے درجے کی چیز ہے
ان کی بحث خود ان کے مقالے سے مختلف تھی ایسا ہوتا ہے ڈاکٹر لطف الرحمان
کا مقالہ میں نے پڑھنے کے لئے مانگا تو معلوم ہوا پٹنہ سے کسی ادبی پرچے
کی اشاعت عمل میں آنے والی ہے اس کے ایڈیٹر صاحب لے کر چلے گئے ڈاکٹر
قمر رئیس کا مقالہ تو غالباً مشاعرے کے اہم نمبر میں چھپ رہا ہے بہرحال
دونوں مقالے چھپ جائیں تو اہل ظرافت کو اپنی حیثیت کا صحیح اندازہ ہو
جائے گا آج کی بحث خوشگوار حد تک نزاعی تھی اور اگر لوگ لنچ پر مدعو نہ
ہوتے تو یہ اور طول پکڑتی، سیمینار کو اتنی ہی حد تک کامیاب ہونا چاہئے۔
مزید کامیابی، قواعد اردو کے منافی ہے۔

کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے اس لئے لوگ بہ عجلت ممکنہ ہوٹل پرنس
کی طرف بھاگے محمد حسین آزاد کی طرف سے دعوت تھی ہوٹل پرنس بھی
معقول جگہ ہے اچھا ہوا کہ کھانا بند کمرے میں نہیں بلکہ ٹھنڈی دھوپ میں
تھا کھلی جگہ میں ٹہل ٹہل کر کھانا زیادہ مناسب ہوتا ہے، کھانے کا
میدان میدانِ کارزار میں تبدیل ہو گیا۔

سہ پہر میں بہار اردو اکاڈمی کی طرف سے بانکی پور کلب میں
چائے کی دعوت تھی، بانکی پور کلب بھی پٹنہ یونیورسٹی کی طرح گنگا کنارے
واقع ہے، پرانی عمارت ہے اس لئے کافی وسیع ہے گنگا میں اترنے کے
لئے سیڑھیاں بھی بنی ہوئی ہیں جن کی موجودہ حالت یہ ہے کہ ان پر
پاؤں رکھو تو سیدھے گنگا میں جا پڑو، سرور جمال کو میں نے بڑی مشکل
سے قسمیں دے کر واپس بلایا۔ وہ اگر ایک قدم اور آگے بڑھتیں تو خطرے
کی بات تھی، معلوم ہوا کہ یہ مکان سر علی امام یا ان کے صاحبزادے کا تھا
بیگم عزیزہ امام ایم پی دعوت میں موجود تھیں لیکن مکان کی ملکیت کوئی ایسی
اہم بات نہ تھی کہ ان سے پوچھی جاتی۔ دعوت میں بہت لوگ تھے اور اپنی
اپنی پسند کے حلقے میں بیٹھے ہوئے تھے سیاسی پارٹیاں اسی طرح بنتی ہیں
بہار اردو اکاڈمی اردو کی اکاڈمیوں میں سے ایک ہے سہیل عظیم آبادی
اس کے کرتا دھرتا ہیں، سہیل عظیم آبادی افسانہ نگار تو ہیں ہی لیکن
یہ پرانے کانگریسی بھی ہیں، اور پرانے کانگریسی، پرانے چاولوں
اور پرانی شراب کی طرح "وقیع" ہوتے ہیں، سہیل صاحب جتنا زیادہ
کام کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ پان کھاتے ہیں، کبھی پان نہیں کھانے
کے وقت واحد میں چار پان ایک تھیلی میں پیک کر کے پیش کئے جاتے ہیں
(پانوں کی ... یہ میں نے پہلی مرتبہ دیکھی) دو چار منٹ تک منتظر دیکھتے
رہنے کو جی چاہتا ہے، عصرانہ میں مٹھائی بہ مقدار کثیر تھی (پٹنہ ہے)
کچھ شناسا کا عصرانہ عصرانہ نہیں لطف آیا تقریریں کہیں ہوئیں نا۔

شام میں ساڑھے چھ بجے جشن ظرافت کا کلائمکس تھا یعنی مشاعرہ۔
وہی بھارتیہ کلا منڈپ کا ہال اور وہی ہنگامہ۔ مشاعرہ ٹھیک
وقت پر شروع ہوا۔ شاعر تو پچھلی اجلاس میں بھی شریک تھے لیکن آج
ان کی سج دھج کچھ اور ہی تھی۔ کل کے براتی آج کے نوشاہ۔ دن بدلتے
دیر نہیں لگتی۔

مشاعرے کی صدارت محمد علی نے کی اور تقریر میں کہا کہ وہ تو کل
تقریر کر چکے ہیں آپ لوگ کل کیوں نہیں آئے پٹنہ کانگریس کمیٹی کے صدر
سیتارام کیسری نے مشاعرہ کا افتتاح کیا، سامعین بے حد خوش ہوئے
ملی جلی اردو بجائے خود مزاح آور ہوتی ہے مشاعرے کو کنڈکٹ کر رہے
تھے شفیع مشہدی اناؤنسر کی حیثیت اسکول کے اسپیکر کی تو نہیں ہوتی
لیکن اس سے ملتی جلتی ضرور ہوتی ہے خود انہوں نے بھی کافی ہنسایا
اپنی اناؤنسنگ میں وہ بار بار ہندوستان میں بہنے والے دریاؤں کا
ذکر کرتے رہے کہ انہوں نے اس جشن ظرافت کے ذریعہ سب پانیوں کو

مشاعرہ شروع ہو گیا لیکن سامعین تھے کہ چلے آ رہے تھے خود ڈائس پر اتنے سامعین آگئے تھے کہ شاعروں کی شکل مشکل ہی سے دکھائی دے رہی تھی۔ مشاعرہ جب عنفوانِ شباب پہ آیا لوگ ہمہ تن چشم و گوش ہو گئے (شباب دیکھنے کی چیز ہوتی ہے) ان کے قہقہوں نے شاعروں کو اور زیادہ ورغلایا ان میں سے کچھ نے ڈوب کر کلام پڑھا اور کچھ نے ابھر کر۔ کوئی پچیس شاعروں نے کلام سنایا۔ مہمان شاعروں میں سلیمان خطیب، طالب خوندمیری، بوگس حیدرآبادی، پاگل عادل آبادی، گرد بر حیدرآبادی، بیاباں حیدرآبادی، مقرب حسین ند (بھوپال) ہلال رضوی رام پوری، پروفیسر سید حسن، پروفیسر مہدی علی، جوہر سیوانی، اسرار جامعی، عادل لکھنوی، فیاض عالم رقیب، خالد رحیم، اسماعیل آذر، قادر نکیم پوری، تماشا گیاوی اور مسٹر لکھنوی جیسے شاعر موجود تھے جو مشاعرے کی کامیابی کے لئے کافی ہی نہیں بلکہ کافی سے زیادہ تھے میزبان شاعروں میں علامہ فضل امام وقف، رضا نقوی واہی، ابرار ساغر، محبوب جہانگیر نے کلام سنایا اور محفل کو گرمایا (سردیوں کے موسم میں کسی کو گرمانا مشکل کام ہوتا ہے)

سلیمان خطیب کو لوگوں نے بہت سنا۔ سلیمان خطیب کو شبہ تھا کہ سامعین ان کی دکھنی نہیں سمجھیں گے (غلط فہمیوں کا کوئی علاج نہیں) لیکن جب انہوں نے دکھنی شاعری سنائی تو انہیں معلوم ہوا کہ ان سے بہتر دکھنی سمجھنے والے بھی موجود ہیں۔

مشاعرہ جب برخاست ہوا تو لوگوں کو افسوس ہوا کہ اتنی جلدی کیوں برخاست ہو گیا۔

۱۳ر دسمبر ہماری وداع کا دن تھا مہمانوں نے سامان سمیٹنا شروع کیا (یعنی اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا) منتظمین جلسہ نے واپسی کا بندوبست بھی اتنا ہی اچھا کیا تھا جتنا ٹھہرنے کا بلکہ واپسی کے بندوبست میں زیادہ محنت کی تھی (خوشی کا موقع تھا) صبح ہی صبح ہر کسی کے ہاتھ میں اس کی واپسی کا ٹکٹ اور ریزرویشن کارڈ تھا۔ ان پھر رخصتیاں سلامیاں ہوتی رہیں، میں چونکہ سب سے پہلے آیا تھا اس لئے سب سے آخر میں جانے والا تھا (فرسٹ کم لاسٹ گو، میرا اصول ہے) حیدرآباد گروپ بھی اسی ٹرین سے سفر کرنے والا تھا جو رات گیارہ بجے پٹنہ سے نکلتی ہے ہم لوگوں کو رات میں گیارہ بجے تک مصروف رکھنے کا یہ بندوبست کیا گیا کہ جشنِ ظرافت کے سکریٹری ضمیر حسین ونارک نے اپنے گھر پر ایک محفل شعر مع ڈنر ترتیب دی نہایت بے تکلف اور گھریلو محفل تھی۔ طے یہ ہوا کہ سلیمان خطیب کو بالتفصیل سنا جائے گا اور ان کی آواز ٹیپ کر لی جائے گی۔ جب ہم «دل افزا» (کیوں کہ یہی اس مکان کا نام تھا) پہنچے تو کمرے میں ہر طرف ٹیپ ریکارڈ لگے ہوئے تھے ہماری سانسیں تک ٹیپ ہو گئیں محمد حسین آزاد بھی آئے تو ٹیپ ریکارڈ لے کر ہی آئے۔ شفیع مشہدی نے پھر دریاؤں کا ذکر چھیڑ دیا میں نے عرض کیا وہ آندھرا جائیں تو بہتر ہوگا۔ پانی کے جھگڑے چک جائیں گے۔ نہیں مانے بولے تمل ناڈو میں رہوں گا اور ایک جشنِ ظرافت اور کروں گا۔ رضا نقوی واہی نے فوراً تائید کی کیوں کہ انہوں نے بہت دیر سے کچھ کیا نہیں تھا محمد حسین آزاد وزیر زراعت نے فرمایا ٹھیک ہے ظرافت کی کھیتی ہری رہے تو ان کا کیا بگڑتا ہے۔ بات پکی ہو گئی مشاعرہ ہوا، ہر کسی نے کلام سنایا۔ کلیم عاجز بھی شریکِ محفل تھے ان سے اتنا اصرار ہوا کہ عاجز آ کر انہوں نے دو غزلیں سنا ہی دیں، میں نے کتنے ہی لوگوں کو ترنم میں پڑھتے سنا ہے لیکن کلیم عاجز کے ترنم میں عجیب و غریب کیفیت ہے اور پھر استادانہ کلام۔

شفیع مشہدی نے وداعی تقریر کی شکریہ کہہ کر رونے نہیں جواب میں میں بھی بے پیدا۔ معلوم نہیں کس نے جادو کر دیا تھا کہ میں کہہ بیٹھا کہ آئندہ اگر یہاں پیدل آنے کے لئے بھی کہا گیا تو ہم پیدل بھی آجائیں گے۔ اب ڈرتا ہوں کہیں سچ مچ پیدل نہ بلوا لیا جائے لیکن کوئی حرج نہیں کہا ہے تو کر کے بھی دکھاؤں گا۔ حالی نے کیا خوب کہا ہے حالی نے سبھی باتیں اچھی کہی ہیں کون سا شعر لکھوں!!

دی بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس: مرکنٹائل کوآپریٹو بینک بلڈنگ، ۷۸ محمد علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

بینک کاری کے تمام امور بشمولہ غیر ملکی زرِ مبادلہ کا لین دین انجام دیتا ہے اس کے علاوہ آپ کا معیارِ زندگی بلند کرنے میں آپ کی ہمت افزائی کرتا ہے اور جملہ اقسام کے گھریلو استعمال کے سامان کے حصول میں آسان شرائط پر آپ کی مدد کرتا ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء سے سود کی شرحیں

۱۔ سیونگ ڈپازٹس پر

سیونگز اکاؤنٹس پر (چیک سہولت کے ساتھ) ۶ فیصد سالانہ

۲۔ فکسڈ ڈپازٹس پر ۲ مارچ ۱۹۸۴ء سے

مدت	شرح	مدت	شرح
۱۔ ۱۵ سے ۴۵ دن تک	۳½ فیصد سالانہ	۵۔ ۹ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ایک سال سے کم	۶½ فیصد سالانہ
۲۔ ۴۶ سے ۹۰ دن تک	۴ ″ ″	۶۔ ایک سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۲ سال تک	۸½ ″
۳۔ ۹۱ سے زیادہ مگر ۶ ماہ سے کم	۵ ″ ″	۷۔ ۲ سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۳ سال تک	۹½ ″
۴۔ ۶ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ۹ ماہ سے کم	۵٫۵ ″ ″	۸۔ ۳ سال اور اس سے زیادہ عرصہ پر	۱۱ ″

مندرجہ بالا شرح انٹرسٹ تمام شیڈولڈ اور نیشنلائیزڈ بینکوں سے ایک فی صدی زیادہ ہے۔

دہلی برانچ

3655 نیتا جی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی 110002

فون:- 264374 — 268266

منیجنگ ڈائریکٹر	دہلی زونل منیجر
زبیر جی رنگون والا	شمیم کاظم

"بزمِ ادب کا کُل ہند مشاعرہ"

خلیل انجم کامتی

بزم ادب آرڈیننس فیکٹری آبنہ جھری ناگپور کے زیرِ اہتمام اس سال بھی یوم جمہوریہ کی تقریب کے سلسلے میں ۲۵ رجنوری ۲۰۰۳ء کی شب میں دس بجے ایک کُل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ یہ "بزم ادب" کا نواں سالانہ مشاعرہ ہے۔ او ایف ٹی آئی ہال کو شاندار طریقے سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ہال سامعین کے ہجوم سے گلزار بنا ہوا ہے اور رنگین نوا شعرا مشاعرہ کی اسٹیج کی زیب و زینت بنے ہوئے ہیں صدارت کے فرائض جناب جلیل ساز صاحب فرما رہے ہیں۔ اور مہمانِ خصوصی ہیں جناب ایم سی ماتھر ڈائرکٹر اسٹاف کالج آر ایف آبنہ جھری ناگپور۔ ماتھر صاحب کی علم دوستی کے باعث بزمِ ادب کی جانب سے شائع کئے گئے ادبی کتابچہ کا افتتاح بھی آپ سے ہی کرایا جا رہا ہے۔ مشاعرے کے اناؤنسر کمال جالسی صاحب نے وہاج باندوی کو دعوتِ سخن دی ہے۔ وہاج صاحب کی نظم "جشنِ جمہوریہ" واقعی قابلِ تحسین ہے جسے سامعین نے غور و توجہ کے ساتھ سماعت فرمایا۔ وہاج صاحب کے بعد کمال صاحب ونود کمار دیپ سے مخاطب ہو کر انھیں زحمتِ سخن سرائی دے رہے ہیں۔ دیپ صاحب ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ آپ آئے اور اپنے کچھ متفرق اشعار اور ایک نظم سنا کر تالیوں کی گونج میں مائک سے رخصت ہوئے۔ اب سلیم درانی صاحب کو تکلیف دی جا رہی ہے سلیم صاحب نہایت خوش وضع لباس میں نظر آ رہے ہیں ان کی غزل داد کی خوشگواری حاصل نہ کر سکی سلیم صاحب کے بعد ناگپور کے نوجوان شاعر سید قیوم صاحب مائک پر آ گئے ہیں۔ قیوم تمنا ویسے تو کوی سمیلنوں کے کوی ہیں مگر آج غزل سُنا رہے ہیں۔ ترنم گوارا ہے اور انداز بھی اچھوتا۔ غزل کے بعد سامعین کی فرمائش پر ایک گیت سُنا کر اور داد پا کر قیوم صاحب مائک سے کامیاب لوٹ رہے ہیں سید قیوم کے بعد اب راقم الحروف کو یاد کیا جا رہا ہے۔ خاکسار نے اپنی غزل معمول کے مطابق ترنم میں سنائی غزل کے یہ دو شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

آپ تو ہر بات کا دیتے ہیں خنجر سے جواب
آپ کی محفل سے کوئی کیا اٹھ کے جائے گا

اے غمِ دوراں نہ کر اہلِ محبت کی تلاش
کس کو فرصت ہے جو تجھ کو اپنے گھر لے جائے گا

غزل ختم کر کے رخصت ہونا چاہتا ہی تھا کہ قدردانِ علم دفن نے دوسری غزل سنانے پر مجبور کر دیا۔ اور ارشاد احبا کی تعمیل میں ایک اور غزل پیش کر کے رخصت ہوا۔ اب آرڈیننس فیکٹری آبنہ جھری پرائمری اسکول کی معلمہ محترمہ مینا ورما مائک کے سامنے ہیں۔ مینا ورما ہندی کی شاعرہ ہیں لیکن مشاعرے میں پہلی مرتبہ تشریف لائی ہیں۔ مینا ورما کے بعد نقیبِ مشاعرہ نے مذاق جرکھاروی صاحب کو زحمت دی۔ مذاق صاحب غزل گو شاعر ہیں اور مذاق مذاق میں ایسی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ سامعین ہنسی کے ساتھ کبھی کبھی سنجیدہ بھی ہو جاتے ہیں۔ بہرحال! مذاق جرکھاروی سامعین کو ہنسانے میں بے حد کامیاب ہیں۔ خاص طور سے قوم کی بھیتی بھات منصوبہ بندی اور شراب بندی پر کچھ بعد دیگرے چند خاکے پیش کر کے رخصت ہوئے ہی تھے کہ نقیبِ مشاعرہ نے ہندوستان کی ممتاز و مقبول شاعرہ محترمہ مسعودہ حیات صاحبہ سے نہایت موزوں الفاظ میں مائیک پر تشریف لانے کی التماس کی مسعودہ حیات نے نہایت پُر وقار انداز اور ترنم میں اہلِ ذوق کو اپنے کلام سے لطف اندوز فرمایا۔ دو شعر آپ بھی سنئے ؎

معجزہ بن گئی کیا آج مری تشنہ لبی
ایک قطرے کے تلے کتنے سمندر نکلے

رہبرو تم نے تو منزل کا پتہ بھی نہ دیا
تم سے بہتر تو مری راہ کے پتھر نکلے

سامعین کے اصرار پر مسعودہ حیات صاحبہ مزید کلام عنایت کر رہی ہیں۔ آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے پھر دو شعر حاضر ہیں ؎

جب شام ملاقات پڑوسی کے مکاں سے
آواز کوئی آئے تو لگتا ہے کہ تم ہو
جب شانہ بھی کرنے نہ اُٹھے ہاتھ ہمارا
اور زلف سنور جائے تو لگتا ہے کہ تم ہو

مسعودہ حیات نہایت کامیاب، "واہ واہ" اور "سبحان اللہ" کے شور میں مائیک سے رخصت ہو رہی ہیں۔ اب آپ خلش قادری صاحب کا بھی ایک شعر سن لیجئے۔ فرماتے ہیں ؎

زندگی کر مجھے تسلیم کہ دنیا میں نہیں
مجھ سے بہتر ترے انداز سمجھنے والا

اب محترمہ ملک نسیم صاحبہ مائیک پر تشریف لاتی ہیں۔ ان کے بھی دو اشعار سن لیجئے ؎

سیلاب جب رُکا تو ہر اک پوچھنے لگا
رہتے تھے جس میں ہم وہ عمارت کہاں گئی؟
تاریخ اپنی ہم کو دکھاتی ہے آئینہ
ظلموں سے کھیلنے کی جسارت کہاں گئی؟

[1]پیکر غزل ختم کر کے رخصت ہونا ہی چاہتی تھیں کہ سامعین نے شور تحسین بلند کرتے ہوئے ایک غزل اور سنانے کی درخواست کی ہے لیجئے پیکر عصمت کو دوبارہ غزل سرائی کی تکلیف دی جا رہی ہے۔ سنئے ؎

دھندلکا شام کا چھایا ہے اب تو آ جاؤ
کہ اب تو پرندے بھی لوٹ آتے ہیں

یہ زندگی تو کڑی دھوپ ہے نسیم یہاں
نہ جانے کتنے ہرے پیڑ سوکھ جاتے ہیں

نسوانی آواز کا جادو فضا میں جاگ اٹھا ہے۔ سامعین اپنی [2]بیداری کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اب جبل پور کے جناب ساز جبل پوری مائیک پر آ رہے ہیں اور تحت میں غزل ارشاد کر رہے ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

نوکِ ناخن سے چٹانوں پہ بناتے ہیں کنواں
اور امید یہ کرتے ہیں کہ پانی نکلے

اب کمال جائسی کلام عنایت فرما رہے ہیں۔ تین اشعار آپ بھی سن لیجئے ؎

اک پیار کے رستے کے دونوں ہی مسافر ہیں
وہ چھاؤں میں چلتے ہیں ہم دھوپ میں چلتے ہیں
دیوانوں کی فطرت کو سمجھا ہی نہیں کوئی
وہ شہرِ نگاراں میں رُک کے ہیں نہ چلتے ہیں
درد کے شعلوں میں یوں عشق کا گلشن جلے
تیرا بھی آنچل جلے میرا بھی دامن جلے

اب مائیک پر [3]نظر ایٹوی صاحب آ گئے ہیں۔ یہ اچھے ترنم کے ساتھ ساتھ نوجوان دلوں کو گھائل کرنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ دو شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

یہ موج کہاں مجھ کو طوفاں سے بچا لائی
اس پار بھی گہرائی اُس پار بھی گہرائی
میں شہرِ محبت سے کچھ اس طرح گزرا ہوں
اک ہاتھ میں تہمت ہے اک ہاتھ میں رسوائی

اب ایک ایسی شاعرہ کو سماعت فرمائیے جو بلبلِ ہزار داستاں ہیں اور جنہیں زبانِ شعر و سخن تسنیم صدیقی کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ آپ لوگوں نے حضرت روش صدیقی صاحب کا نام سنا ہو گا آپ ان کے بھائی سلام صدیقی کی صاحبزادی ہیں، آج کل آپ کی سحر بیانی فضائے شعر و سخن کو متاثر کر رہی ہے۔ سبحان اللہ! کیا لہجہ ہے؟ کیا کلام ہے؟ وقت چاہتا ہے کہ ٹھہر جائے۔ چند اشعار آپ بھی سن لیں ؎

یوں بار بار ہم سے روداد غم نہ سنئے
ہم اپنی بے بسی پر مغرور ہو نہ جائیں
کل تک بھی کسی مسیحا قاتل بنے ہوئے تھے
اب آپ بھی ستم گر مشہور ہو نہ جائیں
اب کے بچھڑوں گی تو کھو جاؤں گی
راستہ روک لے پاگل میرا
آج بھی وہ نہیں آیا تسنیم

---

[1] کیا پیکر عصمت ہونے کا کوئی ڈاکٹری سرٹیفکیٹ انکے گلے میں لٹک رہا تھا؟ (ایڈیٹر) [2] بیداری یا بیقراری" (ایڈیٹر) [3] نظر ایٹوی صاحب کے بارے میں اس نئی دریافت پر ادارہ شانِ ہند مبارکباد پیش کرتا ہے [4] مرحوم روش صدیقی کی روح بھی کانپ اٹھی ہو گی (ایڈیٹر) [5] ہوتا ہے خلیل انجم نے تسنیم صدیقی کو پہلی بار دیکھا ہے ورنہ وہ اس قدر رشتہ خطی نہ ہوتے (ایڈیٹر)

بہہ گیا آج بھی کاجل میرا
چھوتے ہی برگِ گل کو مرا ہاتھ جل گیا
لیکن تمام عمر کا کانٹا نکل گیا

کہنے کو منزلوں کی حدوں سے گزر گیا
پھر خود ہی رہنما کا ارادہ بدل گیا

اب پروفیسر نہال تاباں مائیک پر تشریف لارہے ہیں، زندانہ کیفیت لب و لہجہ سے ظاہر ہے لیکن ماحول انھیں برداشت کرنے پر مجبور دو شعر آپ کی نذر کئے جارہے ہیں ؎

اکیلے میں جنم لیتے ہیں سپنے
جوانی کو نہ تنہائی میں رکھئے
مراسم اور اپنوں سے مراسم
سنبھل کر پاؤں گہرائی میں رکھئے

اب جناب صدر کلام عنایت فرما رہے ہیں، ہر شعر تیر و نشتر بن کر سینہ و دل میں اتر رہا ہے۔ چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

دل کے داغوں کا چمکنا بھی مقدر کی ہے بات
اپنے گھر بیٹھے بٹھائے چاندنی ہم کو ملی
کوئی سایہ گاؤں کی پگڈنڈیوں میں کھو گیا
جگمگاتے شہر کی آوارگی ہم کو ملی
وحشتِ دل نے کبھی رکنے کی مہلت ہی نہ دی
چھاؤں بھی ہم کو ملی اور دھوپ بھی ہم کو ملی

یہ مشاعرہ بھی "بزم ادب" کے گزشتہ مشاعروں کی طرح نہایت کامیاب رہا اور صبح چار بجے اختتام کو پہونچا۔

واجدہ تبسم

یک ایسی منفرد افسانہ نگار ہیں کہ اپنا ثانی نہیں رکھتیں۔ اگر آپ نے ان کی سب ذیل تازہ ترین تصانیف نہیں پڑھیں تو یوں سمجھئے کہ آپ اردو افسانہ نگاری کے اس انداز سے ابھی تک ناواقف ہیں۔

نتھ اترائی	(افسانے)	تیس روپے
نتھ کا زخم	(ناول)	تیس روپے
نتھ کا بوجھ	(افسانے)	تیس روپے

فتر شانِ ہند۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

سرور تونسوی

ماں کے سایۂ عاطفت سے محروم

یہ شمارہ پریس میں جانے ہی والا تھا کہ سرور صاحب کی والدہ محترمہ کی حالت تشویشناک حد تک بگڑ گئی جو کہ گوڑگاؤں میں اپنے دوسرے بیٹے کے ہاں کئی دنوں سے علیل تھیں۔

چنانچہ ہم دونوں ان کی تیمارداری کیلئے گوڑگاؤں چلے گئے اور پندرہ دنوں کے بعد ۳ اور ۴ مارچ کی درمیانی رات کے سوا تین بجے والدہ صاحبہ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

سرور صاحب کچھ رسومات کی ادائیگی کیلئے گوڑگاؤں میں ہیں اور ۹ مارچ کو دہلی آجائیں گے۔

اس وجہ سے یہ شمارہ وقت پر شائع نہ ہوسکا۔ مارچ کا شمارہ بھی تیار ہو رہا ہے جو بہت جلد حوالۂ ڈاک کیا جارہا ہے اپریل کا شمارہ یکم اپریل کو روانہ خدمت کئے جانے کی ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے۔

سرور صاحب کی اپنی صحت دن بدن معمول پر آرہی ہے اور خدا نے چاہا تو وہ بہت جلد دفتری اور دوسری ذمہ داریاں حسبِ سابق سنبھال لیں گے۔

سرور صاحب کے شدید مضروب ہونے پر جو حضرات بہ نفسِ نفیس عیادت کیلئے تشریف لائے اور جنھوں نے خطوط۔ تار اور ٹیلیفون کے ذریعہ ملک بھر سے ہمدردی کا اظہار فرمایا، میں ذاتی طور پر ان سب مخلصین کی شکر گزار ہوں۔ قبلہ الحاج حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی مدیر اعلےٰ شمع ہر روز سرور صاحب کو دیکھنے آتے رہے ان کے اس احسان اور ہمدردی کے لئے شکریہ ادا کرنے کیلئے میں الفاظ کا انتخاب کرنے میں ناکام ہوں۔ بس یہی دعا کرتی ہوں کہ خدا حافظ صاحب کا سایۂ ہمایونی ہم سب پر مدتوں قائم رکھے ۔۔ (آمین)

شکر گزار
روحی دہلوی

دیوؤں کا استھان

ڈاکٹر اُودے سرن ارمان (بلاری)

میرے والدِ محترم جناب بشیر احمد صاحب اپنے ہندو دوستوں کے تیج تیوہار اور شادی بیاہ میں شامل ہوتے تھے اور کبھی کسی ہندو دوست کے وہاں کوئی مذہبی تقریب یا بھگوان کا کیرتن ہوتا تو بھی وہ کچھ وقت شرکت کرتے اور بھگوان کے نام پر تقسیم کئے جانیوالا پرشاد (تبرک) بھی احترام سے لیتے اور کھا لیتے۔ اسی طرح انکے ہندو دوست ہمارے مذہبی تیوہاروں اور شادی غمی میں برابر کے شریک ہوتے۔ کیسا ہنسی خوشی کا زمانہ تھا کیسے میل ملاپ کے دن تھے لوگ حقیقی زندگی جینا جانتے تھے سنہ ۱۹۰۶ء میں جب میں خوب جوان تھا میرے والد صاحب نے اپنے بچپن کے دوست پنڈت دیا شنکر پانڈے کے لڑکے کی شادی میں شرکت کے لئے مجھے بھیجا کیونکہ میرے والد صاحب کے پاؤں میں تکلیف تھی اس لئے مجبوراً انہوں نے یہ شرف مجھے بخشا۔ میں اس اعزاز پر بہت خوش تھا کیونکہ ان دنوں جب برات چڑھتی تھی تو دولہے کے آگے آگے طوائف اور بھنڈیلے ناچتے گاتے چلتے تھے اور مجھے یہ تفریح پسند تھی۔ ہندو شادیوں میں سوانگ تماشے بھی خوب ہوتے تھے ساری رات تفریح میں بیت جاتی تھی، پانڈے جی کی برات میں ایک چوتھائی براتی مسلمان تھے اس زمانے میں یہ ایک عام بات تھی۔ اسی سال بنگال کے دو حصے کئے جا رہے تھے اور انگریز سیاستداں ایک ایسا زہر ہم ہندو مسلمانوں کے لئے تیار کر رہے تھے جس کے اثر سے ہم صدیوں تک متاثر رہیں گے اور یہ زہر تھا مسلم لیگ کا وجود قائم کرنا۔

پانڈے کی برات ایک گاؤں میں جا رہی تھی، برات ایک گاؤں میں گئی لڑکی والوں کو خیر اپنا فرض ادا کرنا ہی تھا، پر ایسے لگ رہا تھا کہ برات سارے گاؤں والوں کے ہاں آئی ہے، گاؤں کا ہر شخص براتیوں کی خاطر مدارات میں دل و جان سے لگا ہوا تھا گاؤں والوں کا دلی خلوص، بے غرضانہ خدمت، اور آنکھوں میں خوشی کی سچی اور حقیقی چمک زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ اصل ہندوستان گاؤں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے، شہروں میں تو سب دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔

مجھے گھر پر تو شام ہی کو نیند آ جاتی تھی مگر یہاں رات بھر نیند کا نام و نشان دُور دُور نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہندوؤں کی شادی کے رسم و رواج اور بھانوریں دیکھنے کا ذوق و شوق نہ جانے نیند کو کہاں سات سمندر پار چھوڑ آیا تھا۔ ادھر جنواسے میں ”امر سنگھ راٹھور“ کا سوانگ ہو رہا تھا، تاشے نقارے کی گمک کا بھر طولیں اور چوبولے کی دُھنیں دل میں اُمنگیں بھر بھر دیتی تھیں، اس زمانے کی شادیوں میں لوگ اپنے بہادروں کے گیت گاتے تھے اور آج فلمی گانے ”وہ بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ“، ”ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں اور چابی کھو جائے“، ”تو پندرہ برس کی میں سولہ برس کا“، کیا ستم ظریفی ہے کہ حال ہی میں ایک برات میں دو ہنسوں کا جوڑا بچھڑ گیو رام“، فلمی گیت کی دُھن بجائی جا رہی تھی

ایسے اپنے ہاں ہندوؤں کی شادیاں تو کئی دیکھی تھیں لیکن بھانوریں پڑتی پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا، ہندوؤں کے نکاح کا طریقہ آگ کو گواہ کر کے دو زندگیوں کو پاک رشتے میں باندھ دیا جاتا مجھ ایسے صاف دل و دماغ والے نوجوان کو کسی طور بھی بُرا نہ لگا۔

ساری رات بیت گئی دن نکل آیا سب لوگ ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے لوٹا ڈور سنبھالنے لگے میں نے بھی ایک لوٹے میں پانی لیا اور گاؤں سے باہر کھیتوں کی طرف چل دیا، کل جب برات آ رہی تھی تو میں نے گاؤں کے باہر کھجور کا ایک بہت بلند پیڑ دیکھا تھا جوں ہی گاؤں سے باہر نکلا کھجور کا یہ لمبا پیڑ نظر پڑا۔ اور میں اسی طرف رفع حاجت کیلئے چل دیا اچھا خاصا قطب مینار دُور سے یہ کھجور کا پیڑ نظر آتا تھا۔ راستے میں مجھے ایک گاؤں

والے نے ٹوکا "ادھر مت جانا وہاں دیوؤں کا استھان ہے"
"اچھا بھائی صاحب نہیں جاؤں گا" میں نے راستہ بدلتے ہوئے
کہا۔ سردی کی زیادتی اور کپڑوں کی کمی کی وجہ سے بغلوں میں ہاتھ
دئے ذرا آگے بڑھ کر گھاس پھوس اکٹھا کرکے جلا کر تاپنے لگا۔
"کتنے بھلے لوگ ہوتے ہیں یہ غریب آدمی بھی، شاید فرشتوں کو
غریبوں کے بھیس میں زمین پر بھیجدیا ہے رب العالمین نے تاکہ
دولت مندوں کا امتحان لیتے رہیں" معاً میرے شعور نے مجھے
ورغلایا اور میں نے پھر کھجور کے اس لمبے پیڑ کی طرف رُخ کرلیا
وہ دیوؤں کا استھان ہے تو کیا ہوا میں وہاں رفع حاجت نہیں
کروں گا، کسی فقیر کا مزار ہو یا دیوؤں کا استھان سبھی قابل احترام
ہوتے ہیں، اوس سے تر دُوب گھاس پر میرے نقش پا بڑے
عجیب سے لگ رہے تھے اس راستے پر کوئی مدتوں سے نہیں آیا گیا
تھا اگر کوئی ادھر آتا جاتا تو پگڈنڈی کے سے نشان ضرور ہوتے۔

اب میں کھجور کے درخت کے بالکل قریب تھا سر اوپر اٹھا کر اس کی
بلندی دیکھتے ہی میرے ذہن میں آیا کہ اس کھجور کے درخت نے نہ جانے
کتنے زبردست طوفانوں اور برق رفتار آندھیوں کا مقابلہ کیا ہوگا
مگر اس کا سر افتخار قطب مینار کی طرح اور تاج محل کے گنبد سے بھی زیادہ
اونچائی لئے ابھی تک اپنی سرفرازی کو قائم رکھے ہوئے ہے، میں ان
ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ پیچھے سے کسی کی آواز آئی "ہاں یہ
قطب مینار کی طرح اونچا اور تاج محل سے بھی بلند ہے" میں نے مڑ
کر دیکھا تو دُور تک آدم نہ آدم زاد، میری اجابت اوپر چڑھ گئی، پسینے
سے شرابور اور دہشت زدہ میں نے بھوت پریت کی کہانیاں بند
کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر سو واٹ کے بلب کی روشنی میں خوب پڑھی
تھیں مگر واسطہ آج ہی پڑا، جس حقیقت کو میں "کچھ بھی نہیں ہوتا
ہے" کہہ کر ٹال دیتا تھا آج وہ داستانیں بالکل سچی معلوم ہو رہی
تھیں۔ میں آج موت سے مقابلہ کر رہا تھا، بھاگ کر بھی نہیں جاسکتا
تھا۔ میں نے "لاحول" پڑھی اور ہمت کرکے کچھ آگے بڑھا، درخت
کے چاروں طرف خوب جھاڑ جھنکاڑ تھا جیسے کھجور اہو کے بڑے مندر
کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے مندر ہیں۔ میں نے جھانکا "دیوؤں
کا استھان کدھر ہے" جھاڑ جھنکاڑ کو ادھر ادھر کرکے میں کچھ آگے
بڑھا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ دیوؤں کا استھان ہو یا کسی بزرگ کا
مزار، ان کی تعظیم کرنی چاہئے۔ ایسی جگہوں پر محبت اور خلوص کا سکہ
رواں ہوتا ہے، مذہب کے بکھیڑے سے یہ لوگ بالکل دُور ہوتے
ہیں، جونہی میری نظر کھجور کے جڑ پر کچھ پرانی چھوٹی ٹکیا اینٹوں پر گئی "تو
میں سمجھ گیا کہ کھجور کا تنا توڑتے ہوئے مزار کے گھیرے میں اُگا ہوا ہے
اللہ اکبر جس کی جڑ اتنی گہری ہوگی زمانے کے حوادث اس کا کیا بال بیکا
کرسکیں گے"

"ہاں، واقعی اس کا بال بیکا بھی نہیں ہوسکے گا" یہ الفاظ سنتے
ہی میں نے مڑ کر دیکھا تو میدان صاف تھا میں نے پھر "لاحول" پڑھی
مگر میرا جسم قدرے کانپ رہا تھا اور دل بیٹھا جارہا تھا کہ یا اللہ کس مصیبت
میں پھنس گیا، میں لرزاں وخیزاں مزار کی سمت دیکھ رہا تھا کہ کسی طرح
یہ پتہ چل سکے کہ یہاں کوئی مسلمان بزرگ ابدی نیند سو رہا ہے یا کسی
ہندو کی آخری آرام گاہ ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کھنڈر کے اندر
سے ایک ناگ پھن اٹھائے رُدتا ہوا، "میں نے پھر خدا کا نام لیا،
مگر اتنے میں ایک دوسرے ناگ نے پھن باہر نکالا۔ میں نے اکثر پان فروشی
کی دوکان پر شوجی مہاراج کی تصویر میں ان کے گلے میں لٹکے ہوئے ناگ دیکھے تھے
یہ دونوں ناگ بالکل ویسے ہی تھے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ہاتھ
جوڑ کر کھڑے ہوجانے سے ناگ بغیر نقصان پہونچائے چلے جاتے ہیں
لہذا میں نے فوراً ہاتھ جوڑ لئے اور آنکھیں بند کرلیں اور میں سمجھ
چکا تھا کہ یہ ناگ نہیں ہیں کوئی اور ہی مخلوق ہے لہذا میں نے
اپنے خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے آنکھیں بند کرکے بہ آواز بلند کہا
"دیوؤں کے استھان کے پاس آنے کا میرا منشا یہ نہیں کہ کوئی بے ادبی
کروں یا کسی طرح کا نقصان پہنچاؤں، میں تو ایک اجنبی ہوں کوئی
خطا ہوگئی ہو تو معاف کردیجئے آپ تو انسان کے دل کی دنیا تک
رسائی رکھتے ہیں" میں ایسا کہہ ہی رہا تھا کہ میرے کانوں کے
پاس گرم گرم پھنکار سی محسوس ہوئی میں نے جلدی سے آنکھیں
کھولیں تو مجھے ایسا لگا کہ سانپ میرے سر پر چڑھ آئے ہیں مگر
دیکھتا کیا ہوں کہ سانپ غائب اور ایک جوان حسین وجمیل
لڑکی اور ایک خوبصورت نوجوان میرے سامنے کھڑے ہیں۔ میری خوشی
کا ٹھکانہ نہ رہا میں نے انھیں بغور دیکھا اور دیوانوں ہوکر خدا
کے حضور سر جھکا دیا۔ جب میرے حواس سنبھلے تو میں نے پوچھا
"آپ کون ہیں؟"

اسی گاؤں کے باشندے ہیں"
"آپ انتہ صاحب توقیر اور خدا رسیدہ ہستی ہیں مگر گاؤں والوں کو اپنے مزار کی مرمت کرنے کی اجازت نہیں دی" میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو وہ مسکرا کر بولے۔
"اس مزار میں ایک جوڑا دفن ہے وہ نہیں چاہتا کہ یہاں کی قدرتی خوبصورتی ختم کی جائے"
"ایک قبر میں جوڑا دفن ہے یہ تو میں آج ہی سُن رہا ہوں"
میرے اس حیرانی پر ہنستے ہوئے کہنے لگے
"اس گاؤں میں ایک بڑھئی کا لڑکا تھا گوپی اور ایک جولاہے کی لڑکی تھی مُرادن، یہ دونوں چھوٹے چھوٹے کسانوں کے بچے تھے، دونوں کے ساتھ کے کھیت تھے جو پاس پاس تھے گیدڑوں اور چڑیوں سے رکھوالی کرنے کے لئے دونوں نے اپنے اپنے کھیتوں میں ٹانڈ (مچان) بنا رکھے تھے اور دونوں اپنے اپنے کھیت کی رکھوالی کرتے تھے۔ ایک دن کھانا کھاتے وقت گوپی کا پانی سے بھرا گھڑا نیچے گر کر پھوٹ گیا۔
"کیا ہوا" مُرادن نے گھڑا پھوٹنے کی آواز سن کر پوچھا۔ گوپی نے بے پرواہی سے کہا "کھانا کھانے کے بعد خود ہی آ کر دیکھ لینا"
مُرادن یہ سنتے ہی گوپی کے مچان پر گئی اور پوچھنے لگی جلدی بتا کیا ہوا؟ کوئی دونوں کو ایک ٹانڈ پر دیکھ لے گا تو گاؤں میں مہنہ دکھانا بھاری ہو جائے گا۔ گوپی نے پھوٹے ہوئے گھڑے کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہا دیکھ نہیں رہی ہو کہ کیا ہوا ہے۔ مُرادن نے بے ساختہ کہا تو کیا ہوا، تمہارا پانی گر گیا تو میرا گھڑا بھرا رکھا ہے پی لو" یہ سن کر گوپی کچھ سوچ کا حالاں کہ وہ پیاسا تھا کیونکہ کھائی ہوئی روٹی کنڈے کی کرس کی طرح اس کے حلق میں نیچے سرک رہی تھی اسے چپ دیکھ کر وہ پھر بولی موپی تو پی لو یہاں کوئی دیکھ تھوڑا ہی رہا ہے۔ میں کسی سے کہوں گی نہیں چھوا چھوت کا خیال مت کرو جس کنویں میں تمہارا گھڑا غوطے لگا کر پانی بھرتا ہے اُسی میں میرا گھڑا بھی ڈبکی لگاتا ہے جب اس گھڑے سے کنویں کا پانی خراب نہیں ہوتا تو اس گھڑے کا پانی بھی کیوں کر خراب ہوگا۔ تو پی لو، گھڑا جھکاتے ہوئے مُرادن نے جو اس حقیقت پر روشنی ڈالی تو گوپی نے فوراً جھک کے اوک لگا کر گٹ گٹ پانی پی لیا اور ڈکار لی "پانی نہیں یہ دُنیا کے لوگ خراب ہیں" گوپی نے کہا۔ "تو ایک سیندا کھالو"
مرادن نے پاس رکھے ہوئے سیندوں میں سے ایک اُٹھا کر گوپی کے سامنے بڑھاتے ہوئے کہا۔
"سیندے تو میرے کھیت میں بھی بہت ہیں" گوپی بولا۔
"یہ دوسری قسم کا ہے" مُرادن نے کہا۔
مُرادن کے ہاتھ سے سیندا لے کر گوپی نے جونہی اسے دانتوں سے کاٹا تو وہ نہ صرف کچا بلکہ کڑوا بھی تھا، لہٰذا گوپی نے دانتوں سے کاٹے ہوئے سیندے کا باقی حصہ مُرادن کو دیدیا اور منہ میں پڑے سیندے کے ٹکڑوں کو تھوکتے ہوئے کہا کہ میرا منہ بھی کڑوا کر دیا۔ مُرادن گوپی کا دانتوں سے کاٹا ہوا باقی سیندا لے کر بڑے مزے سے چبا چبا کر کھا گئی اور ایک عجیب سے انداز دلبری سے کہنے لگی کس قدر میٹھا سیندا ہے تم تو جھوٹ بولتے ہو جی۔ گوپی حیرانی سے کہنے لگا "مرادن تو نے میرا دانتوں سے کاٹا ہوا سیندا کھا لیا" "تبھی تو یہ میٹھا ہو گیا"۔
مُرادن نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا، اس کے بعد گوپی چلا آیا اور اپنے کھیت کی ٹانڈ پہ آ بیٹھا اور وہیں سے اس کو دیکھتا رہا، اسے ایسا لگا جیسے زمین و آسمان دونوں گھوم رہے ہیں، اسی دن سے دونوں میں گہرا پیار ہو گیا مُرادن اردو پڑھی ہوئی تھی اور گوپی ہندی جانتا تھا لہٰذا "زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم" کے مصداق دونوں پیار بھری چٹھیاں نہ لکھ سکتے تھے، چنانچہ کچھ سوچ کر گوپی نے اردو پڑھنی شروع کر دی۔
ایک دن درویش کے استھان کے پاس دونوں اپنی شادی کا پروگرام بنا رہے تھے کہ کلو ہریجن نے دیکھ لیا۔ کوئی کتنا ہی محبت کو چھپائے مگر یہ کمبخت تو کوٹھوں چڑھ کر بولتی ہے۔
جنگل کی آگ کی طرح گاؤں میں بات پھیل گئی اور مذہب نے دونوں کے پیار کے بیچ دیوار اُٹھا لی، یہ دیکھ کر مُرادن نے ہندو بننا منظور کر لیا مگر گوپی نے اس کو ایسا کرنے سے روکا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بستی کے لوگ اس کے ہندو ہو جانے پر بھی اس کو قبول نہیں کریں گے جب کہ مسلمانوں میں اس کے بالکل برعکس ہے، لہٰذا گوپی نے مسلمان بننے کے لئے امام صاحب سے ساتھ گانٹھ لگا لی۔
تاریخ طے ہو گئی، جب گوپی کے بڑے بھائی کو اس کا علم ہوا تو اس نے گوپی کو آڑے ہاتھوں لیا "ایک مسلمان لڑکی کے پیار میں اندھے ہو گئے مر جاؤ کہیں جا کر مگر پیار کی خاطر دھرم بدلنا بُری بات ہے

اس سے بستی کی بدنامی ہے خاندان کی ناک کٹتی ہے، جاتی کو نیچا دیکھنا پڑے گا،، بھائی کے سامنے تو اس نے کچھ نہیں کہا مگر رات کو افیون کھا کر سوگیا اور ایک پرچہ لکھ کر سرہانے رکھ دیا ،، کہ میں اس دنیا کو چھوڑ کر جا رہا ہوں جس میں مذہب محبت کو محدود کرتا ہے تم پیار کرنے سے روک سکتے ہو مگر مرنے سے تو نہیں روک سکتے، میری آخری خواہش پوری کر دینا یعنی مجھے دیوؤں کے استھان کے پاس سرسوں کے کھیت کے کونے میں پھونک دینا ،،

مرادن کو جب اس کا پتہ چلا تو اس کی زبان گُنگ ہو گئی، مگر جب صبح کو اسے مردہ پایا گیا تو اس کے سرہانے کے نیچے سے بھی ایک پرچہ ملا جس پر لکھا تھا کہ میں تو تنیا کھا کر اپنے گوپی کے پاس جا رہی ہوں لہٰذا مجھے بھی وہیں دفنانا جہاں گوپی کو جلایا ہے۔ اس کی وصیت اس کے بڑے بھائی نے پڑھ کر پرچہ پھاڑ دیا اور تجہیز و تکفین کے انتظام میں لگ گیا جب اس کا جنازہ اٹھانے لگے تو وہ اتنا وزنی تھا کہ کئی آدمی مل کر بھی نہ اٹھا سکے، لوگ حیرت زدہ تھے جب سب تدبیریں بے کار ثابت ہوئیں تب اس کے بھائی نے اس کی آخری خواہش سب کے سامنے رکھی جو ایک مشکل کام تھا لہٰذا گاؤں کے معزز ہندوؤں کو بلایا گیا اور انھیں مرادن کی آخری خواہش کے بارے میں بتایا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ وہ خود ایسا کرنا نہیں چاہتے مگر تمام کوششوں کے باوجود جنازہ اٹھتا ہی نہیں۔ ہندو حضرات نے صاف الفاظ میں انکار کر دیا کہ جہاں گوپی کی چتا جلائی گئی وہاں مُرادن کی قبر نہ کھودی جائے جب یہ ہندو حضرات واپس ہوئے تو سب کے سب مُرادن کے گھر سے نکلتے ہی اندھے ہو گئے اور بڑی مشکل سے گرتے پڑتے اپنے گھروں میں پہنچے، جہاں کی آنکھوں کی روشنی نے واپس آنے کا نام تک نہ لیا آخر کار ہندوؤں نے یہ فیصلہ کیا کہ مُرادن کی قبر گوپی کی کریا پر بنانے کی اجازت دے دی جائے شاید سب کی آنکھوں میں پھر سے روشنی آ جائے لہٰذا مسلمان بھائیوں کو بلایا گیا اور انھیں اس کی اجازت دی گئی کہ وہ ایسا کر سکتے ہیں تو مسلمانوں اور ہندوؤں کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سب ہندوؤں کی آنکھوں کی روشنی واپس آ گئی۔

مُرادن کی آخری خواہش پوری کی گئی اور اس طرح ایک قبر میں یہ دو محبت کرنے والے دفن ہوئے۔ یہ کہہ کر لڑکا چُپ ہو گیا۔

آپ اپنے مزار کو خوبصورت بنوانا کیوں پسند نہیں کرتے، میرے اس سوال پر لڑکے نے مسکراتے ہوئے کہا کہ ہم شاہ جہاں تھوڑے ہی ہیں اور نہ ہماری محبت نمائش چاہتی ہے۔ مگر آپ کا مزار بہتر انداز میں بنوانے سے اس یادگار کے بارے میں ہر کسی کو پتہ چل سکے گا اور عوام کو کچھ عقل تو آئے گی۔ اس پر اس لڑکے نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا کہ جب دنیا کے عوام کو گیتا، بائبل اور قرآن اور گرو گرنتھ صاحب عقل نہ سکھا سکا اور مذہب کی دیواروں میں قید ہونے سے نہ بچا سکے انہیں میرے مزار کی اینٹیں کیا سکھائیں گی۔ لڑکے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ محبت اور خدا دنیا کے ہر مذہب سے پہلے موجود تھے مگر دنیا والے نہ تو محبت کو سمجھتے ہیں اور نہ مذہب کو، محبت کو ہوس اور مذہب کو وسیلۂ فساد سمجھ لیا گیا ہے حالاں کہ محبت ہی خدا ہے اور مذہب صرف اور صرف اپنے معبود کی عبادت کرنے کے مختلف طریقوں کا نام ہے یہ کہتے ہوئے اور میرے دیکھتے دیکھتے وہ دونوں بغل گیر ہو گئے اور مختصر ہوتے ہوتے کھجور کے تنے میں سماتے چلے گئے ٭٭

غزل

اُمِّ ہانی لکھنؤ

حیراں ہے عقل وقت کی گردش سے چال سے
اجسام داغدار ہیں ان ماہ و سال سے

انسانیت کو اب کوئی پہچانتا نہیں
کتنا ہے بُعد آج بھی ان خد و خال سے

افکارِ نو پہ ناز ہے ان مُنکرین کو
حیراں مگر ہیں آج بھی بارش سے کال سے

انسان کو ضرورتِ ایماں ہے ان دنوں
بنتی نہیں ہے بات کوئی قیل و قال سے

اردو دنیائے افسانہ نگاری میں ایک نیا ابھرتا نام

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

جو ہندی افسانوی دنیا میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ہندی افسانہ نگاری میں ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں

اگر آپ

قومی یک جہتی کے دلدادہ ہیں، یا ہندو مسلم اتحاد کے حامی۔ یا دیہات (گاؤں) کی سادہ اور پاک فضا میں زندگی بسر کرنے والوں کی جی داری۔ عزت و ناموس پر مرمٹنا۔ باہمی رفاقت اور غیر فرقہ وارانہ روابط کی دلکش، سچی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں نیز جہیز اور دیگر مجلسی برائیوں کو دور کرنے کی حمایت کرتے ہیں تو ——— پڑھیے

مان سروور

جو ڈاکٹر اودے سرن ارمان کے اکیس ایسے اچھوتے اور دل و دماغ پر اثر کرنے والے سچائی پر مبنی اردو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو اپنی دلکشی۔ بہترین لکھائی چھپائی اور دیدہ زیب قومی یک جہتی کے رنگوں میں آپ کی نظروں کو دعوت مطالعہ دے گا ——— قیمت -/۲۱ روپے ـ علاوہ محصول ڈاک

یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی بھی افسانہ کو شروع کریں اور بغیر پورا پڑھے کتاب کو رکھ دیں۔

مان سروور کا انگریزی ایڈیشن بھی بہت جلد منصۂ شہود پر آرہا ہے جسے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے جناب ادیب لکھنوی ریٹائرڈ پرنسپل رام رتن انٹر کالج بلاری نے۔ اس کے علاوہ مان سروور کا ہندی ایڈیشن شائع ہو گیا ہے جو ہر اچھے بک سیلرز کے ہاں دستیاب ہے۔

(قیمت پندرہ روپے)

ملنے کا پتہ

یو۔ ایس۔ اے ہسپتال

پوسٹ بلاری۔ ضلع مراد آباد (یوپی)

(نوٹ: دفتر ماہنامہ شان ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے بھی یہ کتابیں دستیاب ہے)

سیاسی شگوفے

امریکہ میں گذشتہ صدارتی انتخاب کے دوران ایک امریکن نے شکایت بھرے لہجے میں اپنے دوست سے کہا "یار مجھے تو بد اور بدتر یعنی کارٹر اور ریگن میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے"
دوست نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ بیک وقت دونوں ہی منتخب نہیں ہوں گے"۔

سابق صدر نکسن نے اپنے نائب صدر جیرالڈ فورڈ کو پہلی بار چین کے دورے پر بھجوایا تو نصیحت کی
نکسن: دیکھیں، چین جائیں تو پاگوڈا جانا ہرگز نہ بھولنا۔
فورڈ: سر! میں سب سے پہلے پاگوڈا سے ہی مذاکرات کروں گا۔
(یاد رہے کہ چین میں عبادت خانے کو پاگوڈا کہتے ہیں)

سائبیریا کی فوجی چھاؤنی میں تین اعلیٰ امریکی افسر قید تھے ان میں سے ایک نے دوسرے سے دریافت کیا "آپ کو کس جرم کی بنا پر گرفتار کیا گیا؟"
"میں نے ۱۹۳۹ء میں "کامریڈ پوپوف" کے خلاف نکتہ چینی کی تھی" دوسرے نے جواب دیا۔
دوسرے قیدی نے پہلے سے دریافت کیا۔
"اور آپ کس جرم میں پابند سلاسل ہیں"
پہلے نے جواب دیا "میں نے ۱۹۴۰ء میں کامریڈ پوپوف کی تعریف کر دی تھی"
اس کے بعد دونوں قیدی تیسرے کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت کیا
"آپ کس غلطی کی سزا بھگت رہے ہیں؟"
تیسرے نے جواب دیا "میری غلطی یہ ہے کہ میں ہی کامریڈ پوپوف ہوں"۔

سکندر اعظم، قیصر روم اور نپولین ماسکو کے سرخ میدان میں ایک فوجی نمائش دیکھ رہے تھے۔ سکندر اعظم کی نظر ٹینکوں پر پڑی تو چونک کر کہا۔
"اگر میرے پاس اس قسم کے ٹینک ہوتے تو میں پورے ایشیا کو زیر نگیں کر لیتا۔"
قیصر روم نے جدید ترین دور مار میزائلوں پر للچائی ہوئی نظر ڈال اور کہا۔
"اگر میرے پاس ایسے خوفناک آلاتِ جنگ ہوتے تو میں ساری دنیا پر قبضہ جما لیتا"۔
اس دوران نپولین پراودا کو بڑی حیرت کے ساتھ پڑھ رہے تھے انھوں نے سر اٹھایا اور کہا
"اگر میرے پاس اس قسم کا اخبار ہوتا تو کسی کو معرکہ واٹرلو کی کانوں کان خبر نہ ہوپاتی اور میں رسوائی سے بچ جاتا"

روس کی سیاسی پولیس نے بداپسٹ کے قریب دریا ڈانوب میں سے پتھر کے زمانے کی ایک لاش برآمد کی اور اعلان کیا کہ یہ لاش مشہور فاتح اٹیلا کی ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ "خفیہ پولیس" کو یہ بات کس طرح معلوم ہوئی۔ پولیس افسر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "لاش نے خود اعتراف کیا ہے"۔

مشرقی جرمنی کے کمیونسٹ سربراہ اولبریخت نے راستے میں ایک بچہ دیکھا اسے قریب بلایا اور پوچھا "تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟"
بچے نے جواب دیا "کامریڈ اولبریخت"
اور والدہ کا کیا نام ہے
"عوامی جمہوریہ جرمنی"
کوئی خواہش؟
میری یہی چاہت ہے کہ میرے ماں باپ دونوں مر جائیں اور میں یتیم ہو جاؤں"۔

شادی

سلمان بٹ

شادی کے بارے میں ایک عام کہاوت ہے کہ جو لوگ شادی کے دائرے کے اندر ہیں وہ باہر نکلنا چاہتے ہیں اور جو باہر ہیں وہ اندر آنا چاہتے ہیں یہ کہاوت سُن کر ہمیں نہ جانے کیوں منی بس کا خیال آ جاتا ہے کیونکہ جو لوگ سڑک پر کھڑے ہوتے ہیں وہ منی بس میں بیٹھے اور کھڑے ہوئے افراد کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جو لوگ اندر پھنسے ہوتے ہیں وہ باہر کی آزاد فضا میں کھڑے ہوؤں کو حسرت سے دیکھتے ہیں اوپر والی بات کو بعض لوگ آسان لفظوں میں یوں بیان کرتے ہیں کہ شادی کرے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ کرے وہ بھی پچھتائے، اس پر ہمارے ایک کنوارے دوست کہا کرتے ہیں کہ اگر دونوں صورتوں میں پچھتانا ہی ہے تو کیوں نہ شادی کر کے پچھتایا جائے اور ہر قسم کے پچھتانے کا تجزیہ ہو جائے ان کی اس بات کے جواب میں ہمارے ایک اور شادی شدہ دوست کہا کرتے ہیں کہ اوپر والی بات یوں تو سچ ہے کہ کنوارے اور شادی شدہ دونوں ہی پچھتاتے ہیں لیکن اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ زیادہ کون پچھتاتا ہے چنانچہ کہاوت میں اس کمی کے سبب اکثر لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں اور انجانے میں شادی کر بیٹھتے ہیں ہمارے شادی شدہ دوست کا کہنا ہے کہ کنوارے انسان کا ذہنی سکون دس فیصدی سے پچاس فیصدی تک برباد ہوتا ہے جب کہ شادی شدہ انسان کا سکون ساٹھ فیصدی سے پچانوے فیصدی تک بلکہ بعض حالتوں میں سو فیصدی تک برباد ہو جاتا ہے ان کا کہنا ہے کہ شادی شدہ حضرات کو ایک منظم تحریک چلانی چاہئے جس میں کنواروں کو شادی کرنے سے باز رکھا جائے اور ان پر اپنے تجربے کی بنا پر شادی کے نقصانات بتائے جائیں انھیں کہا جائے کہ بھائیو! جو غلطی ہم کر چکے ہیں وہ تم نہ کرو، ہم تو ڈوبے ہیں لیکن تمہیں ڈوبنے سے بچانا چاہتے ہیں۔

میں نے انھیں بتایا کہ یہ تحریک کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی بالخصوص اس وقت تک جب تک اس کی باگ ڈور شادی شدہ افراد کے ہاتھ میں ہے کیونکہ کنوارے کبھی یقین نہ کریں گے کہ یہ شادی شدہ حضرات خلوص دل سے یہ مشورہ دے رہے ہیں وہ تو شاید یہ سمجھیں گے کہ یہ لوگ جس پھل کو خود چکھ چکے ہیں (بلکہ چکھتے جا رہے ہیں) ہمیں اس سے باز رکھنا چاہتے ہیں دراصل یہ نہیں چاہتے کہ کوئی اور بھی اس کی خوشیوں میں شریک ہو۔ چنانچہ اس تحریک کا ردِعمل یہ ہوگا کہ شادیاں زیادہ کثرت سے ہونے لگیں گی اور وہ کنوارے جو فی الحال شادی کا نہیں سوچ رہے بلکہ زندگی بنانے کی فکر میں ہیں، شادی کے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

شادی کے بارے میں سوچنا دراصل شادی کی طرف پہلا قدم اُٹھانے کے مترادف ہے شادی کم بخت چیز ہی ایسی ہے کہ جو بھی اس کے بارے میں سوچنا شروع کرتا ہے وہ شادی کئے بغیر دم نہیں لیتا یعنی سوچ اس لحاظ سے خطرناک ہے کہ یہ انسان کو ایک ہی طرف دھکیلتی ہے اور بالآخر انسان شادی کے کنوئیں میں مُنہ کے بل گر جاتا ہے

ہمارے شادی شدہ دوست ہماری بات سُن کر قدرے متفکر ہوئے پھر کچھ دیر چپ رہنے کے بعد بولے "کیوں نہ چند کنواروں کو اس بات پہ آمادہ کر لیا جائے کہ وہ شادی کے خلاف تحریک چلائیں" ہم نے کہا کنواروں کو اس بات پہ آمادہ کرنا ناممکن ہے کوئی کنوار نہیں چاہے گا کہ اس قسم کی تحریک چلا کر اپنی "تندرستی" کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شبہ پیدا کرے، یہ سُن کر وہ حسرت سے ماتھے پہ ہاتھ مار کر کہنے لگے "اے کاش! مجھے شادی سے پہلے عقل آ جاتی تو آج یہ روزِ بد دیکھنا نہ ہوتا نیز میں اپنی طرح اور بہت سے لوگوں کو بدنصیب ہونے کو بچا لیتا، یہ سن کر ہم نے کہا "اب پچھتائے کیا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

شادی انسان کی ان شامتوں میں سے ہے جن سے بچنا محال اور نہ بچنا مہلک ہے، شادی کے بعد صرف مرد ہی نہیں پچھتاتے عورتیں بھی اپنی قسمت کو کوستی رہتی ہیں، البتہ مرد اور عورت کے پچھتانے میں تھوڑا سا فرق ہے، مرد عموماً یہ کہتا ہے "اے کاش! شادی نہ کرتا" جب کہ عورت کا کہنا ہے "اے کاش! میں تم سے

ہی، گویا مرد شادی کے خلاف ہوتا ہے جب کہ بیوی اپنے موجودہ
ہر سے، بیوی کو اپنے خیال میں سوائے عیوب کے کچھ اور نظر نہیں آتا
، کہ دوسری عورتوں کے شوہروں میں اسے سوائے خوبیوں کے اور کچھ
نہیں آتا، مجھے تو کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ جو اللہ تعالیٰ نے
ت کو دو آنکھیں عطا فرمائی ہیں، تو ان کا مصرف یہ ہے کہ عورت
آنکھ سے اپنے شوہر کی برائیاں دیکھے اور دوسری آنکھ سے ہمسائی
شوہر کی خوبیاں دیکھے، ہماری نظر سے آج تک کوئی ایسی خاتون
گزری جس نے اپنے شوہر کی تعریف کی ہو، اگر قارئین کرام کی
میں ایسی کوئی عورت ہو تو براہ کرم ہمیں اس کا نام و پتہ بھیجکر
فرمائیں کیونکہ ہم ایسی عجیب و غریب عورت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

شادی کو بعض لوگ خانہ آبادی کہتے ہیں یعنی گھر کی آبادی بڑھ
تی ہے اور آبادی بڑھنے کے نقصانات سے آپ واقف ہیں اگر
ں تو فیملی پلاننگ والوں سے پوچھ لیں اور یہ کام ذرا جلدی کریں
یں کہ پتہ چلا ہے، کہ عنقریب یہ محکمہ ٹوٹنے والا ہے، آبادی بڑھتی
تو گھر کے کمروں کی تعداد گھٹ جاتی ہے، باتھ روم کے باہر لائن
جاتی ہے دستر خوان پر کھینچا تانی شروع ہو جاتی ہے دن کو
م کرنا تو کجا راتوں کی نیند تک حرام ہو جاتی ہے عمر گھٹ جاتی
معروفیت بڑھ جاتی ہے۔

مہمان زیادہ آنے لگتے ہیں سر کے بال تیزی سے سفید ہونے
ہیں ڈاکٹر کی دوائیوں کا بل بڑھ جاتا ہے۔

انہی سب عوامل کی بنا پر میرے شادی شدہ دوست کا کہنا
کہ شادی نہ کرنے والا کم پچھتاتا ہے لیکن شادی کرنے والا زیادہ
افسوس! کنوارے اس بات کو تسلیم نہیں کرتے وہ کہتے ہیں کہ
الی کی جس اذیت سے ہم گزر رہے ہیں اسے شادی شدہ حضرات
سمجھیں گے، سچ ہے ہر کسی کو اپنا دکھ ہی بڑا معلوم ہوتا ہے۔

غزل

بسمل نقش بندی بانسواڑہ
(راجستھان)

خواہشوں کا بوجھ سینے سے جدا کرتے چلیں
صاف ہم بھی اپنے دل کا آئینا کرتے چلیں

روح کو قیدِ عناصر سے رہا کرتے چلیں
حل حیاتِ عارضی کا مسئلہ کرتے چلیں

زیرِ خنجر ایک سجدہ پھر ادا کرتے چلیں
آؤ تازہ قصۂ کرب و بلا کرتے چلیں

ہر قدم دیتے چلیں زندہ دلی کا پھر ثبوت
ہر پریشانی کا ہنس کر سامنا کرتے چلیں

دور کر دیں ذہن سے اپنے پرائے کا تمیز
دوست دشمن سب کو اپنا ہمنوا کرتے چلیں

اس خزاں کے دور میں ذکرِ بہاراں چھیڑ کر
زرد شاخوں میں ہر اک پتا ہرا کرتے چلیں

شیشۂ دل لے کے [illegible] کیوں نہ پتھر کے قریب
کیوں نہ اک [illegible] آشنا کرتے چلیں

جس پہ اے بسملؔ خطاؤں کو بھی پیار آنے لگے
زندگی میں ایک ایسی بھی خطا کرتے چلیں

ضروری اطلاع

میری والدہ ماجدہ شریمتی رام پیاری بیوہ لالہ گنیش داس کتھوریہ ساکن کولاڑھ [illegible] سالہ عمر [illegible] گڑگاؤں (ہریانہ) بتقاضائے عمر و طویل علالت (کینسر) کے دماغی توازن سے محروم ہو چکی ہیں لہٰذا اگر کوئی شخص ان سے کسی قسم کی وصیت یا مکان کے بارے میں کوئی تحریر وغیرہ لکھوائیگا تو وہ قانونی طور پر قابل تسلیم نہ ہوگی، جب تک کہ ہم دونوں بھائیوں کے اس تحریر پر دستخط نہ ہوں والدہ ناخواندہ ہیں انکا نشان انگوٹھا کوئی بھی شخص آسانی سے نیم بیہوشی کی حالت میں یا کسی لالچ کے زیر اثر یا انکی دماغی حالت یکساں نہ ہونے کی وجہ سے باسانی لگوا سکتا ہے، لہٰذا اس تحریر کے ذریعہ ایسی ہر حرکت قابلِ تسلیم نہ ہوگی، فقط [illegible] سرور [illegible]

پنڈت نہرو کی وصیت

پروفیسر شباب اشرف
(دیولا)

اپنے ہم وطنوں سے مجھ کو پیار ملا ہے کچھ اتنا
پیارے سب کچھ اس دُنیا میں ایسی کوئی سوغات نہیں
بہتوں کی تعظیم ہوئی ہے بہتوں کی تعریف ہوئی
مجھ کو یقیں ہے اس دُنیا میں جتنے سال بھی اور جیوں گا
کیا کیا لوگ تھے ساتھ ہمارے کیا کیا کار و بار رہے
میرے مرجانے پہ کوئی دھرم کی رسم ادا مت کرنا
ایک دکھاوا ہے دُنیا میں ان رسموں کو پورا کرنا
میرے مرجانے پہ لوگو میری لاش جلا دینا
راکھ مری محفوظ نہ رکھنا میری وصیت پر چلنا
دھرم کی خاطر راکھ مری یہ گنگا میں ہرگز نہ بہانا
گنگا میری عمر کی ساتھی گنگا سے ہے پیار پرانا
گیت کہانی لوک کتھائیں کیا کیا اس پانی سے جڑی ہیں
اپنی اس پیاری گنگا سے ہار گئی ہے جیت گئی ہے
تہذیبوں کی جان یہی ہے کلچر کی پہچان یہی ہے
گنگا ہمالے کی برفیلی چوٹی یاد دلاتی ہے
کیسے کیسے میدانوں کی مجھکو یاد دلاتی ہے
بھور کی چنچل کرنوں میں یہ ہنس کر رقص دکھاتی ہے
پتلی دھیمی کتنی سُندر جاڑے میں ہو جاتی ہے
چوڑی چکلی اس کی چھاتی ایک سمندر لگتی ہے
گنگا بھارت کے ماضی کی یاد رہی ہے روپ رہی ہے
ماضی کی کتنی ہی رسمیں یوں تو میں نے توڑی ہیں
میری خواہش ہے یہ رسمیں دیش ہمارا توڑ کے رکھ دے
جن سے انساں بندھ جاتے ہیں بے بس ہو کر رہ جاتے ہیں
لاکھ میں چاہوں لیکن کیسے ماضی سے میں کٹ جاؤں
اوروں سی یہ ہنسی میری اس زنجیر کی ایک کڑی ہے
صدیوں کا یہ سرمایہ ہے کیسے اس زنجیر کو توڑوں
میری خواہش ہے اک مٹھی خاک مری گنگا میں بہانا
بچ جائے جو راکھ ہوا میں طیارے سے لے جانا
اپنے دیش کی اس مٹی میں یوں میری مٹی کھو جائے

بس میں نہیں ہے میرے جس کا ذرہ بھر لوٹا دینا
ایسی شے کا لوٹا دینا اپنے بس کی بات نہیں
اتنا پیار ملا ہے مجھ کو رُوح مری ہے جل تھل سی
لوگوں کے اس پیار کی لَو کو ساری عمر نہ بجھنے دوں گا
دکھ سکھ میں یہ سارے ساتھی اپنے ساجھے دار رہے
ان رسموں کا میں نہیں قائل مجھکو ان رسموں سے بچانا
اپنے کو ہے دھوکا دینا اوروں کو ہے دھوکا دینا
جل جائے جب ارتھی میری راکھ مری سنگم پہ لانا
گنگا میں اک مٹھی لے کر میری راکھ بہا دینا
میرے لئے بے مطلب سا ہے ان رسموں کو پورا کرنا
بچپن سے مانوس ہوں اس سے آج بھی اس کا دیوانہ
گنگا کی بہتی لہروں سے صدیاں جیسے بول رہی ہیں
قوموں کی اک یاد گتھی ہے سب کے دل کی پریت گتھی ہے
روز بدلتی ہر دم بہتی پھر بھی گنگا ہی رہی ہے
گہری گہری جنت جیسی گھاٹی یاد دلاتی ہے
جن میں ڈھلی ہے ہستی اپنی ہم کو یاد دلاتی ہے
پُراسرار اُداسی اس پر دن ڈھلتے چھا جاتی ہے
اور گرجتی ہے بارش میں بڑھ کر شور مچاتی ہے
اپنی اس قوت سے ساری چیزوں کو ڈھا سکتی ہے
حال سے ہو کر مستقبل کے ساگر میں یہ بہتی ہے
ان فرسودہ بندھن کی زنجیریں میں نے توڑی ہیں
ریت کی یہ ساری زنجیریں دیش ہمارا توڑ کے رکھ دے
بٹ جاتے ہیں، گھٹ جاتے ہیں، سارے لوگ سمٹتے ہیں
ناز ہے جس میراث پہ مجھ کو کیسے اس سے بٹ جاؤں
جس کی ہے تاریخ پُرانی اتنا نے ماضی سے جڑی ہے
اس میراث کو جاتے جاتے نذرِ عقیدت دیتا جاؤں
تربینی سے ساگر تٹ تک راکھ مری بہ جانے دینا
کام کسان جہاں کرتے ہوں ان کھیتوں میں بکھرانا
پھر نہ الگ ہو پھر نہ جُدا ہو، دیش کا اک حصہ ہو جائے

حیات و فن

محمد خالد عابدی
(اندور)

خلیل رزّاقی اجینی

آپ ۱۹۲۱ء میں اجین میں پیدا ہوئے، اقتصادی حالت خراب ہونے کی وجہ سے آپ ۱۹۲۶ء میں ترکِ وطن کرکے رتلام منتقل ہوگئے تھے۔ خلیل رزاقی نے اپنے تعارف اور اپنی شاعری کے بارے میں مجھے لکھا ہے کہ "رتلام میں میرے ماموں محمد عمر صاحب تبلہ کی ٹرنک فیکٹری تھی ماموں صاحب سٹی کانگریس کے صدر تھے اس وقت یہ کانگریس، "پرجا منڈل" کے نام سے تھی۔ ان کی فیکٹری اور دوکان اس دور کے باغیوں کا مرکز تھی۔ پورے ہندوستان کی طرح ۱۹۴۲ء میں رتلام میں بھی "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک، ان کی رہنمائی میں چلی اور وہ گرفتار ہوگئے۔ اجین سے آنے کے بعد صرف چھٹی جماعت کے بعد میری تعلیم ختم ہوگئی، البتہ وہاں میرا سیاسی ذہن بنا، کچھ حالات سازگار ہوئے اور ہم لوگ واپس اجین آگئے، میرے بڑے بھائی محمد فضل الرحمان، حضرت ساغر چشتی اور حضرت شمیم اجینی کے خاص دوستوں میں سے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی مجھے بھی شاعری کا شوق ہوا اور ٹوٹے پھوٹے شعر کہنے لگا، کبھی چھوٹے چھوٹے افسانے لکھتا"

خلیل رزاقی کا یہ سب کچھ پڑھنا لکھنا خاموشی کے پردے میں ہوتا تھا جب تخلیقات وغیرہ کا پلندہ جمع ہوجاتا تو اُسے ندی میں بہا دیتے تھے۔ ان کی پہلی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی اور کس سے اصلاح لی؟ اس سلسلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"ہندوستان آزاد ہونے کے بعد غالباً ۱۹۴۸ء میں پہلی بار ایک مکمل نظم "امام الہند" کے عنوان سے کہی اور جرأت کرکے حضرت ساغر چشتی کو بغرض اصلاح بتائی نظم دیکھ کر حضرت ساغر بہت خوش ہوئے اور مختصر سی ردو بدل کر اصلاح کردی، کچھ ہی دن بعد حضرت باسط بھوپالی مشاعرے میں شرکت کے لئے اجین آئے ہوئے تھے۔ ایک غزل پر اصلاح ان سے بھی لی اسی دور میں حضرت باسط اجینی سے مشورہ لیتا تھا اس کے بعد حضرت کاشف الہاشمی سے مشورہ لینے لگا، اور یہ کہنے میں قطعاً جھجک محسوس نہیں کرتا کہ آج بھی میں، اکثر و بیشتر حضرت کاشف الہاشمی سے ہی مشورہ لیتا ہوں"

خلیل رزاقی نے ایک ناول "عذرا کا انجام" بھی لکھا تھا اس ناول میں مصنف کا تعارف حضرت باسط اجینی نے دیباچہ، صہبا قریشی نے، مقدمہ عطا الٰہی عطاؔ صدیقی نے اور سلطان احمد صدیقی اور پروفیسر مولانا عبدالقیوم (شعبۂ دینیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے آراء لکھی تھیں۔ صد افسوس کہ آپ کی مسلسل پریشانیوں کے سبب اس ناول کی اشاعت نہیں ہو سکی۔

خلیل رزاقی ایک انقلابی شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں حُبّ الوطنی بھی ہے اور اپنے مُلک ہندوستان پہ مٹنے کا جذبہ بھی۔ ان کی شاعری میں نعرے بازی کی قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ وہ صدقِ دل سے اپنی ذات کا جائزہ بھی لیتے ہیں، ان کا نعرہ اصلاحی پہلو بھی رکھتا ہے ؎

گرتے گرتے بھی سنبھلنا چاہیئے
وقت کے سانچے میں ڈھلنا چاہیئے
نظم کو ہم کو بدلنے کے لئے
پہلے خود ہم کو بدلنا چاہیئے

نمونۂ کلام

کوئی علاج ضروری نہیں ہے تیرگی کے لئے
جلاؤ مشعلِ عرفان روشنی کے لئے
اگر سمجھنا ہے اسرارِ زندگی اے دوست
جگا شعورِ نظر کو بھی آگہی کے لئے

نہیں ہے جن کو ابھی اپنی راہ تک معلوم
کچھ ایسے لوگ بھی آتے ہیں رہبری کے لئے
گلشن میں کھلے نہ بہاروں کا تذکرہ
ایسا نہ ہو گلوں کی ہمیں آنکھ ترسے
دی گئی یوں مجھے سیف و قلم کی دولت
رہنما کوئی وفادار دیا ہو تو بتا
آدمیت کا سبق دینے کو اس کلجگ میں
لے کے بنواس کسی رام کو لانا ہوگا

انقلابات کا پیغام دیا اُردو نے
بادۂ امن کا اک جام دیا اُردو نے
جنگِ آزادی میں اُردو نے سپاہی بن کر
ہم کو آزادی کا انعام دیا اُردو نے

حیات آفریں نغمے سنائے گی دُنیا
کبھی تو گیت محبت کے گائے گی دُنیا
اٹھے گا پردۂ ظلمت نظامِ عالم سے
یقیں ہے جشنِ اخوت منائے گی دُنیا

قمر اُجینی

سید رفیق احمد قمر اُجین میں ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ پی ڈبلو ڈی اُجین میں ملازم ہیں، شاعری سے دلچسپی طالب علمی کے زمانے میں پیدا ہوئی۔ آپ نے اپنا ابتدائی کلام اپنے ماموں بہاض گجوہر تلمیذِ بسمل کو دکھایا۔ انھوں نے برق تخلص تجویز کیا، خاطر خواہ حوصلہ افزائی نہ ہونے کی صورت میں پھر اپنا کلام کسی کو نہیں دکھایا متعدد دواوین اور مطالعہ کتب سے اپنی طبیعت کو ہی استاد بنایا۔

اعجاز صدیقی مرحوم نے سید رفیق احمد قمر اُجینی کے تعارفی خاکہ میں لکھا ہے کہ

چھریرا بدن، لانبا قد، رام پوری وضع قطع، ایک نہایت خوش مزاج نوجوان بہت سی حسرتوں اور بہت سے ارمانوں کو اپنے سینے میں چھپائے ہوئے دل میں داغ ہی داغ، مگر چہرے پر مسکراہٹیں، اُجین کے نوجوانوں میں ایک اچھا اور ممتاز شاعر، اچھا دوست، اچھا کام کرنے والا، قدیم رنگِ سخن سے جدید رنگ کی طرف آنے میں کوشاں، مگر ماحول کا گلہ گزار — وہ کہتا بھی اچھا ہے اور پڑھتا بھی اچھا ہے، اُجین کے شاعرانہ مذاق کو بڑھانے اور وہاں ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنے میں اس کی کوششوں کو بڑا دخل ہے۔"
(جب رخت سفر باندھا۔ ماہنامہ شاعر جنوری ۱۹۵۲ء ص ۵۵)

اور سلطان احمد صدیقی نے سید رفیق احمد قمر، اُجین کے حالات کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ

"آپ کا پہلا کلام غزل سے شروع ہوا، آپ بزمِ ادب اُجین کے ماہانہ اور سالانہ مشاعروں میں شرکت کی آپ کے ہم عمر شاعروں میں کاشف الہاشمی ہیں، آپ نے سب ہی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے مگر غزل کی طرف زیادہ رجحان ہے۔ ایک عرصے مشاعروں میں شرکت سے تنفر اس لئے پیدا ہو گیا کہ آج کل کے شعراء کے کردار سے مطمئن نہیں ہیں، آپ کا کہنا ہے کہ "ہر اچھے شاعر کو صاحبِ کردار بھی ہونا چاہیئے" آپ کا ابتدائی کلام ضائع ہو گیا ہے۔ ایک مجموعہ بنام "افکار" ترتیب دیا ہے۔"

سید رفیق احمد قمر کی شاعری میں ملک و قوم کا درد اور باوقار زندگی گزارنے کا پیغام ہے۔ ان کی شاعری مظلوموں کو پناہ اور مجبوروں کو ہمدردی کا درس دیتی ہے۔

نمونۂ کلام

لطف و کرم کے چاہنے والے غم سے کیوں انکار کریں
پھولوں پر تو ان کا حق ہے جو کانٹوں سے پیار کریں
ہم ہی سہی غدارِ گلستاں لیکن اے اربابِ چمن
جن کو وفا پر ناز ہے اپنی ہم سے تو آنکھیں چار کریں
اور بھی ہوں گے اس دُنیا میں، ہم جیسے دیوانے کیا

دامن جو خوشیوں سے بچائیں اور غموں سے پیار کریں
اُن کو تو ہم اپنا بنائیں جن کو زمانہ ٹھکرا دے
مظلوموں کے آنسو پونچھیں مجبوروں سے پیار کریں

گلستاں پر خزاں کی یورشیں دیکھی نہیں جاتیں
مرے امکاں میں ہو تو جاوداں کردوں بہاروں کو
اے گردشِ دوراں رہنے دے مت چھیڑ الم کے ماروں کو
ہو جائیگا ٹھہرانا مشکل اشکوں کے مچلتے دھاروں کو
اللہ رے دل کی بے تابی جو ہوئے رخصت گلشن سے
پھولوں کو کبھی چوما تو کبھی سینے سے لگایا خاروں کو

تو ہی نہ تمنا مجھے منظور نہیں | بے مہری دُنیا مجھے منظور نہیں
تو قیر سے مرنے کی دُعا کرتا ہوں | تحقیر سے جینا مجھے منظور نہیں

باغباں اپنے نشیمن کا نہیں مجھکو ملال
غم تو اس کا ہے کہ شعلے گلستاں تک آ گئے

غزل

عتیق احمد منظر ہاشمی
(بلاری)

خود نہیں ہے اعتبارِ ہستیٔ فانی مجھے
کیا کروگے سونپ کر اپنی نگہبانی مجھے

بندہ پرور التفاتِ خاص رہنے دیجئے
اب تو راس آنے لگی ہے دل کی ویرانی مجھے

وہ جو مجھ سے دُور بیٹھے ہیں نگاہیں پھیر کر
لگ رہی ہے اُن کی صورت جانی پہچانی مجھے

مجھ کو قدرت نے نوازا ہے متاعِ فقر سے
کچھ نہیں ہے احتیاجِ تاجِ سلطانی مجھے

وہ الٹ دینا نقابِ رُخ سرِ بزمِ ازل
یاد ہے اب تک ترے جلووں کی تابانی مجھے

نزع کے عالم میں اے منظر وہ آجائیں اگر
بارِ خاطر ہی نہ ہو کوئی پریشانی مجھے

غزل

صلاح الدین نفلی خالد
کوٹھی راٹھ سین

سرمایۂ حیات وہ بن کر سنور گیا
لمحہ جو تیری یاد میں ہنس کر گزر گیا
شیرازۂ حیات کچھ ایسا بکھر گیا
خوشیوں سے تنگ آگیا دل غم سے بھر گیا
پوچھو نہ راہِ عشق کی صحرا اور دیاں
ہنس کر کہیں رہ گیا کہیں رو کر گزر گیا
پنہاں ہیں اس میں رازِ محبت کی وسعتیں
وہ اشکِ غم کہ جو سرِ مژگاں ٹھہر گیا
ہر شام ساتھ لائی ہے اک آس دید کی
مایوس کرکے وہ مجھے وقتِ سحر گیا
خالد یہ اس کے حُسن کا احسان ہی تو ہے
اپنا بنا کے وہ مجھے دیوانہ کر گیا

غزل

پروفیسر فرید قریشی سحر اکبرآبادی
(کویت)

آپ آئیں گے تو راحت آفریں آئے گی رات
ورنہ عہدِ رفتہ کی صورت گزر جائے گی رات
آپ گر وعدے پہ آجائیں تو آکر دیکھئے
صبح کی تنویر دامن پر چھپا لائے گی رات
میں جو پلکوں سے تری تصویر پر موتی چھڑکوں
ابرِ نیساں بن کے دُنیا بھر پہ چھا جائیگی رات
خونِ دل کی سرخیاں لے کر شفق رخصت ہوئی
ماتمی کپڑے پہن کر شام سے آئے گی رات
آپ کی وعدہ فراموشی اگر یوں ہی رہی
صبحِ محشر تک مرے حصے میں آجائے گی رات
جب نہ پائے گی ستم مجھکو سراپا اضطراب
کس کے داغِ دل گنے گی خود تڑپ جائیگی رات

ہر ماں اور باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُن کا لاڈلا دُنیا کی آنکھ کا تارا بنے۔ صرف اُن کا ہی نہیں، قوم کا ملک کا بھی نام روشن کرے اور [illegible] کا بوجھ اٹھائے۔ یہ خواہش اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر آپ نے اس سلسلہ میں کیا کچھ کیا ہے۔ اس کی ابتدا پنگوڑے میں کیجئے اپنے لاڈلے کو "ممتا" دیجئے یہ ننھے بچوں کا خاص ٹانک ہے جو ایک ماں کی طرح ان کی حفاظت کرتا ہے۔ جسم میں کیلشیم کی کمی کو دور کر کے ہڈیوں کے ٹیڑھے پن کو روکتا ہے۔ ننھے بے زبان بچوں کو قبض سے نجات دلاتا ہے۔ نزلہ اور زکام میں بھی مفید ہے۔ بچوں کو ہنستا اور تندرست رکھنا ہی "ممتا" کا کام ہے۔ اپنے بچے سے پیار ہے تو اسے "ممتا" ہی دیجئے اور دیکھئے وہ کتنی جلدی جلدی پروان چڑھتا ہے۔

قیمت بڑی شیشی [illegible]

قیمت [illegible] پیسے

شمع (یونانی اینڈ آیورویدک) لیبارٹریز، لال [illegible]

ثقافتِ ہند
نئی دہلی

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ — رجسٹرڈ دہلی نمبر DN/۳۰/۷

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ذرہ ذرہ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
اہل وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ماہنامہ
شان ہند
نئی دہلی

ایڈیٹر
سرور تونسوی

زر سالانہ ۱۸/- روپے
فی پرچہ ۲/- روپے

جلد نمبر ۳۴		مارچ ۱۹۸۲ء		شمارہ نمبر ۳

ہندی کے مسلمان شعراء

۱ - ایک ایسی کتاب جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک نہ تو اردو میں شائع ہوئی ہے نہ ہندی میں۔

۲ - اس کتاب کو پڑھنے سے اردو اور ہندی کے وہ خودساختہ نام نہاد دانشور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اردو اور ہندی کی بقا و حیات کا ضامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے کہ جو کام سرکار سے ہتھیائے ہوئے لاکھوں روپیہ سے نہ ہو سکا اور جو کام اردو اور ہندی کے نام نہاد دانشور آج تک نہ کر سکے وہ ایک فرد واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳ - اس کتاب نے ہندوستانی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کیساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشوونما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی اور ہندی مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہموطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴ - اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی داں لیکھک کا گن گان کرے گا اور ہر اردو داں مصنف کو دعائیں دے گا کہ جس نے اردو ادب کو ایک ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

۵ - ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اکادمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی اردو اکادمیوں کے ذمہ دار ارکان میں شاید غیرت کم ہو اگر اپنا منہ دکھانے لگیں اور ندامت محسوس کریں کہ انہوں نے سرکاری یعنی عوامی کروڑ ہا روپیہ اردو کی اکثر غیر مفید اور غیر ضروری کتابیں شائع کر کے محض اپنوں کو فائدہ پہنچایا اور ہندی کے مسلمان شعراء ایسی بیش بہا اور خالص ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

۶ - آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کی جانچ کیلئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہماری اس تحریر کی حرف حرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کر کے اس کی پوری قیمت واپس لے لیجئے۔ حضرت چندوری نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کیلئے مواد فراہم کرنے اور اس کو ہر پہلو سے مستند بنانے کیلئے فاضل مولف نے ہزارہا کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں کو قربان کر دیا یہ نادر روزگار کتاب "ہندی کے مسلمان شعراء" چھپ کر تیار ہے۔ اپنی فرمائش پہلی فرصت میں بھجوائیے۔ قیمت ۱۰/- روپے علاوہ محصول ڈاک

مزید معلومات کیلئے: دفتر شان ہند، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲ کو لکھئے

دریا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس، چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی اور سرورق پائلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

سماجی انصاف کے ساتھ تیز رفتار ترقی کے لئے

نیا بیس نکاتی پروگرام

اس سمت میں دلی سب سے آگے ہے

شریمتی اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند کی طرف سے ۱۴ جنوری کو نئے بیس نکاتی پروگرام کے اعلان کے فوراً بعد دلی انتظامیہ نے ۱۸ جنوری کو لیفٹننٹ گورنر کی زیر صدارت ایک اعلیٰ سطحی اسٹیئرنگ کمیٹی قائم کی۔ ترقیاتی پروگرام کے ہر سیکٹر میں پھر ایسے منصوبوں اور پروجیکٹوں کی نشاندہی کر کے جو براہ راست اس قومی پروگرام کے تحت آتے ہیں اس طرح ان کے عمل درآمد میں تیزی لانے کے اقدامات کئے گئے ہیں۔

کچھ نمایاں خصوصیات

★ چھٹے پنج سالہ منصوبے کے دوران مزید ۳۵۰۰ ہیکٹر آراضی کی سینچائی اس سال ۷۴۰ ہیکٹر آراضی کی۔ آٹھ ہزار ایکڑ اراضی کی سینچائی کیلئے صاف کئے گئے گندے پانی سے سینچائی کی نئی اسکیم پر عمل درآمد۔ ★ ہر سال دیہی علاقوں میں رہنے والے ۳۰۰۰ غریبوں کو خود انحصاری روزگار شروع کرنے میں امداد ★ زرعی اور صنعتی مزدوروں کی اجرت میں ۲۵ فیصد اضافہ۔ اس سے ۸ لاکھ مزدوروں کو راحت ★ ۱۰۸۰۰۰ ہریجن خاندانوں (۲۷۰۰۰۰ افراد) کے فائدے کے لئے خصوصی کمپونینٹ پلان۔ ہریجن بہبود کی مد کے تحت چھٹے پنجسالہ منصوبے میں ۵۲۳ لاکھ روپے ★ ۱۳۸ گاؤں میں پائپ لائن سے پینے کا پانی دستیاب۔ اگلے سال تمام دیہات میں پینے کا پانی دستیاب ہوگا ★ اس سال دیہی علاقوں میں بے زمینوں کو ۰۰۰ رہائشی قطعے، ۷۵۰۰ رہائشی پلاٹ ہموار کئے جا رہے ہیں جن میں سے ۱۵۰۰ پلاٹ تیار چھٹے منصوبے میں ۷۵۰۰ بے زمین خاندانوں والوں کو مکان بنانے کے لئے مالی معاونت۔ اس سال ۱۵۰۰ کو ★ سال ۸۲-۱۹۸۱ کے دوران ایک کروڑ روپے کی لاگت سے ۱۱۵۰ ٹیوب ویلوں کو بجلی۔ اگلے سال میں بھی اتنی رقم صرف کی جائیگی، ۳۶ ہریجن بستیوں کیلئے بجلی فراہمی کا بندوبست، اب ہی بستیوں کیلئے بجلی کی فراہمی ★ اگلے سال ۳۰ ہزار نسبندیوں کا نشانہ مقرر جب کہ اس سال ۱۵ ہزار ...، دیہی اور خاندانی بہبود کے مراکز کھولے جائیں گے ★ ٹی بی، جذام، بے بصری اور خراب صحت کیلئے جامع اور مربوط اقدامات ★ عوامی تقسیم کاری نظام میں سدھار۔ اب ۲۸۶۰ مناسب دام دکانیں، ۳۰۰ مٹی کے تیل اور ۱۸۲ کوئلے کے ڈپو ★ دستکاریوں کے سیکٹر میں ۸۱-۱۹۸۰ء میں ۵۰ء۱۱ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۵ لاکھ روپے اسی طرح دستی کرگھوں میں رقم ۴۴ء۱۶ لاکھ روپے سے بڑھ کر ۲۳ء۳۴ لاکھ روپے کر دی گئی ہے ★ ماں اور بچے کی دیکھ بھال کیلئے چار بہبودی ادارے ۳۸ کام کاجی مراکز، ۴۶ زچگی و طفل بہبودی مراکز، ۴۱ بچوں کے ادارے، ۱۱ ڈے کیئر سینٹرز کام کر رہے ہیں۔ میونسپل کمیٹی کی طرف سے ایک لاکھ سے زیادہ اور نئی دلی میونسپل کمیٹی کی طرف سے بھی طلبا کو دوپہر کا کھانا اس کے علاوہ خصوصی تغذیہ بخش پروگرام کے تحت ۹۶ ہزار بچوں، ۱۷ ہزار عورتوں کیلئے تغذیہ بخش خوراک کا بندوبست ★ چھ تا گیارہ سال عمر والے زمرے میں آنے والے سبھی بچوں کیلئے ابتدائی تعلیم کا انتظام۔ ۱۲ تا ۱۴ سال عمر والے زمرے میں آنیوالے بچوں میں ۸۰ فیصد بچے مڈل اسکولوں میں زیر تعلیم ہیں باقاعدہ اسکولوں میں داخلہ نہ لے سکنے والوں کیلئے جز وقتی اسکولوں کا انتظام۔

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و اشاعت / دلی انتظامیہ دلی

ڈی آئی پی/پلان - ۸۲/۶

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

کیا اردو کانفرنس اردو کے مسائل کا حل ہے؟

اردو کی آڑ میں حکومت اپنے ووٹوں کی حفاظت چاہتی ہے ۔ اور کچھ لوگ اپنے حلوے مانڈے کا انتظام ۔ اور دونوں اپنے اپنے ارادوں میں کامیاب و کامران اور بیچاری اردو زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میرے نام پر اپنی کرسیوں کو محفوظ رکھنے والو اور میرے نام پر دال روٹی کھانے والو کچھ تو خدا سے ڈرو ۔ اردو پرست عوام ہیں کہ حکومت نے اگر کوئی اعلان اردو کے حق میں کر دیا تو خوشی سے بغلیں بجانے لگتے ہیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ محض اعلان ہی اعلان ہے ۔ اور اردو کے نام پر دال روٹی کھانے والوں نے انہیں الّو بنانے کیلئے یہ ڈھونگ رچا رکھا ہے کہ کبھی کل ریاستی اردو کانفرنس ہوتی ہے تو کہیں کل ہند اردو کانفرنس اور یارانِ تیز گام عالمی اردو کانفرنس بھی کر گزرتے ہیں ۔

حال ہی میں چندی گڑھ میں عالمی اردو کانفرنس ہوئی ، یہ ون مین شو تھا یعنی سردار دستگیر نے تن تنہا یہ کانفرنس منعقد کی ۔ یار لوگوں کا کہنا ہے کہ اس عالمی اردو کانفرنس کی آڑ میں دستگیر صاحب نے پچاس ہزار روپیہ کمایا کوئی ایک لاکھ کہہ رہا ہے ۔ محتاط حضرات کا کہنا ہے کہ دستگیر صاحب نے بیس ہزار روپیہ کمایا ۔ خدا کرے یہ سچ ہو اور ہمارے دوست دستگیر صاحب نے واقعی کچھ روپیہ کما لیا ہو ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دستگیر صاحب نے ملک بھر کے امرا ، رؤسا اور اردو کے نام پر شہرت چاہنے والے حضرات سے اپنی اس عالمی اردو کانفرنس کیلئے مالی مدد کیلئے خطوط لکھے تھے (ایک ایسا خط ہماری نظر سے بھی گزر چکا ہے) مگر انہیں عالمی اردو کانفرنس کے نام پر کس قدر روپیہ مل سکا یہ وہی جانتے ہیں اور یہ بھی کیا پتہ کہ انہیں اپنی گرہ سے ہی کچھ دینا پڑا ہو ۔ کیونکہ اردو پرست عوام اردو کے رسائل اور کتابیں تو خرید کر پڑھتے نہیں عالمی اردو کانفرنس کے نام پر وہ کیا دیں گے ۔ ان کچھ ہو ؟

آسامیوں نے ذاتی شہرت کیلئے یا کوئی مفاد حاصل ہونے کی امید میں [illegible] کی ہو تو یہ بات قابلِ قبول ہو سکتی ہے ۔

اب حیدر آباد میں کل ہند اردو کانفرنس ہو چکی ہے ۔ یہ کانفرنس انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام ہوئی ۔ اردو کی بقا و حیات کی سب سے زیادہ ذمہ داری انجمن ترقی اردو کی ہے مگر اس انجمن نے اپنی ذمہ داری کا احساس کس حد تک کیا اور اپنا فرض کہاں تک نبھایا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ۔ حیدر آباد کی انجمن ترقی اردو کے بارے میں سنا ہے کہ وہ فعال ہے ۔ خدا کرے واقعی ایسا ہو ۔ مگر مرکزی انجمن ترقی اردو کی کارگزاری ایسی نہیں کہ جس پر کوئی بھی اردو پرست فخر کر سکے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جناب خلیق انجم صاحب نے اردو گھر کی تعمیر و تکمیل میں جو ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے اس کی مثال نہیں ہے مگر اردو کی بقا و حیات کیلئے مرکزی انجمن سے جو امیدیں وابستہ تھیں وہ پوری نہیں ہو سکیں ۔ مرکزی انجمن ترقی اردو کو جو سرکاری گرانٹ ملتی ہے وہ کچھ ایسے از کار رفتہ ملازمین کی بھاری بھر کم تنخواہوں کی نذر ہو جاتی ہے جو اگر اس انجمن کی بجائے کہیں اور ملازمت کرتے تو انہیں اس مہنگائی کے زمانے میں بھی کوئی تین صد روپیہ ماہانہ سے زیادہ پہ ملازم نہ رکھتا ۔ گویا یہاں بھی روزی روٹی کا ہی معاملہ ہے ۔

رہ گیا اردو اکاڈمیاں تو اگر اس گندگی کا پوسٹ مارٹم کیا جائے تو بہتر ہے ۔ یہ تو بنائی ہی اس لئے گئی ہیں کہ کچھ اردو والوں کی طرف لقمہ ہائے تر پھینکنے سے ہندوستانی مسلمان خوش رہیں گے کہ حکومت نے ہر ریاست میں اردو اکاڈمی کھول رکھی ہے ۔ ورنہ نہ تو اردو کی ترقی و اشاعت ان کا مقصد ہے اور نہ ہی اردو کی بقا و حیات ان کے بس کی بات ہے ۔ ترقی اردو بیورو نے واقعی کچھ ایسی کتابیں اردو میں شائع کی ہیں جن پر اردو والوں کو فخر ہونا چاہئے ۔ مگر ان کتابوں کو کتابوں کی دکانوں [illegible]

[illegible]

تعداد یوں کو پڑھنے والے ہی نہ ہوں گے تو ترقی اُردو بورڈ کی بہترین سے بہترین مطبوعات کا کیا مقصد رہ جاتا ہے۔ بہار اور یوپی میں جزوی طور پر اُردو کو ریاست کی دوسری زبان قرار دے دیا گیا ہے مگر یہ پوچھنے والا کوئی نہیں کہ اُردو پڑھنے والے طالب علم کتنے ہیں۔ جب بچے اُردو پڑھیں گے ہی نہیں تو اُردو کی بقا و حیات یا اُردو کی ترقی محض اُردو کانفرنسوں سے کیسے ممکن ہے۔

دہلی۔ یوپی یا بہار میں جن اسکولوں میں اُردو ذریعہ تعلیم ہے اُن کی یہ حالت ہے کہ پڑھانے والوں کو اُردو پڑھانے کے نام پر سرکاری خزانہ سے تنخواہ تو ملتی ہی ہوگی مگر یہ اندازہ لگانے کی کسی نے ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ اُردو پڑھنے والے طلبا ہیں کتنے!

حکومت خواہ مسلمانوں کی ووٹیں محفوظ کرنے کے لئے یا اقلیتوں کے مفاد کے لئے اُردو کیلئے کچھ نہ کچھ کر رہی ہے مگر یہ مت بھولئے کہ اُردو کی لاش کا جنازہ اُردو اکاڈمیوں، انجمن ترقی اردو، اردو کی روٹی کھانے والوں اور اُردو کے مسلمان دانشوروں کے کندھوں پر ہے۔ ضرورت ہے کہ بہار، یوپی اور دہلی کی حکومت اپنے ماہرین تعلیم کو مہاراشٹرا اور مدراس بھجوائے تاکہ وہ دیکھ کر آئیں کہ وہاں اُردو کی حالت اسکولوں میں بہتر کیوں ہے۔ تاکہ وہی طریقے یہاں پر بھی آزمائے جائیں۔

یہ بالکل بھول جائیے کہ اردو کانفرنسوں سے کچھ ہونے والا ہے۔ خواہ اس میں نائب صدر جمہوریہ تقریر فرمائیں یا کسی ریاست کا وزیر اعلیٰ۔ اُردو کو اگر آپ ہندوستان میں زندہ دیکھنا اور زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو حکومت سے کہئے کہ وہ اُردو کو ابتدائی اسکولوں میں پڑھانے کا انتظام کرے اور ہم سب اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کیلئے اسکولوں کے سربراہوں پر زور دیں کیونکہ جب تک ابتدائی اسکولوں میں اُردو پڑھائی ہی نہیں جائیگی تو پھر وہ نسل جو اُردو جانتی ہے اس کے بعد اُردو کے خطوط بھی پڑھنے والے مشکل سے ملیں گے۔ اس پر بغلیں مت بجائیے کہ بہار اور یوپی نے اُردو کو کچھ اضلاع میں جزوی طور پر اردو کو دوسری زبان تسلیم کر لیا ہے جب تک اسکولوں میں ابتدائی طور پر اُردو کی تعلیم جاری نہ ہوگی اُردو کسی بھی دوسرے طریقہ سے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُردو کانفرنس محض حکام اعلیٰ، وزرا اور نائب صدر مملکت کی نظروں میں سمانے کیلئے کی جاتی ہیں۔ یار دوستوں کو عنایات کا بہانہ بنایا جاتا ہے یا اردو کے نام پر مفت کی واہ واہ وصول کرنے کیلئے۔ اس لئے ہم حیدرآباد کی اس اُردو کانفرنس کو کامیابی کی مبارکباد تب ہی پیش کریں گے جب اس کے داعی اپنے منصوبوں کی تکمیل کی عملی شکل عوام کے سامنے پیش کر سکیں گے۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری سے سلسلۂ خط و کتابت تو ایک عرصے سے تھا مگر انہیں میں نے پہلی بار دیکھا جشنِ جمہوریت کی اولین تقریب کے مشاعرہ میں۔ جمہوریت کا یہ پہلا جشن ۱۹۵۰ء میں لال قلعہ میں منایا گیا جو تین دن تک چلتا رہا۔ ایسا جشن پھر ۳۲ سال میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ کنور مہندر سنگھ بیدی جشنِ جمہوریت کی انتظامی کمیٹی کے سربراہ تھے لہٰذا پروگرام ایسا بہترین رہا کہ شاہجہاں سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک کی روحیں خوش ہو گئی ہوں گی۔

اردو مشاعرہ میں ملک کے ہر حصے سے مشہور اور نمائندہ شاعروں کو مدعو کیا گیا۔ اس مشاعرہ میں اس وقت کے وزیر اعظم اور عوام کے دلوں کے بادشاہ پنڈت جواہر لال نہرو معہ اپنی ہمشیرہ وجے لکشمی اور اپنی بھانجی نینا کے ہمراہ تشریف لائے۔ پنڈت دتاتریہ کیفی، حضرت بیخود دہلوی، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت فراق گورکھپوری، حضرت سراج لکھنوی، جناب قدیر لکھنوی، حضرت نوح ناروی، جناب احمق پھپھوندوی، حضرت جگر مراد آبادی۔ غرضیکہ ملک کا ہر مشہور اور ممتاز شاعر اس مشاعرہ میں موجود تھا۔ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست دہلی نے خود راقم الحروف کو اس جشنِ جمہوریت کی رپورٹنگ کیلئے حکم فرمایا لہٰذا یہ رپورٹنگ ریاست کی تین مسلسل اشاعتوں میں شائع ہوئی اور اتنی مقبول ہوئی کہ آپ کا یہ نیازمند ادبی اجتماعات کی رپورٹنگ کے لئے ایک موزوں رپورٹر سمجھا جانے لگا۔

اس مشاعرہ میں شراب تو کئی شاعروں نے پی رکھی تھی مگر فراق گورکھپوری اسٹیج پر یوں لائے گئے جیسے کسی حادثے کی زد میں آ جانیوالے کو بے ہوشی کی حالت میں ایمرجنسی وارڈ میں لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس مشاعرے میں پنڈت نہرو ایسی شخصیت جلوہ افروز ہو تو وہاں کیسے کیسے لوگ سامعین میں رہے ہوں گے اور پنڈت جی کے ہمراہ کیسے کیسے ممتاز و مخصوص حضرات تشریف لائے ہوں گے۔ مگر مشاعرہ شروع ہوئے ابھی کچھ ہی وقت ہوا تھا کہ فراق جی نے اسٹیج پر ہی پیشاب کر دیا۔ منتظمینِ مشاعرہ کنور مہندر سنگھ بیدی، مہاراج بہادر، جناب ساحر ہوشیارپوری وغیرہم نے فراق صاحب کی اس "انفرادی" شان پر پردہ ڈالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اسٹیج پر بیٹھے کئی نازک مزاج اور ممتاز شعرائے کرام کے چہروں سے جو نفرت اور رنج کا اظہار ہو رہا تھا وہ فراق صاحب کی کثرتِ شراب نوشی کے اس نتیجے کا زبانِ حال سے کھلا کھلا ہی گیا۔ اور اس صورتِ حال کا علم پنڈت نہرو کو بھی ہو گیا۔

میرے دل و دماغ میں جناب فراق گورکھپوری کا جو تصور کئی سالوں سے پل رہا تھا فراق صاحب کی یہ حالت دیکھتے ہی نہ جانے کہاں گم ہو کر رہ گیا اور میرے لئے یہ ایک حادثہ تھا جس سے پہلے میں کبھی دوچار نہیں ہوا تھا۔ پنڈت نہرو نہایت اطمینان سے تشریف فرما رہے۔ نقیبِ مشاعرہ نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے مائیک اٹھا کر فراق صاحب کے سامنے رکھ دیا تاکہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے کلام سنا دیں۔ ویسے عام شعرا تو مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر کلام سنا رہے تھے کیونکہ کئی ہزار سامعین کا مجمع بہت دور تک پھیلا ہوا تھا اور جب تک شاعر مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر کلام نہ سناتے سامعین شاعر کو دیکھ نہ سکتے تھے۔ اناؤنسر نے اعلان فرمایا کہ فراق صاحب کی طبیعت کافی ناساز ہے اس لئے وہ بیٹھ کر ہی کلام سنائیں گے۔ اس دن سے میرے دل میں فراق کی وہ عظمت نہ رہی جسے میرے دل و دماغ پر چھانے میں ایک عرصہ لگا تھا۔

جناب ڈاکٹر ہیرا لال صاحب چوپڑہ نے کلکتہ سے لکھا کہ کلکتہ کی ایک مارواڑی سنستھا (ادارہ) اردو کا مشاعرہ کرانا چاہتی ہے لہٰذا آپ جوش، فراق، جگن ناتھ آزاد اور دوسرے کچھ شعرا کو کلکتہ اس مشاعرے میں لائیے۔ جوش صاحب اور آزاد صاحب دونوں دہلی میں تھے ان سے بالمشافہ منظوری حاصل کرنے کے بعد فراق صاحب کو خط لکھا تو جواب میں منظوری تو موصول ہوئی مگر ایسی شرائط کے ساتھ کہ مجھے ان شرائط کے بارے میں کلکتہ فون سے بات کرنی پڑی اور چوپڑہ صاحب نے فرمایا کہ آپ ان حضرات کو جیسے بھی ہو کلکتہ لے آئیے۔

یہ مشاعرہ کلکتہ کے ایک مندر میں تھا اور شام کے چار بجے سے آٹھ بجے

تک ہی اس کیلئے وقت مقرر کیا گیا تھا۔ فراق صاحب نے شراب نوشی مندر کی سیڑھی پر بیٹھ کر کی اور وہ اُدھم مچایا کہ سامعین میں جو خواتین تشریف رکھتی تھیں ان میں سے ایک خاتون روتی ہوئی اٹھ کر مشاعرہ سے چلی گئیں جو کہ فراق صاحب کی صاحبزادی تھیں اور اپنے لڑکوں لڑکیوں کی عورتوں کو مشاعرہ میں ساتھ لائی تھیں تاکہ یہ خواتین بھی ان کے والد محترم کا کلام سن لیں مگر جب فراق صاحب کو سٹیج پر شراب پی کر مستی بلکہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ازار بند لٹکائے مائیک پر کلام سناتے دیکھا اور عشق نیز حسن کے سراپا میں ننگے پن کی رباعیات سنیں تو وہ اپنے باپ کی اس قابلِ رحم یا قابلِ نفرین حالت کو دیکھتے ہوئے روتی ہوئیں مشاعرہ سے اٹھ کر چلی گئیں

مدراس۔ رتلام۔ گورکھپور۔ بمبئی۔ لدھیانہ۔ دہلی۔ دہرہ دون بنارس اور دیگر مقامات پر قریباً تیس مشاعروں میں میرا اور فراق صاحب کا ساتھ رہا۔ مگر ہر مشاعرہ میں انھوں نے شراب نوشی کو مقدم سمجھا۔ ایک مقام پر ڈرائی ایریا کی وجہ سے منتظمین کا کہنا تھا کہ مشاعرہ گاہ میں اگر کسی شرابی شاعر کو پولیس نے پکڑ لیا تو بدنامی ہوگی اس لئے تمام شراب کے رسیا شاعروں سے التجا کی گئی کہ وہ مشاعرہ گاہ میں شراب پی کر نہ چلیں، ہاں مشاعرہ کے بعد اپنی قیام گاہ پر جس قدر چاہیں شراب پی لیں۔ باقی شعرا نے تو موقع کی نزاکت یا معاوضہ کے لالچ میں یہ شرط مان لی مگر فراق صاحب نے مشاعرہ میں جانے سے انکار کر دیا اور جب کوئی بھی دلیل یا گزارش انھیں قائل نہ کر سکی تو منتظمین مشاعرہ کو اعلان کرنا پڑا کہ فراق صاحب کی طبیعت ناساز و خراب ہے اسلئے وہ مشاعرہ گاہ میں تشریف نہ لا سکیں گے۔

میں نے انھیں جگر۔ جوش۔ یگانہ چنگیزی۔ آغا طاہر نبیرہ محمد حسین آزاد۔ نازر لکھنوی۔ وقار ترپاکیمنی اور دیگر درجنوں اساتذہ سے علمی اور شعری مسائل پر بحث کرتے سنا مگر جس انداز سے صحیح یا غلط بحث کرتے تھے وہ بانکپن کسی دوسرے شاعر میں نہ دیکھا۔ جوش صاحب حاضر جوابی میں طاق تھے مگر بحث میں فراق کے سامنے ان کا بھی دریا نہیں چلتا تھا۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ فراق کا واسطہ ساری عمر لٹریچر سے رہا اس لئے مطالعہ اور تعلیم میں وہ جوش صاحب سے کہیں آگے تھے اور انگریزی میں تو وہ جوش صاحب سے اس قدر فزوں تر تھے کہ انھیں انگریزی پڑھا سکتے تھے۔

حاضر جوابی۔ برمحل اشعار سُنانا۔ اردو۔ ہندی۔ سنسکرت۔ انگریزی میں اچھی شدھ بدھ رکھنے، حسن اور عشق کا سراپا بیان کرنے نیز غلط یا صحیح حوالے دینے میں کوئی بھی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا خواہ وہ کسی بھی قد کا کیوں نہ ہو۔

مشاعروں میں اکثر اساتذہ اپنے شاگردوں کے کلام پر داد دینے میں بخل سے کام نہیں لیتے مگر دوسرے شعرا خصوصاً بتدی اور اوسط درجہ کے شاعروں کو قطعاً داد نہیں دیتے۔ مگر فراق میں یہ بات نہیں تھی انھیں جب بھی کوئی اچھا شعر سنائی دیا تو انھوں نے دل کھول کر داد دی۔ گورکھپور کے مشاعرہ میں جب انھوں نے یہ شعر سنا ؎

هم جانتے ہیں گردشِ شام و سحر کا حال
گزری ہے عمر گردشِ شام و سحر کے ساتھ

تو فرمانے لگے ارے تم سے یہ شعر ہو کیسے گیا۔ ان کا یہ فرمانا تھا سامعین نے انتہائی داد و ستائش کے ساتھ شاعر سے یہ شعر سُنا۔

کلکتہ میں مَیں نے ان سے پوچھا کہ فراق صاحب دن کو تو اچھے بھلے ہوتے ہیں اور دانشوری کی جملہ صفات آپ میں بدرجۂ اتم دکھائی دیتی ہیں اور آپ کی زبان سے نکلا ہوا لفظ لفظ اکثر دانشوروں کو دانشوری کی راہ دکھلانے کے اہل ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ شراب پینے کے بعد اپنی تمام ہوش مندی کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو انگریزی کی ایک ضرب المثل سناتے ہوئے اور آنکھوں کی پتلیوں کو اپنی روایتی شان سے گھماتے ہوئے کہنے لگے میاں ہر ہوش مند کے تحت الشعور میں غیر ہوش مندی کا عنصر ہوتا ہے جس کا اظہار کسی صورت ہوتا ہی ہے۔ اور اگر کوئی جینیس یا انٹلکچوئل جنسی بے راہ روی پر گامزن نہیں تو وہ قطعاً مجبور ہوتا ہے اور یا پھر کسی بھی عام اُلو کے پٹھے کی طرح ہوتا ہے۔ فراق صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ جیسے جنسی بے راہ روی یہ ہمارے ہاں ہی ایسا سمجھا جاتا ہے یورپ یا ایشیا کے دوسرے ملکوں میں اسے بُرا نہیں سمجھا جاتا بلکہ کسی بھی شخص کا ذاتی عمل۔ عرض کیا گیا کہ فراق صاحب آپ ویدوں تک کے فرمودات کو اپنے کلام میں ڈھالتے ہیں اور ہندوستان کی قدیم روایات کی قدر کرتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ جنسی بے راہ روی کو آپ صحت۔ فراق صاحب

قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ معاشرہ پر اس کا اثر بد کیونکر ہو سکتا ہے۔ تو ذرا تلخ و غصہ بھری آواز میں آنکھوں کی پتلیوں اور چہرے کو مختلف زاویوں پر گھماتے ہوئے فرمانے لگے سرور صاحب آپ ...ید دل کے زمانے اور بصارت کی قدیم روایات کو کیا سمجھیں گے نئی ...پ کو ان ریشیوں منیوں اور بزرگوں کی جنسی بے راہ روی کی سیکڑوں مثالیں دے سکتا ہوں جنہیں آپ پوجتے ہیں۔ اور اس کے بعد انھوں نے ایک کے بعد ایک ایسے ایسے واقعات سنائے کہ ان کے مطالعہ اور حافظہ کی داد دیتے بنی۔

میری ان سے آخری ملاقات دوسری کل ہند غیر مسلم اردو ...رائٹرس کانفرنس کے موقعہ پر لکھنؤ میں پچھلے برس ہوئی۔ اچاریہ دھرمیندر ...ناتھ اور مجھے مسلم مسافر خانہ (جہاں کانفرنس کے مندوبین کے قیام کا ...ت اچھا انتظام تھا) سے پرنس انجم قدر اپنے ہوٹل لے گئے اور وہیں ...مارے قیام کا انتظام کرا دیا۔ دوسرے دن صبح پرنس انجم قدر صاحب نے بتایا کہ فراق صاحب بھی تشریف لائے ہیں اور ہمارے کمرے ...ملحق کمرے میں قیام فرما ہیں۔ میں فوری طور پر فراق صاحب کے ...حاضر ہوا تو شیام کرشن نگم بھی تشریف فرما تھے دونوں کے سامنے ...کی کے گلاس رکھے تھے۔ نگم صاحب نے فراق صاحب کے ساتھی سے ...ر بھائی سرور صاحب کیلئے گلاس لائیے۔ میں نے معذرت چاہی تو ...ق فرمانے لگے نگم صاحب یہ اب ہماری برادری سے نکل گئے ہیں۔
...ق صاحب کی حالت قابل رحم تھی انھیں بستر پر ہی پیشاب اور پاخانہ ...یا جاتا تھا۔ ٹانگیں مفلوج ہو چکی تھیں مگر آواز میں وہی کڑک ...موں میں وہی چمک۔ برمحل اشعار کا وہی تانتا۔ اور گفتگو میں ...ح کا پہلو پہلے سے زیادہ تھا۔ کانفرنس کے کھلے اجلاس میں جو ...ں نے تقریر فرمائی، وہ تقریر کیا تھی، اردو کا پورا مقدمہ تھا جو انھوں نے دلائل و براہین کے ساتھ ایسے دل نشین انداز میں ...ن فرمایا کہ سامعین بار بار عش عش کر اٹھے۔

جوش سے ساری عمر ان کی چشمک رہی مگر اس چشمک میں ...ر بدنامی۔ بدخواہی یا نیچا دکھانے کے سفلی جذبات کا دور دور ...نام ونشان نہیں تھا۔ فراق اب اس دنیا میں نہیں رہے اور ...چلے میں بھی انھوں نے اپنی چشمک کو بھلایا نہیں اور جوش ...کو پیچھے عالم جاودانی کو سدھارے تاکہ زبان کبھی فرقو ...بی کی خوشگوار چشمک جاری رہے۔ رہے نام اللہ کا۔

باب انتقاد

ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر

سحر دہلوی

ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵-۱۱۰۰ نے ایک خصوصی شمارہ ڈاکٹر سید عابد حسین نمبر شائع کیا ہے ڈاکٹر عابد حسین کا اسم گرامی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معماروں کی صف اول میں آتا ہے اور جس تندہی اور دیانت کے ساتھ انھوں نے جامعہ ملیہ کے ارتقائی منزلوں میں اپنے عملی کردار کا ثبوت دیا اسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا۔ ڈاکٹر عابد حسین نہ صرف ایک عالم، معلم، دانشور، مصنف بے نظیر مترجم کی حیثیت سے ہی ممتاز تھے بلکہ وہ ایک اچھے انسان کی جملہ صفات کے مالک تھے یہ خصوصی شمارہ پندرہ (۱۵) اہل قلم حضرات کی ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو نذر عقیدت کا گلدستہ ہے اور ہر مضمون نگار نے مرحوم کی کسی نہ کسی خوبی کا تذکرہ خوب سے خوب تر انداز میں تحریر فرما کر اس خصوصی شمارہ کو ایک یادگاری حیثیت دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب کی یہ یادگار ہر لائبریری میں محفوظ کئے جانے کے قابل ہے۔ ضخامت ۱۵۶۔ قیمت سولہ روپیہ۔ کتاب نما کے مستقل خریداروں سے بارہ روپیہ

فکر و شعور

جناب کوثر چاندپوری نہ صرف ایک ممتاز اور منفرد افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ ادبی، علمی اور تنقیدی مضامین میں بھی ایک خاص طرز نگارش رکھتے ہیں حال ہی میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے اپنے اشاعتی منصوبے کے تحت جہاں اور بہت سی بہترین کتابیں شائع کی ہیں وہاں جناب کوثر چاندپوری کے پندرہ علمی۔ ادبی اور تنقیدی مضامین کے مجموعہ "فکر و شعور" کی اشاعت یقیناً اردو اکادمی مدھیہ پردیش کے متعلقہ کارکنان کی بیدار مغزی اور ایک اہم ضرورت کے احساس کا یقین دلاتا ہے۔ فکر و شعور میں قبلہ کوثر صاحب نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا ہے اسکے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے آجکل کچھ مسلمان ادیب اپنی فطری کمینگی اور فرقہ پرستی کی آگ میں جلتے ہوئے منشی پریم چند کے بارے میں عجیب و غریب قسم کی بکواس کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور اسی قماش کے کچھ رسائل و جرائد کے مدیران کرام محض چند پیسے زیادہ فروخت ہونے کے لالچ میں ایسی بکواس چھاپ ...

(بقیہ ص۱۷ پر)

طلوعِ اقبال

محمد عبد اللہ قریشی

۱۸۹۸ء میں بھاٹی دروازہ لاہور بازار حکیماں کے مشہور حکیم
جاع الدین محمد نے انجمنِ اتحاد قائم کر کے ہفتہ وار مشاعروں کی طرح
لی موصوف بہت بڑے طبیب، فلسفی اور ادیب و شاعر سخن فہمی
سخن گوئی دونوں میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے "خزینۂ حزینہ"
اہلبیت علیہم السلام کے مرثیوں کا مجموعہ اور "داغِ ہجراں" اشعار
دیوان ان کی شاعری کی یادگار ہیں۔ انہوں نے اُردو زبان کی
روز افزوں ہر دلعزیزی سے متاثر ہو کر فارسی اور عربی میں شعر کہنا
ترک کر دیا اور یہ اردو بزم مشاعرہ قائم کی حکیم احمد شجاع انہی کے فرزند
اس بزم کے مشاعرے حکیم امین الدین بیرسٹر ایٹ لا کے مکان پر
ہوتے تھے اور جو کلام یہاں پر پڑھا جاتا تھا وہ "شورِ محشر" میں شائع
کیا جاتا تھا۔ طرحی غزلوں کا یہ گلدستہ ہر ماہ خان احمد حسین خان
ادارے میں اس انجمن کی طرف سے طبع ہوتا تھا۔ خان احمد حسین خان
مجلس کی روحِ رواں تھے۔ وہ ایک ممتاز ناول نویس، ادیب
شاعر تھے، انھوں نے بعد میں اپنا رسالہ "شباب اردو" جاری
جو بہت مقبول ہوا، وہ عاشقانہ اور طرزِ جدید دونوں میں حق شعر گوئی
ادا کرنے پر قادر تھے اور شاہزادہ مرزا ارشد گورگانی کے ارشد ترین
تلامذہ میں شمار ہوتے تھے۔ یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو لاہور میں انتقال
انتقال کے وقت ان کی عمر نوّے برس کے لگ بھگ تھی، آپ نے
بیش ساٹھ برس اردو ادب اور صحافت کی خدمت کی اور سیکڑوں
کتابیں تصنیف فرمائیں۔

مرزا ارشد گورگانی دہلوی خاص اس مشاعرہ میں شرکت کے
فیروز پور سے لاہور آیا کرتے تھے۔ وہ وہاں مدرس تھے، ان کے
شاگرد بھی اچھی خاصی تعداد میں شریک ہو کر مجلس کی رونق بڑھاتے
یہ سب دہلی دبستان کے پیرو تھے۔!

میرزا ناظم حسین ناظم لکھنوی مالک و مدیر اخبار "ناظم الہند"
لکھنؤی زبان کے دلدادہ تھے ان کے بھی بہت سے شاگرد اس مشاعرہ

میں شامل ہوتے تھے۔ بقول حکیم احمد شجاع دونوں کی ٹولیاں جب اس
بزم مشاعرہ میں اپنا اپنا رنگ جمانے کے لئے مصروفِ غزل خوانی
ہوتی تھیں، تو لوگوں کی آنکھوں کے سامنے انیس اور دبیر کی
رقابت کا نقشہ کھنچ جاتا تھا لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی
میر اور مرزا ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھے اور اس زمانے
میں بھی پنجاب کے شعرا میر اور مرزا ہی کے زیرِ قیادت میدانِ
سخن طرازی میں ایک دوسرے سے مصروفِ پیکار رہتے، بہرحال
اس بزم کی رونق اسی ہنگامے پر موقوف تھی اور جب تک یہ
ہنگامہ جاری رہا "شورِ محشر" قیامت برپا کرتا رہا"۔

(خوں بہا ص ۱۹۰)

اس مجلس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں ہر مذہب اور
ہر خیال کے شاعر اور سخن فہم بلاتفریق مذہب و ملت شریک ہوتے
تھے۔ کالجوں کے نوجوان طالب علم بھی شعر گوئی اور شعر فہمی کے شوق
میں چلے آتے تھے اور سخن دانی کی داد لینے اور دینے میں کسی سے پیچھے
نہ رہتے تھے۔ ان نوجوان مشتاقانِ سخن میں اقبال بھی تھے۔
حکیم احمد شجاع صاحب اپنی کتاب "خوں بہا" میں لکھتے ہیں :

"سر محمد اقبال نے جو اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور
میں پڑھتے تھے، اپنی پہلی غزل اسی مشاعرہ میں پڑھی
اتفاق کی بات ہے کہ جس سال میں پیدا ہوا اسی سال
اقبال نے اسی مشاعرے میں وہ شعر پڑھا جس کا
چرچا بہت دیر تک اربابِ ذوق کے حلقوں میں رہا۔
ان کا یہ شعر اب تک پرانے لوگوں کی زبان پر جاری ہے :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اس واقعے کے بیس برس بعد سر محمد اقبال نے
ایک دن مجھ سے کہا تم اور میری شاعری ہم عمر ہو

دونوں کی جوانی سدا بہار ہے"

یہ بیان نیرنگ داستان کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر مجھے اس کے صحیح تسلیم کرنے میں کسی قدر تامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حکیم صاحب نے اپنی پیدائش کی تاریخ یکم صفر المظفر ۱۳۱۲ھ بتائی ہے جو مطابق ہے ۱۸۹۴ء کے اس وقت اگرچہ لاہور میں مشاعرے ہوتے تھے مگر اقبال ابھی سیالکوٹ ہی میں زیر تعلیم تھے۔ وہ سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے ایف اے پاس کرنے کے بعد ۱۸۹۵ء کے اواخر میں لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے بی۔ اے کا امتحان ۱۸۹۷ء میں پاس کیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ۱۸۹۵ء یا ۱۸۹۶ء سے پہلے لاہور کے کسی مشاعرے میں شریک نہیں ہوئے۔ جہاں تک اقبال کے اپنے بیان کا تعلق ہے وہ درست معلوم ہوتا ہے کیوں کہ انھوں نے ۱۸۹۳ء کے لگ بھگ سیالکوٹ میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے اور اس لحاظ سے ان کی شاعری اور حکیم صاحب ہم عمر تھے اور دونوں کی جوانی سدا بہار ہے۔

اقبال اپنے کالج کے دوستوں کی تحریک پر پہلے پہل ۱۸۹۶ء کے کسی مشاعرے میں شریک ہوئے اس کے بعد برابر شریک ہوتے رہے۔ چنانچہ ایک طرحی مشاعرے میں اقبال نے یہ غزل پڑھی:

تم آزماؤ "ہاں" کو زباں سے نکال کے
یہ صدقے ہوگی میرے سوالِ "وصال" کے
کم بخت اک "نہیں" کی ہزاروں ہیں صورتیں
ہوتے ہیں سو جواب سوالِ "وصال" کے
ہم موت مانگتے ہیں وہ گھبرائے جاتے ہیں
سمجھے کسی نے اور ہی معنی "وصال" کے
اے ضبط ہوشیار! مرا حرفِ مدعا
قابو میں آنہ جائے زبانِ سوال کے
مارے ہیں آسمان نے مجھے تاک تاک کر
کیا بے خطا ہیں تیر کمانِ ہلال کے
ان کی گلی میں اے مجھے اندھیر پڑ نہ جائے
اے ضعف دیکھ! مجھ کو گرانا سنبھال کے
موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

میں نے کہا۔ یہ بے رخی اور یہ کجادائیاں
کہنے لگے کہ بول ذرا منہ سنبھال کے
کہتے ہیں ہنس کے جائیے ہم سے نہ بولئے
قربان جاؤں طرزِ بیانِ ملال کے
بگڑے حیا نہ شوخیٔ رفتار سے کہیں
چلتے نہیں وہ اپنا دوپٹہ سنبھال کے
تصویر میں نے مانگی تو ہنس کر دیا جواب
عاشق ہوئے تھے تم تو کسی بے مثال کے
کہتا ہے خضرِ دشتِ جنوں میں مجھے کہ چل
آتا ہوں میں بھی پاؤں سے کانٹا نکال کے
اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

اس غزل میں اقبال نے میر و مرزا کی چپقلش اور دبستانِ دلّی و لکھنؤ کے جھگڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا مسلک بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ یہ غزل بانگِ درا میں درج نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس غزل کے بعض اشعار پر مرزا ارشد گورگانی پھڑک اٹھے تھے اور انھوں نے اس شعر پر:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

بے ساختہ داد دیتے ہوئے فرمایا تھا "میاں صاحبزادے اس عمر میں اور یہ مضمون! اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ" اس شعر کا اثر یہ ہوا کہ تمام اہلِ علم و قلم کی نگاہیں یک بیک اقبال کی طرف پلٹ گئیں۔ جب ہر طرف سے واہ واہ ہونے لگی تو ایک مشاعرے میں اقبال نے وہ غزل پڑھی، جس کے دو شعر یہ ہیں:

خوب سوجھی ہے تہِ دام پھڑک جاؤں گا
میں چمن میں نہ رہوں گا تو مرے پر ہی سہی
شعر کہتا ہی نہیں اقبال کو آتا — لیکن
آپ کہتے ہیں "سخنور" تو سخنور ہی سہی

شیخ عبد القادر مرحوم فرماتے تھے کہ اس "سخنور ہی سہی" کے ٹکڑے پر ایک شور مچ گیا تھا، یہ غزل بھی اقبال کے کم

جو کلام ملتا نہیں تھی۔

۱۸۹۶ء کے کسی مشاعرے میں، جس کے لئے یہ طرح تجویز کی گئی تھی۔

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا

اقبال نے وہ غزل پڑھی، جس کے مقطعے میں داغ کی شاگردی پر فخر کا اظہار کیا گیا ہے۔

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ اس پر نہیں نازاں
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغِ سخنداں کا
(شور محشر دسمبر ۱۸۹۶ء)

نسیم بھرت پوری اور تشنہ بلند شہری داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے تھے اور داغ ہی کے رنگ میں کہتے تھے۔

۱۸۹۶ء کے آخر میں حکیم شجاع الدین محمد کا انتقال ہو گیا اور انجمنِ اتحاد کو ناقابلِ تلافی صدمہ پہنچا۔ حکیم امین الدین۔۔۔ بیرسٹر ایٹ لا نے کچھ عرصہ اس رسم کو نبھانے کی کوشش کی مگر انھیں پشاور جانا پڑ گیا، جس سے ایک خلا پیدا ہو گیا، حکیم صاحب علم و فضل میں کامل مانے جاتے تھے۔ ان کی ذکاوت اور طلاقت خاص طور پر مشہور تھی۔ انجمن حمایت الاسلام لاہور کے سالانہ جلسوں میں ان کی تقریریں بڑے شوق سے سنی جاتی تھیں ان کی معلومات وسیع اور تنقید گہری ہوتی تھی وہ جب کبھی لاہور آجاتے تھے تو ان کی موجودگی سے اس محفلِ ادب کی گوناگوں دلچسپیوں میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

حکیم امین الدین کی عدم موجودگی میں حکیم شہباز الدین نے اس کام کو سنبھالا مگر بقول حکیم احمد شجاع وہ جذب صادق کی وہ کشش جو بزرگوں کی شفقت میں تھی اس نوجوان کی ہمت کو نصیب نہ ہوئی حکیم شہباز الدین بہت ہی باعزا اور نفیس انسان تھے مگر ان کے سینے میں ایسا دل تھا جس میں سمندر کی وسعت اور ابر کی فیاضی تھی وہ جو کچھ کماتے، اپنے احباب کی خاطر مدارات میں صرف کر دیتے ان کی زبان کی شیرینی، منکسر مزاجی اور مہمان نوازی نے ان کے گھر کو علم و ادب کے شیدائیوں کا مرجع بنا دیا تھا جن کی دید کے شائق دور دور سے ان کے مکان پر [illegible] اور ان کی صحبت سے اکتساب شرف کرتے تھے۔

آخر مشاعرے بند ہو گئے، شورِ محشر کی اشاعت بھی رک گئی، مگر ایک بات ضرور ہوئی کہ وہ صاحبانِ ذوق جنھیں اس بزمِ مشاعرہ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہونے، کچھ سیکھنے اور کچھ سکھانے کی عادت سی ہو گئی تھی، اب ہر روز حکیم صاحب کی بیٹھک میں جمع ہو جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ گھر علم و ادب کے شیدائیوں کا ایک اچھا خاصا کلب بن گیا، جہاں یہ سلسلہ برسوں تک جاری رہا، یہاں جمع ہونے والے بزرگوں میں ایک ایک آسمانِ ادب کا درخشاں ستارہ تھا۔

انہی دنوں کا واقعہ ہے کہ عید رمضان کی تقریب پر حکیم امین الدین نے دعوت دے کر اپنے چیدہ چیدہ دوستوں کو بلایا، حاضرین کے نام یہ ہیں: نواب غلام محبوب سبحانی رئیس اعظم لاہور، مولوی محبوب عالم مالک و مدیر پیسہ اخبار، شیخ عبدالقادر، ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، خان احمد حسین خان، خلیفہ نظام الدین، مولوی احمد دین وکیل مصنف سرگزشتِ الفاظ، شیخ گلاب دین وکیل مصنف قانونِ شریعت: رواج، حکیم شہباز الدین، خواجہ رحیم بخش، منشی غلام محمد ناظم، مرزا محبوب بیگ وکیل اور سید محمد شاہ وکیل۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شیخ عبدالقادر نے تجویز پیش کی کہ لطائف و ظرائف تو روز ہی ہوتے رہتے ہیں، حسنِ اتفاق سے اس وقت ہم میں دو قادر الکلام شاعر موجود ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ حضرت اقبال اور خان احمد حسین خان فی البدیہہ ایک ایک غزل کہہ کر ہمیں سنائیں، حاضرین نے یک زبان ہو کر اس تجویز کی تائید کی، شیخ عبدالقادر نے مومن کا یہ شعر پڑھ کر اس کے دوسرے مصرعے کو طرح مقرر کیا۔

وعدۂ وصل سے ہو دل کو تسلی کیونکر
فکر یہ ہے کہ وہ وعدے سے پشیماں ہوگا

چنانچہ دونوں نے کچھ دیر فکر کی اور اس کے بعد اپنی اپنی غزل سنائی۔ خان احمد حسین خان نے کہا:

سرد مہری سے تری سرد زمستاں ہوگا
گرم جوشی سے مری کوہ درخشاں ہوگا
چارہ گر [illegible] مرے درد کو بدنام نہ کر

[illegible] کیا ہے جو مئے کشی درماں ہوگا
اہ جو جنت سے ہے طوف کو دیکھا کرتا
زخم [illegible] پہ کیا تیرے وہ قرباں ہوگا
کون کہتا ہے کہ [illegible] ستارہ نکلا
وہ کسی وجہ سے انگشت بدنداں ہوگا
سیر جنت نے عطا مجھ کو وہ کی ہے دولت
خون بھی تھوکوں تو وہ لعل بدخشاں ہوگا
جانبِ ملکِ عدم ہم تو روانہ ہوں گے
حشر کیا آپ کا اے حسرت وارماں ہوگا
داغِ دل میں نے جو اترا کے دکھایا ان کو
ہنس کے فرمایا چراغِ تہ داماں ہوگا
دشتِ غربت میں ہمیں ڈھونڈھتا پھرتا ہے کوئی
یہ ترا سایہ ہما اے شامِ غریباں ہوگا
بلبلیں دور رہیں مجھ سے تو اچھا احمد
ورنہ تو گل کی طرح چاک گریباں ہوگا

اقبال نے فرمایا :

لاکھ سرتاجِ سخن ناظرِ شروان[1] ہوگا
پر مرے سامنے اک طفلِ دبستاں ہوگا
مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہوگا
عشق کی راہ میں جو کوئی قدم رکھے گا
کبھی گریاں کبھی خنداں کبھی عریاں ہوگا
جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنتی ہوگا فرشتوں میں نمایاں ہوگا
کیا کہیں مستِ مئے عشق کہاں ہوتا ہے
بہ درِ دیرِ مغاں ناصیہ کوباں ہوگا
جیتے جی سر نہ جھکائیں گے کسی کے آگے
مجھ پہ احسان نہ ہوگا تو یہ احساں ہوگا
زندگی چار دہاڑے ہے تو اس کی خاطر
بوالہوس ہوگا جو شرمندۂ احساں ہوگا

چار سو پھولوں کا انبار نظر آتا ہے
شاید اس بزم میں اقبالؔ گل افشاں ہوگا

یہ غزل اگرچہ ابتدائی مشق کے زمانے کی ہے، ارتجالاً کہی گئی ہے اور بعد میں اقبال کے بلند معیار پر پوری نہ اترنے کی وجہ سے کسی مجموعے میں جگہ نہ پا سکی، لیکن اس کے بعض بعض شعروں سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ اقبال ابتدا ہی سے چند خاص خیالات اپنے سامنے رکھتے تھے، جنہوں نے آہستہ آہستہ پختہ ہو کر فلسفۂ خودی کی صورت اختیار کر لی۔ خودی اقبال کا خاص موضوع ہے یہی ایک محور ہے جس کے گرد اقبال کا سارا فلسفہ گھومتا ہے۔ اگر اسے اقبال کی تعلیم سے خارج کر دیا جائے تو اقبال کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے اسرارِ خودی اگرچہ ۱۹۱۴ء میں لکھی گئی لیکن خودی اور خودداری کا ذکر اس غزل میں بھی موجود ہے یہ شعر دیکھئے :

جو وفا پیشہ سمجھتا ہے خودی کو ایماں
جنتی ہوگا فرشتوں میں نمایاں ہوگا
جیتے جی سر نہ جھکائیں گے کسی کے آگے
مجھ پہ احسان نہ ہوگا تو یہ احساں ہوگا

اور پھر اس مضمون کو :

مردِ مومن کی نشانی کوئی مجھ سے پوچھے
موت جب آئے گی اس کو تو وہ خنداں ہوگا

اقبال نے آخری ایام میں فارسی کا جامہ پہنا کر ہمیشہ کے لئے اس طرح کو محفوظ کر دیا :

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ او
(ارمغانِ حجاز)

اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جب ان کا آخری وقت آیا تو انہوں نے ایک مردِ مومن کی طرح نہایت خندہ پیشانی سے موت کو لبیک کہا ؛؛

---

[1] ناظمِ شروان عبداللہ خاں آغا نی شروانی ہے

لکّی

تقی حسین خسرو

اب تو خود اُسے بھی اپنے لکّی ہونے کا یقین آنے لگا تھا۔ ورنہ وہ اپنے دوستوں اور ملنے والوں کے اس خیال کو مختلف باتوں پر محمول کر کے ٹال جاتا۔ کیوں کہ جب کبھی وہ اسے لکّی کہتے تو اس کی نظریں شیشے کی سطح سے ٹکرا کر واپس ہونیوالی معکوس کرنوں ہی کی طرح گھوم کے ہی گھر کی جانب اٹھ جاتیں اور وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کے رہ جاتا۔۔۔

تجمل خاں آدمی شوقین تھا اور ہر شوقین آدمی ہی کی طرح اپنے شوق کی تکمیل ہی کو زندگی کا حاصل سمجھتا کہ اس کا شوق یک طرفہ بھی نہ تھا کہ موسیقی کے شوق میں بس موسیقی ہی کے ہو کے رہ گئے اور تمام زندگی سُر تال کی پہچان ہی میں گزار دی۔ یا پینٹنگز اور آرٹ ورکس جمع کرنے کی خواہش میں ساری دُنیا سے ناطہ توڑ لیا اور تمام عمر اصلی اور نقلی کی پہچان ہی کرتے رہے۔ جوئے بازی کا سا خارجی کرشل شوق بھی اسے نہ تھا کہ زندگی میں انڈوں کی نکاسی کے سوا کوئی اور کام ہی نہ کیا، اس نے اس قسم کے شوق کبھی نہیں پالے۔ اس کے شوق میں ان تمام شوقوں کی یکطرفی تھی نہ ان کے حامل اشخاص کی سی یک رُخی۔ اس کے شوق میں تو بڑی وسعت تھی، وہ جن چیزوں کے حصول کا خواہش مند تھا اُن کی موجودگی میں تو ایسے ہزاروں شوق پورے کئے جا سکتے تھے وہ دولت اور حیثیت کی اسی طاقت پہ مرمٹا تھا پھر اس نے انہی کے حصول کو اپنا مقصدِ حیات بنا لیا اور اپنی جائز ناجائز کوششوں سے ان کے حصول میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہا تھا، یہی وجہ تھی کہ اُس کے دوست اور ملنے والے اسے لکّی کہتے کیونکہ دولت اور حیثیت کے حصول کی کوشش کون نہیں کرتا دُنیا والے انہی کی موجودگی یا غیر موجودگی کو زندگی کی تمام کامیابیوں یا ناکامیوں کا معیار سمجھتے ہیں مگر اس میں کامیابی کتنے لوگوں کو ہوتی ہے؟

وہ پچاس کے پیٹے میں تھا، قد درمیانہ، جسم فربہ، کھِلتا ہوا رنگ، بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں سونے کی بھاری انگوٹھی اور کلائی پہ سنہری ہی گھڑی۔ وہ ایک ہاتھ میں [illegible] غیر ملکی بریف کیس اٹھائے تیز تیز قدم اٹھاتا اور جب پیلے رنگ کے مزدا کے اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھتا تو گاڑی شہر کی پُر رونق، وسیع اور جگ مگ کرتی سڑکوں پر فراٹے بھرتی نظر آتی۔ ہمیشہ بڑے چیک کی قمیص ان شرٹ کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک رنگ کے لباس میں اور خصوصی طور پر تھری پیس سوٹ میں اچھا بھلا آدمی بزرگ نظر آنے لگتا ہے وہ اپنی بزرگی چھپانا چاہتا تھا۔ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی تھا کہ وہ اپنے سر کے بالوں سے خضاب اُترنے دیتا نہ ٹھوڑی کے بالوں کو ہی جلد کی کھڑکیوں سے جھانکنے کی اجازت دیتا۔ البتہ وہ قریب سے دیکھنے والوں سے اپنی عمر چھپا تا نہ تھا۔ گھٹی ہوئی ٹھوڑی کے نیچے اس کے گلے کی کسی قدر لٹکتی جلد اور سلوٹیں باتوں کی عمر کی چغلی کھاتیں مگر اس کے لئے دیکھنے والے کا باریک بین ہونا ضروری تھا ورنہ عام طور پہ لوگ اس کے مُسکراتے چہرے جس پہ تازہ تازہ خون دوڑتا محسوس ہوتا اور سر کے سیاہ بالوں ہی کے اسیر ہو کے رہ جاتے مگر وہ لوگ جو ذرا باریک بین ہوتے ہیں انھیں کسی قدر مشکل پیش آتی کہ وہ اس کے گلے کی لٹکتی جلد، سلوٹیں اور اس کے چہرے کی سرخی میں کوئی رشتہ قائم نہ کر پاتے مگر اس سے تجمل خاں کو کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ باریک بین کتنے لوگ ہوتے ہیں ۔۔ ؟

تجمل خاں کی زندگی میں اُس کا دیہات سے شہر کی جانب سفر فیصلہ کن ثابت ہوا تھا، وہ دیہاتی نہ تھا مگر شہر اور شہر کی زندگی پر جان دیتا، شہر کی پُر رونق چوڑی چکلی جگ مگ کرتی سڑکیں جن کی رونق لازوال اور جن کی جگ مگ پر وقتِ واحد میں ہزاروں کہکشائیں قربان کی جاسکتی ہیں اُن سڑکوں پہ ڈرائیونگ میں کتنا لطف آتا اور وہ بڑے بڑے پاش ہوٹل جن کی خوشبو میں بسی فضا کیسے خواب آگیں ہوتی اور پھر وہ سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیرا اور قیمتی کپڑوں میں ملبوس موٹے تازے لوگ۔ جن کے قیمتی کپڑے [illegible] اور جسموں کی تازگی اُن کی دولت اور حیثیت کی ضامن ہے اُن ہوٹلوں

میں نظر آتے لوگوں میں کوئی بھی ڈیلا پتلا یا معمولی حیثیت کا آدمی نہیں
معمولی حیثیت کے لوگ تو ان ہوٹلوں کے آگے سے گزرتے ہوئے بھی ڈرتے
کہ ہوٹل کے کشادہ گیٹ پر بڑی بڑی مونچھوں والا لالہ جو ہاتھ میں
موٹا ڈنڈا لئے بیٹھا ہوتا۔ پھر کیا مجال کہ وہ اندر داخل ہونے کا سوچ
بھی سکیں، جس کو دیکھئے جس سے ملئے وہ بڑی چیز ہے۔ بڑی آسانی
سے تعلقات بڑھتے ہیں آج کی دنیا میں تعلقات ہی تو بڑی چیز ہیں
کتنے بے شمار کام نکلتے ہیں ان تعلقات کی برکتوں سے! اور پھر وہ
کالے بازار میں بکتے انتہائی بیش قیمت خوشبویات میں تیرتی خوبصورت
عورتیں! جن کی ایک نظر پر وہ آج بھی کابل قندھار قربان کر سکتا
تھا۔ وہ عورتیں کتنی انٹلکچوئل ہوتی ہیں! ان کے ہر انداز میں کیسی
ہمہ گیر پہلوداری ہوتی ہے! ان کی ہر حرکت ہر ادا جھیل کی سطح پر پیدا
ہوتی چھوٹی چھوٹی لہروں ہی کی طرح دائرہ در دائرہ پھیل کر ہوٹل
میں موجود ہر آدمی کو اپنے آغوش میں لے لیتی ہے! انٹلکچوئل عورت کتنی
بڑی نعمت ہے! جس کے ساتھ ہوتی ہے اس کو لوگ کتنی عزت سے
دیکھتے ہیں ــ! شہر اور وہ بھی کراچی جیسے شہر میں مستقل رہنے کی
آرزو تجمل خان کے دل میں برسوں سے تھی۔ وہ اس سلسلے میں اپنے
اندر ایک بڑی ہی زرخیز صلاحیت پاتا۔ وہ شہر سے سینکڑوں میل
دور ایک فیکٹری کے گرد آباد چھوٹی سی گندی آبادی میں رہنے پر
مجبور تھا جہاں زندگی بے رنگ اور بے رونق تھی۔ گویا اس کی
زندگی کی ریل گاڑی ایک ایسے مقام پر رکی کھڑی تھی جہاں حدِ
نظر تک ویرانی اور خشک سالی نظروں کے سامنے تھی اور ریل گاڑی
کے ایک بے بس مسافر ہی کی طرح رکی ہوئی گاڑی کا چلانا اس کے
بس میں بالکل نہ تھا۔ وہ چھوٹی سی آبادی فیکٹری سے متعلق لوگوں
پر مشتمل تھی یا پھر ان لوگوں پر جو مختلف چھوٹے چھوٹے پیشوں سے
تعلق رکھتے تھے جیسے نائی، موچی، دھوبی یا پھر وہ لوگ جو فیکٹری
کے مزدوروں کے لئے چھوٹے موٹے ہوٹل چلاتے۔ ایک حقیر سا کلب بھی تھا
جس میں [illegible] لوگ جمع رہتے جو سستے سگریٹ پیتے اور ایک
دوسرے سے گھٹیا مذاق کرتے یہی وجہ تھی کہ فیکٹری سے متعلق
افسران اس کلب کا رُخ کرنا بھی کسرِ شان سمجھتے۔ تجمل خان بھی آخر
افسر تھا پھر وہ کیسے اس کلب کا رخ کر سکتا تھا مگر دوسرے افسران
کے برخلاف فیکٹری سے متعلق تمام طبقوں میں مقبول تھا اس کی
وجہ اس کی دور اندیشی تھی کہ نہیں معلوم کب کس سے کوئی کام
پڑ جائے۔ کسی کے لئے چھوٹا موٹا کام بھی کرتا تو اس طرح کہ وہ
زندگی بھر اس کے احسان کو بھول نہ پائے اور ہمیشہ اس کے آگے
جھکا رہے وہ غرض مند آدمی سے کچھ اس طرح پیش آتا۔

"ٹھیک ہے یار آدمی ہی آدمی کے کام آتا ہے بھائی چند روز
پہلے کی بات ہے کہ الطاف کو ایک کام پڑ گیا ــ وہی الطاف
جو مکینک ہے۔ سوچا بے چارہ پریشان ہے۔ اس کا کام میں نے
چٹکی بجاتے کر دیا۔ مگر اب الطاف کہیں ملتا ہے تو سلام بھی مشکل
ہی سے کرتا ہے ــ مگر یار چھوڑو آدمی غرض نکل جانے کے بعد
ایسا ہی کرتا ہے"

غرض مند آدمی تجمل خان کے سامنے اور خود اپنے دل میں بھی
الطاف کو لعنت ملامت کرتا۔ دیکھو کیسا احسان فراموش آدمی
ہے! کیا احسان کا بدلہ یہی دیا جاتا ہے ــ؟ اور تجمل خان کی
فراخدلی پر دل ہی دل میں ایک ناقابلِ اظہار جذبۂ تحسین محسوس
کرتا۔ پھر اس ڈر سے کہ کہیں اسے بھی احسان فراموش نہ کہا جائے
زندگی بھر تجمل خان کا احسان مند رہتا۔

مگر تجمل خان کو گھر کا سکون حاصل نہ تھا۔ اس کی بیوی اس کی
اُمنگوں کے برخلاف ایک معمولی پڑھی لکھی گھریلو عورت تھی جو کسی اعتبار
سے بھی اس کی شریکِ حیات بننے کے قابل نہ تھی اور بچے ــ
بچوں کے بارے میں تو تجمل خان سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس کے
دو بچے پولیو سے موذی مرض کا شکار تھے اور ایک لڑکی کا ذہنی توازن
ٹھیک نہ تھا۔ اس کی بیوی بس اپنے معذور بچوں کی دیکھ بھال میں
لگی رہتی اور کبھی ذہنی طور پر اس کے قریب بھی نہ آسکتی۔ اس میں
صلاحیت ہی کب تھی۔ وہ اکثر سوچتا یہ کم بخت عورت نہیں معلوم
کیسے اس کی بیوی بن گئی وہ اپنے معذور بچوں کی ذمے دار بھی
بیوی ہی کو سمجھتا۔ عورت اگر اچھی ہو تو معذور بچے نہیں جنتی۔ پھر
وہ اکثر سوچتا کہ اگر کبھی خوش قسمتی سے وہ شہر منتقل ہونے میں
کامیاب ہو ہی گیا تو پھر وہ اس جاہل عورت کے ساتھ کیسے گزارا
کر سکے گا؟ اس کم بخت کی جہالت کا سوسائٹی پر کتنا برا اثر پڑے
گا! موجودہ سوسائٹی میں مقام کا بنانا اس وقت تک ممکن
نہیں جب تک بیوی نہ صرف پڑھی لکھی ہو بلکہ انٹلکچوئل بھی

اس کو لگتا جیسے اس کے دیہات سے شہر کی جانب سفر کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی بیوی ہو۔ وہ اس ناکارہ جاہل عورت سے چھٹکارہ بھی تو نہیں حاصل کر سکتا تھا۔ ایسی صورت میں اس کے معذور بچوں کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ مگر اس کے یہی بیوی بچے جن کو وہ ہمہ وقت فراموش کئے رہتا اس کو اس وقت ضرور یاد آجاتے جب اسے اپنے کسی بڑے افسر کے آگے جواب دہی کرنی پڑتی تو وہ بڑے ہی رقت آمیز لہجے میں کہتا۔

"سر میرے دو بچے CRIPPLED ہیں! لڑکی کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں"

بچے CRIPPLED ——— ! اور لڑکی کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں! وہی افسر جو ابھی اس سے جواب طلبی کر رہا تھا اب اس کی آنکھوں میں تجمل خان کے لئے دفعتاً ترحم اور ہمدردی کا جذبہ ابھر آتا۔ پھر نہ صرف یہ کہ اس کی جواب طلبی ختم ہوتی بلکہ آگے کے لئے بھی راہیں کھل جاتیں۔

آخر تجمل خان کے لئے راہیں کھل ہی گئیں۔ گویا اس کی ہوئی گاڑی نے سیٹی دی اور دھواں اڑاتی چل پڑی تھی۔ اس کی زندگی کی ریل گاڑی کا رخ شہر کی طرف تھا۔ کراچی جیسے شہر کی طرف! کراچی جو اس کی آرزوؤں کا شہر تھا۔ پھر تو وہ جیسے ریل گاڑی کے آگے آگے دوڑتا ریل گاڑی سے بہت پہلے کراچی پہونچ گیا تھا۔

دراصل اس کی تبدیلی بطور سزا کی گئی تھی، وہ تو اس کی نوکری چلی جاتی، اس نے مردوں کو زندہ جو کر دیا تھا۔ بعض ایسی رقومات کی ادائیگی کروا دی تھی جن کے وصول کنندوں کو مرے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا۔ پتہ نہیں اب تک کتنے مردے اس نے زندہ کر دئے تھے؟ ایک بددیانت افسر نہ صرف اپنے ادارے بلکہ پوری قوم کا دشمن ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف یا تو قانونی چارہ جوئی کی جاتی یا کم از کم نوکری سے تو ضرور ہی برطرف کر دیا جاتا، مگر ایک بار پھر اس کے وہی معذور بچے اس کے آڑے آگئے تھے لہٰذا بطور سزا اس کا تبادلہ فیکٹری سے دور شہر کر دیا گیا کہ اس طرح وہ تمام سہولتیں جو فیکٹری سے راست تعلق کی وجہ سے حاصل تھیں وہ ختم ہو گئی تھیں اس کے لئے فی الوقت یہی سزا کافی سمجھی گئی تھی، مگر تجمل خان کے لئے یہی سزا نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوئی

شہر اور شہری زندگی کتنے بے پناہ امکانات رکھتی ہے اپنے اندر۔ زرخیز زمین کو اب کھاد کی کمک پہنچ ہی گئی تھی اور اس طرح بے مثال فصل کے امکانات روشن سے روشن تر ہو گئے تھے۔ پھر تو کچھ ہی دنوں میں بہت سی معدوم رشتہ داریاں وجود میں آگئیں جن میں دیہات، تعلقہ، ضلع، شہر یا پھر صوبے تک کا حوالہ شامل تھا کچھ ایسی دوستیاں بھی وجود میں آگئیں جن میں فریقین کے مفاد کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا، پھر تو ان تمام حلقوں میں تجمل خان اور تجمل خان کا نام سکۂ رائج الوقت کی طرح گردش کرنے لگا، کچھ ہی دنوں میں فیکٹری کے بالائی حلقوں میں نہ صرف اس کا کھویا ہوا وقار بحال ہو گیا بلکہ اس کی ترقی بھی کر دی گئی۔ ایک مالیاتی ادارے کے ایک بہت بڑے افسر نے اس کی سفارش جو کر دی تھی پھر تو جیسے یہ بات ایک بار پھر ثابت ہو گئی کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے پہلے بھی اور آج بھی عیش تو تجمل (حسین) خان کے لئے ہی بنا تھا

تجمل خان نے اپنے دفتر سے کراچی کے سب سے فیشن ایبل اور قیمتی بازار کا فاصلہ صرف دو سال دو ماہ میں طے کیا تھا۔ اس کی یہی رفتار جو بظاہر رفتار سے کم تھی اس کی تیز روی کی ضامن تھی کیوں کہ یہی معمولی سا فاصلہ لوگ صدیوں کے سفر کے بعد بھی عبور نہیں کر پاتے یہی وجہ تھی کہ اس کے دوست اور ملنے والے اسے لکی کہتے۔ حالاں کہ اس دوران میں اس کا وہ کاروبار بھی کچھ وقت کے لئے مندہ رہا تھا جس میں نقصان کا احتمال ہی نہیں ہوتا۔ اس دوران میں ملک پر سے جنگ چھڑ گئی تھی۔ فیکٹری کے لئے خریدے اور درآمد کئے گئے مال پر وہ بڑی ہوشیاری سے کمیشن وصول کرتا تھا۔ مگر جنگ سے تو پورے ملک ہی کی معیشت متاثر ہوئی تھی۔ بے شمار خاندان بے گھر ہوئے ان گنت عورتیں بیوہ ہوئیں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد یتیم ہو گئی۔ کچھ محب وطن لوگ تو محض صدمے ہی سے جاں بحق ہو گئے۔ یہ سب کچھ تجمل خان کو بھی گراں گزرا تھا۔ مگر جنگ کا ماحول پیدا کیا جانا، ملک کا دفاع، قوم کے لئے قربانی یا پھر زخمیوں کی کراہیں، بیواؤں کی آہیں اور بھوک اور سردی کے مارے بچوں کا بلکنا، ان سب باتوں کا تجمل خان کی زندگی میں کوئی وجود نہ تھا وہ تو اپنے دفتر میں بیٹھے دو بلا واسطہ اور ایک بالواسطہ ٹیلی فون میں سے کسی ایک کی خرابی

سے جھنجھلا اُٹھتا کہ اس طرح اس کے تعلقات کے وسیع جال میں عارضی طور پر ہی سہی بڑے بڑے مہیب سوراخ پڑ جاتے اور ان مہیب سوراخوں سے اُسے خوف آتا۔ اس کمرے کا ایئر کنڈیشنر اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی ٹھپ ہو جاتا تو وہ بڑبڑانے لگتا، "کیا مصیبت ہے؟ آدمی سکون سے کام بھی نہیں کرسکتا۔" اُس کا پی اے جو اُس کے نجی کام جیسے بجلی، گیس کے بل کی ادائیگی وغیرہ کے لئے باہر جاتا اگر واپسی میں لیٹ ہو جاتا تو وہ چلا اٹھتا۔ "چھوٹے سے کام میں اتنی دیر لگادی! شرم کرو، کیوں حرام کھاتے ہو؟" بیچارہ پی اے بس سر، ہی سر کہتا رہ جاتا۔ اسی طرح چپڑاسی چائے بسکٹ اور مشروبات کے پیش کرنے میں تاخیر نہیں کرسکتا تھا۔ تجمل خان کو جنگ دراصل اس لئے گراں گزری تھی کہ اس کم بخت جنگ سے شہر کی رونق میں فرق آگیا تھا اس کا وہ کاروبار بھی جس میں نقصان کا کوئی احتمال ہی نہ تھا کسی حد تک مندا ہو گیا تھا وہ ٹیلی فون پہ کینک سے اپنے پی اے سے چپڑاسی سے اکثر کہتا "بھئی دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہو اپنا معاملہ ٹھیک رہنا چاہئے" اُس کا مخاطب اُس کو حیرت سے دیکھتا مگر تجمل خان تو ان کے لئے بہت بڑی چیز تھا، اور بڑی چیز کو وہ حیرت سے دیکھ ہی تو سکتے تھے اور وہ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک بڑے افسر کے ساتھ ساتھ سیٹھ بھی بن گیا۔ اس نے شہر کے سب سے فیشن ایبل اور قیمتی بازار میں ایک اسٹور خرید لیا تھا جس کا نام اس نے اپنے دوستوں اور ملنے والوں کے اصرار پر [illegible] STORE رکھا کہ اب اُسے خود بھی اپنے کچھ ہونے کا یقین آنے لگا تھا۔

مگر اسٹور خریدنے سے پہلے اس نے دوسری شادی بھی کر لی تھی اور اس انٹلکچوئل بیوی کے حصول کی اپنی عمر بھر کی خواہش پوری کی تھی اس کی دوسری بیوی نے ایک لمبا عرصہ غیر شادی شدہ زندگی کا گزارا تھا وہ سوسائٹی کی اعلیٰ سطحوں پہ حرکت کرنے سے اسی طرح واقف تھی جیسا ایک کہنہ مشق کھلاڑی مختلف میدانوں میں کھیلنے سے واقف ہوتا ہے اپنی دوسری بیوی کو پاکر تجمل خان کو لگا تھا جیسے وہ دونوں ایک مدت سے ایک دوسرے کی تلاش میں تھے۔ اگلے وقتوں میں کیا مجنوں نے لیلیٰ کو اور کیا لیلیٰ نے مجنوں کو تلاش کیا ہوگا۔ تجمل خان نے اپنی پہلی بیوی اور معذور بچوں کیلئے شہر سے دور مکان لیا تھا کہ اس کے ملنے والے اُن تک اور وہ اُن کے ملنے والوں تک پہنچ نہ پائیں۔ اب وہ اور اس کی انٹلکچوئل بیوی مل کر اسٹور چلاتے تجمل خان بھی برائے نام ہی دفتر جاتا کسی نہ کسی کام کا بہانہ کر کے دفتر سے نکل جاتا اُس کی غیر موجودگی میں اس کا پی اے چھوٹے موٹے کام چلاتا اور کاغذات لے کر شام کو اسٹور پہ آجاتا وہ اپنے پی اے کو آتا دیکھ کر بڑبڑاتا "کیا مصیبت ہے؟ ایک آدمی کیا کیا کرسکتا ہے؟ اُف کتنا تھک جاتا ہوں میں؟" اس کی انٹلکچوئل بیوی اپنی قیمتی ساڑھی کا پلو ٹھیک کرتے ہوئے کہتی۔ "ڈارلنگ! اتنا کام نہ کیا کرو ایسی بھی کیا نوکری کہ آدمی کو سانس لینے تک فرصت نہ ملے" وہ کچھ ایسے اسٹائل سے بولتی کہ لگتا وہ مغربی دھن پر کوئی پاکستانی گانا گا رہی ہو۔ اور اُس کا یہ گانا سن کر تجمل خان کی تھکن میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ وہ بُرا سا منہ بنا کر اپنے پی اے کی طرف دیکھتا جس سے پی اے کچھ اور بھی سہم جاتا۔ وہ چیخ پڑتا "ارے میرا منہ کیا تک رہے ہو؟ لاؤ جلدی کرو" اور پھر کاغذات پہ جو اس کا پی اے اُس کے آگے پیش کرتا جاتا، بڑی بے زاری سے دستخط کرتا۔

رمضان کے مبارک مہینے میں چھوٹے معمولی بازاروں پہ بھی رونق آجاتی ہے کہ دکاندار اپنی اپنی دکانوں کے آگے چوکیاں بچھا کر سلے سلائے کپڑے، رنگ برنگے رومال، موزے جوتے، بنیان اور رنگ برنگی چوڑیاں سجا دیتے ہیں معمولی حیثیت کے غریب لوگ بھی جو سال بھر سستی ترکاریاں، راشن کا آٹا اور سیکنڈ ہینڈ کپڑے خریدتے رہتے ہیں اس مہینے میں اپنے بیوی بچوں کیلئے نئے کپڑے اور جوتے خریدنا ضروری سمجھتے ہیں چاہے اس کے لئے انہیں قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ تجمل خان کا اسٹور تو ایک ایسے بازار میں تھا جس کے خریداروں میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہوتی جو شام کو محض وقت گزاری کے لئے اپنی کوٹھیوں سے شاپنگ کرنے نکلتے ہیں اور اشیاء کی خریداری سے پہلے قیمت کا پوچھنا، بھاؤ تاؤ کرنا، تضییع وقت اور کسر شان سمجھتے ہیں، رمضان میں تو جیسے شاپنگ کا بہت معقول بہانہ اُن کے ہاتھ آجاتا ہے چنانچہ رمضان کا مہینہ شروع ہوتے ہی تجمل خان کے کام میں بے انتہا اضافہ ہو گیا تھا۔ اب وہی بازار جس کی رونق شام کے سایوں کے ساتھ بڑھتی جاتی تھی صبح ہی سے اس میں چہل پہل رہتی رات کو تو گویا میلے کا سماں رہتا۔ خاندان کے خاندان اُمڈے

ہوتے۔ نئی نئی چمکتی کاروں کی تعداد کچھ اتنی زیادہ ہو جاتی کہ پارکنگ کا مسئلہ بن جاتی تجمل خاں نے کچھ ماہ پہلے برابر کی دکان بھی لے لی تھی اور درمیان کی دیوار گرا کر اپنے اسٹور کو نہ صرف توسیع کر دی تھی بلکہ اسٹور کو بھی سپر مارکیٹ بنا دیا تھا۔ رمضان میں اس نے اسٹور میں کئی اضافی ٹیوب لائٹ بھی لگوائے تھے اور سفید دودھیا اس کا تقریباً پچیس فٹ لمبا بورڈ بھی بنوایا تھا جس پر اُبھرے ہوئے حروف میں لکھا تھا LUCKY'S STORE تمام دکانوں کے بورڈوں میں سب سے نمایاں تھا اور خریداروں کی توجہ فوری اپنی جانب کر لیتا۔ عید جوں جوں قریب آتی جا رہی تھی رش میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ تجمل خاں اس وقت اپنے اسٹور کے طول و عرض میں دوڑا دوڑا پھر رہا تھا کہ کہیں کوئی گاہک سیلز مینوں کی توجہ سے محروم نہ رہ جائے اس کا اسٹور اس وقت بقعۂ نور بنا ہوا تھا ایک آدمی ایک بچے کو اٹھائے سیڑھیاں چڑھ کر اس کے اسٹور میں داخل ہوا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا شائد کسی سیلز مین کی توجہ اپنی طرف کرنا چاہتا تھا۔ تجمل خاں نے محسوس کیا وہ پسینہ پسینہ ہو رہا تھا۔ بچہ کافی بڑا تھا۔ وہ جھٹ کر پہنچا۔

”میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟ مگر آپ انہیں نیچے کیوں نہیں اُتار دیتے؟“ اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

اِس سے پہلے کہ وہ آدمی کوئی جواب دیتا، بچہ بولا۔

”میں ابو کے پاؤں سے چلتا ہوں“

وہ ہنس دیا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ہاں یہ صحیح کہہ رہا ہے میرے پاؤں سے ہی چلتا ہے۔

”میرے بیٹے کیلئے جوتا چاہئے، کوئی اچھا سا جوتا“

تجمل خاں نے بچے کو غور سے دیکھا، اسے لگا جیسے بیٹے کو باپ پر اور باپ کو بیٹے پر فخر ہو۔

وہ ان کو دکان کے اس حصے میں لے گیا جہاں جوتے رکھے تھے مگر وہاں کوئی کرسی خالی نہیں تھی کچھ لوگ آگے ہی کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے ظاہر ہے سیلزمین بھی مصروف تھے وہ خود جھٹ کر بچے کی سائز کا جوتا لے آیا۔

”اب تو تمہیں نیچے اُترنا ہی پڑے گا۔ ورنہ یہ جوتا کیسے پہنیں گے؟“

اسے نہیں معلوم کیوں بچے کو باپ کی گود میں مسلسل چڑھا دیکھ الجھن سی ہو رہی تھی۔

”نہیں یہ کھڑا نہیں ہو سکتا“

”کھڑا نہیں ہو سکتا — !کیا یہ ...“

”ہاں“

اُس آدمی نے اُسے فقرہ پورا کرنے نہ دیا۔

تجمل خاں اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

اس آدمی نے اپنے بیٹے کو اٹھائے اٹھائے ہی جوتا پہنا کر دیکھا۔ مگر اس دوران میں اس کے چہرے سے بے زاری کا اظہار ہوا نہ ناگواری کا۔ گویا اپنے معذور بیٹے کے پاؤں میں جوتا نہ پہنا رہا ہو۔ خود پہن رہا ہو۔

پھر اس نے قیمت ادا کی اور اپنے بیٹے کو اٹھائے دکان سے نیچے اُتر گیا تجمل خاں بھی اس کے پیچھے پیچھے دکان سے نیچے اُتر آیا مگر وہ آدمی اپنے پیچھے اس کی موجودگی سے بالکل بے خبر تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اپنے بچے کی طرف تھی۔ اس نے اپنے بیٹے کو سڑک کی دوسری جانب کھڑی گاڑی پر بٹھایا۔ اور پھر وہ گاڑی بہت جلد بے شمار گاڑیوں کے جنگل میں کھو گئی۔ مگر اس گاڑی کی عقبی سرخ بتی تجمل خاں کی نظروں سے اوجھل نہ ہو سکی۔ گاڑی کی وہ ننھی سی بتی گویا اس کے ذہن تک ایک لکیر سی بناتی چلی گئی تھی۔ روشنی کی لکیر — وہ ایک ایسے آدمی کی گاڑی کی بتی تھی جس کا معذور بیٹا اس کے پاؤں سے چلتا تھا۔ کسی نے اسے پیچھے سے آواز دی۔ اس نے پیچھے دیکھا — اس کے اسٹور کا پچیس فٹ لمبا دودھیا گلاس کا بورڈ اپنی تمام سفیدی کے باوجود سیاہ تھا۔ بے پناہ سیاہ! اور اس سیاہی میں بورڈ پر اُبھرے حروف تیزی سے مٹتے جا رہے تھے۔ ٭٭

(ص… کا بقیہ)

کی اشاعت میں اپنی اور اپنے آبا واجداد کی نجات سمجھ رہے ہیں ایسے لوگوں کو چاہیے کہ ”فکر و دانشوری“ میں کوثر چاند پوری کا مضمون ”پریم چند — اچھا انسان بڑا ادیب“ پڑھیں تاکہ انھیں عبرت حاصل ہو اور وہ اپنے گناہ کا کفارہ کر سکیں جناب فضل تابش سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اکاڈمی اور اکاڈمی سے شائع ہونے والی مطبوعات کو فرقہ پرستی کی ہوا سے بچانے کی فکر کریں گے۔ ”فکر و دانش“ نہایت اچھے ڈھنگ سے شائع کی گئی۔ قیمت ساڑھے تیرہ روپیہ۔ اکاڈمی اور دفتر شانِ ہند سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

اردو دنیائے افسانہ نگاری میں ایک نیا ابھرتا نام

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

جو ہندی افسانوی دنیا میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ہندی افسانہ نگاری میں ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں

اگر آپ

قومی یکجہتی کے دلدادہ ہیں، یا ہندو مسلم اتحاد کے حامی، یا دیہات (گاؤں) کی سادہ اور پاک فضا میں زندگی بسر کرنے والوں کی جی داری، عزت و ناموس پر مر مٹنا۔ باہمی رفاقت اور غیر فرقہ وارانہ روابط کی دلکش، سچی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں، نیز جہیز اور دیگر مجلسی برائیوں کو دور کرنے کی حمایت کرتے ہیں تو ——— پڑھیے

مان سروور

جو ڈاکٹر اودے سرن ارمان کے لکھے ایسے اچھوتے اور دل و دماغ پر اثر کرنے والے سچائی پر مبنی اردو افسانوں کا مجموعہ ہے جو اپنی دلکشی، بہترین لکھائی چھپائی اور دیدہ زیب قومی یکجہتی کے رنگوں میں آپ کی نظروں کو دعوتِ مطالعہ دیگا

قیمت ۱۲/- روپے علاوہ محصول ڈاک

یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی بھی افسانہ کو شروع کریں اور بغیر پورا پڑھے کتاب کو رکھ دیں

مان سروور کا انگریزی ایڈیشن بھی بہت جلد منصۂ شہود پر آرہا ہے جسے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے جناب ادیب لکھنوی ریٹائرڈ پرنسپل رام رتن انٹر کالج بلاری نے۔ اس کے علاوہ مان سروور کا ہندی ایڈیشن شائع ہو گیا ہے جو ہر اچھے بک سیلرز کے ہاں دستیاب ہے۔

ملنے کا پتہ (قیمت پندرہ روپے)

یو۔ ایس۔ اے ہسپتال

پوسٹ بلاری ضلع مراد آباد (یو پی)

نوٹ: دفتر ماہنامہ شان ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے بھی یہ کتابیں دستیاب ہے

سعادت — کیسا بہترین تھا جس سے میری پہلی ملاقات تقریباً بیس
برس پہلے ۲۵-۱۹۲۴ء میں "ہال بازار" امرتسر میں لندن کے
وہاں کے مشہور و معروف فوٹو گرافر عاشق — پورا نام شاید عاشق
محمد تھا — کے سٹوڈیو میں ہوئی تھی؟ بھائی ابوسعید کی زبانی پتہ
چلا تھا کہ موصوف کوہ نور فلم کمپنی بمبئی کے سابق کیمرہ مین تھے۔
میٹرک میں بوجوہ فیل ہونے کے صدمے اور گھر — مختصر افراد خانہ
میں تنہائی کے احساس نے مجھے جذبات کے نکاس اور ذہنی سکون کی
تلاش میں لاشعوری طور پر ایک ایسی راہ، بلکہ راہیں دکھائیں جنہوں
نے آگے چل کر میری زندگی کا مقصد متعین کیا اور اس کے حصول کے لئے
ایک مسلسل اور خطرناک جدوجہد میں مصروف کر دیا۔ میں نے لڑکپن ہی
سے بے شمار سرکس کے کھیل، تھیٹر کے ڈرامے اور فلمیں (خاموش اور متکلم)
دیکھی تھیں۔ اس کے نتیجے میں شہرت یا گھر سے فرار حاصل کرنے کے لئے میں
نے بچپن میں ایک سرکس میں کام کرنے کے لئے اس کے منیجر کو خط بھی لکھا
تھا، یہ کیسی مضحکہ خیز حرکت تھی۔ اس دور کا مخصوص غیر ذمہ دارانہ، طفلانہ
خواہش، عاشق کے ہاں فلمی ایکٹر بننے کی خواہش اس کی ایک کڑی
تھی — ان دنوں امرتسر میں ایک فلم کمپنی "ست نارائن مووی ٹون"
— قائم ہوئی تھی جس میں ملازمت حاصل کرنے کے لئے امیدوار کی
حیثیت سے مجھے اپنا فوٹو بھی اتروانا تھا — اس مقصد کے لئے
عاشق سے بہتر اور کون ہو سکتا تھا۔

عاشق کے سٹوڈیو میں میری بھورے یا سنہری رنگ کے
ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر لگی،
غالباً بغیر فریم کی سنہرے رنگ کی عینک کے پیچھے اس کی سمجھ میں
غیر معمولی دلچسپی لینے والی نظروں نے میری توجہ اپنی جانب منعطف
کرا لی جب اسے پتہ چلا کہ میرا بھائی کون ہے تو اس میں اپنائیت کا احساس
نمایاں ہو گیا۔ اس نوجوان کا نام سعادت تھا، سعادت حسن —
وہ سٹوڈیو میں بیٹھ کر بھی اکثر انگریزی کے ناول پڑھتا، بیٹا کرائے
پہ لے کر بے شمار انگریزی ناولوں کے تراجم پڑھے تھے جو ان دنوں
کے مشہور مترجم، تیرتھ رام فیروزپوری نے کئے تھے — سعادت اور
مجھ میں ایک مشترک دلچسپی اس وقت ایکٹروں کے انداز میں فوٹو اتروانا
تھی — اس شوق کے تحت اس نے حیرت انگیز انداز میں گندے بچے
آئے سے اپنی شکل بگاڑ کر اس میں عاشق سے فوٹو اتروایا تھا —
اس نے ہالی ووڈ کے عالمی شہرت یافتہ ایکٹر لان چینی جسے
MAN WITH A THOUSAND FACES
کا لقب دیا گیا تھا، کی نقل کی تھی ان دنوں لاہور کا ایک ایکٹر ماسٹر اسمٰعیل
بھی میک اپ کرنے کا استاد مانا گیا تھا۔

دیسیوں فلموں میں "دیسی ایکٹر انگریزی لباس میں" ہندی
ایکٹروں کی طرح ہیٹ پہن کر ہاتھوں میں پستول پکڑ کر نشانہ باندھ
کے پوز میں میں نے عاشق سے غیر معمولی فوٹو اتروایا۔

عاشق کے سٹوڈیو میں چند ملاقاتوں نے مجھے سعادت کے گھر
کا راستہ بتا دیا یا شاید بھائی ابوسعید مجھے اس کے ہاں پہلے لے
(گئے)۔ اس کا گھر کٹڑہ جیمل سنگھ (امرتسر) کوچہ وکیلاں میں تھا۔ امرتسر
میں شہر کے دوسرے بازاروں کی طرح مسلمانوں کی چند دکانیں
جو بزازی، کراکری، جوتوں اور ٹوپیوں کے کاروبار کے لئے مشہور
کوچہ وکیلاں کی آبادی شہر کے متمول مسلمانوں کے گھرانوں میں شمار
ہوتی تھی۔ یہ خاصی لمبی چوڑی گلی تھی جس کے شمال مغربی کونے پر سعادت
کا مکان واقع تھا، یہ کچھ فاصلے پر بند ہو جاتی تھی۔ مکان کی ڈیوڑھی
گلی کے ساتھ ملتی تھی اس کے داخلی دروازے کا پردہ اٹھا کر اندر
داخل ہوتے ہی آنے والے کی نظر سب سے پہلے بھگت سنگھ کی
پر پڑتی تھی، جس نے تین برس پہلے لاہور میں انگریز پولیس
سانڈرس پر بم پھینک کر ہلاک کر دیا تھا بعد ازاں اسمبلی میں بم
پھینک کر ہندوستان میں انگریز کے دہشت پسند تحریک چلا
سنسنی خیز دور شروع کیا تھا — غالباً ۱۹۲۹ء میں اخبار
سے پکڑے جانے کے بعد پھانسی کی سزا ملنے پر ہمارے اسکول
لڑکوں نے شیشوں کی کھڑکیاں توڑ کر اپنے غم و غصے کا اظہار
کانگریس اور سیاسی سرگرمیوں کا پنجاب کے ایک نہایت
مرکز کی حیثیت سے امرتسر کو ممتاز مقام حاصل تھا — کئی
مسلمان لیڈر بھی وہاں کی پیداوار تھے — ڈاکٹر کچلو، عطا
بخاری اور قاضی فضل حق وغیرہ — باری علیگ کی نمود
جانثار اور حسن عباس سے اسی فضا اور اسی شہر اور اسی کوچہ
ہوا جس نے بالخصوص منٹو کے ذہن کو کافی متاثر کیا۔ بھگت
شہید کا مجسمہ دیکھنے کے بعد میں نے کمرے کا جائزہ لیا، یہ
لمبا چوڑا تھا۔ میرے خیال میں اس کی لمبائی ۱۵—۲۰ فٹ

کرائی امارت کے قریب ہوگی۔ اس میں ایک لمبا چوڑا قالین بچھا تھا
ایک طرف لکھنے کا منشیانہ ڈیسک اور دیوار کے ساتھ چند کرسیاں
تھیں۔ گھوم کر دیکھا تو داخلی دروازے کی بائیں دیوار پر لگی دو تصویروں
نے چونکا دیا۔ یہ بالی وُوڈ کی باکمال، حسین اور مشہور اداکارہ سین
تھ اور اداکار رانلڈ کالمن کی تھیں اور داخلی دروازے کے اوپر شاید
سعادت حسن کے والد مرحوم کا فوٹو آویزاں تھا — باپ بیٹے کے نقوش
میں خاصی مشابہت تھی لیکن والد کے چہرے سے رعب اور درشتی
جھلکتی تھی۔ پگڑی اور جبہ پہنے وہ سراپا سرکاری ملازم لگتے تھے۔ سنا تھا
وہ سعادت کی آوارگی سے تنگ تھے — اس گھر میں بھی ہمارے گھر کی
طرح شدید سناٹا چھایا رہتا اندر سے کبھی کبھار کسی خاتون کی آواز
— یہ سعادت حسن کی سگی والدہ تھیں۔

جب جب میں سعادت کے ہاں جانے لگا میں نے اسے ہمیشہ
انگریزی کی کسی نہ کسی کتاب کا ترجمہ کرتے دیکھا۔ ان کا نام وغیرہ پڑھنے
اور موضوع جاننے کا مجھے بھی شوق پیدا ہوا۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں
بھی والد کی ایک لائبریری تھی جو بیشتر انگریزی کی کتابوں پر مشتمل تھی
تو مجھ میں انہیں پڑھنے اور سمجھنے کی ان دنوں تو قابلیت نہ تھی لیکن
ان کی چھپائی، جلدیں، کاغذ اور تصاویر دیکھنے اور نام معلوم کرنے
کا ضرور شوق پیدا ہوا۔ ان کتابوں میں سر والٹر سکاٹ کا نام مجھے
یاد تھا، جیسے یہ بڑی فخر کی بات ہو۔ میں نے منٹو کی مذکورہ کتابوں
کو بغور دیکھا تو ان میں سے ایک، تو وکٹر ہیوگو کی
پائی نیو جس کا سرگزشت
اسیر کے عنوان سے ترجمہ کر رہا تھا۔ دوسری کتاب آسکر وائلڈ
OSCAR WILDE کی ویرا VERA تھی جس کا
اس نے اسی عنوان سے ترجمہ کیا۔ انہی دنوں چند اردو کے رسالوں
اور دیگر کتابوں میں ایم۔ اسلم کی "گناہ کی راتیں" بھی دکھائی
دی۔ اسے پڑھنے کو جی چاہا لیکن منٹو سے ڈر گیا۔ بہرحال اسے ہمیشہ
کمرے کے ماحول میں بکھرے کپڑے پہنے، قالین پر بیٹھے کام کرتے دیکھا۔
لکھنے میں منہمک دیکھ کر میں اس سے بہت متاثر ہوتا۔ یوں
معلوم ہوتا کہ ترجمہ کرنا اس کا پیشہ ہے۔ مذکورہ کتاب کے ترجمے
کے اختتام پذیر ہو چلا گیا۔

کچھ عرصہ بعد جب سعادت حسن منٹو کی ترجمہ شدہ مذکورہ کتابوں
کے ساتھ ساتھ روسی اور فرانسیسی افسانوں پر مشتمل دو ایک اردو
رسالے دیکھے جن میں اس کا نام سرِ فہرست تھا، تو بڑی خوشی ہوئی
میں نے وہ تمام تراجم پڑھے جن کی بنا پر سعادت حسن کو کیا شہرت
مل گئی۔ خالی سعادت حسن کو نہیں، سعادت حسن منٹو کو۔ منٹو کا نام
سن کر مجھے پہلے عجیب سی ہنسی، عجب بھی گدگدی سی ہوئی کیوں کہ یہ
نام تو ایک انگریز جنرل، لارڈ منٹو کا تھا جس کا ذکر اور "کارنامے"
ہم نے اسکول میں تاریخ میں پڑھے تھے۔ روسی افسانوں کے مترجم
— منٹو — کا نام پڑھ کر کتنے لوگوں نے سمجھا وہ روسی ہے
ان دنوں ہندوستان میں انقلابِ روس، سرخ انقلاب کا
بہت چرچا تھا، باری علیگ بھی اسی قسم کا ایک انقلابی صحافی
گردانا جاتا تھا۔ اس نے اپنے نوساختہ گروپ "امرتسر اسکول آف
تھاٹ" جس میں بھائی جان، منٹو اور حسن عباس شامل تھے،
کے عنوان سے ایک گروپ فوٹو بھی اتروایا اور ایک انقلابی پرچہ
بھی نکالا جو شاید چند شماروں کے بعد حکومت نے بند کر دیا۔

لاہور کے ناشرانِ ادبی کتب سے رسائی سے منٹو کا تعارف
کروانے اور وہاں اسے کام دلوانے میں باری علیگ کا بھی ہاتھ
تھا۔ ایم اے او کالج اور علی گڑھ یونیورسٹی میں تعلیم لینا اور مالی
وجوہات کی بنا پر ادھوری چھوڑنے کے باعث منٹو کو فکرِ ذریعہ معاش
بنانا پڑا۔ اسے اپنی صلاحیتوں کا کچھ تو اندازہ ہو گیا تھا ورنہ ڈگری
کے بغیر ملازمت بھی کہاں ملتی تھی لیکن لاہور میں صحافی تراجم کے بعد
کوئی کیسے بندہ رہ سکتا تھا چنانچہ ایک دن پتہ چلا کہ وہ بمبئی
ہجرت کر گیا ہے۔ ان دنوں بمبئی میں اردو کا ہفتہ وار فلمی رسالہ
"مصور" بہت مقبول تھا۔ "غالب کشمیری (امرتسری) اس کا مدیر تھا
جب کہ نذیر احمد اس کا پبلیشر لاہوری تھا۔ اول الذکر کی سفارش
پر منٹو کو "مصور" میں ملازمت مل گئی۔ اور یوں مترجم سعادت
حسن منٹو افسانہ نگار، فلمی کہانی نویس اور صحافی کے روپ میں
منظرِ عام پر آیا..... اپنی افسانہ نگاری کے آغاز تا عروج کے
بارے میں وہ کہیں ایک جگہ کچھ یوں لکھتا ہے — "جب مجھ پہ
سب دروازے بند ہو گئے تو میرے دل پر کسی نے دستک دی
پوچھا کون ہو؟ جواب آیا — افسانہ! مجھے بھی آزما دیکھو"۔ اس
دلکش آواز پہ مشورہ درست تھا۔ کیوں کہ دیکھتے دیکھتے بمبئی میں

آئے پہلی نظر کیفی کی "ہیرا لال" ہندوستانی رنگین (ان دنوں ہاتھ سے
رنگی ہوئی فلم کو رنگین کہا جاتا تھا) فلم "کسان کنیا" کی کہانی لکھنے
کا موقع ملا۔ اس نے مسعود کا جیسا کہ اس نے بھائی جان کو لکھا "آدمی
نمبر ۲" تنہا، اکیلے نکال کر نہ صرف بمبئی کے فلمی حلقوں بلکہ اس عظیم فلم کے
بے مثال ڈائرکٹر شانتا رام سے خراج تحسین وصول کیا اور بطور صحافی
اپنا سکہ منوا لیا ("مسعود" کے تقریباً ہر شمارے میں احمد ندیم قاسمی
صاحب کا تازہ کلام بھی شائع ہوتا) اسی زمانے میں اس نے "ساقی" کے
لئے مختصر افسانے لکھنے شروع کئے۔ "ساقی" نے "منٹو" کو بحیثیت
افسانہ نگار انفرادیت حاصل کرنے اور اردو ادب کا ایک عہد ساز
افسانہ نگار بننے میں ایک مینار کا کام دیا، جو بدنام زمانہ "دھواں"
اور "بو" جیسے اُس کے بعض چند افسانوں پر مقدمے چلنے اور ایسا
سلسلہ قائم ہونے کا ایک تاریخی اور شخصیت ساز دور ثابت ہوا!
ساقی کو اردو کا پہلا ایسا ادبی رسالہ ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے
جو افسانہ نگاروں کو معاوضہ ادا کرتا تھا۔

کالج میں داخلہ لینے کے بعد ادب و فلم سے دلچسپی بڑھنے کی وجہ
سے مجھے منٹو کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہا — بھائی جان سے باقاعدہ
خط و کتابت سے اس کی روز افزوں ترقی کی خوشخبری ملتی رہتی۔
غالباً ۹—۱۹۳۸ء میں منٹو نے اپنی منگنی ہو جانے کے بارے میں
لکھا۔ لڑکی کا نام صفیہ تھا۔ کشمیری تھی۔ وہ بھی چشمہ لگاتی ہے
میں بھی چشمہ لگاتا ہوں — وہ اردو بولنے سے گھبراتی ہے جبکہ
میں انگریزی بولنے سے۔ خط میں کچھ اس طرح کی بے تکلفانہ
باتیں لکھی تھیں۔ مجھے اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ اس کی والدہ
کو بھی لڑکی پسند تھی کیونکہ ان سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ ان کے
بمبئی ہی میں انتقال سے اسے شدید صدمہ پہنچا۔

منٹو کی جلد ہی صفیہ سے شادی ہو گئی — اور —
ایک دن ملک کا مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اپنی نوجوان
بیوی صفیہ، اور آٹھ دس ماہ کے پیارے سے گول گول سے، بچے
آصف کے ساتھ ہمارے ہاں امرتسر آیا۔ یہ بچہ ماں باپ کی طرح
گورا چٹا لیکن ان دونوں، بالخصوص ماں سے کہیں زیادہ صحت مند
تھا ایک خوش شکل بچہ جسے LITTLE MANTO
بھی کہا جا سکتا تھا۔ منٹو اپنے اُجلے کپڑوں — سفید کرتہ پاجامہ
ہی اصلی ہنسی بکھیرنے لگا اس میں اس کے چوڑے دہانے کے چھدرے
دانتوں میں ایک بالائی سونے کا چڑھا دانت بھی ہنستا۔ فقرہ:
بے فکری، خوش کن اور صحت مندانہ ہنسی تھی "تم سب بمبئی آجاؤ
خواجہ (اس کا مخصوص بے تکلفانہ طرز تخاطب) کام کی فکر نہ کرو"
لیکن بھائی جان کی بھی شادی ہو چکی تھی اور ایک بچہ بھی ہو چکا تھا
میں نے بھی تعلیم مکمل نہ کی تھی، اس لئے منٹو کی پیش کش سے
مخصوص حالات میں استفادہ نہ کیا جا سکا۔ اب تو اپنی کشتی چلا
پڑی تھی ہم بمبئی کے بے پایاں انجانے سمندر میں کسی لائف جیکٹ کے
بغیر کس طرح چھلانگ لگا سکتے تھے — پھر دوسری عالمی جنگ کے
بادل چھا رہے تھے۔

منٹو بمبئی واپس چلا گیا جہاں سے کچھ عرصہ بعد ننھے آصف کے
یکلوتے بیٹا [illegible] کو بیمار ہو جانے کی المناک خبر آئی۔ گو عمر اسے
کو ہمارا گھر بھی بہت پیارا تھا لیکن اس کا یہ ملنا تو جیسے ایٹم بم پھٹنے
پیش خیمہ تھا

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئے دو تین برس ہوئے تھے کہ بھائی
جان آل انڈیا ریڈیو سے بطور اسسٹنٹ پروڈیوسر منسلک ہو گئے
ان دنوں یہ انتہائی GLAMOROUS یا عزت اور معقول [illegible]
کی نوکری سمجھی جاتی تھی اور حقیقت بھی یہی تھی۔ ڈائرکٹر جنرل کی حیثیت
سے [illegible] احمد شاہ بخاری نے دہلی سٹیشن میں چوٹی کے ادیب جمع
کر لئے تھے۔ ان میں کرشن چندر کا نام سر فہرست تھا۔ فلم سازی [illegible]
چند برس [illegible] کا [illegible] ریڈیو [illegible] منٹو کی کشش
اور آپا صفیہ کا ایک قابل عزت [illegible] معقول آمدنی کی
ملازمت کو ترجیح دینا، یہ سب مل ملا کر [illegible] دہلی ریڈیو اسٹیشن کے
ادبی محاذ میں شامل ہونے پر منتج ہوئے اور دونوں دوست (ابو
اور منٹو) ایک ہی بلڈنگ (حسن بلڈنگ، کشمیری گیٹ) کی بالائی
نچلی منزلوں میں [illegible] کے [illegible] پڑوسی بھی بن گئے اس
کہ ہم اپنی دیوار پر سے جھک کر منٹو سے باتیں کر سکتے تھے۔

یہاں انگریزوں کے دنوں کا ایک مزیدار واقعہ یاد آیا [illegible]
[illegible] تھی۔ دن کے گیارہ بجے کا عمل ہوگا کہ منٹو کے کسی
گالیاں دینے اور پیٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد عمل کے
طور پر [illegible] رہا تھا۔ کوئی لڑکا۔ میں نے دیوار پر سے جھانک

منٹو کو کمتہ آتا رے پاجامے کے پائنچے ٹخنے میں اُڑسے ننگ
۲۲ انچ چوڑی چھاتی نکالے، ہاتھ میں پتلی سی چھڑی لیے
نے کے لئے یا تھوڑی سا تھا۔
"کیا ہوا خواجہ؟" بھائی جان نے اُوپر سے پوچھا۔
"حرامزادہ چوری کر رہا تھا۔"
منٹو کا ہاتھ شاید پہلی مرتبہ کسی پر اس طرح اُٹھا تھا جیسے
طالب علمی کے زمانے میں کالج کے سامنے اس کے ایک ہم جماعت
لڑکے نے ایک دودھ ہی کی دکان سے لڑائی کے دوران
ڈنڈا کر اسے دے مارا تھا۔ منٹو نے اس کے بدلے، اس ہتھیار
سے کہیں موثر قلم کا آلہ سنبھال کر ایسے سماج دشمن افراد
وہ سماجی اقدار کے خلاف استعمال کرنے کی قسم کھائی تھی
گو ریڈیو کے نئے میڈیم پر اس نے کمال قدرت حاصل کر لی
نتیجے میں اس نے سو سے زیادہ کامیاب ڈرامے اور فیچر
ٹیلیشن کی گھٹن اور یک رنگی اس کے مزاج کے منافی ثابت ہوئی
اس دوران بی۔ بی۔ سی کے لئے ایک خصوصی ڈرامہ بھی لکھ کر
بھیجا۔ مجھے معلوم نہیں اس کا کیا بنا۔ وہ اکثر اپنے دو غیر فلمائے
سکرپٹ پڑھ کر سناتا۔ "خود دو" اور "مرزا غالب" جو اس
اس کے، علی الترتیب پروڈیوسر ڈاکٹر محبوب اور سہراب
کے لئے لکھے تھے، گو "مرزا غالب" نامکمل تھا۔ اس پر
تیق کی تھی۔ اس نام کی سہراب مودی کی فلم اس سکرپٹ پر بنی تھی۔
ایک ڈیڑھ برس بعد اس نے پھر بمبئی کی بانہوں میں سکون پایا۔
"فلمستان" سے منسلک ہونے کے بعد اس کے مستقل کہانی
اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے اس کی ہر فلم میں تحریری رول ادا کیا
تھی۔ "آٹھ دن" ایک لحاظ سے خاص طور پر یادگار رہے
کہ اس میں اس نے ایک دیوانے کا رول ادا کیا۔ اس کا
"ایٹم بم" ملکتے پھرنا اب تک یاد ہے۔ اس کی آواز
تیز بولتا تھا الفاظ کی ادائیگی اور تلفظ بھی صاف نہ تھے
کے دوران اس کے چہرے کے تاثرات اور حرکات اس کے ابلاغ
سنبھالتے۔ اثر انگیز تھے۔ سولہ ستر برس پہلے اس کی ان چینی
میک اپ میں فوٹو اُتروا کر اداکار بننا اس کے اداکار بننے کی
خواہش ظاہر کرتا تھا۔ اچھے مکالمے اور ڈرامے لکھنا اس کی

بات کے منتظر تھے۔ لیکن وہ صرف ایک ایسے خوفزدہ بچے سے ملتا
تھا جو چہرے پر خوفناک خول چڑھا کر دوسروں کو ڈراتا پھرتا ہے۔
"فلمستان" میں قیام کے دوران اس نے میری فلمی فن سے
پیشہ ورانہ عملی دلچسپی کی وجہ سے مجھے بمبئی آنے کی دعوت دیتے ہوئے
ایک خط میں لکھا "اسے یہاں بھیجو۔ "فلمستان" میں جس شعبہ میں
کام کرنا پسند کرے اس میں سیٹ کروا دوں گا۔" اپنی پہلی مصروفیت
کے باعث میں اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا۔

اس دوران میں اس پر تین افسانوں، دھواں، بو اور
کالی شلوار پر فحاشی کے الزام میں تین مقدمے چل چکے تھے جن میں وہ
ہر ایک میں باعزت بری کر دیا گیا تھا۔ دراصل اس کا اصلی تخلیقی
جوہر افسانہ نگاری میں ہی کھلا جس میں اس نے منفرد مقام حاصل
کر لیا تھا۔

قیام پاکستان کے اگلے سال وہ مادرِ وطن کی آغوش میں پلٹا،
بمبئی سے ہجرت کی۔ نئے معاشرے کے مسائل، کردار اور ایسا مضمون
پر لکھنے کے لئے بے شمار موضوعات اس جیسے بے باک ادیب کے منتظر
تھے فرقہ وارانہ فسادات میں خون کی ہولی اور انسانی بربریت کی
خونچکاں داستانیں ابھی دیکھنے سننے میں آ رہی تھیں، ان سے متاثر
ہو کر "سیاہ حاشیے" جیسے افسانے اور "ٹھنڈا گوشت"، "کھول دو"،
"اوپر نیچے درمیان" جیسے تہلکہ مچانے والے افسانے لکھے۔
ماپساں کی طرح اکثر بے دھڑک ایک افسانہ ایک ہی رفتار سے لکھا۔ لکشمی
بلڈنگ کے اپنے فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں صوفہ، کرسی پر آلتی پالتی مار کر
بیٹھا دائیں گھٹنے پر رکھے بڑے سائز کے پیڈ یا تختی پر کاغذ جھکا
وہ پارکر سے باریک، الفاظ میں عموماً ایک نشست میں کاٹے بغیر وہ
حیران کن ذہنی استعداد اور تیز رفتاری سے لکھتا۔ یہ نفسیاتی دباؤ
کے نکاس اور مالی تقاضوں کا نتیجہ تھا مگر اس کے گھر والوں کو اس بات کی
شکایت تھی کہ اپنی کفالت کے لئے انہیں دوسروں کا دست نگر ہونا
پڑتا کیونکہ اب وہ تین بیٹیوں کا باپ تھا۔
اس نے "ٹھنڈا گوشت" لکھ کر پاکستان میں پہلا ادبی دھماکہ
کیا۔ یہ افسانہ انسانی بربریت پر شدید ضرب تھی کہ فسادات میں
انسان اتنا اندھا ہو گیا کہ اس نے نعش تک کو اپنی ہوس کا نشانہ
بنانے سے دریغ نہ کیا لیکن محتسب نے اسے مخربِ اخلاق قرار دیا

ایک ایسی تحریر جس کا مقصد اُس کی نظر میں جنسی لذت پسندی کا
سامان فراہم کرنا تھا۔ اسکے نتیجے میں اس پر فحاشی کے الزام میں مقدمہ
قائم کیا گیا۔ میں ان دنوں نفسیات و فلسفہ کا لیکچرر تھا اور تجزیہ نفسی
سے خصوصی دلچسپی رکھتا تھا، افسانہ نگاری میں ابھی قدم رکھا
تھا۔ منٹو وغیرہ کی ہر تحریر پڑھی تھی۔ اس سے دیرینہ برادرانہ تعلقات
کی بنا پر بھی مجھے صفائی کے گواہوں میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا
میں نے "ٹھنڈا گوشت" بغور پڑھا اور اسکی صفائی میں
پیش ہونے کیلئے خود کو تیار کر لیا۔ یہاں شاید یہ کہنا بے جا نہ ہو
کہ برق رفتاری سے لکھی ہوئی منٹو کی بیشتر تحریریں، بالخصوص افسانے
جو اُس نے قیام پاکستان کے بعد لکھے تھے، اُن کا ادبی معیار،
اس کے اپنے معیار سے بھی کہیں کمتر تھا۔

خیر مقدمہ پیش ہوا۔ عابد صاحب کے بعد دوسرے نمبر پر
مجھے گواہی دینے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں نے اپنے بیان میں کہا کہ یہ
افسانہ قطعاً فحش نہ تھا، کیونکہ فحاشی نفسیاتی طور بنیادی طور پر
ایک انسانی ردِ عمل ہے، ٹھنڈا گوشت پڑھنے کے بعد قاری
پر برعکس تاثرات طاری ہوتے ہیں۔ ایشر سنگھ کی ناگفتہ بہ کیفیت
فسادات کی انتہائی بربریت پر خوفناک حملہ ہے، ایک انسان
دوست ادیب کی چیخ ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اس پہلو پر کسی صفائی
کے گواہ نے زور نہ دیا بلکہ عدالت کو اس طرف متوجہ ہی نہ کیا۔ مزید
برآں میں نے یہ بھی کہا (جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے) کہ ایسی
تحریر ناپختہ قاری کیلئے مقصود نہیں ہوتی۔ افسانے میں کرداروں
کی زبان ان کی نفسیات کے مطابق اور فطری ہے۔ قطعاً فحش
نہیں ہے۔

تاہم اس عدالت نے اس افسانے کو فحش قرار دیتے ہوئے
ملزموں کو سزا دے دی۔ گو اسکے خلاف سیشن میں فوراً اپیل کر کے
انہیں بری کر دیا گیا۔ فاضل جج نے اپنے فیصلے میں انتہائی بیدار
مغزی اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے لکھا کہ یہ سوسائٹی
کی عکاسی کرتا ہے اس لئے اسے اسی شائستگی کے نظریے سے نہیں جانچنا
چاہیئے۔

لیکن حیرت کی بات ہے کہ "ٹھنڈا گوشت" کے بعد منٹو پر
فحش نگاری کے الزام میں "کھول دو"، "اوپر نیچے درمیان"
کی وجہ سے بھی مقدمے چلے۔ ان میں بھی وہ بری کر دیا گیا۔ ان
ایک کی صفائی کے ضمن میں مجھے اپنی جیمز جوائس کی "یولیسز"
کاپی منٹو کو بھجوانے کا اعزاز حاصل ہوا کیونکہ اس میں اس کی
اور اس کی تنسیخ کے دونوں فیصلے شائع کئے تھے۔ ان کا اردو
"لذتِ سنگ" میں بھی شائع کیا گیا۔

قیام پاکستان کے چھ سات برس بعد اسکے فلمی مرکز
لاہور میں سالانہ سات آٹھ فلمیں بننے لگیں۔ ان میں منٹو
دو تین کہانیاں اور سکرپٹ لکھے۔ "بیلی"، "آغوش" اور
"نمبر ۹" ان کی جو درگت بنی اور منٹو کو ان کا جتنا اور جیسے
ملا وہ باعث شرم تھا۔ اور اب وقت آ گیا تھا جب اُسے
رہنے کیلئے نہیں بلکہ اپنے زہر اُس کی تسکین اور معاشرے کی
دشمنی سے بچنے کے لئے اس کے پاس ایک موثر علاج باقی
کثرتِ شراب نوشی (DIPSOMANIA) اس کے
شرابی دوست، ادبی بونے، اس کی بغل میں بیٹھ کر یا
کندھوں پہ سوار ہو کر اس کی قربت اور شہرت حاصل کرنا
تھے جس کی خاطر انہوں نے اُسے مفت کی شراب پلا پلا کر
پرانی عادت کو خوفناک مرض میں بدل دیا تھا۔ گو وہ پہلے سے
تھا لیکن ایک ثانوی حیثیت رکھنے کی بجائے اب یہ اس کا
مقصد ہو گیا جس سے اسے ناقابل بیان دکھ پہنچا ناگزیر
دیکھتے دیکھتے اسے شراب نے چبا کر رکھ دیا، وہی حشر
عرصہ ہوا سہگل کا بمبئی میں ہوا تھا۔ یوں تو اسکے افسانوں
میں اس کی صاف علامات ملتی تھیں ... کہ اس کا ذہنی شیرازہ
بکھر رہا تھا۔ جیسے پھولوں کا گلدستہ کھل کر بکھر گئے، اس کو
NEURATIC BREAKDOWN ہو گیا تھا:
کیسے کیسے پاگل خانے، پھر ہسپتال میں داخل کروایا گیا۔
مرض کی شدت میں کمی ہو گئی، عارضی افاقہ بھی ہوا
نوشی سے پرہیز کرنے سے اُس کی زندگی میں چند سالوں کا
ہو جانا بھی ممکن تھا لیکن DIPSOMANIA نے اُسے
چنگل میں دبوچ لیا۔ جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ دراصل اسے
نفسی کروانے کی ضرورت تھی گو کہ یہ ایک طویل ذریعہ علاج
مریض کو اس کے لئے آمادگی ظاہر کرنی چاہیئے۔ بہر طور ہم نے

آزماد یکھا چاہا۔ ہمارے ایک چچازاد بھائی۔ پروفیسر ایم۔ اے
یشی مرحوم ایک نہایت ہی کامیاب، ملکی شہرت کے مالک تھے جو منٹو
ذاتی طور پر بھی جانتے تھے۔ انہیں منٹو کے گھر کے معائنہ کے لئے
جایا گیا۔ لیکن یہ تریاق بھی بہت دیر، سالوں بعد پہنچا۔
پھر۔ منٹو کے ایک بدنام شرابی ہونے کے افسانے عام
ئے۔ وہ اپنے علاج کے لئے ٹیکہ لگوانے کیلئے روپے حاصل
ے کیلئے ہر کس و ناکس کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بھی نہ شرماتا
..... کل کا ایک خوددار اور حساس سعادت حسن منٹو! انہی
سردیوں میں وہ مجھے کالج میں ملنے آیا۔
کیا تمہارے پاس پانچ روپے ہوں گے مجھے ٹیکہ۔۔"
نے کہا۔
یہ انیس برس پہلے آٹے سے میک اپ کر کے بگاڑے ہوئے
ے سے کہا۔ جیسے ڈاکٹر جیکل مسٹر ہائیڈ بن گیا ہو۔
مستقلاً۔

اس کے باوجود سعادت حسن منٹو کے انتقال کی وجہ سے دکان
ہے گی، "کا نوٹس پڑھ کر مجھے صدمہ ہوا ہے۔"

فارم IV
رول (۸)

تفصیل بابت ملکیت وغیرہ

ار کا نام — شانِ ہند
فہ اشاعت — ماہنامہ
بان — اردو
ام اشاعت : فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ر پبلشر ایڈیٹر اور مالک کا نام :۔ ودیا پرکاش سرور
میت — ہندوستانی
ل پتہ :۔ فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲
ودیا پرکاش سرور تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین
طابق درست ہیں۔ ودیا پرکاش سرور پبلشر۔ یکم مارچ ۱۹۹۲ء

غزل

عبدالحکیم شاہد رتلامی

آنکھوں سے دل کے خون کی برسات ہے تو ہے
کچھ بھی ہو تیری دی ہوئی سوغات ہے تو ہے
لوگوں نے جانے کتنے فسانے بنا لئے
اس آدمی سے صرف مری بات ہے تو ہے
لرزاں دکھائی دیتے ہیں ہر پل جو موت سے
اجزائے زندگی یہ تجھے مات ہے تو ہے
گھبرا رہے ہو کس لئے اے گردشِ حیات
لمحہ بہ لمحہ جب تو مرے ساتھ ہے تو ہے
چاہت میں تیری ہو گیا رسوا تو غم نہیں
اس میں بھی تیرا ذکر تری بات ہے تو ہے
ہنس کر قبول کر لیا جس نے غمِ حیات
ارض و سما میں ایک مری ذات ہے تو ہے
شاہد طویل ہے شبِ ہجراں تو غم نہیں
ہوگی کبھی تو اس کی سحر رات ہے تو ہے

غزل

سید سرفراز علی کاشف کنڈرکی

ہاتھ اٹھتے ہیں دعا کو نہ دوا مانگے ہے
زخمِ دل بس ترے دامن کی ہوا مانگے ہے
مانگنے کو تو بہت کچھ ہے تری دنیا میں
پر مرا ذوقِ طلب بوئے وفا مانگے ہے
دید ہو جائے جو اک تو غنیمت جانو!
جذبۂ عشق تو کچھ اور سوا مانگے ہے
اک نظر چہرۂ پُرنور دکھا دے ہم کو
مانگ لے اس کے عوض ہم سے وہ کیا مانگے ہے
تلخیٔ ہجر گوارہ ہے ہمیں ہر صورت
دل کو کیا کیجئے جب قرب ترا مانگے ہے
دل کے بہلانے کو اے کاش وہ کہدیتے کبھی
آرزو کیا ہے تری مانگ لے کیا مانگے ہے
بے وفا تم کو وفاؤں کا صلہ دیں کاشف
دل بھی کیا ہے کہ اندھیروں سے ضیا مانگے ہے

چودھری افضل حق آپ کو روکتے اور کہتے علامہ صاحب جیل بھگتنا آپ کے بس کی بات نہیں، وہاں بڑی مصیبتیں اور ذلتیں اٹھانا پڑتی ہیں مگر علامہ حسین میر نہ مانے آپ پشاور گئے وہاں کسی جلسے میں آپ نے سیاسی تقریر کر دی اور گرفتار ہو کر جیل چلے گئے جب مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تو ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کر دیا لہذا انھیں بی کلاس دے کر کہا گیا آپ جیل میں دو چار روز رہ کر سوچ لیں کہ آپ کو ضمانت پر رہا ہونا ہے یا نہیں۔ مجسٹریٹ نے دو چار روز کی آپ کو مہلت دی جب دوبارہ علامہ صاحب مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تو پھر دوبارہ ضمانت پر رہا ہونے سے انکار کر دیا سی آئی ڈی سخت پریشان ہوئی۔ انھوں نے آغا صاحب کی بی کلاس ختم کرا دی تو آپ دوسرے روز ہی ضمانت پر رہا ہو کر لاہور چلے آئے جب چودھری افضل حق کے دفتر میں ملاقات کرنے کیلئے گئے تو چودھری صاحب بہت حیران ہوئے اور کہا علامہ صاحب ابھی تو آپ کی ضمانت دینے کیلئے پشاور جا رہا تھا آپ واپس کیسے آ گئے علامہ صاحب ہنس کر فرمانے لگے چھوڑ یار چودھری جیل بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے میں کہاں چلا گیا وہاں نہ نظم، نہ دھوپ ہوتی، نہ دوستوں کی محفلیں، نہ سیخ کباب نہ ہنسی مذاق، چاروں طرف اونچی اونچی کالی دیواریں، لوہے کے جنگلے چپ چاپ موت کا سناٹا میں نے سوچا جب ہم باہر انگریز سے عدم تعاون کرتے ہیں تو جیل کا بھی عدم تعاون ہونا چاہئے، انگریز بہادر نے کہا جیل نہ جاؤ میں نے کہا ضرور جاؤنگا انگریز نے کہا جیل میں رہو، میں نے کہا جیل میں میرا جی تنگ رہتا ہے، لہذا میں جیل پر لعنت بھیج کر چلا آیا ہوں، مقصد تو انگریز کو خراب کرنا تھا وہ میں نے کر دیا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ جماعت اہلحدیث کے رہنما تھے جو علامہ حسین میر کاشمیری کو تبلیغی کانفرنس میں دہلی اپنے ساتھ لے گئے جب گاڑی دہلی اسٹیشن پر پہنچی تو علامہ صاحب کو علم تھا کہ استقبال کرنے والوں کا ہجوم بے پناہ ہوگا آپ نے مولوی ثناء اللہ کا عمامہ چھین کر ڈبے کے دروازے میں کھڑے ہو گئے مولانا ثناء اللہ مقابلتاً نحیف الجثہ تھے علامہ صاحب ان سے کہنے لگے مولانا لوگ جلوس نکال رہے ہیں میں آپ کیلئے راستہ بناتا ہوں آپ فوراً اترنے کی کوشش کیجئے گا۔

ریل گاڑی پلیٹ فارم پہنچی تو ہجوم کے نعرہ ہائے تکبیر سے اسٹیشن کی فضا گونج اٹھی، علامہ صاحب دونوں ہاتھوں سے دھڑا دھڑ سلام کرتے جاتے تھے عام لوگ انھیں پہچانتے نہ تھے، انھوں نے علامہ حسین میر کاشمیری ہی کو مولوی ثناء اللہ امرتسری سمجھ کر ہاروں سے لاد دیا، ادھر مولانا ثناء اللہ بے چارے ڈبے میں بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے جلوس یہ جا وہ جا۔

اسی طرح ایک دفعہ یونٹی کانفرنس الہ آباد میں منعقد ہوئی تو علامہ حسین میر کاشمیری پنجابی وفد کے سیکرٹری بن کر ساتھ گئے، اس زمانہ میں ریل گاڑی میں ریزرویشن کا کوئی سوال نہ تھا سبھی لیڈر سکنڈ کلاس ڈبے میں سوار تھے راستے میں مختلف اسٹیشنوں پہ اس وفد کا استقبال ہوتا رہا اور علامہ حسین میر کاشمیری اس وفد کی راستے میں خوب خاطر مدارات کرتے رہے مولانا ظفر علی خاں نے اپنا اور ساتھیوں کا ٹکٹ خریدنے کے لئے جو روپے علامہ صاحب کو دئیے تھے وہ سب روپے راستے میں انھوں نے اس وفد کی خاطر مدارات پر اڑا دئیے مگر آپ نے ٹکٹ لینے کے بجائے پلیٹ فارم خریدنے پر اکتفا کیا اور سفر بغیر ٹکٹ کے کٹ گیا البتہ الہ آباد سے ایک یا دو اسٹیشن ادھر تمام وفد کے ٹکٹ بنوا لئے جب اسٹیشن سے باہر نکل کر علامہ حسین میر کاشمیری کی اس حرکت کا پتہ چلا تو وفد کے تمام لوگ ششدر رہ گئے مگر علامہ صاحب قہقہے لگاتے ہوئے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

ان کی ظرافت طبع کا یہ عالم تھا کہ اپنی بیوی کی موت پر انتہائی مغموم تھے، عزیز، رشتے دار وغیرہ کفن پر گیری سے قرآن آیات لکھوانے لگے تو علامہ حسین میر کاشمیری کی رگ ظرافت پھڑکی نہایت سنجیدگی سے فرمایا، بھائی پارسل پر پتہ صحیح لکھنا کہیں غلط پتہ لکھنے پر اللہ میاں پارسل واپس نہ کر دیں۔ غرض ظرافت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک دفعہ ان کے دوستوں نے بہت مجبور کیا کہ علامہ صاحب دعوت کریں پہلے انکار کرتے رہے بعد میں مان گئے، سب دوستوں کو دعوت پر بلا لیا پھر انھیں کمرے میں بٹھا کر باہر سے تالا لگا کر چل دیئے، احباب کچھ دیر تک علامہ صاحب اور ان کے کھانے کا انتظار کرتے رہے بعد میں محلے والوں کو پتہ چلا تو انھوں نے تالا توڑ کر مہمانوں کو رہا کیا۔

علامہ صاحب آئے دن نئی نئی سوچتے تھے ایک مرتبہ شرارت سوجھی تو لاہور کے ایک تھانے میں بطور تفریح طبع کلرک بھرتی ہو گئے چنانچہ لفافوں سے ٹکٹیں اتار اتار کر انھیں بیچ بیچ کر آس پاس والوں کی خاطر تواضع کا حق ادا کرتے رہے جب کوئی علامہ صاحب سے پوچھتا مولانا آپ کے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی ہے جو آپ فراخدلی سے مہمان نوازی پر خرچ کرتے ہیں؟ علامہ صاحب مسکرا کر فرماتے! فلاں سیاست کا کرتا دھرتا ہوں، مجھے کرنے کیلئے کوئی کام نہیں ہے اس لئے یکسانیت کو توڑنے اور محض جی بہلانے کیلئے یہاں ملازم ہو گیا ہوں ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ نوکری اسکے ساتھ ہی یہ کہہ دیتے بھائی میں تو پیسے کو ہاتھ کے میل کے برابر سمجھتا ہوں۔

آخر ایک روز علامہ کی طبیعت وہاں سے بھی اچاٹ ہوئی اور نوکری چھوڑ کر وہاں سے آنے لگے تو ان کی جگہ سکھ کلرک آیا وہ آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا اور آپ سے خوشحال بننے کا نسخہ دریافت کرنے لگا۔ آپ نے حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر اسے بھی اپنا صدری نسخہ یعنی ٹکٹیں اتار کر بیچنے کا بتا دیا۔ سردار جی علامہ حسین میر کاشمیری کے صدری نسخے پر عمل کرتے ہوئے آپ کے نقش قدم پر چلتے رہے، کچھ دنوں تک تو آپ نے خوب مرغ اڑائی آخر بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی ایک روز سردار جی رنگے ہاتھوں پکڑے گئے انھیں ہتھکڑی لگی اور وہ جیل کی ہوا کھانے لگے۔

امرتسر میں مولوی محمد صادق علامہ حسین میر کاشمیری کے جگری دوست تھے دونوں کی آپس میں خوب نبھتی تھی ایک روز علامہ صاحب نے مولوی محمد صادق سے کہا مولانا مرغ کانفرنس ہونا چاہئے مولوی محمد صادق نے جواب دیا کہ ضرور ہونا چاہئے مولوی محمد صادق کے چھوٹے بھائی محمد اسلم نے ایک موٹا تازہ مرغ پال رکھا تھا۔ مولوی محمد صادق نے محمد اسلم سے کہا بھائی اسلم اپنا مرغ بیچ دو اور مجھ سے اس کے پیسے لے لو مگر محمد اسلم نہ مانا اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ بھائی یہ مرغ اصیل ہے اور میں نے اسے بڑی محبت اور محنت سے پالا ہے میں اسے ہرگز نہ دوں گا۔ مولوی محمد صادق نے محمد اسلم کو پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا یا اسلم تم باز آ جاؤ، اپنا مرغ میرے ہاتھ بیچ دو تم اپنے پیسے لے لو مگر محمد اسلم نہ مانا تب مولوی محمد صادق نے کہا اسلم تمہارا مرغ حلال ہوگا ضرور ہوگا اور خود تمہارے ہاتھ سے ہوگا اور تم بھی ہمارے ساتھ مرغ کھاؤ گے مگر اسلم نے مولوی صادق کی ایک نہ مانی۔

ایک ماہ کے بعد مرغ کانفرنس منعقد ہوئی مولوی محمد صادق نے تاؤ کھا کر مرغ منگوائے اور ان کے ساتھ ہی محمد اسلم کا بھی مرغ حلال کرا دیا محمد اسلم کو مولوی محمد صادق کی اس چال کا پتہ نہ لگا مولوی محمد صادق نے محمد اسلم کے ہاتھ سے اپنے دوستوں کو دعوت نامہ بھیجا۔ دعوت نامے کے نیچے یہ لکھا ہوا تھا شعر ۔ "لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا" اب یہ دعوت نامے محمد اسلم نے دوستوں میں بانٹ دیے۔ رات کو تمام دوست جمع ہوئے انھوں نے مرغ کی دعوت خوب اڑائی، جب کھانا کھا چکے تو مشتاق کیوں سے محمد اسلم آخر میں کھانے لگے۔ مولوی محمد صادق نے علامہ حسین میر کاشمیری سے درخواست کی کہ مرغ کانفرنس کی صدارتی تقریر ہونی چاہئے علامہ صاحب نے پہلے تو مرغ کانفرنس کی خوب خوب تعریف کی پھر بعد کہ میں اس خوبصورت دعوت کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور مولوی محمد صادق کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آئندہ اتنی اچھی دعوتیں کیا کریں۔ مولوی محمد صادق اٹھے اور کہا کہ مبارکباد کا ہرگز مستحق نہیں ہوں بلکہ اس دعوت کی مبارکباد کا چھوٹا بھائی محمد اسلم ہے جس نے نہ صرف اپنا جان قیمتی مرغ اس دعوت کیلئے قربان کیا بلکہ ایک ایک دوست کے گھر خود جا کر دعوت نامے تقسیم کئے ہیں۔

اس وقت محمد اسلم مرغ کی ٹانگ پکڑے روٹی کے ساتھ کھا رہا تھا اس نے جب سنا کہ اس کا مرغ بھی دعوت میں حلال ہو گیا ہے تو چیخ مار کر اٹھا اور پاگلوں کی طرح چلاتا ہوا تمام کمروں میں اپنے مرغ کو ڈھونڈنے لگا اور ساتھ ساتھ زاروقطار رونے لگا کہ ہائے میرا اصیل مرغ نے حلال کر دیا۔ اس کے یوں شور مچانے پر تمام محفل ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ علامہ حسین میر کاشمیری نے کہا بھائی اسلم اب صبر کرو خدا کو یہی منظور تھا کہ یہ مرغ قوم پر قربان ہو جائے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ وہ مرغ بے چارہ تمہارے پیٹ میں چلا گیا جو تھا تمہارا مرغ اب پھر کبھی کیا مل سکتا ہے؟ اسلم میں تمہارے مرغ کے غم میں نہایت عمدہ مرثیہ کہوں گا تم فکر نہ کرو۔

محمد اسلم نے اپنے مرغ کے غم میں دو دن تک روٹی نہ کھائی علامہ حسین میر کاشمیری کا موڈ میں ہوتے تو یہ شعر گنگنایا کرتے

تعریف اس خدا کی جس نے پلاؤ بنایا
کیسی بنائی بوٹی کیا شوربہ بنایا

دلّی کا تاریخ ساز مشاعرہ - ایک جائزہ

نمائندہ روزنامہ قومی آواز

مشاعرے کسی زمانے میں تہذیب کا ایک حصہ ہوتے تھے۔ دلی کی بزمِ شمع اس تہذیب کا ایک ورثہ ہے، دلّی کی بدلتی تہذیب میں مشاعرے مثال کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک لال قلعہ کا مشاعرہ (جو اب ادبی اکھاڑہ بن چکا ہے) اور دوسرا شنکر شاد مشاعرہ جو لالہ مرلی دھر میموریل سوسائٹی کے زیرِ اہتمام پچھلی دو دہائیوں سے اپنی شان برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس مشاعرہ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ہر سال پاکستان سے شاعر مدعو کئے جاتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مشاعرہ ثقافتی اہمیت کا حامل ہے۔

اس سال یہ مشاعرہ ماڈرن اسکول (بارہ کھمبا روڈ) کے ہال میں ہوا۔ دلی کے لفٹنٹ گورنر مسٹر شیدر لال کھورانہ اس مشاعرے کے مہمانِ خصوصی تھے، منتظمین نے چیدہ چیدہ شاعروں کے انتخاب کا اہتمام کیا تھا۔ یہ وہ شاعر تھے، جن کے ادبی مقام اور مشاعرے میں کامیابی اب مسلّم امر بن چکی ہے اور ان کی موجودگی مشاعرہ کی کامیابی کی دلیل ہوتی ہے اور سامعین ان کا کلام سننے کیلئے دیر تک انتظار کر سکتے ہیں۔

اس سال شنکر شاد کے اس مشاعرہ میں اسٹیج سے لیکر سامعین تک سکوت اور سوگ کا ماحول رہا۔ جوش اور فراق کے وصال نے مشاعرے پر اپنے روایتی رنگ پر پردہ ڈال دیا۔ سامعین زور سے واہ کہنے سے احتراز کرتے رہے اور بہت سے شاعر ہوٹنگ کی اذیت سے بچ گئے۔

مشاعرہ کی کامیابی جہاں اچھے کلام پر منحصر ہے وہیں اچھی نظامت کا بھی اس میں بڑا ہاتھ ہوتا ہے کسی بھی مشاعرے اور خاص طور سے بڑے مشاعرے کی نظامت آسان نہیں ہوتی اس کیلئے اسی مشاقی کی ضرورت ہوتی ہے جو ہنر کیلئے لازم ہے۔ ناظم کا شاعروں کو ان کے حسبِ مرتبت اور حسبِ مذاق سامعین سے متعارف کرانا مشاعرے میں رنگ بھرنے کے مصداق ہوتا ہے لیکن افسوس ہے کہ اس بار اس مشاعرے کی نظامت اس انداز سے ہوئی کہ بعض شعراء بہت پست قد ہو گئے، کچھ کو تو تین تین بار (ایک ہی باری میں) پڑھنے کی اجازت دی گئی اور بعض شاعروں کو کندھا پکڑ کر ڈائس سے ہٹایا گیا جبکہ سامعین "ونس مور" کی آوازیں لگاتے رہے۔

اس مشاعرہ کا آغاز حسبِ معمول شنکر و شاد کے کلام سے ہوا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر بشیر بدر نے انجام دئیے اور صدارت اختر الایمان کے سپرد ہوئی۔ مشاعرہ بہت سست رفتاری سے شروع ہوا۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنے مخصوص ترنم سے یہ غزل پیش کی

گُڑیا گڑیے کو بیچا خرید لیا ۔ گھر سجایا گیا رات بازار سا

بات کیا ہے کہ مشہور لوگوں کے گھر ۔ موت کا سوگ ہوتا ہے تیوہار سا

اشوک نرائن شرر نے "وزبان" کے شعر پیش کئے

لازم تھا ہم سفر ہو کوئی راہِ زیست میں

قسمت نے میرے حق میں غمِ دل بنا دیا

ڈاکٹر بشیر بدر نے موقع کی نزاکت کو نظر انداز کرتے ہوئے، یا شاید مشاعرہ اٹھانے کیلئے پاکستان کی شاعرہ صبیحہ صبا کو دعوتِ سخن دی محترمہ صبیحہ صبا نے داد سے بے نیاز تحت میں دو غزلیں پیش کیں

بہت دنوں میں اسے اتنا میں نے سمجھا تھا ۔ وہ دوستی میں نہیں دشمنی میں اچھا تھا

ذرا کہو تو سہی دل میں ہے کدورت کیا ۔ کہ برتنوں کو چھلکنے کی ہے ضرورت کیا

صبیحہ چونکہ پہلی بار اس مشاعرے میں شریک ہوئی تھیں اس لئے جب پہلے کے راہی شہباز کا نام پکارا گیا کہ وہ بھی پہلی بار اس مشاعرے میں آئے تھے انہوں نے اپنی نظم "واپسی" سنائی اور فرمائش پر تاج محل نظم پیش کی دونوں نظمیں پسند کی گئیں۔

محترمہ شبنم زکا پنوری نے بھی دو غزلیں پیش کیں

اپنی آواز کو ترسنے لگی ۔ زندگی تو مجھے کہاں لائی

سامعین پر سناٹا چھایا رہا لطف کی بات یہ کہ "فرنٹی نشست" والے جنہیں سخن فہم قرار دیا جاتا ہے، نہایت خاموشی سے شعر سنتے رہے اور ٹیپ ریکارڈ چلتے رہے۔ (کاش اگلے سال انہیں "فرنٹی پاس" نہ بھیجا جائے)

محمد یسین دہری مگر انہوں نے اپنی پُر اثر غزل پیش کی مگر سامعین کو جوش نہ دلا سکے ؎

سب ہی منتظر تھے کہے گا کوئی مگر کچھ
اور اس کے پاس حرف کوئی معتبر نہ تھا

ڈاکٹر ملک زادہ منظور کا نام پکارا گیا، تالیاں بجیں انہوں نے حسب توقع یہ غزل پڑھی ؎

چہرے پہ سارے شہر کے گردِ ملال ہے
جو دل کا حال ہے وہی دلی کا حال ہے
کشکول چشم لے کے پھرو اب نہ دربدر
منظور قحطِ جنسِ وفا کا یہ سال ہے

محترمہ ممتاز مرزا نے اپنے مخصوص ترنم میں یہ غزل پڑھی ؎

ہر اک شاخ ہے رقصاں ہر ایک گل خنداں
صبا کے قافلے صحنِ چمن سے گزرے ہیں

ڈاکٹر بشیر بدر نے جامع الفاظ میں محترمہ فہمیدہ ریاض کا تعارف کرایا۔ فہمیدہ ریاض نے جو نظم پیش کی وہ ان کے خیالات کی غماز تھی۔

اس کے بعد ڈاکٹر ساغر اعظمی مائیک پر آئے اور خوش لحنی سے غزل طراز ہوئے۔ ابھی انہوں نے یہ شعر ؎

اب تو ہمارے گھر کا یہ ماحول ہو گیا
رشتوں کا احترام بھی لفظوں میں کھو گیا

پڑھا تھا کہ واہ واہ کی صدائیں بلند ہوئیں

بس ایک ذرا سی بات تھی لیکن تمام عمر
وہ مجھ کو جاگنے کی سزا دے کے سو گیا

ڈاکٹر ساغر اعظمی پہلے شاعر تھے جنہیں ناظمِ مشاعرہ کی واہ واہ حاصل تھی۔ سامعین کے اصرار پر ساغر اعظمی نے ایک غزل اور گیت سنایا۔

ڈاکٹر بشیر بدر نے ترنم کی اس گونج کے بعد سنجیدہ شاعر نازش پرتاب گڑھی کو دعوتِ سخن دی، نازش صاحب کی جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اس کا "اکھڑ جانا" غیر یقینی نہ ہوتا۔ مگر نازش پرتاب گڑھی نے ایک نظم "شانتی کے نام" پیش کر کے نہ صرف سامعین کو آواز کے سحر سے نکالا بلکہ شانتی کی روداد اس تاثر سے سنائی کہ سامعین دم بخود رہ گئے۔

پاکستان کے مہمان شاعروں اور گیتوں کے سیدا، غزل کے عاشق

جمیل الدین عالی نے پہلے "دوہے" سنائے، فقرہ بازی ہوئی اور پھر غزل سنائی ؎

اگلی ہی گلی میں رہتا ہے اور ملنے تک نہیں آتا ہے
کہتا ہے تکلف کیا کرنا ہم تم میں تو پیار کا ناتا ہے

جمیل الدین عالی نے خاصا وقت لیا اور کافی داد حاصل کی۔ شاعر کچھ کچھ سابق رویے پر آچلا تھا کہ بشیر بدر نے فوراً ہلال رامپوری کا نام پکارا۔ ان کے مزاحیہ کلام میں طنز کی چاشنی تھی اس سے سامعین "بس" کرنے پر تیار نہ تھے۔ یوں بھی سنجیدہ شاعری کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح سے لوگ کچھ زیادہ ہی محظوظ ہوتے ہیں۔ قطعہ ختم ہوا۔ ہلال رامپوری پلٹے، "ونس مور" کی آوازیں گونج اٹھیں وہ پھر مائیک کی طرف مڑے اور ڈاکٹر بشیر بدر نے اپنا حق استعمال کرتے ہوئے انہیں واپس موڑ دیا۔ ہلال صاحب تو کبھی اس بات کو طنزیہ مصرعہ کے حوالے کر دیں گے مگر سامعین کو یہ رویہ خاصا ناگوار لگا۔

لیجئے، شاذ تمکنت کو دعوتِ سخن دی گئی وہ چونکہ مشاعروں کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہیں اسلئے انہوں نے فضا ہموار کرنے کے لئے اپنی غزل کی ردیف کے بارے میں چھوٹی سی تقریر کی اور میر، فراق اور جاں نثار اختر کے مصرعے سنائے۔ اتنی دیر میں سامعین ہلال رامپوری کو بھول گئے۔ شاذ تمکنت نے یہ غزل پڑھی ؎

ہمیں پتہ ہے کڑی دھوپ کا سفر کیا ہے
ہمارے سر سے تو سورج بھی ڈھل گیا ہے میاں

شاذ تمکنت نے مشاعرہ میں نئے اور پرانے کی آمیزش کا سماں باندھ دیا۔

جگن ناتھ آزاد نے تشکر شاد مشاعرے کی تعریف کی اور کہا کہ یہ مشاعرہ ہندوستان و پاکستان کے تعلقات بہتر بنانے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے ؎

لے کے نغموں میں گلستاں کا نکھار آتے رہو
اس چمن میں صورتِ فصلِ بہار آتے رہو
سرزمینِ ہند ہے شعر و ادب کا گلستاں
گلستاں میں تم مثالِ جوئے بار آتے رہو

جگن ناتھ آزاد کی بات صحیح ثابت کرنے کیلئے ڈاکٹر بشیر بدر نے پاکستان کی شاعرہ زہرہ ماجد علی کو دعوتِ سخن دی، انہوں نے

نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ ترنم سے غزل شروع کی سے

ہم نے بڑھی مسافتیں، وقت ہوئی کہ ہم
خود ہی بھٹک گئے جو تجھ بے راستہ

سامعین کے اصرار پر انھوں نے دو غزلیں اور سنائیں، ایک شعر ملاحظہ ہو سے

لفظِ پیمان بھی اقرار بھی اظہار بھی ہیں
طاقتِ صبر اگر ہے تو یہ غم خوار بھی ہیں

زہرہ کے اچھے شعر اور اچھی آواز سے سامعین جھوم جھوم گئے۔

اب چند شعراء باقی تھے اور غالباً یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کسے بلایا جائے۔ (دیکھے اب تک تو شاعر کو بلانے میں سوچ کو دخل نہ تھا) چنانچہ غلام ربانی تاباں کا نام پکارا گیا وہ جس سنجیدگی سے اسٹیج پر بیٹھے تھے، اسی سنجیدگی سے انھوں نے غزل پیش کی سے

قدم قدم پہ چمن پھر بھی کھل گئے ہوں گے
جنوں کی راہ، بہاروں کی رہ گزر نہ سہی!
نہ جانے کس کا لہو، سنگ و خشت میں ہوگا
کسی کا گھر تو ہے آخر خدا کا گھر نہ سہی!

بیکل اتساہی، جن کے ترنم کے لوگ شیدائی ہیں مالک رام نے پہلے "بکھرے سپنے" نظم سنائی، لوگ ترنم پر اصرار کرتے رہے، ترنم سے بیکل اتساہی نے دوہے سنائے سے

چاگن میں البیلا سا دن یہ کس کا ہے
پیاسا ساچہرہ، بھیگا دامن کس کا ہے
اپنے اندر جھانک کے بیکل دیکھ ذرا
تو ہے سب کا دوست تو دشمن کس کا ہے

سامعین بیکل اتساہی کا گیت سننے کے لئے بے کل تھے، اور بیکل اتساہی واپس ہونا چاہتے تھے۔ سامعین کی جیت ہوئی اور بیکل اتساہی کو اپنا مشہور گیت سنانا پڑا۔

بیکل اتساہی کے گیت کے بعد ڈاکٹر بشیر بدر نے "در حدیثِ دیگراں" کے بجائے، ایک لطیفہ خود پر چسپاں کر کے یوں سنایا — میں مشاعرہ میں جاتا ہوں، میری ایک غزل ایسی ہے جو لوگ ہر بار سننے کی فرمائش کرتے ہیں، یہ معاملہ بہت دن چلا تو میں نے سامعین سے پوچھا کہ آپ اتنے دن سے یہ غزل سن رہے ہیں "آپ کا جی نہیں بھرا" انھوں نے کہا "جب تک صحیح نہیں پڑھو گے پڑھوا تے رہیں گے"۔

معلوم نہیں اس لطیفہ کا محل کیا تھا؟ بہرحال اب پاکستان سے آئے ہوئے مہمان شاعر قتیل شفائی کو دعوتِ سخن دی گئی۔

میں گھر سے تیری تمنا پہن کے جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے
وہی تو سب سے زیادہ ہے نکتہ چیں میرا
جو مسکرا کے ہمیشہ گلے لگائے مجھے

اسٹیج پر دو شاعر تھے جنھیں ابھی کلام سنانا تھا۔ ایک صاحب صدر تھا اور دوسرے علی سردار جعفری۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے علی سردار جعفری کا "ادب کا قد آور شخصیت" کہہ کر تعارف کرایا۔ انھوں نے اپنی "پیغامِ زنداں" نظم پیش کی اور چونکہ سامعین کی بے حسی دیکھ چکے تھے۔ اس لئے "لفظ آلودہ" کو مختلف معنی و مفہوم میں ادا کر کے "شاعرانہ جسارت" کا اظہار نظم سنانے سے پہلے ہی کر دیا۔

صاحب صدر اختر الایمان نے کسی کو صدارت دینے کا مفہوم یہ بتایا تھا کہ "اس شخص کو زیادہ بولنے دیا جائے اور نہ سننے دیا جائے" ان کے سننے کی حد تک تو ہم کچھ نہیں کہہ سکتے البتہ کم بولنے کی کسر انھوں نے اس طرح پوری کی کہ "کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام" کے لمبے عنوان سے اتنی طویل نظم پڑھی کہ ان سب شاعروں سے بدلہ لے لیا جنھوں نے اپنی تین تین غزلیں سامعین کی فرمائش پر سنائی تھیں۔

مشاعرہ ختم ہوا، رات آدھی بیت چکی تھی، لوگ بوجھل دل سے اٹھے اور سوچتے ہوئے ہال سے نکلنے لگے کہ منتظمین نے اس تاریخ ساز یادگاری مشاعرے کو آج کس کی بے دلی نے بے اثر بنایا۔

تنخواہوں میں سے مناسب ٹیکس کاٹنا نہ بھولیے

انکم ٹیکس قانون تنخواہ ادا کرنے کے ذمہ دار ہر فرد سے مانگ کرتا ہے کہ وہ ماٰخذ پر ہی مقررہ شرحوں پر ٹیکس کاٹ لے اور سرکاری ملازمین کی حالت میں فوری طور پر اور دیگر ملازمین کی حالت میں سات یوم کے اندر اندر اسے سرکار کے کھاتے میں جمع کرادے۔

آجر کے غفلت کرنے پر

(i) ٹیکس کی کل رقم اس سے وصول کی جائے گی

(ii) اس پر سود اور جرمانہ لگے گا اور

(iii) قانونی کارروائی بھی ہو سکے گی جس کے نتیجے میں قید با مشقت اور جرمانے کی سزا بھی ہو سکتی ہے

سزا سے بچیے

خیال رہے تنخواہ میں سے کاٹے جانے لائق ٹیکس صحیح صحیح کاٹا گیا ہے اور اسے مقررہ مدت کے اندر اندر سرکاری کھاتے میں جمع کرا دیا گیا ہے۔

کاٹے گئے ٹیکس میں اگر کوئی کمی بیشی رہ گئی ہو تو اسے ماہ فروری / مارچ ۱۹۸۲ء میں ادا کی جانے والی تنخواہوں میں سے پوری کر لیجیے۔

ڈائریکٹوریٹ آف انسپکشن
(ریسرچ، اسٹیٹسٹکس اینڈ پبلک ریلیشنز)
محکمہ انکم ٹیکس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

غزل انعامی مقابلہ

کویت بزمِ سخن اردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں یہ اعلان کرتی ہے کہ ہندوستان
کے شعرائے کرام اور شاعرات مندرجہ ذیل مصارعِ طرح پر اپنی غزلیات انعامی
مقابلہ میں بھجوائیں۔

غزل زیادہ سے زیادہ سات اشعار پر مشتمل ہو۔ اور غزل کے ساتھ ہر شاعر یا شاعرہ
کو اپنی تازہ ترین تصویر اور مختصر سوانح حیات بھجوانا ضروری ہوگا۔

جو غزلیات ۳۰ جون تک کویت بزمِ سخن کے ہاں موصول ہوں گی وہی غزلیات
انعامی مقابلہ میں شریک ہو سکیں گی۔

دو انعامات جوش ایوارڈ اور فراق ایوارڈ الگ الگ ہر مصرع طرح
پر کہی گئی غزلیات میں سب سے بہترین غزلیات پر دئیے جائیں گے۔ یہ انعام پانچ صد
امریکی ڈالر کے ہوں گے جن کا اعلان جولائی ۱۹۹۳ء میں کر دیا جائے گا۔

انعامی مقابلے میں بھجوائی گئی تمام غزلیات مع تصاویر و سوانح حیات شعرائے کرام
و شاعرات کو ایک گلدستہ کی صورت میں (کتابی شکل میں) شائع کیا جائے گا اور انعامی
مقابلہ میں حصہ لینے والے تمام شعرائے کرام اور شاعرات کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ
کتاب ہر شاعر اور شاعرہ کی خدمت میں کویت بزمِ سخن کی طرف سے عزت افزائی کے طور
پر بھجوائی جائے گی۔

مصارعِ طرح

(۱) دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
(قافیہ) (ردیف)

(۲) سر پہنچ کر منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی
(قافیہ) (ردیف)

امید ہے کہ ہندوستان کے شعرائے کرام اور شاعرات زیادہ سے زیادہ تعداد
میں اس انعامی مقابلہ میں حصہ لے کر خدمتِ اردو میں ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

غزلیات مع تصویر اور مختصر سوانح حیات اس پتہ پر بھیجیں

جناب عمر الدین چکی والا صاحب پوسٹ بکس نمبر 2507 صفات۔ کویت

P.O-BOX No 2507-SAFAT-KUWAIT

منجانب: پروفیسر فرید قریشی سیکریٹری جنرل کویت بزمِ سخن

یقی صاحب کے بارے میں لکھا گیا ہے حالاں کہ حقیقت بالکل
س کے الٹ ہے اور یہ صاحب مندرجہ ذیل شعر کی تفسیر بنے اپنی
اہلیت کی پردہ پوشی کر رہے ہیں ؎

مکر جانے کا قاتل نے نرالا ڈھنگ نکالا ہے
سبھوں سے پوچھتا پھرتا ہے کس نے مار ڈالا ہے

جناب عتیق صاحب بحر علوم کی ایک ایسی قابل قدر ڈگری حاصل
کئے ہوئے ہیں جو ملک بھر میں انگلیوں پر گنے جانے والوں کے
پاس ہے۔ عتیق صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک ایسے مقتدر
ندان کے چشم و چراغ ہیں جنہیں علم۔ اخلاق، تہذیب
ور شرافت گھٹی میں ملتا ہے۔ حال ہی میں کل ہند اردو کانفرنس
حیدر آباد کے سلسلہ میں عتیق صاحب نے جو خدمات انجام دی ہیں
وہ یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔

طرحی غزل کا انعامی مقابلہ

دفتر شان ہند میں ہر روز کم از کم پندرہ بیس شعرائے
کرام کا کلام برائے اشاعت موصول ہوتا ہے۔
شان ہند کا زیر نظر اشاعت کے صفحہ ۲ پر کویت بزم سخن
کا ایک انعامی اعلان شائع ہو رہا ہے جس میں دو مصارع طرح
پر طرحی غزلیں کہنے کی ہندوستانی شعراء کو دعوت عام دی گئی ہے
ان طرحی غزلوں پر جوش ایوارڈ اور فراق ایوارڈ دئے جائیں گے
ان کی مالیت پانچ صد امریکی ڈالر ہوگی۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا
گیا ہے کہ اس انعامی مقابلہ میں شامل ہونے والی تمام غزلیات مع
شعرائے کرام کی تصاویر اور مختصر سوانحی خاکوں کے ایک گلدستہ
کی شکل میں شائع کی جائے گی اور یہ خوبصورت گلدستہ ہر شاعر اور
شاعرہ کو بغیر کسی قیمت کے کویت بزم سخن اپنے ڈاک خرچ پر پیش کریگی۔
عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ شعراء خصوصاً نامور شاعر و
شعرا طرحی غزل کہنے کی جسارت ہی نہیں کرتے جس سے کسی بھی شاعر
کی قدرت کا علم ہی نہیں ہو سکتا۔ اور شعرا کی طرح پر غزل کہنے
سے بے رغبتی سے عوام یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اکثر شعرا استادوں سے
غزلیں لکھوا کر مشاعروں میں اپنے ترنم کے زور پر مقبولیت حاصل
کرلیتے ہیں ورنہ اصل میں وہ شاعر ہوتے ہی نہیں۔

کویت بزم سخن نے شعرا حضرات کیلئے یہ ایک نادر موقع
مہیا کیا ہے کہ وہ اس طرحی انعامی مقابلے میں شریک ہو کر شاعر
ہونے کا ثبوت دیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ گراں قدر انعام بھی
آپ کی قسمت میں لکھا ہو۔

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

مسرور تونسوی

رام پور (یو۔پی) میں ایک بزرگ تھے جناب جنا صاحب۔ حجام ان کا خط بنا رہا تھا کہ یکایک بے ساختہ جلالی انداز میں فرمانے لگے الا اللہ اور ایسا کرتے ہوئے ان کا بایاں ہاتھ برق رفتاری سے اس طرح اٹھا جیسے کسی کو سہارا دے رہے ہوں چنانچہ ان کے اس طرح اٹھنے سے حجام استرے کو قابو میں نہ رکھ سکا اور جنا میاں صاحب کے گال سے خون بہنے لگا۔ حجام کچھ دیر تک دم بخود رہا اور ان کے گال سے خون بہنے والی جگہ کو دبائے بیٹھا رہا۔ جب خون رکا تو ہمت کر کے جنا میاں صاحب سے مخاطب ہوا کہ میاں یہ آپ کو کیا ہوا تھا۔

جنا میاں صاحب فرمانے لگے وہ لڑکا جو یہاں آیا کرتا تھا نا آج کل وہ سفر میں ہے اور جس جہاز پر وہ سوار تھا اسے حادثہ پیش آگیا تھا جس سے وہ لڑکا ڈوب رہا تھا اس کی جان بچانے کے لئے اگر تھوڑا سا میرا خون بہہ گیا تو کیا ہوا۔

رام پور میں ہی ایک دوسرے بزرگ تھے چھلن میاں صاحب۔ لوگ ان سے تعویذ لینے آتے اور یہ تعویذ دیتے ہوئے صرف یہی فرماتے کہ اسے اپنے مکان کی چھت میں اڑس دینا اور خدا کا کرم یہ ہوتا کہ ہر تعویذ لینے والے کی مراد پوری ہو جاتی اکثر بدقماش لوگ بری خواہشات کی تکمیل کے لئے ان سے تعویذ لینے آتے مگر چھلن میاں صاحب اس قسم کے حاجت مندوں کو صاف کہہ دیتے کہ للہ مجھے خدا اور اللہ کے نام کو بدنام نہ کرو۔ تعویذ لینے والے دل ہی میں شرمندہ ہو کر الٹے پاؤں لوٹ جاتے۔

جھنگ میں ایک بزرگ تھے جیون شاہ۔ جن کے بارے میں کبھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مسلمان تھے یا ہندو۔ ان کا یہ معمول تھا کہ وہ حاجت مندوں سے کچھ نہ کچھ پڑھنے کو بتلا دیتے اور خدا کا کرنا یہ ہوتا کہ ان حاجت مندوں کے کام ہو جاتے ایک ہندو لڑکا کسی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ فرمانے لگے بیٹا تو کلمہ حق لا الٰہ الا اللہ پڑھا کر تیرا کام ہو جائے گا لڑکے نے پورے یقین کے ساتھ جیون شاہ صاحب کے حکم کی تعمیل کی اور خدا نے اس کی مراد چند دنوں میں ہی پوری کر دی۔ انہی جیون شاہ صاحب نے ایک مسلمان حاجت مند سے کہا کہ تم رام رام جپا کرو تمہارا کام بہت جلد ہو جائے گا۔ یہ مسلمان حاجت مند جیون شاہ صاحب کے اس کافرانہ فرمان پر ناراض ہو گیا اور ان کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا کچھ دنوں بعد اس مسلمان کو خواب میں کچھ نظر آیا تو یہ پھر جیون شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور جیون شاہ صاحب کا پھر وہی فرمان تھا کہ تم رام رام جپو گے تو تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا اس لئے تم پہلے اپنے دل کو صاف کرو۔ اور دل سے یہ خیال نکال دو کہ رام کہنا کفر ہے۔ یہ بھی خدا ہی کا دوسرا نام ہے اور اگر تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تو پھر یہاں نہ آنا۔ اب مسلمان حاجت مند سے نہ رہا گیا اور اس نے خفگی کے انداز میں کہا کہ آپ اچھے بزرگ ہیں کہ ایک مسلمان کو کافر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس پر جیون شاہ صاحب نہایت ملائمت سے کہنے لگے کہ تم جانتے ہو کہ وہ ہندو لڑکا بہ آواز بلند کلمہ پڑھتا رہا اور خدا نے اس کی مراد گیارہ دنوں میں ہی پوری کر دی وہ لڑکا حسب معمول مندر بھی جاتا رہا اس کا نام بھی وہی رہا مگر صرف میرے بتائے ہوئے وقت میں وہ گیارہ بار کلمہ پڑھ لیتا تھا تو کیا وہ ہندو نہیں رہا۔ اگر تم پانچوں وقت کی نماز پڑھتے رہو ہر روز قرآن خوانی بھی کر اللہ اللہ بھی کرو۔ اور اگر میرے بتائے ہوئے وقت میں تم صرف گیارہ مرتبہ رام رام کہہ دو گے تو کیا تم مسلمان نہیں رہو گے۔ یہ کس نے بتا دیا کہ اگر مسلمان رام رام کہے گا تو وہ مسلمان نہیں رہے اور پھر یہ کیا ضروری ہے کہ تم علی الاعلان ایسا کہو تبھی کام ہو گا۔

عبدالمجید صاحب سالک فرما رہے ہیں "جام نوازگی" یہ اس پر پنڈت ہری چند اختر مسکرانے لگے اور کہا "آنکھ اپنا حصہ لیتی ہے" محور صاحب مطلع ارشاد فرماتے ہیں ؎

قفس پر بھی وہی ہے التفاتِ آسماں اب تک
اسی رفتار سے منڈلا رہی ہیں بجلیاں اب تک

مطلع ثانی ارشاد ہوا ہے ؎

جھکا جاتا ہے ان کی دیدنی پر آسماں اب تک
تمہارے نقشِ پا کی خاک باقی ہے جہاں اب تک

اس شعر پر داد اچھی دی گئی ہے۔ حفیظ جالندھری خوب داد دے رہے ہیں۔ مگر آج مخمور صاحب پہلا سا رنگ نہیں جما سکے۔ سنئے کس قدر اچھے شعر فرماتے ہیں ؎

محبت دل میں طوفانِ تمنا بن کے آئی تھی
جھکولے کھا رہی ہے کشتیٔ عمرِ رواں اب تک

ستم صیاد کے قیدِ قفس رونا نشیمن کا
مری مجبوریاں دیکھو کہ زندہ ہوں یہاں اب تک

مخمور صاحب کو داد اچھی مل رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

جگر داغوں کا مسکن ہے تو دل زخموں کا گہوارہ
امانت ہیں یہ ان کی بے نیازی کے نشاں اب تک

یہ نظارہ میری آنکھوں سے کیوں اوجھل نہیں ہوتا
کبھی بجلی گری تھی جل رہا ہے آشیاں اب تک

مخمور صاحب کو مناسب داد مل رہی ہے اور آپ ایک دو مزید شعر سنا کر مائیک سے ہٹ گئے ہیں۔ دور پچھلی صفوں میں دہلی کے پہلے شفیق الرحمن صاحب اور جناب امن لکھنوی نظر آ رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو صوبۂ دہلی کی جنرل سکریٹری حمیدہ سلطان صاحبہ مع اپنی بہنوں اور بھابی کے تشریف فرما ہیں۔ مسز رشام ناتھ بھی آپ کے ساتھ بیٹھی ہیں۔ حاضری اب کافی ہو گئی ہے۔ بائیں طرف مولانا آئین خاں صاحب، مولانا تاجور الرزاق ملیح آبادی۔ شری ہات نیر آف ملاپ، عادل نیر صاحب مع بیگم صاحبہ، مسز ساحر، مسز آزاد تشریف فرما ہیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی کا بچہ جو صوفہ پر سو رہا تھا نیچے گر گیا ہے اور اس نے رونا شروع کر دیا ہے۔ پنڈت ہری چند اختر فرما رہے ہیں کہ بچہ ہندی پڑھنے لگا ہے۔

سردار نجیب اللہ خاں سفیر افغانستان ممتاز ہو کر بڑی حیرانی سے دیکھ رہے ہیں کہ پنڈال کس تیزی سے شعرا کا کلام سن کر چھا رہا ہے۔ جناب عرش ملسیانی تشریف لائے ہیں اور نہایت ہی بہترین ترنم سے فرما رہے ہیں ؎

اک نقطۂ مظلوم کا نالہ رسا ہوتا نہیں
اے خدا دنیا میں تیری بندہ کیا ہوتا نہیں

یہ غزل آپ دلی کالج کے مشاعرہ میں سنا چکے ہیں۔ سنئے کتنا اچھا شعر ہے ؎

کیوں مرے ذوقِ تصور پر تمہیں شک ہو گیا
تم ہی تم ہو اور کوئی دوسرا ہوتا نہیں

اس شعر پر خوب داد دی گئی ہے کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ عرش مجنوں تو ہیں مگر دودھ پینے والے ہیں۔ اس پر عرش صاحب فرماتے ہیں کہ اگر مجنوں کی داستان سنا دوں تو کنور صاحب جھینپیں گے جس پر سب ہنس رہے ہیں۔ سردار نجیب اللہ خاں کی دائیں طرف دو خواتین تشریف فرما ہیں جو شعر خوب سمجھتی ہیں اور نہایت شگفتگی سے داد دے رہی ہیں۔ عرش فرما رہے ہیں ؎

ہم کو راہِ زندگی میں اس قدر رہزن ملے
رہنما پر بھی گمانِ رہنما ہوتا نہیں

سجدے کرتے بھی ہیں خود انسان دیا انسان پر
اور پھر کہتے بھی ہیں بندہ خدا ہوتا نہیں

عرش صاحب کو اچھی داد مل رہی ہے۔

عرش پہلے یہ شکایت تھی ..... کہ اب یہ شکوہ ہے کہ وہ ظالم خفا

کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ مقطع کا تخاطب کسی اور سے ہے بیوی سے ہے۔ اب کنور صاحب نے نہایت موزوں الفاظ میں جناب عبدالمجید صاحب سالک کا تعارف کرایا ہے اور فرما رہے ہیں کہ سالک صاحب پنڈت ہری چند اختر کے لنگوٹیے رہے ہیں اور ہیں۔ تو لیش کا ارشاد فرما رہے ہیں دلی را دلی می شناسد۔ سالک صاحب مائیک پر تشریف لے آئے۔ ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ اب سالک صاحب کی توند بڑھ گئی ہے سالک صاحب رباعیات سنا رہے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

تھا جوشِ شباب اتفاقی ساقی جب وہ ولولے اب کہاں ہیں باقی ساقی
اک نغمۂ دل نواز مطرب امطرب اک جرعۂ جانفزا ساقی ساقی

کنور صاحب فرما رہے ہیں کہ اگر ارشاد ہو تو تعمیلِ حکم کروں سالک صاحب مسکراتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

بڑا شہر کہنا ایسے ہی ہوتے۔ مختصر ہونے چاہئے۔ اس لئے سب مجھے
مختصر کہتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

پھر وہ چلا گیا ـــ پیدل اور تنہا۔ راستے میں آبادی کچھ
زیادہ نہیں تھی اور اس زمانے میں اُس سڑک پر آمدورفت بھی کم تھی
اور بسیں تو چلتی ہی نہیں تھیں۔ اس کے چلے جانے کے بعد نہ جانے کیوں
میں اداس سا ہو گیا۔ مجھے رہ رہ کر وہ یاد آتا رہا۔ اس کا چہرہ اور اس
سادگی بھرا انداز بہت پیارا۔ زور ڈالنے پر بھی مجھے یاد نہ آیا کہ میں نے اسے کہاں
دیکھا تھا۔ چند دنوں کے بعد مجھے ایک بار پھر دفعہ پیچھا ناپڑا۔ دن
دنوں کے بعد مجھے زیادہ وقت شہر کے دفاتر میں گزارنا پڑا
اس طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ پھر یکایک بقرعید آگئی۔ میں کام میں
اس قدر الجھا ہوا تھا کہ وہ مجھے یاد نہیں آیا۔ عید کی شام کو میں
شہر گیا تو یکایک وہ مجھے عابد روڈ پر نظر آگیا۔ اس نے سفید
پائجامہ پہن رکھا تھا جس پر گھٹنوں کے قریب پیوند لگے ہوئے تھے۔
قمیص بھی سفید ہی تھی لیکن آستینیں پھٹی ہوئی تھیں سر پر کپڑے
کی ٹوپی تھی۔ وہ ہاتھ میں دوا کی بوتل لیئے تیز تیز قدموں سے معظم جاہی
مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے دیکھا تو وہ ٹھٹک گیا۔ میرے پاس
آیا اور ادب سے سلام کیا۔

”عید مبارک صاحب“، وہ بولا۔ میں نے بھی عید مبارک کہا
اور دوا کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

”کئی دن سے امی کی طبیعت بہت خراب ہے صاحب۔ میں دوا
لینے گیا تھا۔ نامپلی ہسپتال میں مہاجرین کو دوا مفت ملتی ہے“

یہ ہسپتال، پرانے پل سے تقریباً چار میل پر تھا۔

”کیا تمہارے سوا گھر میں اور کوئی نہیں ہے افضل؟“
میں نے پوچھا۔

”اب کوئی نہیں ہے صاحب۔ جب ہم کلکتے میں رہتے تھے تو سنا ہے ہم
بڑے آدمی تھے۔ نانی اماں کالج میں پڑھایا کرتی تھیں۔ فسادات میں نانی
اماں کو بدمعاشوں نے مار ڈالا۔ امی کو بھی بدمعاش اٹھا کر لے گئے تھے
لیکن بعد میں فوج نے بچا لیا۔ میں تو ڈر سے ٹرنک میں چھپ گیا تھا
اس لیے بچ گیا۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

اس کی باتیں سنتے ہی یکایک بہت سی باتیں یاد آگئیں ـــ
”نانی اماں کالج میں پڑھایا کرتی تھیں۔ کلکتے میں ہم بڑے آدمی تھے“
افضل ـــ افضل، طلعت کے بیٹے کا نام بھی تو افضل تھا۔ وہ
تو کلکتے میں رہتی تھی۔

”تمہیں اپنی امی کا نام معلوم ہے افضل؟“ میں نے دھڑکتے
دل سے پوچھا۔

”طلعت سلطانہ ہے صاحب“ ـــ اب وہ بالکل بدل گئی ہیں
ان کے چہرے پر زخموں کے نشان ہیں وہ دیکھ بھی نہیں سکتیں“
اس نے جواب دیا۔

خدا جانے وہ کیسا سماں تھا؟ طلعت کے چہرے پر نشان!
وہ دیکھ نہیں سکتیں! یہ غلط ہے۔ شاید یہ ایک خواب ہے
بھیانک خواب ـــ میرے کان یقیناً مجھے دھوکہ دے رہے
ـــ طلعت بیمار ہے؟ افضل کی ماں؟ نہیں یہ سب صحیح
اس شام کو میں نے افضل کو اپنی کار میں بٹھایا۔
گیا اور اس سے ملا اور میں نے وعدہ کیا کہ اس بچے کی تعلیم کا
میں کروں گا۔ خوشی سے اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو بہہ
وہ چپ چاپ روئے گئی جیسے اس کی زبان میرا شکریہ
کرنے یا خوشی ہی کا اظہار کرنے سے قاصر ہو۔

اس کے بعد ماضی کے واقعات نے مجھے اس قدر تڑپایا
رات میں پل بھر کے لیئے بھی نہ سو سکا۔

طلعت کبھی کلکتے کے ایک امیر گھرانے کی بیٹی تھی۔
انٹرمیڈیٹ دارجلنگ سے پاس کیا تھا پھر وہ بی اے کے
کالج میں آگئی۔ یہیں میری اس سے ملاقات ہوئی اور بہت
اچھے دوست بن گئے۔ میں ان کے یہاں اکثر آنے جانے لگا۔
گھنٹوں باتیں کیا کرتے ادبی دنیا کی باتیں، فلمی دنیا کی
ماضی اور مستقبل کی باتیں۔ لاتعداد باتیں جن کی نہ ابتدا
نہ انتہا ـــ لیکن یکایک باتوں کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ایک
جب میں پہنچا تو اندھیرا ہو چکا تھا اور ڈرائنگ روم کا
فیوز ہو گیا تھا۔ وہ پنجوں کے بل کھڑی بلب بدلنے کی کوشش کر رہی
تھی۔ کئی بار کوشش کے باوجود اس کا ہاتھ ہولڈر تک
اس پر میں نے کہا، ”تمہارا ہاتھ نہیں پہنچے گا ـــ ادھر آ
پرے ہٹو ـــ میں لگاتا ہوں“

میں نے مسکرا کر [illegible]

حیرت سے بہت [illegible] کو کہا۔ دوسرے لمحے وہ [illegible] میکر اُترنے لگی تو میں اس وقت اس کے ہاتھ سے اسٹول میری طرف جھک گیا اور وہ دھم سے مجھ پر آن گری اور میں نے بے اختیار اس کو تھام لیا۔ اس نے اس حرکت کو غلط سمجھا اور فوراً مجھ سے علیحدہ ہو گئی اور جھنجھلا کر کہا

"مجھے معلوم نہ تھا تم بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ذلیل ہو" غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور وہ مجھے حقارت سے دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اپنی صفائی میں کچھ کہتا وہ مڑی اور اس نے اپنی خوابگاہ کا دروازہ کھولا اور آواز دی ——— "افضل"

چند لمحوں کے بعد ایک ننھا سا بچہ سلیپنگ سوٹ پہنے باہر آیا جہاں ہم کھڑے تھے وہ حصہ نیم تاریک تھا لیکن خوابگاہ روشن تھی۔ دروازہ کھلتے ہی بچے کے تعاقب میں روشنی ڈرائینگ روم میں دبے پاؤں داخل ہو گئی۔

"دیکھو۔ یہ ہے اس بچے کو؟" اس نے اضطراب بھرے لہجے میں کہا: "میرا بچہ ہے ——— افضل!"

"طلعت؟" میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"کیوں یقین نہیں آتا؟ تم مجھے کنواری سمجھ رہے ہو نا؟ ——— میں شادی شدہ ہوں اختر صاحب ——— یا شاید ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں ——— میرا شوہر مجھ سے شادی کرنے امریکہ سے آیا تھا۔ شادی کے بعد وہ سات مہینے یہاں رہا پھر امریکہ چلا گیا۔ وعدہ کر گیا، جاتے ہی مجھے بلوائے گا۔ میں نے مہینوں انتظار کیا پھر اس کی تلاش شروع کر دی تو معلوم ہوا جو پتہ اس نے ہمیں دیا تھا اس پر اس نام کا کوئی شخص رہتا ہے اور نہ کبھی رہتا تھا۔ آج تک ہمیں پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے اور زندہ بھی ہے یا مر گیا ——— میرے دل میں اب اس کیلئے صرف نفرت ہے ——— اس کمبخت بچے کیلئے بھی نفرت ہے جسے دیکھ کر مجھے وہ یاد آتا ہے ——— تو میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے افضل؟ جاتا کیوں نہیں اپنے کمرے میں ——— کمبخت تو نہ ہوتا تو میں خود جا کر سکتی تھی۔ لیکن اب میں کچھ نہیں کر سکتی ——— جا، دفعہ ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے ——— جا نانی اماں کے پاس، وہی تیری ماں ہیں!"

اس نے اپنے ہوش اور حواس کھو دئیے تھے اس کی ہر حرکت میں اضطرار کی کیفیت تھی۔ غصے سے بپھری ہوئی وہ بچے کی طرف مڑی اور اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ لگایا۔

"امی،" ایک چیخ سنائی دی اور پھر بچے نے حیرت سے ماں کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی کمرے کے سناٹے میں اس کی ہچکیوں کی آواز گونجنے لگی ——— میں پتھر کے ایک بے جان بت کی طرح کھڑا یہ ناقابلِ فہم تماشہ دیکھتا رہا۔ طمانچہ مارنے کے بعد وہ روتے ہوئے بچے کو گھورتی رہی جذبات کی شدت سے اس نے اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا اور پھر یکایک اس کے جذبات کے خاموش سمندر میں طوفان آ گیا اور وہ "میرے بچے میرے بچے،" چیختی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور اسے دیوانہ وار چومنے لگی۔ ماں کے سینے سے لگ کر اور اس کے گرم اور نرم بوسوں کو محسوس کر کے بچے کی سسکیوں میں اضافہ ہو گیا۔ ماں بیٹے ایک دوسرے کے گلے سے لگ کر رونے لگے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ——— موقع کو غنیمت جان کر میں چپکے سے لوٹ آیا

اس کے بعد میں کبھی ان کے یہاں نہیں گیا۔ میں اسے کبھی تنہائی میں نہیں ملا۔ میں اس سے کالج میں ایک سال آگے تھا۔ اس لئے میں نے اس سے پہلے ڈگری لی اور کلکتہ کو ہمیشہ کیلئے خدا حافظ کہا۔ اعلیٰ تعلیم میں نے ملک سے باہر حاصل کی۔ جب برصغیر میں آزادی کا سورج طلوع ہوا تو مجھے حیدرآباد دکن میں اچھی ملازمت مل گئی۔

اب کئی برسوں کے بعد ایک بار پھر مجھے قسمت اس کے پاس لے آئی تھی۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا میں نے ان دونوں کیلئے کیا۔ افضل کو ایک اچھے اسکول میں داخل کر دیا اور طلعت کا شہر کے ڈاکٹر سے علاج کرایا۔ چھٹی کے دن میں اکثر طلعت اور افضل کو اپنے ساتھ سیر کرنے لے جاتا۔ افضل کو جانور بہت پسند تھے۔ اس کی خوشی کی خاطر میں نے ایک انگریز افسر سے کتے کا ایک گول مٹول سا بچہ لیکر افضل کو دیدیا۔ [illegible] افضل کو عشق ہو گیا۔ ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتا جہاں جاتا لے جاتا۔

ایک دن کسی تہوار کی چھٹی تھی میں ان دونوں کو علی الصباح [illegible] لے گیا۔ ظاہر ہے افضل کے ساتھ اس کا پالتو کتا بھی آیا [illegible] پکنک منانے کا پروگرام بنایا۔ کھانے پینے کا سامان [illegible] اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے دری بچھا دی۔ [illegible] تازہ ادبی رسالہ لے گیا تھا۔ افضل ملازم اور کتے کے ساتھ [illegible] کھیلنے لگے اور میں نے رسالے کے کچھ حصے پڑھ کر طلعت کو سنانا شروع کر دئیے۔

ہم پکنک منانے میں کچھ اس قدر کھو گئے کہ یکایک ایک چیخ و پکار

ایگمارک
بھارت سرکار ایگمارک کا لیبل لگی شدہ اشیا کے خالص
اور اعلیٰ کوالٹی کے ہونے کی گارنٹی کے طور پر جاری کرتی ہے ۔
اعتماد کے ساتھ خریدیئے
ایگمارک پر بھروسہ کیجیے
گھی، مکھن، خوردنی تیلوں، شہد، دالوں اور پسے ہوئے مصالحوں
کو ایگمارک لیبل تبھی جاری کیا جاتا ہے جب اصلی سازو
سامان سے لیس لیبارٹریوں میں ان کی اچھی طرح اور بار
بار جانچ پڑتال کرلی جاتی ہے ۔
ہمیشہ ایگمارک لیبل والی
اشیاء خریدیئے

ایمان دار کی مجبوری

ڈاکٹر اودے سرن ارمان بلاری

وہ سڑک کے کنارے کنارے برابر کھانستا چلا جا رہا تھا یوکلپٹس کے پیڑ کے سائے میں رکشے والا اسے جھک جھک کر کھانستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دور جا کر کھانستے کھانستے اس نے سڑک پر ہی بلغم تھوک دیا۔ "کتنا بدتمیز ہے۔ آگے بڑھ کر نالی میں بھی تو تھوک سکتا تھا۔ یہ لوگ کیسے لکھے پڑھے ہیں؟" رکشے والا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ اسی وقت کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ "او رکشا والے!" یہ سنتے ہی وہ چونکا پیچھے مڑ کر دیکھا اور بولا۔

"صاحب! کہیں چلنا ہے کیا؟"

"ہاں ایک لاش کو گنگا گھاٹ پر لے چلنا ہے۔"

"لے چلیں گے صاحب! کیا دوگے؟" "جو آپ مناسب سمجھیں دے دیجئے گا۔" یہ کہتے ہوئے رکشا والا اس آدمی کے ساتھ ہو لیا مگر اس کے دماغ سے وہ بات نہیں نکلی تھی اور وہ بڑبڑاتا ہوا کہنے لگا۔

"آدمی کے اندر سے جو بھی چیز نکلتی ہے گندی ہی نکلتی ہے سوائے اللہ کے نام کو چھوڑ کر۔"

"صحیح کہتے ہو،" رکشا پر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا اور رکشا پوسٹ مارٹم کے چیمبر کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ برآمدے کے فرش پر کپڑوں میں لپٹی ہوئی ایک لاش پڑی تھی۔ دو آدمیوں نے اس کو اٹھا کر رکشا کے پائدان میں ترچھا رکھ دیا اور خود دونوں سیٹ پر بیٹھ گئے۔

"چلو بھئی گنگا گھاٹ،" دونوں ایک ساتھ بولے۔

"کیوں بھائی صاحب اس کی ایک ٹانگ نہیں ہے کیا؟" لاش پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے رکشا والے نے ان سے پوچھا۔

"ٹانگ کیا اس کا تو ایک ہاتھ بھی نہیں ہے۔ ریل گاڑی سے کٹ گئے ہیں۔"

"آپ کا کیا لگتا ہے؟"

"وہ بھلا کون لگتا ہے سالا" حقارت کے ساتھ انھوں نے کہا "ہم تو سرکاری آدمی ہیں لاوارث لاشوں کی انتم کریا کر دیتے ہیں۔"

"یہ لاش کہاں سے آئی ہے؟"

"یہ لاش منڈیا جنکشن کے پاس ریلوے کراسنگ پر پڑی تھی۔ مرنے والا کہاں کا تھا ہمیں کچھ پتہ نہیں۔" رکشا والا برابر رکشا چلائے جا رہا تھا مگر اس کے دل میں طرح طرح کے عجیب و غریب سوالات اٹھ رہے تھے مگر وہ خاموش رہا۔ گنگا گھاٹ آ گیا جہاں کی ریت میں انیکوں مالی کے لال چھپے پڑے تھے ان دونوں نے لاش اتاری اور رکشے والے کو پانچ روپے کا نوٹ دیا۔ وہ نوٹ ہاتھ میں لئے کچھ سوچ رہا تھا کہ فوراً ایک نے کہا "کیا کم ہیں؟"

"نہیں سرکار میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس میں سے واپس کتنے کر دوں"

"جا بھاگ جا واپس کچھ نہیں کرنا ہے سرکار کی طرف سے اتنے ہی روپے ملے ہیں کمی بیشی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔" یہ سنتے ہی رکشا والا نوٹ جیب میں رکھتے ہوئے اور رکشا گھما کر نیم کے پیڑ کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ واپسی پر کوئی سواری تو ملنی تھی نہیں کیونکہ یہ شہر کا باہری حصہ تھا اس لئے اس نے سوچا ان دونوں کو واپس لے جاؤں گا تو شاید پانچ کا نوٹ پھر مل جائے سرکار نے ان کو واپس جانے کے لئے بھی تو کچھ نہ کچھ ضرور طے کیا ہوگا یوں سوچتے ہوئے اس نے دھنیے کی چٹنی لپٹی ہوئی جوار کی روٹیاں نکالیں اور کھانے لگا وہ کھاتے کھاتے سوچ رہا تھا کہ لاش ہندو کی ہے یا مسلمان کی تجہیز و تکفین میں کچھ نہ کچھ دیر تو لگتی ہی ہے۔ سرکار کا کام [illegible] کہاں ہوتا ہے اچھے ڈھنگ سے ہوتا ہوگا وہ اس طرح [illegible] ہی رہا تھا کہ ایک سرکاری کرمچاری نے آواز دی۔ "ارے [illegible] یہیں کھڑا ہے گیا نہیں ہے۔" "ارے تو تو کھانا کھا رہا ہے [illegible] جگہ [illegible] پانی بھی نہیں ہے۔ [illegible]"

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-1100..

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

پہنچے ہوئے مہروں کی چرب زبانی پر دھیان نہ دیجئے بلکہ یہ سمجھ کر بیلٹ پیپر پر نشان لگائیے کہ ملک کا مستقبل آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے اور آپ اپنے ملک کا اپنے آپ کا اپنے بچوں کا مستقبل روشن دیکھنا چاہتے ہیں۔

کیا پارسا کوثری جے پوری کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا ہوگا؟

پارسا کوثری جے پوری راجستھان کے ایک ایسے ہر دلعزیز اور مقبول شاعر ہیں کہ راجستھان اور راجستھان کے باہر قریب قریب ہر گانے والی طوائف ان کا کلام الاپتی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ پاکستان کے کسی شاعر نے ان کی ایک مشہور غزل میں کہیں کہیں الفاظ بدل کر پاکستان کی کسی گراموفون کمپنی کو دیدی اور انہوں نے یہ غزل پاکستان کی مشہور اور مقبول مغنیہ منی بیگم سے گوا کر یہ غزل اس کے ایک ایل۔ پی ریکارڈ میں شامل کرلی ہے اور اس پاکستانی ایل۔ پی ریکارڈ کو ایک ہندوستانی گراموفون ریکارڈ بنانے والی کمپنی نے یہاں بھی اسمگل کرکے یہی ایل۔ پی ریکارڈ تیار کرلیا ہے جو منی بیگم کے نام اور مقبولیت کے باعث خوب فروخت ہو رہا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ پارسا کوثری جے پوری کی یہ غزل ان کے مجموعہ کلام "جام کوثر" میں صفحہ ۱۲۳ پر شائع ہو چکی ہے اور شانِ ہند میں کئی مشاعروں کی روداد میں بھی اس کی اشاعت ہو چکی ہے۔ پاکستانی شاعر نے اس غزل کے مطلع کو یوں بگاڑا ہے ؎

یہ تو بتائیں بار بار آنکھیں ہیں اشکبار کیوں
یاد کسی کی جب نہیں روتے ہو یا سبار کیوں

جبکہ پارسا کوثری جے پوری کا مطلع حسب ذیل ہے ؎

یہ تو بتا نہ پارسا آنکھیں ہیں اشکبار کیوں
یاد کسی کی جب نہیں روتے ہو بار بار کیوں

اسی طرح ایک دو جگہ اور ایک آدھ لفظ بدل گیا ہے باقی تمام غزل ویسی کی ویسی ہے۔

پاکستان کی گراموفون کمپنی اور مغنیہ منی بیگم اس ملک کے قانون سے باہر ہیں مگر ہندوستانی گراموفون کمپنی تو قانونی طور پر جواب دہ ہے مگر افسوس کا مقام ہے کہ یہ گراموفون کمپنی کسی خط کا جواب ہی نہیں دیتی۔ لہٰذا پارسا صاحب وکیلوں سے مشورہ کر رہے ہیں۔

کیا ہندوستانی گراموفون کمپنی کو اپنے ملک کے ایک شاعر کو اس کے کلام کا مناسب معاوضہ ادا کرنے کے لئے آنا کانی کرنا مناسب ہے اور کیا یہ کمپنی چاہتی ہے کہ پارسا صاحب عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں؟

مغربی بنگال .... اُردو اکاڈمی

مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے اس سال کتابوں پر انعامات دیتے وقت یقیناً اتر پردیش اردو اکاڈمی کے مقابلہ زیادہ سمجھداری، رواداری اور ایمانداری سے کام لیا ہے اور کئی ایسی کتابوں کو انعام کا حقدار ٹھہرایا ہے جنہیں اتر پردیش اکاڈمی نے نظر انداز کردیا تھا اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی اتر پردیش اردو اکاڈمی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ ہم مغربی بنگال اردو اکاڈمی کے اس بہتر اور منصفانہ رویہ پر مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اتر پردیش میں اُردو

اتر پردیش کی حکومت نے اُردو کو کچھ اضلاع میں دوسری زبان کی حیثیت سے دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اسکے تحت گورنر نے ۱۷ اپریل ۱۹۸۲ء کو آرڈی ننس جاری کیا ہے جو یقیناً ان مانگوں کو پورا نہیں کرتا جن کا اتنے سالوں سے مطالبہ کیا جا رہا تھا اور جن کا وعدہ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ نے فرمایا تھا اس پر ستم ظریفی یہ ہے کہ دوسری طرف مخالفین اُردو اس آرڈی ننس کو بھی نامناسب قرار دے رہے ہیں۔

اُردو مخالفت کچھ تو ملک کی تقسیم سے پہلے اور بعد کے تعصبات (جن میں غیر مسلموں کا تنگ دلی اور مسلمانوں کا اردو کے تئیں مالِ غنیمت سمجھنا دونوں شامل ہیں) اور ان کے عمل و ردِ عمل کا نتیجہ ہے اور کسی حد تک یہ مخالفت غلط فہمیوں پر مبنی ہے۔

یقیناً تعصب کی شدت اب کم ہو چکی ہے لیکن ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ اُردو کو ہندی کا رقیب بنایا جا رہا ہے اور ہندی کو راج سنگھاسن سے ہٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ تاثر بھی اردو کے کچھ مسلمان دانشوروں کا دیا ہوا ہے) جو لوگ ایسا سوچتے ہیں یا کہتے ہیں وہ بعض اُردو دوستوں کی غیر محتاط باتوں اور نعروں کا سہارا حاصل کرنے کے لئے ہر جائز یا ناجائز حربے کو استعمال میں لانے والوں کی آڑ لے کر کہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے سے ہندی کی اولین فوقیت

(باقی صفحہ ۲۶ پر)

بکوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

ایڈیٹر شان ہند ان دنوں علیل ہیں لہٰذا بکوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر کے تحت اس مرتبہ حسب ذیل سچے واقعات ملاحظہ فرمائیے ——————— (ادارہ)

طلاق ! طلاق ! طلاق !

پتی پتنی دونوں کی زبان پر بس یہی ایک رٹ تھی دونوں کا ارادہ اس سلسلہ میں مضبوط نظر آتا تھا۔ اس کریمین جوڑے کی شادی تین برس پہلے ہوئی تھی ان کا دو سال کا ایک پیارا سا بیٹا تھا۔ مگر نہ جانے کس وجہ سے ان میں ناچاقی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے نزدیک اس ناچاقی کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا..... طلاق۔ طرفین کے وکیل اس بات کی جی جان سے کوشش کر رہے تھے کہ انہیں جلد از جلد طلاق مل جائے۔

اس روز عدالت میں کیس کی سماعت پوری سنجیدگی سے ہو رہی تھی۔ جیسا کہ طلاق کے مقدموں میں ہوتا ہے۔ عدالت میں بھیڑ بھاڑ بالکل نہیں تھی۔ پتی اس کا وکیل۔ پتنی اس کا وکیل اور دو ایک رشتہ دار یا گواہ بھی تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا ماں باپ کے من مٹاؤ اور عدالت کی کارروائی سے بے خبر ماں کی گود میں سکھ کی نیند سو رہا تھا پھر شاید بچے کی نیند پوری ہو چکی تھی یا کسی اور وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ ماں کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔ اجنبی جگہ اور اجنبی لوگوں کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ ختم ہو گئی اور اس نے معاملہ سمجھنے کے لئے غور سے چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف ایک کرسی پر پتا کو بیٹھا دیکھ کر پہلی بار اس کے چہرے پر پھر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ باپ بیٹے کی آنکھیں ملیں تو دونوں کی آنکھوں میں چمک اور مسکراہٹ بڑھ گئی۔ بچے نے پتا کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دئے۔ پتا نے بھی آگے بڑھ کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔

پتا کی گود میں آکر بچے نے شکایت کی "پاپا کیس می" پتا نے بھرپور جذبات کے ساتھ اس کا منہ چوم لیا۔ جواب میں بچے نے بھی پتا کا منہ چوما لیا اور ماں کی طرف دیکھا۔ ایک دو سیکنڈ ماں کی طرف دیکھ کر وہ بولا "پاپا کیس ممی"

عدالت کی سنجیدہ فضا میں جیسے کوئی دھماکہ ہو گیا ہو بچے کی بات سن کر سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ عدالت کی کارروائی رک گئی بچے نے اپنی بات پھر دہرائی اس نے سوچا کہ شاید پتا نے اس کی بات سنی نہیں۔ مگر پھر وہی خاموشی۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ بچے کی بات دو بار کہنے کے باوجود پوری نہیں ہوئی تھی اب تک اس کے منہ سے جو بات نکلتی تھی ماں باپ دونوں اسے پورا کرتے تھے۔ تیسری بار اس نے قریب قریب چیخ کر اپنی بات دہرائی اور اس کے بعد رونا شروع کر دیا وہ بار بار اپنی بات دوہراتا تھا "پاپا! کیس ممی" عدالت کے قاعدے قانون اس بال ہٹ کے سامنے دھرے رہ گئے۔ پھر پتا نے پتنی کی گیلی آنکھوں میں خاموش دعوت کو پڑھ لیا یا بچے کی ضد نے اس میں ہمت پیدا کی ایک ایک قدم بڑھاتا ہوا وہ دوسری طرف بیٹھی ہوئی پتنی کی طرف گیا اور اسے چوم لیا، بات پوری ہو جانے پر بچے نے رونا بند کر دیا اور تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ اس کے بعد کی کہانی مختصر ہے پتنی نے سر جھکا لیا اور شرمیلی دلہن کی طرح پتی کے ساتھ عدالت کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ جج وکیل اور دوسرے لوگ انہوں کو پہلے دیکھتے رہ گئے پھر مسکرا دئے ایک معصوم بچے نے ایک پھولتے پھلتے پریوار کو اجڑنے سے بچا لیا۔

دلی کے ایک فیملی جج نے اس سلسلہ میں کچھ دلچسپ قصے سنائے انہوں نے اپنا نام شائع کرانے کی ممانعت کر دی۔ آپ نے کہا کہ بھلے ہی طلاق قانون کو آسان بنا دیا گیا ہے مگر عدالت کی کوشش ہوتی ہے

کہ ان کا پوتر بندھن ٹوٹے نہیں۔ عدالت ان میں صلح صفائی کرانے کی ہر طرح سے کوشش کرتی ہے پھر بھی اگر وہ اپنے فیصلے پر ڈٹے رہیں تو طلاق منظور کر لی جاتی ہے۔

ایک نوجوان جوڑا شادی کے دو سال بعد ہی طلاق حاصل کرنے کے لئے عدالت میں پہنچ گیا۔ پتی پتنی دونوں پڑھے لکھے بھلے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے ہنس مکھ اور ملنسار مگر آپس میں کھٹ پٹ ہوئی تو بڑھتی چلی گئی۔ کسی کی بھی عادت خراب نہیں، کوئی خاص شکایت نہیں پھر بھی ذہنی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں۔ کیس پر غور کرنے کے بعد اور ان دونوں کی شکایتیں سننے اور ان کے گھر والوں سے بات چیت اور تبادلہ خیال کرنے کے بعد عدالت نے انہیں حکم دیا کہ وہ کم از کم ۱۵ دن کے لئے دلی سے باہر کسی خوبصورت جگہ پر ایک ساتھ رہیں کسی ایسی جگہ جہاں دونوں میں سے کسی کا بھی رشتہ دار نہ ہو اور انہیں تین ماہ بعد آنے کو کہا۔ تقریباً دو ماہ بعد ہمارے فاضل جج اپنے کمرے میں بیٹھے تھے تو وہ جوڑا وہاں پہنچ گیا تھا۔ نوجوان نے جج صاحب سے پہلی بات یہی کہی — انکل! کل آپ ہمارے گھر کھانے پر آئیے یہ اپنے ہاتھ کا بنا بھوجن آپ کو کھلانا چاہتی ہیں۔ جج صاحب نے دونوں کی طرف دیکھا تو لگا جیسے نیا جوڑا ہنی مون منا کر لوٹا ہو۔ ان کے سر سے طلاق حاصل کرنے کا بھوت اتر چکا تھا۔ پتی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ انکل کل آپ کو ایک خوشخبری اور بھی سنائیں گے۔ تبھی پتنی نے ہش! کہہ کر اس کی بات روک دی۔ مگر جج صاحب سمجھ چکے تھے کہ پتی کون سی خوشی کی بات بتانا چاہتا ہے۔

دوسرا قصہ ایسے پتی پتنی کا تھا جن کی شادی کو ۱۵ سال ہو گئے تھے ان کے اسکول میں پڑھنے والے دو بچے تھے جو دیکھنے میں خوب صورت باتوں میں سمجھدار اور ذہین معلوم ہوتے ہوئے بھی ناشاد سے معلوم ہوتے۔ پتہ لگا کہ وہ پڑھائی میں من نہیں لگاتے اور امتحان میں فیل ہو چکے ہیں۔ اس کا ذمہ دار پتی پتنی اور پتنی پتی کو بتا رہی تھی۔ دونوں کا خیال تھا کہ بچوں کا مستقبل روشن کرنے کیلئے انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا ہوگا۔ جج صاحب نے کیس پڑھا اور دونوں سے الگ الگ بات کی۔ پھر بچوں کو بلایا پتی پتنی دونوں کے سامنے بچوں سے بات کی۔ انہیں پہلے آئس کریم کھانے کو دی پیار دلار سے اپنے پاس بٹھایا ان کی تعریف کی اس کے بعد جو سوال پوچھے تو پتہ لگا کہ ماں باپ پہلے مل کر دنیا بھر کی نکتہ چینی کرتے تھے اب ایک دوسرے کی کرتے ہیں اور روزانہ کسی نہ کسی بات پر آپس میں جھگڑا کرتے ہیں۔ کئی بار گھر میں کھانا تک نہیں بنتا۔ ادھر اسکول کی کتابوں ڈریس وغیرہ کے لئے ماں یا باپ سے کہتے تو پھر سے مہابھارت شروع ہو جاتا، اکثر انہیں مار یا ڈانٹ کھانی پڑتی گھر میں بھی اسکول میں بھی۔ گھر کی لڑائی کا بچوں کے من پر گہرا اثر پڑتا۔ بچوں نے بتایا کہ کئی بار وہ گھر سے بھاگ نکلنے کی سوچ چکے ہیں مگر ہمت نہیں کر سکے۔ بچوں کی باتیں سن کر پتی پتنی ایک دوسرے کو ذمہ دار ٹھہرانے کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر عدالت نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ بچوں کو وہاں سے بھیج دیا گیا۔ اس کے بعد پتی پتنی کو طرح طرح سے اونچ نیچ سمجھائی گئی پھر انہیں ایل۔ ٹی۔ سی لے کر کسی تیرتھ استھان یا دوسری جگہ جانے کو کہا۔ چھ ماہ بعد یہ پریوار عدالت میں حاضر ہوا تو معاملہ بدلا ہوا تھا۔ مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوتا۔ جج صاحب نے کہا اس عمر میں طلاق ٹالنا آسان نہیں ہوتا کیونکہ اس عمر میں عادتیں بدلنی مشکل ہو جاتی ہیں۔ بچوں کی بغاوت اور ان کے پیار نے ماں باپ کو اپنی غلطی کا احساس کرا دیا تھا۔ اس سے پہلے کیس کے بارے میں جج صاحب نے کہا کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ معاملہ نفسیاتی اور جنسی زیادہ ہے۔ وہ جوڑا مشترکہ پریوار میں رہتا تھا اس لئے پتی پتنی کو ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ بڑے پریوار میں وہ پتی پتنی کے فرائض تو ادا کر دیتے تھے مگر ازدواجی زندگی جسے کہتے ہیں اس کا لطف نہیں اٹھا پائے تھے۔ پندرہ دن سب باتوں سے دور رہ کر انہوں نے ایک دوسرے کو سمجھا۔ اس کے بعد مشترکہ پریوار میں رہ کر بھی انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

ان سب سے زیادہ دلچسپ قصہ دلی سے باہر کے ایک جوڑے کا۔ شادی کے ایک برس بعد ان کے یہاں ایک بیٹی نے جنم لیا دونوں خوش تھے ان کی بیٹی سال بھر کی ہوئی تھی کہ کسی بیماری سے اس کی موت ہو گئی۔ بیٹی ماں باپ دونوں کا کھلونا تھی اس کی موت کے بعد گھر کی ساری خوشیاں ختم ہو گئیں۔ پتہ نہیں کس طرح پتی پتنی میں من مٹاؤ پیدا ہو گیا جو بڑھتا چلا گیا عدالت کی ہر کوشش کے باوجود وہ ایک ساتھ رہنے کو تیار نہ تھے اور انہیں طلاق مل گئی۔ پتنی نے عدالت میں فہرست پیش کی کہ اسے گھر سے یہ چیزیں لینی ہیں جو اس کو اپنی شادی میں ماں باپ کے گھر سے ملی تھیں۔ پتی نے فہرست پر ایک نگاہ ڈالی اور کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اگلے دن پتنی اپنے وکیل اور عدالت کے نمائندے کے ساتھ پتی کے گھر پہنچی دستک دیتے ہی دروازہ کھل گیا اور پتی وہاں موجود تھا۔ اب اس کا جوش و خروش ختم ہو گیا اسے امید تھی کہ پتی گھر میں نہیں ملے

ایڈیٹر شانِ ہند کی والدۂ محترمہ کے انتقال پر ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی نے تعزیت نامے کے ساتھ یہ نظم بھی بھجوائی جسے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے —— (ادارہ)

ماں

ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی

[illegible] عالمِ تخلیق اے جانِ وفا
اے جہانِ سوز۔ جانِ ساز۔ ایمانِ وفا

اے سراپا درد اے شرحِ کتابِ زندگی
بزمِ امکاں میں مدارِ اکتسابِ زندگی

سوچتا ہوں تیرے رتبے کو کہ کیا کہدوں تجھے
کچھ خدا کا خوف ہے ورنہ خدا کہدوں تجھے

ہاں! ازل ہی سے ترا ماتا لقب رکھا گیا
اور ہر دل میں ترا پاسِ ادب رکھا گیا

کس قدر دلکش ضیا افروز ہے صورت تری
محفلِ امکاں میں عالمگیر ہے عظمت تری

منحصر ہے تیری ہستی پر نظامِ کائنات
ہے فقط موقوف تجھ پر احتشامِ کائنات

پاک ہے، بے عیب ہے، بے لاگ ہے الفت تری
کس قدر معصوم ہے اس دہر میں فطرت تری

تیرے قدموں پر ہزاروں جنتیں قربان ہیں
خود ملائک بھی تقدس پر ترے حیران ہیں

دو جہاں کی دولتیں تیرے تکلم پہ نثار
راحتِ باغِ ارم شانِ تبسم پہ نثار

قہر بھی تیرا سراسر مہر کی تصویر ہے..
تیری جھڑکی تیرے بچوں کو خطِ تقدیر ہے

اپنے بچوں کے لئے وقفِ کرم رہتی ہے تو...
شوقِ راحت میں گرفتارِ الم رہتی ہے تو

فطرتِ کونین کی تکمیل تیرے دم سے ہے
عظمتِ جاوید کی تحصیل تیرے دم سے ہے

تو عدم سے ہم کو لائی عالمِ موجود میں
تجھ سے ہست و بود ہے دنیائے ہست و بود میں

تیری لوری کے ترنم سے فضا معمور ہے
تیری تھپکی سے جہاں شاداب ہے مسرور ہے

تیری خدمت میں ہیں مضمر دو جہاں کی راحتیں
تجھ پہ قرباں ہیں حیاتِ جاوداں کی راحتیں

تیرا خلقِ عاطفت خلقِ خدا سے کم نہیں
تو اگر خوش ہے تو پھر قہرِ خدا کا غم نہیں

دستِ شفقت ہے ترا یا عالمِ اعجاز ہے
تیری ہر اک ادا میں اک مسیحی انداز ہے

تیرے شانے میں [illegible] کا پرچا نہیں
تیرے دامن کو دوئی کا داغ لگ سکتا نہیں

انبیاء کا سر بھی تیرے آستاں پر جھک گیا..
یوں سمجھئے آسماں اک آستاں پر جھک گیا

تیری آغوشِ محبت پر ہے جنت بھی نثار
تیری خاکِ پا پہ اسکندر کی عظمت بھی نثار

سحر ہے اعجاز ہے تیری نگاہِ التفات
کھول دی ہے تو نے یکساں سب پہ راہِ التفات

دردمندی کس قدر دیکھی ہے تیری ذات میں
محض بچوں کے لئے ہر دم رہی آفات میں

تیرے دم پہ غمگساری [illegible] ختم ہے
دلکشی، دل آفرینی، دل کشائی ختم ہے

تیری گود اپنی نظر میں عیش کا گہوارہ ہے
روکشِ عرشِ معلیٰ اس کا ہر نظارہ ہے

تو کمربستہ ہے ہر دم جاں فشانی کے لئے
محو ہیں تیری نگاہیں پاسبانی کے لئے

ہاتھ جب اٹھتے ہیں تیرے گرم جوشی کے لئے
الفتیں بڑھتی ہیں آگے سرفروشی کے لئے

بس رہی ہے حلم کی بستی ترے اخلاق میں
مہرباں دیکھا نہیں تجھ سا کوئی آفاق میں

تیری ہستی کارگاہِ دہر کی بنیاد ہے...
یہ تحمل یہ توکل قابلِ صد داد ہے

تو نے دنیا کو سکھایا ہے محبت کا سبق.....
دردِ دل۔ دردِ جگر۔ دردِ اخوت کا سبق

لے گئے بازی فرشتوں سے جگر پارے ترے
ہیں خلافت کے ستارے آنکھ کے تارے ترے

تیرے سینے میں نہاں ہے سوز و سازِ زندگی
زندگی تیری حقیقت میں ہے رازِ زندگی

فرزندانِ وطن کے لئے

دعوتِ فکر و نظر

توصیف علوی عاصی
بی۔ اے کیرانوی

عزم و یقیں پیدا کرو فکر و نظر پیدا کرو
زندگی کی آرزو ہے تو جگر پیدا کرو

ہر طرف چھائی ہوئی ہیں شامِ غم کی تیرگی
ان اندھیروں میں نیا نورِ سحر پیدا کرو

گر بنانی ہے تمہیں رنگین تصویرِ حیات
اس میں یا رنگ بھرنے کو کچھ خونِ جگر پیدا کرو

جن کی خوشبو سے مہک اٹھے فضائے کائنات
گلشنِ ہستی میں وہ گلہائے تر پیدا کرو

بزمِ گیتی کے چراغوں کو اگر دینی ہے لو...
سوزِ دل پیدا کرو سوزِ جگر پیدا کرو

خو ہی کرنا ہے تمہیں شادابِ نخلِ آرزو
خود ہی ہر شاخِ تمنا پر ثمر پیدا کرو

گردشِ دوراں کو دینا ہے تمہیں ہی رخ نیا
تم ہی ہر اک شام سے نورِ سحر پیدا کرو

دامنِ امید کو دینے ہیں سنہ پارے اگر..
دیدۂ گریاں کے اشکوں سے گہر پیدا کرو

جن سے خوابوں کے محل تعمیر ہوتے ہیں سدا
زندگی کے وہ نئے فکر و نظر پیدا کرو

منزلِ ذوقِ طلب میں کیوں ستاروں کی ہے فکر
خود سے جو روشن ہو وہ داغِ جگر پیدا کرو

ڈالنی ہے گر زمانہ کے ستاروں پر کمند
عزمِ محکم کے نئے کچھ بام و در پیدا کرو

جس سے ہل جاتا ہے ہر ایک جبر و طاقت کا ستوں
نعرۂ جوشِ عمل میں وہ اثر پیدا کرو

کیوں دلوں میں ہے یہ عاصی امتیازِ رنگ و نسل
گر ہو تم انساں، تو انساں کی نظر پیدا کرو

قطعہ تاریخِ وفات والدۂ محترمہ جناب سرور تونسوی

اُٹھی ہے مادرِ سرور جہاں سے
کوئی دیکھے مقدر کا بگاڑ آج

رتن ہاتف نے یوں تاریخ کہدی
گرا سرور پہ ہے غم کا پہاڑ آج

۱۹۸۲ عیسوی

(ابوالبلاغت) رتن پنڈوروی

بین مذہبی مناکحت

محمد مجتبیٰ صدیقی
آئی۔ اے۔ ایس سابق رجسٹرار

صدیقی صاحب کا یہ مضمون سو فیصد اسلامی نقطۂ نظر کا آئینہ دار ہے مگر غیر مسلموں کے لئے بھی یہ مضمون اتنا ہی کار آمد اور مفید ہے جتنا کہ مسلمانوں کے لئے۔
لہٰذا "تہذیب الاخلاق" کے شکریہ کے ساتھ ہم اسے آپ کی نذر کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

ایک مشترک سول کوڈ کے اجرا کے لئے ملک میں آزادی کے بعد سے اکثر آواز اٹھائی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کوڈ قوانین شریعت کا پابند نہیں ہوگا۔ اس طرح کا ایک قانون یعنی اسپیشل میریج ایکٹ ۱۹۵۴ء بن ہی چکا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اس قانون کے تحت رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوتا ہے تو نکاح کے تمام ارکان و شرائط جو شریعت نے عائد کر رکھے ہیں نظر انداز ہو جاتے ہیں اور مہر، طلاق، وراثت، اولاد وغیرہ کے مسائل پر قوانین شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔ تبنیت، جس کا شریعت میں کوئی اعتبار نہیں ہے، کے متعلق بھی ایک ایسے ہی قانون کا اجرا زیر غور ہے۔ گو اسپیشل میریج ایکٹ کا نفاذ لازمی طور سے مسلمانوں پر نہیں ہوتا اور نہ غالباً تبنیت کے مجوزہ قانون میں کوئی ایسی قرارداد ہوگی لیکن حق اختیار کے حاصل ہونے سے مسلمانوں کیلئے ان احکام شریعت سے جن پر ۱۴۰۰ سو سال سے عمل ہو رہا ہے، انحراف کا راستہ کھل جائے گا۔

اسپیشل میریج ایکٹ کو مسلمانوں نے ابھی اتنا نہیں اپنایا ہے کہ اس کے پس پشت خو خطرہ ہے وہ کھل کر سامنے آجائے، لیکن کچھ تعجب نہیں کہ مستقبل قریب میں یہ ایک وبا کی صورت اختیار کر لے۔ مسلمانوں کے ایسے خاندان جو جاندان کجیا ہر تک رشتۂ مناکحت استوار کرنا معیوب سمجھتے تھے (گو یہ کچھ قابل تعریف بات نہ تھی) اب اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ عواقب کا لحاظ کئے بغیر ان کے نونہال ایکٹ میں دی ہوئی سہولت کا فائدہ اٹھا رہے ہیں خاندان کے افراد اُن کی مدد تھام تو درکنار، خود اُن کی اس "خوشی" میں شریک ہوتے ہیں اور مذہبی غیرت و حمیت یا خاندانی عصبیت کوئی بھی ان کا راستہ نہیں روکتی۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ شریعت کی رو سے مسلمان مرد کا نکاح صرف مسلمان عورت سے اور مسلمان عورت کا نکاح صرف مسلمان مرد سے جائز ہے۔ کتاب اللہ میں مشرک سے نکاح کی ممانعت ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے۔

"تم مشرک عورتوں سے ہرگز نکاح نہ کرنا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن لونڈی شرک کرنے والی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ اپنی عورتوں کے نکاح مشرک مردوں سے کبھی نہ کرنا جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ ایک مومن غلام شرک کرنے والے سے بہتر ہے اگرچہ وہ تمہیں بہت پسند ہو۔ یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنے اذن سے تم کو جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے"۔ (۲ — ۲۲۱)

اس آیت میں مسلمان مرد اور مسلمان عورت دونوں کے لئے مشرک سے نکاح کی صریحاً ممانعت ہے بلکہ میرے خیال میں یہ اشارہ کہ "یہ لوگ تمہیں آگ کی طرف بلاتے ہیں" ایک طرح سے وعید بھی ہے۔

اس مخالفت کا ایک نفسیاتی پہلو ہے۔ ازدواجی رشتہ ایک ایسا گہرا قلبی تعلق ہے جو اسی وقت پایۂ تکمیل کو پہونچ سکتا ہے جب اس کے ساتھ روحانی تعلق بھی شامل ہو۔ اگر دونوں فریقوں، یا اُن میں سے کسی ایک کو مذہب سے کچھ بھی لگاؤ ہے تو ایسے اہم مسئلہ میں اختلاف ہونا دونوں کی زندگیوں کے لئے اس سے زیادہ مضرت رساں ہو سکتا ہے جتنا کہ پیدائش، نسل، زبان یا دنیاوی حیثیت کا فرق۔ اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ دونوں فریقوں کا اعتقادی نظریہ ایک ہونا چاہئے۔ اگر دو شخص ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں تو دُنیا کے اہم ترین مسائل میں اُن کے خیالات میں ایک حد تک ہم آہنگی ضروری ہے اگر ایسا نہ ہوگا تو ان کے انفرادی اور اجتماعی مسائل دونوں میں آئندہ چل کر دشواریاں پیش آئیں گی۔

مسلمان مرد کو عورت کے مقابلہ میں ایک رخصت بھی دی گئی ہے قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

"آج تمہارے لئے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لئے، اور تمہارا کھانا اُن کے لئے، اور محصنات (پاک دامن عورتیں) بھی تمہارے لئے حلال ہیں خواہ وہ اہلِ ایمان کے گروہ سے ہوں یا اُن قوموں سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی۔"

(۵ — ٦)

یہ سوال علیٰحدہ ہے کہ کن قوموں کا شمار اہلِ کتاب میں ہے۔ یہود و نصاریٰ کا ذکر بحیثیت اہلِ کتاب قرآن کریم میں ہے اور عام طور سے یہی لوگ اہلِ کتاب مانے جاتے ہیں۔ لیکن کتاب اللہ میں کئی مقامات پر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کے لئے رسول بھیجے ہیں۔

"ہر اُمت کیلئے ایک رسول ہے" (۱۰ — ۴۷)

"ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیج دیا" (۱٦ — ۳٦)

بے شک اللہ تعالیٰ کی رحمتِ کاملہ اسی کی متقضی بھی تھی کہ اس کا پیغام لانیوالے صرف جزیرۃ العرب ہی کیلئے مخصوص ہو کر نہ رہ جائیں بلکہ دنیا کی اور قومیں بھی ان سے فیض یاب ہوں، البتہ ان رسولوں کو کتابیں بھی دی گئی تھیں یا نہیں اس کا کوئی حوالہ نہیں ملتا لیکن اغلب ہے کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا دستور جزیرۃ العرب کیلئے تھا، ویسا ہی کرۂ ارض کے اور خطوں کے متعلق بھی رہا ہو اور کتابیں دی گئی ہوں مگر غالباً وہ ضائع ہو گئیں۔ انجیل مقدس کو ہی لیجئے، حضرت عیسیٰؑ کے فوراً بعد ہی ضائع ہو گئی اور اس کی جگہ ان کے حواریوں کی تصنیف کردہ کتابوں نے لے لی جن کو انجیل کے نام سے موسوم کیا گیا۔

ہندوستان کے ایک بہت بڑے صوفی بزرگ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کا خیال ہے کہ یہ ملک بھی اس برکت سے محروم نہیں رہا ہے علامہ اقبالؒ نے رگ وید کی ایک مشہور دُعا "گایتری" کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ تو بہتوں نے بانگ درا میں پڑھا ہوگا مگر علامہ نے اس پر جو شذرہ لکھا ہے اس کے ساتھ اگر نظم پڑھی جائے تو اس کا لطف دو بالا ہو جاتا ہے۔ شذرہ چونکہ بانگ درا کے عام ایڈیشنوں میں نہیں ملتا اس لئے ہم اس کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتے ہیں :-

"ذیل کے اشعار رگ وید کی ایک نہایت قدیم اور مشہور دُعا کا ترجمہ ہیں جس کو گایتری کہتے ہیں یہ دُعا اعترافِ عبودیت کی صورت میں گویا اُن تاثرات کا اظہار ہے جنھوں نے نظامِ عالم کے حیرت ناک مظاہر کے مشاہدہ سے اوّل اوّل انسانِ ضعیف البنیان کے دل میں ہجوم کیا ہوگا۔۔۔ یہی وہ دُعا ہے جو چاروں ویدوں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے۔۔۔۔۔

حق یہ ہے کہ زبان سنسکرت کی نحوی پیچیدگیوں کی وجہ سے السنہ حال میں وضاحت کے ساتھ اس کا مفہوم ادا کرنا نہایت مشکل ہے۔۔۔۔ اصل سنسکرت میں لفظ "سوتر" استعمال کیا گیا ہے جس کیلئے اردو لفظ نہ مل سکنے کے باعث ہم نے لفظ "آفتاب" رکھا ہے۔ لیکن اس لفظ سے مراد اس آفتاب کی ہے جو فوق المحسوسات ہے اور جس سے مادی آفتاب کسبِ ضیا کرتا ہے اکثر قدیم قوموں نے اور نیز صوفیا نے اللہ تعالیٰ کی ہستی کو نور سے تعبیر کیا ہے قرآن شریف میں آیا ہے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

اور شیخ محی الدین ابن عربی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک آئینہ ہے جس سے تمام چیزیں نظر آتی ہیں لیکن وہ

خود نظر نہیں آتا.....،،

منذرہ اتنا کا ٹکڑا لکھنے کے بعد طوالت کے خوف کو نظر انداز کر کے نظم بھی ہم یہاں نقل کئے دیتے ہیں :۔

آفتاب

اے آفتاب روحِ روانِ جہاں ہے تُو
شیرازہ بندِ دفترِ کون و مکاں ہے تُو
باعث ہے تُو وجود و عدم کی نمود کا
ہے سبز تیرے دم سے چمن ہست و بود کا
قائم یہ عنصروں کا تماشا تجھی سے ہے
ہر شے میں زندگی کا تقاضا تجھی سے ہے
وہ آفتاب جس سے زمانے میں نور ہے
دل ہے خرد ہے روحِ رواں ہے شعور ہے
اے آفتاب ہم کو ضیائے شعور دے
چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تُو
یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تُو
تیرا کمال ہستیِ ہر جاندار میں
تیری نمود سلسلۂ کوہسار میں
ہر چیز کی عبادت کا پروردگار تو
زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا تیری نہ کوئی انتہا تری
آزادِ قیدِ اول و آخر ضیا تری

آپ دیکھیں گے کہ نظم کے ہر شعر سے وحدانیت پر ایمان کا اظہار ہوتا ہے کہیں کوئی شائبہ شرک کا نہیں ہے۔

منذرہ کے آخر میں علامہ فرماتے ہیں: "پس ہندو مذہب کو شرک کا مجرم گردانتا میرے نزدیک صحیح نہیں معلوم ہوتا،، بے شک نظم کے پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑتا ہے کہ علامہ کا خیال صحیح ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آج کل ہندو مذہب کے اعمال اس سے بہت کچھ مختلف ہوگئے ہیں۔

یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جو رخصت مرد کو کتابیہ سے نکاح کرنے کی دی گئی ہے وہ عورت کیلئے ممنوع کیوں ہے۔ میرے خیال میں اس میں ایک حکمت مضمر ہے عورت کو مرد کے برابر درجہ دینے کی زمانۂ حال میں بڑی کوششیں ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں اور خالص نظری اعتبار سے برابری کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا گیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے اور میدانِ عمل میں مرد کا تفوّق بدستور قائم ہے۔ قرآن کریم اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :۔

".....عورت کے لئے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے مَردوں کے حقوق اُن پر ہیں۔ البتہ مَردوں کو اُن پر ایک درجہ حاصل ہے"۔ (۲ + ۲۲۸)

کوئی بھی ادارہ ہو اس کو کامیابی سے چلانے کیلئے کسی ایک شخص کا سربراہی ضروری تسلیم کی گئی ہے مگر ہر شخص کو برابری کا درجہ دے دیا جائے تو جتنے منہ ہوں گے اتنی باتیں، اور نتیجہ سوائے انتشار کے اور کچھ نہ ہوگا۔ اسی طرح انسانی معیشت کو کامیابی سے چلانے کے لئے چھوٹی سے چھوٹی اکائی جو قائم کی گئی ہے وہ خاندان ہے اور اس کا بھی ایک سربراہ ہونا چاہئے۔ مرد ہی سربراہ ہے۔ ظاہر ہے کہ خاندان میں جس کو تفوق حاصل ہوگا اسی کے مذہب کو بالادستی بھی حاصل ہوگی۔ اس کے عقائد، عادات اور اطوار کا اثر اہلِ خاندان اور خاص کر اس کی اولاد اور زوج پر پڑے گا۔ اس لئے اگر شوہر غیر مسلم ہے اور بیوی مسلمان تو شوہر کے عقائد کا اثر اولاد اور بیوی پر پڑنا ضروری ہے۔ ملکی قانون اب یہ ہے کہ اولاد کا وہی مذہب ہوگا جو شوہر کا ہے۔ اسلامی شریعت اس بات کو پسند نہیں کرتی کہ جس ماحول میں کفر و شرک کا دَور دَورہ ہو اس میں ایک مسلمان عورت نکاح کر کے مجبوراً کی زندگی بسر کرے اور اس کی اولاد دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے۔

لیکن اگر کوئی مسلمان ان واضح احکام کے ہوتے ہوئے انکی خلاف ورزی کرے تو کیا صورت ہوگی؟ شیعہ فقہ میں تو ایسے نکاح باطل مانے جاتے ہیں یعنی سرے سے اُن کا انعقاد ہی نہیں ہوتا اور یہی حکم مالکی، شافعی اور حنبلی فقہ میں ہے۔ بہ الفاظ دیگر مرد اور عورت دونوں زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن حنفی فقہ میں ایسے نکاح باطل نہیں بلکہ فاسد سمجھے جاتے ہیں یعنی نکاح منعقد ہو جاتا ہے اور اس نکاحِ فاسد سے اگر اولاد ہوگی تو اس کا نسب

باپ سے ثابت مانا جاتا ہے لیکن صاحبین (امام یوسف و امام محمد) کو اس سے اختلاف ہے اور وہ دوسرے فقیہوں کی طرح ایسے نکاح کو باطل کہتے ہیں۔ غالباً امام ابوحنیفہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ شریعت کی سخت ممانعت کے باوجود بھی اگر ایسے نکاح واقعتاً وقوع پذیر ہوتے ہیں تو ان کو باطل قرار دینے میں یہ نہیں کہ سماج میں ایک انتشار پیدا ہوگا بلکہ والدین کے گناہ کی سزا ان کی بے گناہ اولاد کو بھگتنا پڑے گی۔

لیکن اس رعایت کے باوجود فقہ حنفی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ فاسد نکاح قائم رہے بلکہ قاضی کے لئے تاکید ہے کہ فریقین کو اپنے سامنے طلب کرے اور جس فرد سے نکاح جائز ہو اس کو اسلام لانے کی ترغیب دے اگر وہ قبول نہ کرے تو فریقین میں علیحدگی کرا دے۔

یہاں تک تو اس مسئلہ پر مذہبی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی اب اس کے سماجی پہلو کو دیکھئے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ مسلمان اس شخص سے رشتۂ ازدواج قائم کرنے میں احتراز کرتا تھا جس سے نکاح شرعاً ممنوع ہو۔ ایک مثال محمد علی جناح کی دیکھئے ان کو بھی مذہب کی پاسداری اس درجہ منظور تھی کہ انھوں نے ایک پارسی خاتون سے نکاح کیا تو ان کے اسلام لانے کے بعد۔ گو اس وقت اسپیشل میرج ایکٹ کا نفاذ نہیں ہوا تھا مگر ایک اور قانون موجود تھا جس کے تحت ایسے نکاح ہو سکتے تھے مگر جناح نے مذہب ترک کرنا منظور نہیں کیا۔ لیکن اب یہ حالت ہے کہ مرد اور عورتیں دونوں یا تو مذہب سے برگشتہ ہوتے جاتے ہیں یا مذہب پر صرف برائے نام قائم رہ کر اس کے احکام کی کھلے بندوں خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے متوسط طبقہ پر اکثریت کے مقابلہ میں اس کی ذہنی مرعوبیت طاری ہوگئی ہے عوام اس بات میں پڑھے لکھوں سے بہتر ہیں، ان میں نہ دینی غیرت کی کمی ہے نہ ان پر کسی کی مرعوبیت طاری ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اپنے مذہبی شعائر پر کاربند ہونے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں یہ ایک طرح کا ذہنی ارتداد ہے جس کا ہمارا متوسط طبقہ شکار ہو رہا ہے ناجائز نکاح اس ارتداد کی طرف دوسرا قدم ہے جو مسلمان عورت کے لئے غیر مسلم معاشرے میں اپنے مذہب پر قائم رہنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ مرد مسلمان ہو تو وہ بھی اپنی مشرک شریکِ حیات کے عقائد سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ممکن ہے ایسے نکاح اوّل اوّل کامیاب نظر آئیں مگر اس کی بڑی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ کچھ عرصہ کے لیے جنسی تسکین حاصل کرنے کا ایک مشغلہ ہاتھ آ جاتا ہے اور انسان ایک نئی دنیا میں پہونچ کر سب کچھ بھول جاتا ہے لیکن بعد میں جب یہ جذبہ سرد پڑ جاتا ہے تو عواقب سامنے آنا شروع ہوتے ہیں، بیگم صالحہ عابد حسین نے اپنے ایک مضمون میں جو انھوں نے اس موضوع پر اخبار قومی آواز میں کچھ دن ہوئے لکھا تھا۔ اس مسئلہ کا جائزہ صرف سماجی نقطۂ نظر سے لیا ہے انھوں نے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ایسے نکاح عام طور سے کامیاب نہیں ہوتے تعجب کی بات ہے کہ جس بات کی شریعت سختی سے مخالفت کرتی ہے اور جس کا عملی تجربہ سماجی نقطۂ نظر سے بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا، ہم اس کو اپناتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو ہم قرآن کریم کو خدا کا کلام مانتے ہیں لیکن دوسری طرف ہم اس کے احکام سے صرف لاپرواہی نہیں برتتے بلکہ عمداً ان کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں شریعت سے اس انحراف کی سب سے بڑی وجہ ہماری مذہب سے ناواقفیت ہے بچے کا سب سے اوّل مدرسہ ماں کی گود ہے اس لئے ضروری ہے کہ لڑکیاں شریعت کے احکام سے آشنا کی جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دینی تعلیم ضروری ہے کیونکہ اردو نہ صرف ہماری مادری زبان ہے بلکہ ہمارا سارا مذہبی لٹریچر اسی میں ہے۔

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ مذہبی تعلیم جس طرح ہم لڑکیوں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ویسے ہی لڑکوں کے لئے بھی ضروری ہے مذہبی لٹریچر کو ہندی میں تبدیل کیا جا رہا ہے یہ امر ضرور قابلِ ستائش ہے مگر اس میں اتنا وقت لگ جائے گا کہ ہماری نئی نسل مذہب سے بالکل بیگانہ ہو چکے گی۔ عربی خط سے اس قدر تو ہر مسلمان کو آشنا ہونا پڑے گا کہ کتاب اللہ کو اس کی اصلی زبان میں پڑھ سکے۔ عربی زبان کو بھی جہاں تک ہمارے محدود ذرائع اجازت دیں سیکھنے کی کوشش کرنا چاہئے۔ جس

محمود عربی کے فاضل تھے وہ قرآن و حدیث سے براہِ راست استفادہ کر سکتے تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کے فیصلے آج تک نظیر مانے جاتے ہیں۔ ایک جج کی اُن کے متعلق رائے تھی کہ اگر کسی خاص مذہبی حکم کی انھوں نے کسی خاص طریقے سے تشریح کی ہے تو ہمارے لئے اس کو مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

ان کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ ہندو شاستروں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے انھوں نے سنسکرت پر عبور حاصل کیا اور اس کے بعد شاستروں کی مروجہ تفاسیر کے اغلاط پر اُن کے ماخذ کی روشنی میں سیر حاصل بحث کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طلبا کو دینیات کی اعلیٰ تعلیم پی ایچ ڈی کی ڈگری تک دی جاتی ہے یعنی اس کے بعد ان کا شمار دین کے فضلاء میں کیا جانا چاہئے مگر تعجب ہے کہ ان اونچے درجوں کے طلبا کے لئے عربی جاننا لازمی نہیں ہے[1] یہی نہیں بلکہ اساتذہ کے لئے بھی عربی جاننے کی قید نہیں ہے۔ دین کی ادھوری تعلیم سے دینی ذوق تو خیر کیا پیدا ہوگا البتہ اس سے یہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ کہیں دین کے خلاف طلباء میں استہزا کے جذبات نہ پیدا ہو جائیں۔

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے علما اور دوسرے دیندار حضرات کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف خاص طور سے توجہ کرنا چاہئے سختی سے نہیں بلکہ نرمی سے سمجھا کر۔ چور کو چور کہئے تو گو آپ ایک حقیقت بیان کرتے ہیں مگر چور اپنی اس تعریف سے کبھی خوش نہ ہوگا اور نہ چوری سے توبہ کرے گا۔

معاشرے کی بہت سی برائیاں محض اس لئے فروغ پاتی ہیں کہ ان سے کوئی منع کرنے والا نہیں ہوتا اگر کوئی منع بھی کرتا ہے تو وہ دوزخ کے عذاب کی دھمکی دے کر دوزخ کا عذاب حق ہے مگر ایسے ناصح کو لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ کا ارشادِ ربانی بھی یاد رکھنا چاہئے۔

تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ ایسے ملکی قوانین کے خلاف جن کی زد براہِ راست یا ضمنی طور پر قوانینِ شریعت پر پڑتی ہو ہم کو مسلم معاشرے کو باخبر کرنا چاہئے۔ اسپیشل میرج ایکٹ ہی کو لیجئے۔ ہمارے لئے کوئی امر اس آواز کے اٹھانے سے مانع نہیں ہے کہ ہم اس کی بخشی ہوئی آزادی سے محروم کر دئے جائیں۔ اس کے لئے اگر دستور میں ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ بھی کرائی جائے۔

غزل

[illegible]

دل قیدِ غمِ عشق سے آزاد نہیں ہے
پابندِ وفا خوگرِ فریاد نہیں ہے

بلبل ہو کہ گل کوئی یہاں شاد نہیں ہے
رہنے کی جگہ گلشنِ ایجاد نہیں ہے

اس دور کے انسان کو سب یاد ہے لیکن
اک رسمِ محبت ہی فقط یاد نہیں ہے

جینا ہے تو راحت کی تمنا سے گزر جا
ہے کون جو اس راہ میں برباد نہیں ہے

پامالِ تمنا ہی سہی راہِ وفا میں
مایوس مگر انجم ناشاد نہیں ہے

غزل

[illegible]

خدا کرے کہ وفا تیری عارضی نہ رہے
ترا خلوص ترا پیار کاغذی نہ رہے

فضائیں دیکھ لوں تصویرِ ظلمتِ شب بھی
سبھی چراغ بجھا دو کہ روشنی نہ رہے

وہ آ رہے ہیں مرے گھر بڑی امید لئے
مرے خلوص میں یا رب کوئی کمی نہ رہے

انھیں کی طرح خدا مجھ کو سنگدل کر دے
یہ دل کچھ ایسا بنا دے کہ بے کلی نہ رہے

میرے جنون کو اک درجہ وسعتیں دیدے
غمِ جہاں نہ رہے فکرِ آگہی نہ رہے

یہ تانے بانے تو ہونگے حیات کے ایسے
کہیں بھی آپ نہ ہوں یاد آپ کی نہ رہے

کہیں نہ دھوپ سے گھبرا کے ڈھونڈ لیں سایہ
وہ جس پہ ناز ہے فرحت وہ بات ہی نہ رہے

---

[1] دینیات کی فیکلٹی کے درجات میں پہلے بھی عربی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اور اب بھی پڑھائی جاتی ہیں نیچے میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب فیکلٹی کے درجات کے لئے کتابیں اردو میں تھیں اور عربی زبان بھی سکھائی جاتی تھی۔ (ادارہ)

تحریر: عقیل صدیقی

انڈو پاک مشاعرہ انبالہ

آج ۱۳ مارچ ۸۲ء کی شب میں رکمنی دیوی ہال میں شام بہار (ٹرسٹ) کا پانچواں مشاعرہ آئی۔ ٹی۔ سی کے تعاون سے منعقد ہو رہا ہے آپ کا یہ خادم جنوری ۸۲ء کے پہلے ہفتہ سے سینہ دل کے درد کا شکار ہے اس لئے اس مشاعرہ کا دعوت نامہ موصول ہوتے ہی ایک شش و پنج میں رہا کہ یہ سفر کیا جائے یا نہ۔ اس الجھن سے بغاوت کر کے انبالہ پہنچ ہی گیا۔ ایک طرف محترم سعود صاحب کی برہمی کا احساس تھا کہ جب وہ سُنیں گے کہ میں نے سفر کیا ہے تو ناراض ہوں گے یقین جانئے وہ مجھے زندہ رکھنے کیلئے ہر جتن کرتے ہیں وہ میری وجہ سے حد درجہ پریشان رہتے ہیں ان دنوں وہ خود بھی صاحبِ فراش ہیں۔ آپ حضرات ہم دونوں ہی کیلئے دعائے خیر فرمائیں۔

آئیے تو پھر یہ انڈو پاک مشاعرہ آپ کو سنوا دیا جائے۔ سرہند کلب سے سلیم کھتولوی، وید دیوانہ، قاری محمد اسحاق حافظ سہارنپوری وغیرہ کے ہمراہ دُوردرشن (T. V.) کی گاڑی میں بیٹھکر رکمنی دیوی ہال مشاعرہ گاہ پہونچے۔ خدا نے خیر کی ورنہ سردار جی ڈرائیور نے تو سب کو مارنے کا کام کر دیا تھا اس نے اتنی پی رکھی تھی کہ پہلے ایک کار سے اپنی گاڑی ٹکرا دی، یہاں سے بچے تو سڑک کے کنارے بجلی کے ایک پول سے لڑانے کی ٹھان لی۔ یہاں پولس والوں نے گاڑی رکوا کر اس کی خبر لی۔ اور ہم مشاعرہ گاہ تک پیدل ہی چلے گئے ابھی سردی شباب پر ہے لہذا ایک لاجواب پنڈال بنایا گیا ہے جس میں ہوا اور خنکی کا گذر نہیں ہے سامعین کیلئے نہایت آرام دہ کرسیوں کا انتظام کیا ہوا ہے۔ V. T والے بھی تیاری کر چکے ہیں۔ صدارت کیلئے فدائے اُردو کنھیا لال پوسوال صاحب وزیر داخلہ ہریانہ کا اسم گرامی پیش کیا جا رہا ہے اس پر تالیوں سے اظہار خوشنودی کیا جا رہا ہے پوسوال صاحب نے آتے ہی فرمایا کہ میں بڑی گستاخی کر رہا ہوں شعراء کے سامنے بیٹھوں گا۔ اور پھر شعراء کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب ہریانہ نے ٹرسٹ شام بہار کی طرف سے شعراء اور سامعین

کا شکریہ کر کے ایک خوشخبری سُنائی ہے کہ ہم اردو اسکول اور ایک کتب خانہ کا انتظام کر رہے ہیں یہ اسکول خصوصاً عورتوں کے لئے ہو گا ——— تالیاں ——— چونکہ گزشتہ سال یہ دیکھا کہ اُردو کا شعر عورتیں ہندی میں نوٹ کر رہی تھیں تو اسی وقت سوچا گیا کہ ایک اُردو اسکول ضرور کھلنا چاہئے اب ہم تیاری کر رہے ہیں اور پوسوال صاحب سے بھی تعاون کی درخواست کریں گے۔ کلب کے ایک ممبر نے اعلان کیا کہ اس اسکول میں سب سے پہلے میرا نام لکھا جانا چاہئے ——— یہ عورتوں کا اسکول ہے ——— ڈاکٹر منظور صاحب دُور بیٹھے ہوئے بولے ——— اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ——— لیجئے اب اُردو کا جادو انبالہ تک پہنچ گیا ہے یہ ترکیب بڑی کامیاب رہے گی اگر ماں اردو لکھی پڑھی ہوگی تو وہ لامحالہ بچوں کو اُردو پڑھائے گی۔ مشاعرہ یا شاعری سے اُردو نہیں رہ سکتی۔ پوسوال صاحب ایک شمع روشن کر کے مشاعرہ کا افتتاح فرما رہے ہیں اور مختصر سی تقریر فرما کر اسٹیج کے سامنے تشریف لے گئے ہیں اُن کا خیال ہے کہ جب تک شاعر کی صورت نظر نہیں آتی تو شعر کا لطف نہیں آتا لہذا وہ وہاں بھی صدر ہی ہیں ادھر ملک زادہ منظور احمد منظور کا نام نامی نقیب الشعراء کیلئے پیش کیا جا رہا ہے منظور صاحب نے آج تقریر نہ کر کے اچھا ہی کیا وقت بھی زیادہ ہو چکا ہے۔ سلیم کھتولوی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں سلیم صاحب نہ جانے کیوں اپنے بیٹے کا کلر سے زیادہ پہلی غزل الاپ رہے ہیں ؎

بلبل نے چمن میں وقت سحر جب میرا فسانہ دہرایا
شبنم نے جواہر برسائے کلیوں نے تبسم فرمایا
اس نے جو نقاب رُخ کو ذرا تاریکیٔ شب میں سرکایا

یہ آپ ہی سمجھ سکتے تھے ——— منظور صاحب ——— ایک قہقہہ ——— بیچارے نابینا سلیم صاحب مسکراتے ہوئے گرج رہے ہیں ؎

ذروں کی تجلی نے بڑھ کر تاروں کی چمک کو شرمایا

کیا آگ تھی سوزِ فرقت کی بڑھتی ہی گئی ٹھنڈی نہ ہوئی
گو پھر میں آنکھوں نے میری دل کھول کے پانی برسایا

سلیم صاحب نے آج بہت دنوں کے بعد خوب پڑھا ہے میں نے ان سے کہا استاد یہ ترنم بول رہا تھا انہوں نے آج ترنم اڑا دیا ہے نا ـــ دیکھا تو ایک نوجوان کوٹ اور پینٹ زیب تن کئے مائک پر آکر محفل کا جائزہ لے رہا ہے۔ میں نے کوثر صاحب سے عرض کیا کسے پکڑ لائے دیکھا تو اسی ہنسی مذاق میں حبیب ہاشمی کلکتوی غزل سرا ہیں ؎

اب کہاں کوئی مجھے خواب سہانے دے گا
تیرا قصہ بھی وہی درد پرانے دے گا

سامنے حال کا غم پشت پہ ماضی کی تھکن
اب یہ رستہ مجھے منزل پہ نہ جانے دیگا

تم عبث اپنی بصیرت کو جلا دیتے ہو
سلسلہ کرب کا آنسو نہ بہانے دے گا

دل کو اک ضبطِ تسلی ہے کہ وہ شہرِ غزل
آسرا مجھ کو بھی نفرت کے بہانے دے گا

پھر میں نے کوثر صاحب سے کہا یار کوثر بچا سعدی کا بھی کیا جواب ہے انہوں نے زندگی کے ہر پہلو کا کچھ عجیب تجزیہ کیا ہے اب دیکھئے تا کیا فرما گئے ہیں ؎

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

حبیب صاحب کی نو عمری سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے لیجئے اب دوسری غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

سورج کے ضیاؤں کی یہ کور نگاہی ہے
محلوں میں اجالا ہے کٹیوں میں سیاہی ہے

پھر داد کا ایک ریلا سا آیا ہے یہ محلوں اور کٹیوں کی نابرابری ہر جا میں بھی موجود ہے۔ ایسا نظر آتا ہے کہ یار لوگ دوسرا شعر سننے کو تیار ہی نہیں دوسرے مصرعہ کو برابر دہرائے جا رہے ہیں اور حبیب صاحب بھی سرمستی کے عالم میں یوں جھوم رہے ہیں ؎

محسوس یہ ہوتا ہے یہ دورِ تباہی ہے
شیشہ کی عدالت ہے پتھر کی گواہی ہے

میں دیکھ رہا ہوں کہ داد و تالیوں کا ایک سیلاب آیا ہے پھر دوسرے مصرعے پر سر دھن رہے ہیں اور حبیب صاحب فاتح محفل بنے اس منظر کو دیکھ رہے ہیں پھر پنڈال کو گرمانے چلے ہیں ؎

دنیا میں کہیں ایسی تمثیل نہیں ملتی
قاتل ہی محافظ ہے قاتل ہی سپاہی ہے

پھر تالیاں جاگ اٹھی ہیں اور میں خوش ہوں کہ ہمارے ملک میں آزادیٔ تحریر و تقریر ہے آج کا شاعر اور ادیب نہایت شان سے محاسبہ کرتا ہے یہ مزاج اچھا ہے۔ حبیب صاحب پنڈال کو گرما کر تالیوں کے ہڑ بونگ میں کامراں آ رہے ہیں اور اس عالم خستگی میں منظور صاحب نے بہت ہی اچھے شاعر کا انتخاب کر کے مشاعرہ کو شباب کی طرف بڑھایا ہے لیجئے والی آسی لکھنوی پُر وقار انداز سے سنا رہے ہیں ؎

دل کی محفل تری یادوں سے سجا دی جائے
ہو گئی شام کوئی شمع جلا دی جائے

غیر ممکن ہے جو دنیا میں ملن روحوں کا
کیوں نہ یہ جسم کی دیوار گرا دی جائے

داد وصول کر کے اسی گھور گرج سے فرما رہے ہیں ؎

یہاں سب خیریت ہے امن ہے اور بھائی چارہ ہے
ہمارے شہر کے سب مسئلے حل ہوتے جاتے ہیں

داد اس شعر کا حق ہے لہٰذا داد کا ایک دھماکہ سا ہوا ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

میں اک اک بوند پانی کو بہت دن سے ترستا ہوں
مرے اطراف کے تالاب دلدل ہوتے جاتے ہیں

خبر .... کے مرنے کی ذرا پہلے سنا دیجے
کہ اب ناٹک کے سب کردار بوجھل ہوتے جاتے ہیں

والی صاحب بھی محفل کو گرما کر داد سمیٹے جا رہے ہیں اور اب ایک بظاہر بھانجے جی کی صورت لئے انجم عرفانی آ رہے ہیں یار لوگ انکی اس ہیئت کذائی سے ذرا تفریح کے موڈ میں آچلے ہیں اور آپ گرج رہے ہیں ؎

لہو لہو ہے لہو لہو ہے ٭ بس ایک رنگت ہے ایک بو ہے
نہ اس کا میں ہے نہ اس کا تو ہے ٭ لہو لہو ہے لہو لہو ہے
یہ نرم رو بھی یہ شعلہ خو بھی ٭ یہ فتنہ گر بھی یہ صلح جو بھی

ئے گلزارِ آرزو ہے ؛ ادائے رفتارِ جستجو ہے
ے اٹھے تو شرار ہے یہ ؛ مہک اٹھے تو قرار ہے یہ
ب پڑے تو شراب ہے یہ ؛ جو ہنس پڑے تو گلاب ہے یہ
رِ دنیائے آب و گل ہے ؛ یہ روحِ جسم و دماغ و دل ہے
ن جو زیبِ گلو لہو ہے ؛ وہی یہاں ہو بہو لہو ہے
لہو لہو ہے ۔ لہو لہو ہے ۔ !

ں کہ نظم طویل ہے ان کی زود گوئی نے مجھے سننے پر مجبور کر دیا
ی نظم خوب جم کر اور بغٹ کر سنی گئی اور داد کا ریکارڈ چھپ رہا تھا
یہ کیا ہو رہا ہے انجم صاحب نے شمسی مینائی اور عالم فتحپوری کی
پوری کر دی اور خوب خوب داد و تحسین وصول کئے تالیوں کے
نمہ میں جا رہے ہیں اب اس رنگ کو بدلنے کیلئے اظہر عنایتی لپک
رہیں ۔ فرمائشوں کو نظر انداز کر کے غزل سرا ہیں ؎

خط اُس کے اپنے ہاتھ کا آتا نہیں کوئی
پڑھ ہو گی ــــ ایک آواز ــــ ایک قہقہہ ــــ اور
صاحب بھی مسکراتے ہوئے محفل کو چونکانے چلے ہیں ؎

کیا حادثہ ہوا ہے بتاتا نہیں کوئی
اہے جب سے خود کو مجھے دیکھتے ہوئے
ہر سامنے سے ہٹاتا نہیں کوئی

ثابت کر رہی ہے یہ سرزمین مولانا حالی اور خواجہ احمد عباس کی
ق اور سخن فہم حضرات کی محفل ہے کئی بار دہرا کر اسی سے
سے لیک رہے ہیں ؎

دنیا جوان کیا ہوئی میرے پڑوس کی
آنچل میں جگنوؤں کو چھپاتا نہیں کوئی
اور واہ کا ایک شور اٹھا ہے اور آپ چلتے ہوئے ہیں ؎

جب سے بتا دیا ہے نجومی نے میرا نام
اپنی ہتھیلیوں کو دکھاتا نہیں کوئی
جانے نہ جانے وہ خوشبو مزاج لوگ
دل توڑنے کو بھی آتا نہیں کوئی

محفل میں نغمگی بکھیر کر مائک سے جُدا ہو رہے ہیں لیکن
ـ ایک اور ایک اور کا نعرہ بلند کر رہے ہیں ۔ اب اظہر
ـ ایک پرانی غزل ؎

غزل کے دلربا لہجہ میں بولوں
وہ آ جائے تو میں پھولوں میں تولوں

سنا کر کامران پلٹ رہے ہیں اُدھر استاذ الشعراء جوگی جیسلی (پاکستانی) قومی لباس میں ڈوبے آئے ہیں ان دنوں پاکستان کا قومی لباس قمیص اور شلوار قرار دیا گیا ہے ۔ جوگی صاحب نے پنجابی میں کلام سنا کر سماں باندھ دیا ہے جوگی صاحب کو بھی خوب خوب داد دی گئی ہے اب کولی انور ندیم لکھنوی آ کر فرما رہے ہیں ؎

جو لوگ سمندر ہیں وہ پیاسا رہیں گے
ہم لوگ قلندر ہیں اپنے کو پکاریں گے
گلیوں میں دہی لے کے ہاتھوں میں وہی پتھر
کیا لوگ محبت کو ہر دور میں ماریں گے

ندیم صاحب مناسب داد وصول کئے چلتے بنے اور اب پاکستان کے اقبال کوثر آ کر رواں دواں سنا کر چلتے بنے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اب ترنم سے غزل سنائیں گے لیکن وہ ایسا نہ کر سکے ۔ آیئے اب کوثر سہارنپوری سے بھی سن لیجئے ؎

آپ کہتے ہیں تو لو سی لئے لب آئندہ
اب نہ اٹھے گا کوئی شور و شغب آئندہ
آپ کچھ بھی سہی حالات کا منشا یہ ہے
آج بس فردِ عمل نام و نسب آئندہ
آج ممکن ہے ذرا بیٹھ کے باتیں کرنا
کون جانے کہ ملاقات ہو کب آئندہ

کوثر صاحب ہر چند کہ تحت سے پڑھ رہے ہیں لیکن داد ان کو بھی اور شعراء سے کم نہیں دی گئی ۔ لیجئے پاکستان کے مہمان شاعر امداد ہمدانی فرما رہے ہیں ؎

انگلی اُٹھائیے کوئی پتھر اُچھالئے
بدنام ہوں تو شہر سے مجھ کو نکالئے
دل جو تشی ہے دل کا کہا مان جائیے
گہرے سمندروں میں سفینے نہ ڈالئے
امداد اُس گلاب کے چہرہ کو کیا ہوا
سرسوں کے پھول کس نے گھر میں سجا لئے

یگی صاحب نے غیر شاعرانہ زبان سے (ایڈیٹر)

امداد صاحب بھی خوب خوب داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور سپورہ ساقی غزل سرا ہیں ؎

اپنے دروازے پہ ہمدردوں کا میلا دیکھا
مَیں نے کل رات بھیانک سا یہ سپنا دیکھا
جیسے دشواری نہ ہو اپنے مقدر پہ اُسے
مانگنے والے نے کاسے کو دوبارہ دیکھا
جب سزا مجھ کو سُنائی گئی سچائی کی
سُننے والوں میں نہ ماتم نہ اچنبھا دیکھا

ساقی صاحب محفل کو سرشار کرکے شاداں بیٹھ رہے ہیں اور اب مُلک کے محترم شاعر نازش پرتاب گڑھی نے آکر ایک طویل نظم سُنائی جو طوالت کے باوجود سُنی گئی اور نازش صاحب کے شایانِ شان داد و تحسین کے پھول برسائے گئے۔ ادھر منظور صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں لیکن تاحال آزاد ہیں۔ آزاد صاحب نے غزل شروع کی تو ایک ہنگامے نے سر اٹھایا ترنم سے پڑھئے ـــــ اس پہ آزاد صاحب نے فرمایا کہ جوش صاحب نے ایک مشاعرہ میں فرمایا ہماری آواز گھوڑے کی سی ہے کیا ترنم سے پڑھیں گے ـــ فراق صاحب نے فرمایا آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں ادھر ایک قہقہہ بلند ہوا اور آزاد صاحب فرما رہے ہیں ؎

یہ چھپن بھی جا پڑوں سے ہو گی یہ اندازہ نہ تھا
پھر یہ کیا تھا تجھ سے ملنے کا جو خمیازہ نہ تھا
مَیں وہاں قصرِ محبت میں مقید تھا جہاں
صرف دیواریں ہی دیواریں تھیں دروازہ نہ تھا

آزاد صاحب اور داد لازم و ملزوم۔ لہٰذا خوب داد پا کر لوٹ رہے ہیں اور اب رنگِ محفل بدلنے کیلئے پاکستان کے مشہور مزاح گو شاعر سید ضمیر جعفری آکر ترنم سے الاپ رہے ہیں ؎

زندگی ہے مصلحت کے بیچ خودداری کا نام
اور آدمی ہے ساگ میں آلو کی ترکاری کا نام
اُس نے کی پہلے پہل پیمائشِ صحرائے نجد
قیس ہے دراصل ایک مشہور پٹواری کا نام

پنڈال سنبھالے نہیں سنبھل رہا ایک غل غپاڑہ ہے کئی بار دُہرا کر محفل کو قہقہوں پہ اُتارنے چلے ہیں ؎

عشق ہرجائی بھی ہو تو درد کم ہوتا نہیں
اک ذرا تبدیل ہو جاتا ہے بیماری کا نام
رات بھر ناچا کئے اک اجنبی ہم رقص سے
اور پوچھا تک نہیں ظالم نے بیچاری کا نام

پھر ہلڑ بازی نے پنڈال کو اڑانے کی ٹھان لی ہے اور آپ اسی پختہ ترنم سے الاپ رہے ہیں ؎

مُڑ کے دزدیدہ دزدیدہ نظر سے دیکھنا
عشق بھی ہے اک طرح کی چور بازاری کا نام

اب تالیوں کا ریلا سا آیا ہے اور جعفری صاحب پھر صحت افزا شعر عطا کر رہے ہیں ؎

مَیں نے تو اپنے لئے آوارگی تجویز کی
تم نے کیا رکھا ہے اپنی خود گرفتاری کا نام
بات تو جب ہے بدل جائے سرشتِ انساں کی
یوں تو رکھ دینے کو رکھ دو وادنٹ پرلاری کا نام

ضمیر صاحب فاتحِ محفل بنے مائک سے جُدا ہوا چاہتے ہیں کہ فرمائش کے سامنے بے بس نظر آ رہے ہیں اور ایک نظم صاحب کی بیتا یوں شروع کی ہے ؎

خاکسار ماں ہے مُنصر ہر شب چکن بنوا یئے
حاضری پر حاضر و غائب ٹماٹر کھا یئے
جب کہتی ہے چھری کانٹے نقط کھر کا یئے
لنچ پر شلجم۔ ڈنر میں توریاں فرمایئے
مخلجنوں میں بوٹے جوئیے مولیاں ٹن ٹن ٹناں
دیو کی نندن ہو یا گلشیر خاں ٹن ٹن ٹنار
لیڈری کا شوق۔ ذوقِ مینا بازاری بھی ہے
گھر کی مجبوری بھی جم خانے کی لاچاری بھی ہے
فلم پر تنقید فرمانے کی بیماری بھی ہے
ہر ادا بیگم کی مہنگی ہے مگر پیاری بھی ہے
عقل ہے اور اندیشۂ سود و زیاں؟ ٹن ٹن ٹنار
دیو کی نندن ہو یا گلشیر خاں ٹن ٹن ٹنار
ہو چکے ہیں جب سے نینی تال و دہرہ دون بند
بکس میں ہیں جو دہوری کا کوٹ اور پتلون بند

ساغر مینا میں اجمل خان کی معجون بند
صبح کے مضمون ساکت ۔ شام کے شگون بند
جا اُجینا پر بجا ڈگھنیاں ٹن ٹن ٹناں
دیوکی نندن ہو یا گلشیر خاں ٹن ٹن ٹناں

رکمنی دیوی ہال میں اس برفیلی شب میں ایک گرماگرمی اور ہنگامہ بازی کا سماں ہے اس نظم پر وہ داد دی گئی ہے کہ ضمیر صاحب بھونچکا رہ گئے اور سوچتے ہوں گے کون کہتا ہے بھارت میں اُردو کا کوئی مقام اور کوئی درجہ نہیں ہے یہاں تو اُردو کی عمرانی ہے لیکن یہ ہاتھی کے دانت والا معاملہ ہے ورنہ ایسا کہاں ہے اُردو نہایت کس مپرسی کے عالم میں ہے ضمیر صاحب رنگ محفل بدل کر تالیوں کے بے ہنگم شور میں پلٹ رہے ہیں اور اب ڈاکٹر منظور صاحب نہایت اعتماد سے فرما رہے ہیں ؎

چہرے پہ سارے شہر کے گردِ ملال ہے
جو دل کا حال ہے وہی دلی کا حال ہے
اُلجھن ۔ گھٹن ۔ ہراس ۔ تپش ۔ کرب ۔ انتشار
وہ بھیڑ ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے

داد اس شعر کا حق ہے لہٰذا داد کا ایک دھماکہ ہوا ہے کئی بار مکرر کر عنایت کر رہے ہیں ؎

جن میں یہ وصف ہو کہ چھپالیں ہر اک داغ
ان آئینوں کی آج بڑی دیکھ بھال ہے
پرچھائیاں قدوں سے بھی آگے نکل گئیں
سورج کے ڈوب جانے کا اب احتمال ہے

منظور صاحب داد سمیٹے اپنی جگہ آ کر پاکستان کی مشہور شاعرہ [illegible] کو [illegible] نغمگی دے رہے ہیں سنبل صاحبہ غزل سرا ہیں ؎

وہ عکس بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

مطلع نور علی نور منفرد ۔ ترنم میں شعلہ کی لپک اور چہرہ چشم بد دور سنبل سر عکس ماہتاب ۔ اس مطلع کو ان سے سن کر عوام ہی نہیں بلکہ شعراء [illegible] بھی دم بخود رہ گئے اس لئے کہ یہ مطلع بھارت میں کئی سال سے [illegible] شعراء کے ناموں سے پیش کیا جاتا رہا ہے ۔ [illegible] بھونچکا سا [illegible]

سحر طاری کرنے چلی ہیں ؎

وہی تو میرے شبِ غم کا اک پیمبر ہے
وہ اک ستارا جو چشمِ سحر میں رہتا ہے
جو میرے ہونٹوں پہ آئیں تو گنگناؤں اسے
وہ شعر بن کے بیاضِ نظر میں رہتا ہے

پھر داد نے ہنگامہ کا دھوپ دھار لیا ہے اور آپ اسی جانِ لیلا ترنم سے محفل کو گرما رہی ہیں ؎

گزرتا وقت مرا غمگسار کیا ہوگا
وہ خود تعاقبِ شام و سحر میں رہتا ہے
نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں سنبل
ہر ایک سانس مرا اب سفر میں رہتا ہے

پھر فرمائشوں کا احترام کرتے ہوئے دوسری غزل چھیڑ رہی ہیں ؎

خستہ دل ہوں مگر زندگی سی رہتی ہے
ملا ہے جب سے ترا غم خوشی سی رہتی ہے
حسین دنوں کا تصور بھی کم حسین تو نہیں
دل و نگاہ میں اک روشنی سی رہتی ہے
عجیب مصلحت اندیش ہے تمہاری نظر
شناسا ہوتے ہوئے اجنبی سی رہتی ہے

داد کا وہی عالم ہے اس شعر پہ داد کا کچھ اور ہی رنگ ہے اور آپ لہک رہی ہیں ؎

شعارِ ترکِ محبت بہت کے دیکھ لیا
کہ دور رہ کے بھی وابستگی سی رہتی ہے

سنبل صاحبہ محفل کو چونکا کر اسٹیج پر تالیوں کے شور میں [illegible] وشاداں آ رہی ہیں وہ اس کامیابی پر فخر در بھونچکا رہ گئی ہوں گی یہاں اُردو کی مخالفت کی جائے یا اسے وہ درجہ اور مقام نہ دیا جائے وہ جس کی مستحق ہے لیکن مشاعروں میں اُردو کی پذیرائی ہوتی ہے اور مشاعرے قومی یکجہتی کے کاز کو بڑی تقویت پہونچاتے ہیں یہاں تنگ نظری اور تعصب کا مظاہرہ نہیں ہوتا ۔ بقول ریاض

اُردو زبان سنبلی زبان ۔

آپ نے [illegible] نغمگی [illegible] معتبر [illegible] دنیا [illegible]

انداز نیا آہنگ سنئے محمود سعیدی سے ؎

چل پڑے ہیں تو کہیں جا کے ٹھہرنا ہوگا
یہ تماشا بھی کسی دن ہمیں کرنا ہوگا
پاؤں رکھ خاک کے زینہ پہ اس احساس کے ساتھ
اس بلندی سے بہت جلد اترنا ہوگا

وہ نقطۂ عروج سے سہانے اور میں سوچ رہا ہوں اگر شعر اچھا ہوتا ہے وہ ترنم سے پڑھا جائے یا نہ ہر حال میں داد لے کر رہتا ہے کئی بار دہرا کر مسکرا کر فرما رہے ہیں ایک شعر جوانی کا یاد آ گیا —— اب کیا صورت حال ہے —— ڈاکٹر منظور —— اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور آپ عنایت کر رہے ہیں ؎

آئے ہو اس کی عدالت میں تو مجبور نہیں
اب کسی جرم کا اقرار تو کرنا ہوگا

محمد صاحب بھی داد لوٹے خراماں خراماں جا رہے ہیں اور ادھر سلطان اشک آ کر خوش گلوئی کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

میں کیا ہوں مقصد مری تخلیق کا کیا ہے
نہ جانے کتنی صدیوں سے اسی چکر میں رہتا ہوں
علامت فکر و دانش کی جہاں پتھر ہی پتھر ہوں
مری ہمت کہ اس عصر ستم پرور میں رہتا ہوں

اشک صاحب واہ واہ کرا کے چلتے بنے اور اب پاکستان کے جواں سال جواں فکر شاعر ممتاز راشد عنایت کر رہے ہیں ؎

پہلے خوں پیکر اشعار میں ڈھلتا ہی نہیں
غم وہ لاوا ہے جو سینہ سے ابلتا ہی نہیں
مجھ سے منہ پھیرنے والے مری قسمت پہچان
میں وہ سکہ ہوں جو بازار میں چلتا ہی نہیں

راشد صاحب بھی داد پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور پھر پاکستان کے تنویر سپرا آ کر گرج رہے ہیں ؎

اپنی تاریخ نسب پر آج بھی نازاں ہوں میں
عظمت محنت مرے اجداد کا منشور تھا
دشمنی زردار سے مجھ کو وراثت میں ملی
میں بھی ہوں مزدور میرا باپ بھی مزدور تھا

تنویر صاحب غل کم ہوا تو اس طرح دہاڑ رہے ہیں ؎

اٹھا لیتا ہے اپنی ایڑیاں جب سانس لیتا ہے
وہ بونا کس قدر میرے قد و قامت سے جلتا ہے
مری مجبوریاں دیکھو اسے بھی معتبر سمجھوں
جو ہر تقریر میں اپنا لب و لہجہ بدلتا ہے
میں اپنے بچپنے میں لے نہ پایا جن کھلونوں کو
مرا بچہ بھی اب ان کھلونوں کو مچلتا ہے

اب داد دینے والے کرسیوں سے اٹھ کر ہاتھ لہرا کر داد دے رہے ہیں یہی حال تنویر صاحب کا بھی ہے کہ وہ بھی گرج رہے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں ایسے اشعار دونوں ہی طرف پسند کئے جاتے ہیں اور دونوں ہی طرف ایسے مسائل احتجاج پر اکساتے ہیں تنویر صاحب داد سمیٹے جا رہے ہیں اور رفعت سروش فرما رہے ہیں ؎

پھول شعلوں کو بگولوں کو صبا کہتے ہیں
ہم وہ دیوانے ہیں ظلمت کو ضیا کہتے ہیں
کل وہ عالم تھا خدا کو بھی نہ کہتے تھے خدا
اب یہ عالم ہے کہ ہر بت کو خدا کہتے ہیں
عمر بھر ایک ہی دامن سے لپٹ کر رونا
کیا اسی جبر مشیت کو وفا کہتے ہیں
جہل کے دور میں انساں تھے خدا کے بندے
عقل کے دور میں بندوں کو خدا کہتے ہیں

سروش صاحب بھی داد کی جھولیاں بھرے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور منظور صاحب نہایت مناسب اور موزوں الفاظ میں تعارف کرا کر پاکستان کی خوش ترنم شاعرہ صاحبزادہ رفعت سلطان زحمت سخن دے رہے ہیں۔ رفعت صاحب غزل سرا ہیں ؎

آج کی بات پھر نہیں ہوگی ٭ یہ ملاقات پھر نہیں ہوگی
رات انکو بھی یوں ہوا محسوس ٭ جیسے یہ رات پھر نہیں ہوگی
ایسے بادل تو پھر بھی آئیں گے

سامنے سے ایک من چلے نے یا حسین کا نعرہ بلند کیا —— اس پر ایک قہقہہ بھی ابھرا —— رفعت صاحب معصومی حسن پیکر سے سماں باندھ رہے ہیں اسی بانکپن سے محفل کو لوٹ رہے ہیں ایک نظر مڑ کے دیکھنے والے ٭ کیا یہ خیرات پھر نہیں ہوگی پیچھے پھر پنڈال میں ایک طوفان سا آیا ہے کئی بار داد آ

محفل کو گرما رہے ہیں سہ

جیت کے شوق سے گزر رفعت
عشق کو مات پھر نہیں ہوگی

رفعت صاحب حق ترنم ادا کر کے محفل کو لوٹ کر جا رہے ہیں اس عالم میں ایک اور منفرد غزل گو شاعر ساحر ہوشیار پوری آکر عطا کر رہے ہیں سہ

خندۂ لب سے غم دل کو نکھارا جائے
زیست کا قرض سلیقے سے اتارا جائے
کسی چہرہ پہ تبسم نہ کسی آنکھ میں اشک
اجنبی شہر میں اب کون دو بارا جائے
شام کو بادہ کشی شب کو تری یاد کا جشن
مسئلہ یہ ہے کہ دن کیسے گزارا جائے

اس شعر پر منچلے بے قابو ہو چکے ہیں کچھ زیادہ ہی اچھل کود کر رہے ہیں اور ساحر صاحب فرما رہے ہیں سہ

تو کبھی درد کبھی شعلہ کبھی شبنم ہے
تجھ کو کس نام سے اے زیست پکارا جائے

ساحر صاحب تالیوں کے شور میں مائک سے کھسک رہے ہیں پھر پاکستان کے مشہور شاعر امجد اسلام امجد آگئے ہیں محفل کا جائزہ لے رہے ہیں سہ

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے
اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے
...ہوں تر اسی خاک میں ملنا ہے مجھے
وہ تو خوشبو ہے اسے اپنے نگر جانا ہے

داد کا شور کم ہوا تو اسی پُر وقار انداز سے فرما رہے ہیں سہ

... کوئی بھی اندھا نہیں تھا ... لکھا دیوار کا پڑھتا نہیں تھا
... کون سی اچھائی کی ہے ... چلو مانا کہ میں اچھا نہیں تھا
... کھڑکی کے سرہانے ... دریچے میں وہ چاند اترا نہیں تھا
... تیسے چھوٹ جاتا ... تمہارا نہ یاد تھی سپنا نہیں تھا
... یاد مجھ کو ... مگر میں نے اسے دیکھا نہیں تھا

... کے یہ شعر ... کے گلہائے محبت برسے اور آپ شاداں ... پاکستان کے دوسرے مقبول شاعر اور مشہور ... عطاء الحق قاسمی آکر عطا کر رہے ہیں سہ

منزلیں بھی یہ شکستہ بال و پر بھی دیکھنا
تم سفر بھی دیکھنا رخت سفر بھی دیکھنا
حال دل تو کھل چکا اس شہر میں ہر شخص پہ
ہاں مگر اس شہر میں اک بے خبر بھی دیکھنا
چند لمحوں کی شناسائی مگر اب عمر بھر
تم شرر بھی دیکھنا رقص شرر بھی دیکھنا
جس کی خاطر میں بھلا بیٹھا تھا اپنے آپ کو
اب اسی کو بھول جانے کا ہنر بھی دیکھنا

عطاء صاحب کے شایان شان خوب خوب داد و تحسین دی گئی اب تالیوں کے جھنکار میں پاکستان کے مشہور غزل گو اور فلمی گیت کار قتیل شفائی آکر عطا کر رہے ہیں سہ

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

اُدھر سخن فہم اِدھر قتیل صاحب کی طرز ادائیگی بس ایک سماں بندھ گیا ہے یہ الگ بات ہے کہ قتیل صاحب نے ترنم سے پڑھنا چھوڑ دیا ہے لیکن اس تحت کا بھی کیا جواب ہو سکتا ہے سبحان اللہ۔ ارشاد ہوا ہے سہ

میں گھر سے تیری تمنا میں جب نکلوں
برہنہ شہر میں کوئی نظر نہ آئے مجھے
وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے کسی سے تو شرم آئے مجھے
وہ مہرباں ہے تو اقرار کیوں نہیں کرتا
وہ بدگماں ہے تو سو بار آزمائے مجھے

پنڈال بھونچال کی لپیٹ میں ہے تھوڑے سکوت کے بعد اسی سنجیدگی سے فرما رہے ہیں سہ

میں اپنی ذات میں نیلام ہو رہا ہوں قتیل
غم حیات سے کہہ دے خرید لائے مجھے

آپ کے ساتھ ہی یہ نشست کامیاب اور لاجواب محفل شعر و سخن ۲½ بجے ختم ہو رہی ہے یار لوگ ابھی جمے ہوئے ہیں سننے کے موڈ میں ہیں لیکن دوسرا دور ملتوی کر دیا گیا ہے اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں جناب راجندر ملہوترہ

(بقیہ ص ۲۶ پر)

جوش ملیح آبادی اور فراق گورکھپوری کی یاد میں ایک یادگاری تقریب

کویت بزم سخن کے زیر اہتمام اُردو کے بہی خواہ اور اُردو کے عاشق جناب فخرالدین بجلی والا کے دولت کدہ پر ایک خصوصی تقریب شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی اور حضرت فراق گورکھپوری کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے زیر صدارت جناب محمد راول دریا مانی صاحب کونسلر سفارت خانہ پاکستان (کویت) منعقد ہوئی۔

اسٹیج سکریٹری جناب فرید قریشی نے تلاوت قرآن پاک سے تقریب کا آغاز کرنے کے بعد ان عظیم شاعروں کے انتقال پُرملال پر تعزیتی قرارداد پیش کی جسے اتفاق رائے سے منظور کرتے ہوئے شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کے لئے دعائے مغفرت کی گئی اور فراق گورکھپوری کے لئے حاضرین نے ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی۔

سکریٹری کویت بزم سخن فرید قریشی صاحب نے اپنے مقالے میں جوش صاحب کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ جوش کی شاعری میں شعلہ و شبنم کا امتزاج کمال کی حد تک موجود ہے جو کسی دوسرے شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ اس دور کے کچھ نقادوں نے شاعرِ انقلاب کی عظمت کو داغدار کرنے کے لئے بہت کچھ لکھا ہے مگر حقیقت تو حقیقت ہی رہتی ہے۔ آج نہیں تو کل آنے والی نسلیں جوش کی عظمت کو تسلیم کریں گی۔ جوش زندہ باد۔

جناب ساجد اقبال سابق صدر حلقۂ فکر و ادب نحاحین نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ جوش اور فراق دونوں ایک دوسرے کے بڑی اور گہرے دوست تھے اور ایک دوسرے کی شاعرانہ عظمت کے قائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جوش صاحب نے فراق کو رندِ قدح خوار گوہر شہوار، انجمن آگہی کا صدر، ہندوستان کے ماتھے کا ٹیکہ اُردو زبان کی آبرو اور شاعری کی مانگ کا صندل کہا۔ اور فراق نے جوش کی عظمت شاعرانہ کو یوں سراہا ہے:

"جوش ملیح آبادی کی شاعری ایسی ہے جیسے دن نکلا ہو اور کوئی سو نہیں سکتا"۔

جوش کے پاکستان چلے جانے کے بعد فراق نے اپنی محبت کا اظہار یوں بھی کیا ؎

اب رفتگانِ یار کی ہمت نہیں رہی
یاروں نے کتنی دُور بسائی ہیں بستیاں

ساجد اقبال صاحب کی تقریر کے بعد جناب بشیر شادل مائیک پر تشریف لائے۔ موصوف حضرت جوش مرحوم کے دوست تھے اور ان سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ شادل صاحب کا موضوعِ تقریر جوش کی جوشیلی نظمیں تھا... جس پر انھوں نے سیر حاصل تبصرہ فرماتے ہوئے کہا کہ مجھے وہ دور اچھی طرح یاد ہے جب جوش نے اپنی ان نظموں سے ہندستانی قوم کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف آگ سی بھر دی تھی اور قوم میں آزادی کی روح پھونک دی۔ اور جوش کی ان نظموں نے بکنگھم پیلیس کے کنگورے ہلا دیئے۔ جوش انتہائی بےباک اور نڈر تھے۔ بشیر شادل نے محض اپنی یادداشت کے زور پر جوش صاحب کی نظمیں آزادیٔ ہند کا ماتم۔ شکست زنداں کا خواب۔ ہٹلر اعظم سے خطاب۔ غسل صحت وغیرہ سنائیں۔ جنہیں سن کر سامعین پر ایک کیف کا عالم طاری ہو گیا اور ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے جوش خود اس تقریب میں اپنا کلام سنا رہے تھے۔ جوش صاحب کی ایک نظم کے تین بند بشیر شادل صاحب کی زبان سے سنئے ؎

اے ہم نشین فسانۂ ہندوستاں نہ پوچھ
پربت سے دل کی اٹھتی ہے کیونکر فغاں نہ پوچھ
سینے سے گلستاں کے اٹھا کیوں دھواں نہ پوچھ
کیوں باغ پر محیط ہے ابرِ خزاں نہ پوچھ

کیا کیا نہ گل کھلے روشِ خاص و عام سے
کانٹے پڑے زبان پہ پھولوں کے نام سے

تجھ کو یقین آئے گا اے دائمی غلام
میں جا کے قبروں میں سناؤں اگر کلام

تو خود موت سے حیات کے چشمے ابل پڑیں
قبر واسے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں

کلامِ جوش کی کیفیات اور سرشاری ابھی سامعین کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی کہ جناب نور پرکار صاحب فراق گورکھپوری کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے مائیک پر تشریف لائے۔

نور صاحب نے مقالے کے آغاز میں فرمایا کہ فراق رمز و کنایات کا شاعر تھا ان کی شاعری میں بھرپور رمزیت اور استعجاب کی کیفیت ملتی ہے، وہ زندگی سے کبھی بیزار نظر نہیں آتے ہیں بلکہ وہ زندگی سے شکوہ و شکایت کرتے ہیں، بلکہ زندگی کیسی بھی ہو سینے سے لگاتے ہیں۔ وہ ہر فکر انسانی پر حاوی تھے اور ان کے سامنے فکرِ انسانی ہاتھ باندھے کھڑی رہتی تھی وہ بچپن سے ہی حسن کے دلدادہ تھے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ ان کی شاعری مناظرِ قدرت میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ حیات اور کائنات پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ انسان صرف عاشق نہیں بلکہ مکمل انسان ہے۔ وہ محض حسن و عشق کے ہی قائل نہیں تھے۔ اور محض شاعری کرنے والا ہی ان کے نزدیک شاعر نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ پوری کائنات میں گم ہونے والے کو شاعر سمجھتے تھے۔ شاعری کو وہ روح کا سانس لینا کہتے تھے جتنا گہرا سانس ہوگا اتنی ہی گہری شاعری ہوگی۔ ان کی شاعری میں جمود نام کو نہیں وہ سچے وجدان کو شاعری کہتے تھے انہوں نے اپنی شاعری میں معمولی پن پر بہت زور دیا ہے یہ معمولی پن شاعر کا زندگی سے۔ عوام سے مناظرِ قدرت کے فاصلوں کو کم کرنے کی سعی کا نام ہے۔ کیونکہ آپ سے فاصلہ کم ہو اور دیگر فاصلوں کو درمیان سے ہٹا دینے بلکہ ختم کر دینے کا نام فراق ہے اور یہی

فراق کی شاعری ہے۔

فراق کی شاعری میں قربت کا احساس ہے۔ اپنا پن ہے، وجدانیت ہے۔ گہری نیند کے بعد صبح کو جس راحت کا احساس ہوتا ہے وہ ہی فراق کی شاعری ہے۔ فراق کے نزدیک آزادی کا سانس لینا ہی زندگی ہے۔ آزادی حکومتِ غیر سے چھٹکارا پانے کا نام ہی نہیں بلکہ غلط عقائد، غلط رسومات اور غلط جذبات اور غلط اقدار کے مٹانے کا نام ہے یہی وجہ ہے کہ فراق کہتے ہیں ؎

ہم وارثِ مستقبل و تقدیرِ زماں ہیں
ہم اپنی کہانی با حدیثِ دیگراں ہیں
ہم زندہ تھے زندہ ہیں زندہ رہیں گے

نور پرکار صاحب کے تقریرِ دل پذیر کے بعد جناب کمال اظہر صاحب نے فراق اور جوش کو منظوم نذرانہ پیش کیا۔

فراق بھی نہ سکے سن کے یوں انتقالِ جوش
ادیبِ عصر کا غم اور ملال ایسا تھا

کمال اظہر کے بعد نوجوان ادیب ہارون عدیم مائیک پر تشریف لائے اور فرمایا کہ جوش اور فراق کی شاعری میں امتیاز وہ ہے کہ وہ قاری کے دل و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ان شاعروں نے اپنی داخلی کیفیت کی بجائے اپنے ارد گرد رونما ہونے والے واقعات کا سچائی کے ساتھ اپنی تخلیقات میں نقشہ کھینچا، بات گو چھوٹی ہوتی ہے مگر جب وہ شعر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو عظیم ہو جاتی ہے۔

ہارون عدیم اپنی جگہ تشریف لے گئے تو قومی شاعر جناب محمد حسین صدیقی صاحب کو زحمتِ کلام دی گئی۔ کویت میں پنجابی کے منفرد شاعر صدیقی صاحب پاکستانی نیشنل آرگنائزیشن کے صدر ہیں۔ انہوں نے جوش کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کویت میں پنجابی زبان کا بول بالا کیا فرماتے ہیں ؎

دنیا تے آج نظر نہیں اوندا کل جوش اجے سی
اساں دی ٹُر جاناں ایتھوں گل اے سچی ساڈی اے
مرحوم تے ہوئے رحمت تیری دعا صدیقی ساڈی اے
جنت مقام جوش [illegible] نے عظمت بریا تے شادی اے

اب بزم کے صدر جناب طاہر کیفی فرما رہے ہیں کہ مجھ [illegible]

کم مائیگی کا احساس ہے ہمیں جو تحقی اور فراق کے بارے میں کیا کہوں ۔ شاعری
اور فن شاعری کی گہرائیوں کے نشانوں تک محدود نہیں اس کے لئے عمل آگہی اور
عرفان کی ضرورت ہے اور جو تحقی و فراق ان منازل کو طے کر چکے ہیں اس لئے
ان کی شاعری ان کے بعد بھی زندہ رہے گی اور زیادہ مقبولیت پائے گی
طاہر کیفی صاحب نے فرمایا کہ نور پرکار، ساجد اقبال، ہارون نعیم اور
فرید قریشی نے جس انداز سے برصغیر کے ہر دو برگزیدہ شعرا کو شایانِ
شان نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے وہ قابل مبارک باد ہے ۔
اب جناب فرید قریشی نے مائک جناب کیفی صاحب کی تحویل میں
دے دیا ہے تاکہ وہ تقریری دَور کے بعد مشاعرہ شروع کرائیں کیفی
صاحب نے ... جناب نجم سے دوسرے دَور کی بسم اللہ کی ہے نجم فرما رہے
ہیں ۔ ؎

اک نگاہِ ناز کہہ دیتی ہے دل کا ماجرہ
شرط ہے اہلِ نظر ہو اس نظر کے سامنے
بندگی میں جو امامت عشق کی کرلے قبول
کعبہ خود آتا ہے چل کر اس بشر کے سامنے

نجم مناسب داد پا کر اپنی جگہ گئے تو ہارون عدیم صاحب کا نام
نامی اناؤنس کیا گیا، سنئے کیا غضب ڈھا رہے ہیں ؎

ہائے یہ شہر بھی اُجڑا تو انہی کے ہاتھوں
جانتا تھا جو اسے ہم نے بسایا کیسے
میں کہ خود اپنی ہی پہچان گنوا بیٹھا ہوں
وہ مری روح میں اس طرح سمایا کیسے

ہارون عدیم داد کے لئے پھندے اپنی جگہ تشریف لے گئے تو
پنجابی کے کویت میں منفرد شاعر محمد حسین صدیقی یوں پھول برسانے لگے ؎

پھُلاں دی تے گل ای چھڈو پھُلاں نے پھُل ہی بندے نے
عاشق جوشِ محبت اندر منہ چم لیندے نے خاراں دے

اب اعلان ہوا ہے کہ جناب کمال اظہر صاحب جو کہ کویت میں طنز لگاری
میں اپنا جواب آپ ہیں مائیک پر آرہے ہیں سنئے کمال اظہر صاحب کیا
فرما رہے ہیں ؎

ڈائیٹنگ آپ جو کریں تو عنایت ہوگی
آج یہ گوشت کی دیوار گرادی جائے گی
ذوق کی لڑائی میں اکثر ہم نے یہ جہاں میں دیکھا ہے
نمالش نے کھائے ہیں جوتے جب بھی پیچ پچا ڈ ہوا ہے

کویت میں اگر ایسی بھی غزل سننے کو مل جائے تو غنیمت ہے لہٰذا
کمال اظہر قہقہے کی فضا پیدا کرتے ہوئے تشریف لے گئے تو جناب
مصور گیلانی صاحب سنجیدگی بکھیرتے ہوئے فرمانے لگے ؎

رسمِ بادہ کشی بھی فنا ہوگئی
ساقیا تیرے نوش بھی چل بسے
میکدے کی حسیں رات جب ڈھل گئی
صبح دم حضرتِ جوش بھی چل بسے

مصور گیلانی نے اس قطعہ پر سامعین کی پسندیدگی حاصل کرتے ہوئے
غزل شروع کی ہے ان کا ایک شعر آپ بھی سن لیجئے ؎

ضیائیں صرف کاشانوں تلک محدود رہتی ہیں
کسی نادار کے گھر تک اُجالا کیوں نہیں جاتا

مصور گیلانی صاحب نے غزل پر خوب داد پائی ہے اور اب کیفی صاحب
نے کویت کے نامور اور منفرد انداز کے شاعر جناب عبدالستار عاصی سے
کلام سنانے کی درخواست کی ہے ۔ عاصی فرما رہے ہیں ؎

بتائیں کیسے جدائی کا اب یہ عالم ہے
کہ حواس ہیں سب اپنے ہوش کھو بیٹھے
ہزار ڈھونڈئیے ملکِ سخن میں اب ثانی
جو تاجدارِ سخن تھا وہ جوش کھو بیٹھے

اس کے بعد عاصی نے غزل چھیڑی ہے ایک شعر آپ کی نذر ہے ؎

بکھرا ہے کرچیوں میں مرے دل کا آئینہ
یوں منتشر حیات کا شیرازہ ہوگیا

سامعین ابھی عاصی صاحب کی غزل کی سرمستی میں ڈوبے ہوئے تھے
کہ کویت بزمِ ادب کے سکریٹری جنرل جگت کیدار ناتھ کیدار کو
پکارا گیا ہے ۔ کیدار صاحب پنجابی کے بہت اچھے شاعر ہیں ان کا
باہمی [illegible] عشق کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

تُوں کی جانڑیں تُوں کی سمجھیں اوپری آپ سمجھ دے ہے
تُوں پھُل توڑن دی گل کرداں او چھونڑاں دی بابت ہم

کیدار صاحب پنجابی کلام پر بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف
لے گئے تو گو محفل میں ابھی نمودِ سحر کے آثار نمایاں تو نہیں ہوئے
جناب سحر اکبرآبادی کو زحمتِ سخن دی گئی ہے انھوں نے ما

بلکہ یوں سمجھئے کہ جوش اور فراق کی نئی زندگی کا آغاز ہوا ہے ،
آج ہم سب اور آنے والی نسلیں نذرانۂ عقیدت پیش کرتی رہیں
۔ یہ فلک ادب پر چاند ستاروں کی طرح جگمگاتے رہیں گے ۔ میں
بزم کے اراکین کا ممنون ہوں کہ جس کی بدولت مجھے ایسی اچھی
تقریب میں حاضری کا موقع ملا ۔ میرے دروازے خدمت ادب کے
لئے ہر وقت کھلے ہیں آج کی شام میرے لئے یادگار رہے گی ۔ میں
آپ تمام حضرات کو شب بخیر کہتا ہوں ۔ ●●

(صفحہ [illegible] کا بقیہ)

کو کسی بھی زاویہ سے نقصان نہیں پہنچا اردو پرست تو صرف یہ چاہتے
ہیں کہ ہمارے ملک کے دستور کے مطابق اردو کو بھی ترقی کرنے اور
سرکاری کام کاج میں استعمال کئے جانے کا موقع دیا جائے ۔ کیونکہ
اردو بھی اسی ملک میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے ۔ ہمارے ملک
کی جس کثیر آبادی کی مادری زبان اردو ہے اس کے ساتھ یہ ناانصافی
ہے کہ انہیں اپنی مادری زبان کو سرکاری طور پر استعمال کرنے کی
اجازت نہ دی جائے ۔

اتر پردیش کے وزیر صحت وغذا پروفیسر باسودیو سنگھ نے کچھ
دن ہوئے ایک پریس کانفرنس میں جو غیر ذمہ دارانہ بیان دیا ہے وہ
سے وہ خاصا تشویش کا باعث بنا ہوا ہے جب کہ وہ کانگریس (آئی)
کی حمایت اور ٹکٹ پر کامیاب ہوئے ہیں لہٰذا ان کے لئے کانگریس
کے مینی فیسٹو میں کہی گئی باتوں پر پوری طرح عمل پیرا ہونا چاہئے ۔
امید ہے کہ پروفیسر باسودیو سنگھ اپنی ذمہ دارانہ حیثیت کا
خیال کرتے ہوئے اردو کو انصاف اور اس کا حق دلانے میں اردو
دوستوں کا ساتھ دیں گے ۔ ●●

(صفحہ [illegible] کا بقیہ)

اس کی نگاہ میز پر گئی اس پر وہ سارا سامان فہرست کی ترتیب سے
سجا کر رکھا گیا تھا جو اس نے مانگا تھا ۔ بیتی کے منہ کو لگا یہی ایک
منٹ کے لئے بھی اس کا زیادہ وہاں ٹھہرنا پسند نہیں کرتا ۔ اس نے بیتی
کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر رنج یا خوشی کسی قسم کا کوئی بھاؤ نہیں
تھا ۔ ایک عورت کے ناطے بیتی کو یہ بات چبھی اور من میں اتھل پتھل
ہونی شروع ہو گئی شادی کے بعد کی ساری گھٹنائیں فلم کی طرح
اس کے دماغ میں گھوم گئیں ۔ تبھی اس کی نگاہ کمرے میں دیوار پر لگی
ہوئی بیٹی کی تصویر پر گئی وہ سب کچھ بھول کر اسے دیکھنے لگی اور
کافی دیر تک بت بنی ایک ٹک اسے دیکھتی رہی وہ یہ بھی بھول
گئی کہ اس کا وکیل اور عدالت کا نمائندہ اس کے ساتھ ہے اور اس
کا پتی کے ساتھ طلاق ہو گیا ہے اب اس گھر سے اس کا کوئی تعلق یا
واسطہ نہیں رہا ۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئی تھیں ۔ مجھے یہ تصویر
بھی چاہئے ۔ پتی کو اس کے احساسات کا پتہ لگ چکا تھا ۔ کچھ دیر
خاموش رہ کر اس نے جواب دیا بے بی تو اس گھر میں آئی یہاں رہی
یہیں سے چلی گئی اسے اس گھر میں پایا جاسکتا ہے ۔ اور طلاق ہو کر
بھی ختم ہو گئی تھی ۔ بے بی کی تصویر نے وہ کر دکھایا تھا جو عدالت
نہیں کر سکی اور دوسرے لوگ بھی نہیں کر سکے ۔ ●●

(صفحہ ۲۱ کا بقیہ)

اور ان کے رفیق کار مبارک باد کے مستحق ہیں وہ ہر سال ایک اچھا مشاعرہ
منعقد کراتے ہیں ۔ ملہوترہ صاحب کس قدر دلچسپی لیتے ہیں اس کا اندازہ اس
بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ پورے سال اس کی تیاری کرتے رہتے ہیں اس
مشاعرے کے سلسلے میں انہوں نے پاکستان کا بھی سفر کیا ہے یہی وجہ ہے کہ
امسال پاکستان سے اتنے شعرائے کرام نے شرکت کی کہ اب تک بھارت میں
اتنی تعداد میں بیک وقت وہاں کے شعرا اس طرح جمع نہیں ہوئے ۔
ملہوترہ صاحب شعرا کی خوب خاطر مدارات ہی نہیں کرتے بلکہ پینے والوں
کو پلانا کیا وہ چاہتے ہیں انہیں نہلا دیا جائے اور ایسے شعرائے کرام
بھی خوب ڈٹ کر پیتے ہیں یہ بھی اردو کی خدمت ہے۔[1]

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ کئی شعرا نے اس مشاعرہ میں بن بلائے[2]
شرکت کی اور ملہوترہ صاحب کی شرافت کہ ان کی خدمت میں بھی اسی
طرح زادِ راہ پیش کیا جیسے کہ مدعو شعرا کے مطالبات ادا کئے گئے
یہ بات انتہائی افسوسناک اور لائق مذمت ہے ۔ ●●

---

[1] کریمی صاحب پاکستانی شعرا کا یہ طائفہ دہلی کلاتھ ملز کے
مشاعرہ کے سلسلہ میں ہندوستان آیا تھا ۔ (ادارہ)
[2] اگر اردو کی خدمت یوں ہونے لگے تو پھر سارے ملک میں
اردو پڑھنے لکھنے والوں کی تعداد نصف ہو جائے ۔ (ادارہ)
[3] بن بلائے شعرا کے کسی قومی یتیم خانے کا پتہ ہی لکھ دیا ہوتا
(ادارہ)

ناردرن ریلوے

ٹائم ٹیبل نوٹس

مورخہ یکم مئی ۵۸ء سے رائج ہونے والے نئے ٹائم ٹیبل کی خصوصیات حسب ذیل ہیں ۔

گاڑیاں جو جاری کی گئیں

(۱) گاڑی نمبر ۱ ایس ایس ایم / ۲ ایس ایس ایم سیکنڈ کلاس اکموڈیشن کے ساتھ شاملی اور سہارنپور کے مابین حسب ذیل اوقات پر چلیں گی ۔

۱ ایس ایس ایم		۲ ایس ایس ایم
۱۰ - ۱۸	روانگی شاملی آمد	۳۰ — ۱۷
۵۰ - ۲۰	آمد سہارنپور روانگی	۵۰ - ۱۴

(۱۱) گاڑی نمبر ۱ پی ڈی / ۲ پی ڈی سیکنڈ کلاس اکموڈیشن کے ساتھ جو دہلی اور پالم کے مابین مندرجہ ذیل اوقات پر چلتی ہیں اب عام مسافروں کو بھی اٹھائیں گی ۔

۱ پی ڈی (ماسوائے اتوار)			۲ پی ڈی (سنیچروار)	۲ پی ڈی (ماسوائے اتوار اور سنیچروار)
۴۵ — ۷	روانگی	دہلی	آمد ۰۰ — ۱۵	۳۰ — ۱۰
۴۰ — ۹	آمد	پالم	روانگی ۰۵ — ۱۴	۴۰ — ۱۶

گاڑیاں جن کی توسیع کی گئی

(۱) ۱ ڈی ایس ایس / ۸ ڈی ایس ایس دہلی شاملی پسنجر گاڑیاں نئے نمبر ۳ ایس ایس ڈی / ۴ ایس ایس ڈی کے ساتھ سہارنپور تک بڑھا دی جائیں گی اور ان کے اوقات حسب ذیل ہوں گے ۔

۳ ایس ایس ڈی		۴ ایس ایس ڈی
۰۵ — ۱۰ روانگی	دہلی جنکشن	آمد ۳۰ — ۱۸
۱۲ - ۱۴ آمد	شاملی	روانگی ۱۷ - ۱۴
۲۲ - ۱۴ روانگی		آمد ۰۷ — ۱۴
۰۰ — ۱۷ آمد	سہارنپور	روانگی ۳۰ - ۱۱

کی بجائے ۴۵ - ۱۵ بجے پہنچا کرے گی ۔
۲۶۷ ڈاؤن تغلق آباد ۴۰ - ۸/ ۲۴ - ۸ بجے کی بجائے ۱۶ - ۸/ ۱۸ - ۸ بجے پہنچا کرے گی/ چلا کرے گی اور نئی دہلی پر ۲۴ - ۹ بجے کی بجائے ۱۰ - ۹ بجے پہنچا کرے گی ۔
این جی غازی آباد سے ۰۵ - ۱۰ بجے کی بجائے ۳۵ - ۱۰ بجے چلا کرے گی ۔
۵ ڈی ایس ایس (سابقہ ۲ ڈی ایس ایس) دہلی سے ۰۰ - ۲۰ بجے کی بجائے ۲۰ - ۱۹ بجے چلا کرے گی اور شاملی پر ۰۰ - ۲۴ بجے کی بجائے ۳۰ - ۲۳ بجے پہنچا کرے گی ۔
۶ ڈی ایس ایس شاملی سے ۴۰ - ۶ بجے کی بجائے ۲۰ - ۷ بجے چلا کرے گی اور دہلی پر ۱۰ - ۱۱ بجے کی بجائے ۲۵ - ۱۱ بجے پہنچا کرے گی ۔
۸ ڈی ایس ایس (سابقہ ۱۰ ڈی ایس ایس) دہلی پر ۲۵ - ۲۲ بجے کی بجائے ۰۰ - ۲۲ بجے پہنچا کرے گی ۔
۱۲ کے ایس کالکا پر ۰۰ - ۱۷ بجے کی بجائے ۴۵ - ۱۶ بجے پہنچا کرے گی ۔
۲ جے این نجیب آباد سے ۴۰ - ۸ بجے کی بجائے ۱۰ - ۸ بجے چلا کرے گی اور گجرولہ پر ۲۵ - ۱۲ بجے کی بجائے ۰۱ - ۱۲ بجے پہنچا کرے گی ۔
۳ کے این کوٹ دوارہ سے ۳۰ - ۷ بجے کی بجائے ۵۵ - ۶ بجے چلا کرے گی اور نجیب آباد پر ۲۰ - ۸ بجے کی بجائے ۵۰ - ۷ بجے پہنچا کرے گی ۔
۴ ایل کے فاضلکا پر ۴۵ - ۲۲ بجے کی بجائے ۲۵ - ۲۲ بجے پہنچا کرے گی ۔
۱۳ ایچ اپ بھٹنڈہ سے ۰۰ - ۱۲ بجے کی بجائے ۱۵ - ۱۲ بجے چلا کرے گی ۔
۳۳۹ اپ بھٹنڈہ سے ۱۵ - ۱۸ بجے کی بجائے ۰۰ - ۱۸ بجے چلا کرے گی ۔

تھرو اور سیکشنل کوچوں کے رننگ میں کی گئی تبدیلیاں

(i) دہلی اور فیروزپور کے مابین ۲ اپ / ۳۷ ڈاؤن پنجاب میل گاڑیوں کے ساتھ ایک فرسٹ کلاس کوچ (ایف سی) جاری کی جائے گی ۔
(ii) دہرہ دون بمبئی سنٹرل ٹی ایس کمپوزٹ کوچ کی جگہ گاڑی نمبر ۲۰/۷ ۸ - ۸۸/۱۹ کے ساتھ دہرہ دون اور اندور کے مابین ایک کمپوزٹ I اور II کلاس (ایف سی ایس) کوچ جاری کی جائے گی
(iii) پرایسیا اور حضرت نظام الدین کے مابین ۱۴۵/۱۲۷ - ۱۴۳/۱۵۱ گاڑیوں کے ساتھ ہفتہ میں ایک بار کی بجائے ہفتہ میں دو دن ایک کمپوزٹ I اور II کلاس کوچ (ایف سی ایس) چلا کرے گی ۔
(iv) ہفتہ میں دو روزہ وا لیئر نئی دہلی سروس جو ۱۵/۷ - ۱۶/۸ گاڑیوں کے ساتھ چلتا ہے وہ اب ۱۵/۳ - ۲۱ - ۲۲/۲ - ۵۲/۴۹ گاڑیوں کے ساتھ چلا کرے گی ۔
(v) باڑمیر احمد آباد ۲ ٹائر سلیپر کوچ ۲ جے بی / ۱ ایس بی / ۹۶ - ۱ے / ۱۸۵ اے / ۲ ایس بی / ۱ جے بی گاڑیوں کی بجائے ۲ جے بی / ۲۶۶/۶۵ - ۱ اے / ۲۶۵ / ۱ جے بی گاڑیوں کے ساتھ چلا کرے گی ۔
(vi) ایک فرسٹ کلاس (ایف سی) اور ایک ۳ ٹائر سلیپر (جی ایس سی این) بلاسپور اور امرتسر کے مابین ۱۳۷/۲۵ - ۴۶/۲۸ گاڑیوں کے ساتھ جاری کی جائیں گی ۔

گاڑیوں کے اوقات، تھرو اور سیکشنل کیرجوں وغیرہ کے اجرا سے متعلق با تفصیل معلومات کے لئے مئی ۱۹۸۲ء کا ٹائم ٹیبل ملاحظہ فرمائیے جو ریلوے بکنگ / ریزرویشن / انکوائری دفاتر نیز بڑے بڑے اسٹیشنوں پر بک اسٹالوں پر فروخت کیا جا رہا ہے ۔

چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ

R-5-82

MAY 1982

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/57

ـسا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے
ـں دانے خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک یونانی دَوا
ـس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے
ـبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جِلد جل بھی جایا
ـی ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دُور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے
ـں تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبے اور کھُجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور
ـپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

ـت: چھ روپے

شمع لیبارٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک تو اردو میں شائع ہوئی ہے نہ ہندی میں۔

۲۔ اس کتاب کو پڑھنے سے اردو ہندی کے وہ خود ساختہ نام نہاد دانش در جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر اردو اور ہندی کی بقا و حیات کا ضامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے کہ جو کام سرکار سے ہتھیائے ہوئے لاکھوں روپیہ سے نہ ہوسکا اور جو کام اردو اور ہندی کے یہ نام نہاد دانش ور آج تک نہ کر سکے وہ ایک فرد واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندوستانی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی اور ہندی مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی داں لیکھک کا گن گان کرے گا اور ہر اردو داں مصنف کو دعائیں دے گا کہ جس نے اردو ادب کو ایک ایسی بیش بہا تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

۵۔ ترقی اردو بورڈ، نیشنل بک ٹرسٹ، ساہتیہ اردو اکاڈمی، انجمن ترقی اردو ہند اور ریاستی اردو اکاڈمیوں کے ذمہ دار ارکان میں شاید غیرت کے جراثیم اپنا اثر دکھانے لگیں اور ندامت محسوس کریں کہ انہوں نے سرکار کا یعنی عوامی کروڑہا روپیہ اردو کی اکثر غیر مفید اور غیر ضروری کتابیں شائع کر کے محض اپنوں کو فائدہ پہنچایا اور ہندی کے مسلمان شعراء ایسی بیش بہا اور خالص ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔

۶۔ آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کی جانچ کیلئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہماری اس تحریر کی حرف حرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کر کے اپنی پوری قیمت واپس لے لیجئے حضرت پنڈت وِرکا نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کیلئے مواد فراہم کرنے پر لگایا اور اس کو ہر پہلو سے مستند بنانے کے لئے فاضل مولف نے ہزارہا کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں کو قربان کر دیا یہ نادرِ روزگار کتاب "ہندی کے مسلمان شعراء" چھپ کر تیار ہے اپنی فرمائش پہلی فرصت میں بھجوائیے۔ قیمت -/۵۱ روپے علاوہ محصول ڈاک

مزید معلومات کیلئے دفتر شان ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کو لکھئے

ودیا پرکاش سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس حبیتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سرورق پائلٹ پریس

دن میں برات چڑھ رہی ہے

- ہاں یہ ایک اچھی رسم شروع ہوئی ہے۔ دکھاوا اور بجلی کا فضول استعمال بھلا کہاں کی عقلمندی ہے۔ جب کوئی بیچارا بیٹی والا جہیز کی پھانسی کے تختے پر چڑھ رہا ہوتا ہے تو اسے روشنیوں کا ایک ایک بلب بچھو کے ڈنک کی طرح کاٹتا ہے۔
- ہم جہیز کو گناہ سمجھتے ہیں، تبھی تو لوگ چوری چھپے جہیز لینے دینے لگے ہیں۔ مگر یہ فضول کی ٹیپ ٹاپ بھی بند ہونی چاہئے۔ سماج کے لئے بجلی اتنی ہی ضروری ہے جتنا جسم کے لئے خون۔ کیا کوئی ناحق اپنا خون بہاتا ہے۔
- 1980-81 ء میں ہم نے 118 ارب 50 کروڑ یونٹ بجلی پیدا کی تھی۔
1981-82 ء میں ہمارا نشانہ 130 ارب یونٹ بجلی تیار کرنے کا ہے۔ مگر منزل ابھی دور ہے۔

سماجی برائیاں دور کرنا اور ملک کے مفاد کے لئے محنت کرنا ہمارا سب سے بڑا فرض ہے۔

نیا 20 نکاتی پروگرام

نئے 20 نکاتی پروگرام سے متعلق معلوماتی کتابچہ اردو/ہندی/انگریزی میں بھیجیں

نام ....

پتہ .... پن نمبر ......

ڈپٹی ڈائرکٹر،
... دہلی 110001

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

اتر پردیش اردو اکاڈمی خمینی کی راہ پر

اتر پردیش اردو اکاڈمی مالی طور پر اپنی ساکھ کو قائم رکھتی رہی ہے۔ اور ہمیشہ انعامات کی رقم، مسودات پر جزوی مالی امداد، بزرگ ادیبوں کی مالی مدد، طلباء کے وظائف اور اکاڈمی کے ارکان کی تنخواہیں وقت پر ادا ہوتی رہی ہیں مگر جب سے اکاڈمی کی کلیدی آسامیوں پر شیعہ حضرات کو سربراہی ملی تو انہوں نے اکاڈمی کی مالی ساکھ تباہ کر کے رکھ دی اور حالت یہ ہو گئی ہے کہ اکاڈمی کے دفتر کے کارکنان کو تنخواہیں وصول کرنے کے لئے "قلم روک" ہڑتال کرنی پڑتی ہے۔ جن ادیبوں کو مالی مدد دی جاتی ہے انہیں مارچ ۱۹۸۲ء کے بعد اس مالی سال میں اب تک ایک ماہ کا بھی وظیفہ نہیں دیا گیا۔ جن مسودات کی اشاعت کے لئے اکاڈمی نے مارچ ۱۹۸۲ء میں فیصلہ کیا تھا ان مسودات کے مصنفین نے اپنی کتابیں شائع کر کے ۱۹۸۲ء کے وسط میں ہی اکاڈمی میں پیش کر دیں مگر اب تک ان حضرات کو جزوی مالی امداد ادا نہیں کی گئی جب کہ اکثر و بیشتر مصنفین نے اپنے مسودات قرض لے کر شائع کئے۔ مارچ ۱۹۸۲ء میں جن کتابوں پر انعامات کا اعلان کیا گیا موجودہ مالی سال کی سہ ماہی گزر جانے پر بھی یہ انعامات ادا نہیں کئے گئے۔ جب کہ روایت یہ رہی ہے کہ ۳۱ مارچ تک انعامات کے چیک انعام یافتگان کو مل جایا کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ ایسی حالت میں ہو رہا ہے جب کہ اکاڈمی کی سرکاری مالی گرانٹ پہلے سے دو گنی یعنی اٹھارہ لاکھ روپیہ کر دی گئی ہے۔

اردو داں حضرات کھلے بندوں یہ کہہ رہے ہیں کہ جس طرح خمینی نے ایران کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا ہے اسی طرح اردو اکاڈمی اتر پردیش کے شیعہ حضرات نے بھی اردو اکاڈمی اتر پردیش کو ادبی حلقوں میں ایک فکر یہ موضوع بنا کر رکھ دیا ہے۔ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ سے گزارش ہے کہ وہ اتر پردیش میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنائے جانے کے پردے میں اتر پردیش اردو اکاڈمی کو ختم ہونے سے بچائیں۔ اکاڈمی کو اگر سرکاری گرانٹ کا روپیہ ابھی تک نہیں دیا گیا تو یہ حکومت اتر پردیش کی مجرمانہ حرکت ہے کہ وہ اردو اکاڈمی کو بدنام کر رہی ہے اور اگر اکاڈمی گرانٹ کا روپیہ وصول کر چکی ہے تو اتر پردیش سرکار کا یہ فرض ہے کہ اکاڈمی کے ذمہ دار حضرات سے دریافت کرے کہ یہ روپیہ کہاں ہے اور کس وجہ سے حق داروں کو ادا نہیں کیا جا رہا ہے۔ اکاڈمی کسی بھی خط کا جواب دینا حرام سمجھتی ہے جب کہ وظیفہ پانے والے، مسودات پر جزوی مالی امداد پانے والے اور کتب پر انعام پانے والے حضرات درجنوں خطوط اکاڈمی کو لکھ چکے ہیں کہ انکے بقایاجات ادا کئے جائیں مگر اکاڈمی ان خطوط کو شیر مادر سمجھ کر اس طرح بچے کا پارٹ ادا کر رہی ہے جو ماں کا دودھ پیتے ہوئے ماں کی چھاتیوں کو دبانے میں لذت محسوس کرتا ہے۔

جشنِ قتیل شفائی بریلی کی آڑ میں عوام سے فریب

بریلی میں ایک صاحب ہیں ڈاکٹر سلیم۔ ڈاکٹر واکٹر تو خیر یہ جیسے ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے مگر بھولی بھالی لڑکیوں کو پھانسنا فلمی ہستیوں کے نام پر مشاعرے یا قوالی کے پروگرام رکھ کر عوام سے روپیہ بٹورنا اور بعد میں شاعروں اور آرٹسٹوں کو دھتا بتانا ان کا روزمرہ ہے۔

اسی ڈاکٹر سلیم نے ایڈیٹر شان ہند سے بھی رسم و راہ پیدا کر کے ایک بار جناب راجندر کرشن۔ جناب راجندر کمار اور (مرحوم) سی رام چندر وغیرہم فلمی ہستیوں کو بریلی کے مشاعرے

میں مدعو کیا۔ وہ تو بھلا ہو جناب راجندر کرشن صاحب کا جن کی سوجھ بوجھ سے یہ شاطران فلمی لوگوں کو دھوکہ نہ دے سکا۔ مگر مشاعرے کے سلسلہ میں یہ حرام زادہ ایڈیٹر شان ہند کو دھتا بتا گیا اور شاعروں کا معاوضہ کھا گیا اور ایڈیٹر شان ہند کو ذاتی طور پر بھی مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ہر بار اس دھوکہ باز کے ساتھ مقامی ایسے سرکاری کارکنان ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں میں دکانداروں اور کارخانہ داروں کی گردن دبی ہوتی ہے اور وہ اس بدکار کے آلہ کار بن کر دوکانداروں اور کارخانہ داروں سے مالی مدد لیتے رہتے ہیں۔

حال ہی میں بریلی میں جشنِ قتیل شفائی کے نام پر عوام کو لوٹا گیا اور کنوینر مشاعرہ کا نام ڈاکٹر سلیم اشرف بتایا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے ڈاکٹر سلیم اشرف وہی ڈاکٹر سلیم ہے جو اس سے پہلے درجنوں بار بریلی کے عوام کو بے وقوف بنا چکا ہے۔ اب کی مرتبہ اس کے نام کے ساتھ اشرف کا دم چھلا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی حرام زدگی کا دائرہ اور وسیع ہو چکا ہے۔ اس فریبی نے اس مفروضہ جشنِ قتیل شفائی کی تاریخ ۲۰ مئی کی بجائے ۱۲ جون پر ملتوی کر دی جب قتیل شفائی صاحب پاکستان جون کی ابتدائی تاریخوں میں ہی پہنچ چکے تھے کہا جاتا ہے کہ اس بار اس دھوکہ باز کے ساتھ بریلی کے سیلز ٹیکس دفتر کا زبردست تعاون شامل حال تھا اور اخبارات میں شائع ہوا ہے کہ اس مشاعرے کی آڑ میں لاکھوں روپیہ فراہم کیا گیا۔ ڈاکٹر سلیم اشرف بریلی سے فرار ہیں۔ کیا بریلی کے افسران اعلیٰ اس سلسلہ میں اپنی صفائی پیش کریں گے کہ محکمہ سیلز ٹیکس والوں نے ڈاکٹر سلیم اشرف کے اس فرضی پروگرام کے لئے روپیہ فراہم کرنے میں مدد کیوں کی۔ ہم بریلی کے کلکٹر اور کمشنر صاحب سے یہ جائز مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں تحقیقات کریں اور ڈاکٹر سلیم اشرف کی گرفتاری اور عوام کے روپیہ کی وصولی کے ساتھ ساتھ بریلی کے محکمہ سیلز ٹیکس والوں سے بھی باز پرس کریں کہ انہوں نے اس فریب کاری میں حصہ داری کیوں کی۔

پیامِ انسانیت

جناب ایم عقیل صدیقی صاحب (جدہ) تحریر فرماتے ہیں کہ شان ہند میں یہ اعلان کیا جائے کہ "پیامِ انسانیت" عنوان پر بہتر مضمون لکھنے والے کو مبلغ پانچ صد روپیہ انعام دیا جائے گا۔ مضمون ایسا ہو کہ جس سے ہندو مسلم اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے دلوں میں انسانی رشتے کے ناطے بھائی چارگی کا جذبہ پیدا ہو۔ نفرت، ظلم و تشدد، مکر و فریب، کذب بیانی، قتل و غارت گری، جھگڑے فسادات، لوٹ مار کا خاتمہ یا کم از کم اس میں کمی واقع ہو سکے۔ اور ہر انسان کو اپنی منزل جو یقیناً ایک ہے پر اچھے اعمالوں کے ساتھ پہنچنے میں آسانی ہو۔

قارئین شان ہند سے استدعا ہے کہ وہ اس عالمگیر موضوع پر اپنے اپنے خیالات پیش کرنے کی ہر ممکن کوشش فرمائیں۔ خصوصاً ڈاکٹر ہیرالال صاحب چوپڑہ، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، جناب کالیداس گپتا رضا، جناب رام لعل نابھوی، جناب شمس کنول مدیر گگن، محترمہ شہناز کنول مدیرہ گگن، جناب توصیف تملوی، جناب اے۔ رشید کلکتہ سے التماس ہے کہ وہ اس موضوع پر ضروری توجہ فرمائیں۔ تمام مضامین (جناب عقیل صدیقی جدہ) معرفت دفتر شان ہند فلیٹ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ کے نام بھیجے جائیں اور زیادہ سے زیادہ ۱۵ اگست ۱۹۸۲ء تک موصول ہو جانے ضروری ہیں۔ تمام مضامین جدہ بھجوا دیئے جائیں گے اور جو مضمون بہتر قرار دیا جائے گا اس پر پانچ صد روپیہ عقیل صدیقی کی طرف سے دفتر شان ہند سے ادا کر دیا جائے گا۔ بیرون ہندوستان کے قارئین شان ہند بھی اس مقابلہ میں حصہ لے سکتے ہیں۔

قرآنِ مجید میں ....

لفظ اللہ ۲۶۹۲ بار، لفظ رب ۳۵۳۳ بار آتا ہے

ایک نمازی کی زبان سے اس کی پانچ وقت کی نماز میں مجموعی

طور پر کم سے کم ۲۳۸۵ مرتبہ یہ دونوں متبرک الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ اذان کے ذریعہ روزانہ ۵۵ بار اللہ کہا جاتا ہے۔ ان اعداد و شمار کی روشنی میں جناب عقیل صدیقی جیدہ کا فرمان ہے کہ قرآن مجید میں "خدا" ایک بار بھی نہیں آیا، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والے مسلمان اپنے خالقِ مطلق کو "اللہ" یا "رب" کے سوا کسی دوسرے نام، یا خدا" کہہ کر پکاریں۔ یہ دلچسپ اور قابلِ غور حقائق عقیل صدیقی صاحب جیدہ نے ایک کتابچہ "فی امان اللہ" میں شائع کئے ہیں۔ یہ کتابچہ واقعی مطالعہ کی چیز ہے۔ اگر آپ اسے پڑھنا چاہیں تو بلا معاوضہ پتہ ذیل سے حاصل کر سکتے ہیں
جناب عقیل صدیقی صاحب معرفت دفتر شان ہند فلیٹ ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲۔

نیشنلائیزڈ بینک عوام کے لئے زحمت

جب سے بینکوں کو نیشنلائیزڈ کیا گیا ہے عوام کے لئے بینکنگ ایک زحمت بن کر رہ گئی ہے۔ بینکوں کے ملازمین اپنے آپ کو سرکاری ملازم سمجھ کر اب لگن سے کام نہیں کرتے کیوں کہ پہلے انہیں یہ ڈر رہتا تھا کہ اگر محنت اور فرض شناسی سے کام نہ کیا تو بینک کے مالکان ملازمت سے نکال دیں گے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ بیرونی چیک زیادہ سے زیادہ ہفتہ بھر میں آجاتے تھے اور حساب داروں کے حساب میں ان کی رقوم معمولی سے کمیشن وضع کرنے کے بعد جمع کر دی جاتی تھیں، مگر جب سے بینکوں کو نیشنلائیزڈ کیا گیا ہے یہی بیرونی چیک کئی کئی ماہ تک پارٹیوں کو انتظار کا جلوہ دکھاتے رہتے ہیں۔ دینا بینک دریا گنج والوں نے شان ہند کا لکھنؤ سے آیا ہوا چیک اپنی برانچ امین آباد لکھنؤ کو ۲۷ جنوری ۸۲ء کو بھجوایا یہ چیک ۱۹ فروری کو وہاں سے وصول ہو کر آیا تو اس پر امین آباد لکھنؤ برانچ کے منیجر کے دستخط نہیں تھے لہٰذا دریا گنج والوں نے اسے دستخط کرنے کے لئے واپس بھجوایا مگر آج تک اس چیک کا کوئی پتہ نہیں۔ دریا گنج برانچ نے دو چینوں بار ریما نڈ بھجوائے۔ تار دیا۔ مگر امین آباد برانچ والوں کے کانوں پر جوں نہ رینگی۔ اس کے مقابلہ میں

بمبئی مرکنٹائل بینک جو نیشنلائیزڈ کی لعنت سے ہمکنار نہیں ہوا اس کا سروس کا یہ حال ہے کہ بمبئی کا ڈرافٹ دس دن میں کیش ہو کر آگیا جب کہ باقی بینکوں میں ۲۵ دن سے ۱½ ماہ تک لگنا معمولی بات ہے۔

ہم مرکزی حکومت کے نائب وزیر مالیات مسٹر جنارد ھن پجاری صاحب سے مودبانہ التماس کریں گے کہ انہوں نے تو اب بمبئی اور دہلی میں قومی ملکیت والوں بینکوں کی بعض شاخوں کے معائنہ میں بینک کے ملازمین اور ذمہ دار افسروں میں فرض ناشناسی دیکھی ہے مگر عوام تو اس روز سے ان کی جان کو رو رہے ہیں جب سے یہ بینک قومی ملکیت میں آئے ہیں۔

کاش کہ حکومت بینکوں کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد ان میں ڈسپلن، عوام کی خدمت، اور ملکی مفاد کا جذبہ بھی پیدا کر سکتی۔

●●

غزل

پروفیسر فرید قریشی سحر
(کویت)

وہ جا رہا ہے گھر کو جلا کر ابھی ابھی
دُنیا کو اک تماشہ دکھا کر ابھی ابھی

مایوسیوں میں آپ نے پھر حوصلہ دیا
امید کے چراغ جلا کر ابھی ابھی

اک شخص بزمِ دل سے اچانک چلا گیا
روتے ہوئے دلوں کو ہنسا کر ابھی ابھی

وہ جا رہا ہے دیکھئے دیوانہ آپ کا
پانی پہ کچھ لکیریں بنا کر ابھی ابھی

بس یہ ہی فاصلہ ہے موت و حیات میں
بچھڑا ہے کوئی آنکھ ملا کر ابھی ابھی

آسان ہو گیا ہے سفر دل کی راہ کا
بارِ غمِ حیات اٹھا کر ابھی ابھی

پھر تازہ ہو گئے ہیں سحر زخمِ دل میرے
جاتا ہے کوئی آنکھ ملا کر ابھی ابھی

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

محمود تونسوی

مدیر "ایوانِ خاور" بانکوٹی دفتر شانِ ہند میں میرے مددگار تھے، کام کرنے میں انتھک، کوئی کام ایک بار سمجھا دیا تو کیا مجال کہ اس میں پھر کوئی کمی رہ جائے۔ غرضیکہ دفتر کا ہر کام اس خوش اسلوبی سے انجام دیتے کہ دل خوش ہو جاتا۔ کتابوں پر تبصرہ بڑے سلیقے سے کرتے تھے۔ مرحوم ماہر القادری مدیر "فاران" کا مجموعہ کلام کراچی سے شائع ہوا تو اس پر تبصرہ خاور صاحب نے اس قدر بہترین لکھا کہ ماہر القادری نے بھی پسندیدگی کا خط لکھا۔ حالانکہ ماہر القادری کے متعدد اشعار پر خاور نے فنی نقطۂ نظر سے بحث کی تھی اور ماہر القادری صاحب کو جھٹلایا تھا۔

دفتر شانِ ہند میں کتب خانہ بھی ہے اور کتابوں کی الماریوں میں کبھی تالا نہیں لگایا گیا۔ مگر میری نگاہ میں ہر کتاب کی تعداد وغیرہ کا ایک نقشہ سا بنا رہتا ہے اگر کوئی کتاب اپنی جگہ سے ہلی ہوئی ہے تو میں فوراً اس کی تحقیق کرتا ہوں کہ ایسا کیوں ہوا۔ دفتر کی سیڑھیوں میں ان دنوں بجلی کے میٹر کی حفاظت کے لئے میٹر پہ لکڑی کا ایک بکس لگوا دیا گیا تھا۔ ایک روز نیچے اترتے وقت میں نے یوں ہی بے خیالی میں اس بکس کو کھولا تو اس میں چند کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے کتابیں اٹھا کر دیکھیں تو وہ اپنے کتب خانہ کی ہی تھیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں فوراً واپس دفتر میں آیا اور کتابوں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی تو کہیں سے بھی کوئی کتاب ہلی ہوئی نہیں تھی۔ خاور صاحب سے ان کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ دفتر کا لین دین سب خاور صاحب ہی کرتے تھے۔ مثلاً کاغذ خریدنا۔ کاتب کو کتابت کی اجرت ادا کرنے اس کے مکان پر جانا۔ بازار سے فرمائشوں کی کتابیں خرید کر لانا۔ پولیس سے رسالے کے فرمے اٹھانا اور پریس کا بل چکانا۔ کچھ دنوں کے بعد کاتب منشی محمد احسن تشریف لائے۔ سلام علیک کے بعد انہیں چائے پلائی گئی۔ اخلاقاً دریافت کیا کہ کیسے تکلیف فرمائی؟ تو وہ جھجکتے ہوئے فرمانے لگے سرور صاحب آپ تو بغیر ادائیگی کئے کتابت شدہ کاپیاں اٹھاتے نہیں تھے۔ اب ایسی حالت کیوں ہو گئی کہ دو ماہ سے آپ نے ایک پیسہ بھی نہیں بھجوایا اس لئے میں خود حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی خیریت بھی پوچھتا آؤں گا اور روپیہ بھی لیتا آؤں گا۔ خاور صاحب اس وقت جامع مسجد پر کتابیں خریدنے گئے ہوئے تھے۔ میں نے منشی محمد احسن صاحب سے گزارش کی کہ میں نے تو خاور صاحب کے ہاتھ آپ کو روپیہ بھجوا دیا تھا لہٰذا میرے ذمہ تو آپ کا ایک پیسہ بھی واجب نہیں ہے۔ احسن صاحب ایسا نمازی اور سچے انسان ہیں انہوں نے حیرت سے کہا کہ سرور صاحب مجھے تو دو ماہ سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔ میں تو یہ سمجھتا رہا کہ شاید آپ کا ہاتھ تنگ ہے اس لئے کوئی بات نہیں پیسے بعد میں آجائیں گے۔ مگر جب دو ماہ کے رسالے کتابت کرنے کے بعد بھی آپ نے رقم نہیں بھجوائی تو میں خود حاضر ہوا ہوں۔ خاور صاحب اردو بازار سے واپس آئے اور انہوں نے سیڑھیوں کے دروازہ پر ہی احسن صاحب کی آواز سن لی تو وہ پچھلے پیروں نیچے اتر گئے اور جب تک احسن صاحب چلے نہیں گئے اوپر نہیں آئے۔ ادھر خاور صاحب انتظار کرتے کرتے جب کافی وقت گزر گیا تو میں نے احسن صاحب سے کہا کہ آپ جائیے میں خاور صاحب سے دریافت کرنے کے بعد کل صبح ہی آپ کے ہاں حاضری دوں گا اور آپ کا معاملہ نپٹا دیا جائے گا۔ خاور صاحب واپس آئے تو میں نے ان سے دیر سے آنے کا سبب پوچھا۔ احسن صاحب کی شکایت کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ روپیہ تو مجھ سے لے گئے

انہیں کیوں نہیں دیا۔ خاور صاحب نے ڈھٹائی سے کہا کہ میں تو ہر بار روپیہ ان کو دے کر کتابت شدہ کاپیاں لاتا ہوں ابھی یہ ذکر ہو ہی رہا تھا کہ بائنڈر خالد صاحب تشریف لے آئے اور آتے ہی شکایتی لہجے میں کہنے لگے کہ سرور صاحب آپ نے دو ماہ سے بائنڈنگ کے پیسے نہیں بھجوائے حالاں کہ آپ تو ہمیشہ کام کرانے کے بعد فوراً ادائیگی کرتے ہیں۔ اب کیا معاملہ ہے۔ خاور صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا کیوں کہ وہ بائنڈنگ کی اُجرت مجھ سے لے چکے تھے۔ ان دنوں بائنڈنگ کا بل سات آٹھ روپے کا ہوتا تھا۔ خالد صاحب کو دو ماہ کا بل میں نے دوبارہ ادا کر دیا۔ ابھی خالد صاحب سیڑھیوں میں ہی ہوں گے کہ حالی پبلشنگ ہاؤس کے مالک بدر صاحب کا خط لئے ہوئے اس کا ملازم آیا جس میں لکھا تھا کہ آپ تو ہمیشہ نقد کتابیں خریدتے تھے مگر اب تو دو ماہ ہو گئے آپ کے ہاں کتابیں اُدھار جا رہی ہیں براہ کرم بلوں کی ادائیگی فرمایئے۔ میں نے یہ خط خاور صاحب کو دیا اور ان سے کہا کہ آپ تو ہر روز مجھ سے کتابوں کی خریداری کے لئے نقد روپیہ لے جاتے ہیں پھر یہ کیا معاملہ ہے۔ خاور صاحب نے کسی بات کا جواب دینا ہی بند کر دیا اور بالکل خاموش بیٹھے خطوط لکھتے رہے۔ شام کو جب دفتر بند کر کے میں گھر جانے لگا تو نے خاور صاحب سے کہا کہ ذرا چھوٹا کمرہ تو کھلوائیے (یہ گودام ہمارا پچھ ہے) کمرہ کھلا تو کتابوں کے اسٹاک کو بکھرا پایا اور ایک نظر میں ہی پتہ چل گیا کہ سینکڑوں کتابیں اپنی جگہ پر نہیں ہیں۔

رات میں نے بستر پر کروٹیں بدل بدل کر کاٹی، یہ سوچتے سوچتے نیند نہ آئی کہ نہ معلوم خاور صاحب نے کس کس کا روپیہ ادا نہیں کیا اور خود کھا گئے اب یکدم سب کا حساب صاف کرنا ہوگا ورنہ بازار میں جو ساکھ ہے وہ جاتی رہے گی۔ ان دنوں شان ہند کا زرِ سالانہ چار روپے تھا اور کتابوں کی قیمتیں بھی ایک دو روپیہ ہوتی تھیں۔ صبح وقت سے پہلے ہی دفتر آ گیا۔ خاور صاحب دفتر میں ہی سوتے تھے انہیں پیار سے سمجھایا کہ جو بات ہے سچ سچ بتا دیجئے

تو کہنے لگے کہ ہاں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ لیکن خاور صاحب ٹال مٹول کرتے رہے آخر کار انہیں ساتھ لیا اور جہاں جہاں بھی ہمارا لین دین تھا سب کے پاس گیا تو پتہ چلا کہ تقریباً بارہ سو روپیہ کا پیمنٹ (PAYMENT) کرنا ہوگا۔

ان دنوں میری حالت ایسی نہیں تھی کہ بارہ سو روپیہ فوری طور پر ادا کیا جا سکے۔ کچھ روپیہ بنک میں تھا وہ نکلوا لیا کچھ ایک دو دوستوں سے اور بیگم شاہدہ نکہت سے تین سو روپیہ قرض لے کر شام تک تمام ادائیگیاں کر دی گئیں اور خاور صاحب کی خدمات ختم کر دی گئیں۔ احتیاطاً خاور صاحب کی ہمراہی میں سب دکانداروں - کاغذی - کاتب - پریس وغیرہ میں کہہ دیا گیا کہ آئندہ انہیں ہمارا نمائندہ نہ سمجھا جائے۔

شان ہند سے جانے کے بعد خاور صاحب نے دفتر شاہراہ میں ملازمت کر لی۔ وہاں شان ہند کی نسبت کتابوں کی چوری کا میدان زیادہ وسیع تھا۔ کیوں کہ وہاں کتابوں کا اسٹاک ہمارے ہاں سے کہیں زیادہ تھا۔ کچھ دنوں بعد شاہراہ کے مالک یوسف جامعی مرحوم چیلی مارکیٹ میں ملے تو فرمانے لگے سرور صاحب، خاور صاحب کیسے کیریکٹر کے مالک ہیں عرض کیا کہ اچھے شاعر ہیں، تنقید بہترین کر سکتے ہیں، مضمون بھی خوش اسلوبی سے کرتے ہیں، بارڈر کر ہیں، کام کر سکتے ہیں۔ یوسف جامعی فرمانے لگے پھر ایسے کارکن کو آپ نے اپنے ہاں سے رخصت کیوں دے دی۔ جواب میں میں نے مسکرا دیا تو وہ کہنے لگے کہ کل وہ ہمارے ہاں سے کتابیں چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے اور پتہ چلا کہ وہ متعدد کتابیں کو ڑیوں کے بھاؤ متعدد بار فروخت کر چکے ہیں لہٰذا میں نے بھی اسے نکال دیا ہے۔

تین چار دنوں کے بعد خوشنویس محمد احسن صاحب رات کے آٹھ بجے میرے مکان سوئی والان میں تشریف لائے تو ان کے ہمراہ خاور صاحب بھی تھے۔ بیٹھتے ہی آنکھیں ... باہر نکل پڑیں گی۔ جو ... اور

ایسے خاموش کہ جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔ احسن صاحب فرمانے لگے کہ سرور صاحب یہ شام سے میرے سر ہیں انہیں ایک روپیہ دوں تاکہ یہ سینما دیکھ سکیں۔ ان کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر کہا گیا کہ تم کھانا کھالو۔ چائے پی لو۔ مگر سینما کے لئے میں ایک روپیہ نہیں دوں گا۔ اتنے میں ان کے منہ سے شراب کی بو کا بھبھکا جو آیا تو پتہ چلا کہ یہ شراب کے نشے میں ہیں۔ اور ایک روپیہ سینما کے بہانے لے کر مزید شراب پئیں گے۔ (ان دنوں دو روپیہ میں خانہ ساز شراب کی بوتل مل جاتی تھی) جوں ہی مجھ پر اس راز کا انکشاف ہوا کہ خاور شراب پیتا ہے تو سب بات سمجھ میں آگئی کہ انہوں نے یہ سب کچھ محض شراب نوشی کی عادت کے باعث کیا۔ احسن صاحب نے بڑی لجاجت سے کہا سرور صاحب میری ایک گزارش ہے اسے آپ بانکوٹ پہنچا دیجئے۔ یہ اچھے گھر کا لڑکا ہے اور پھر اس نے بتایا کہ یہ آپ کے دوست صوفی بانکوٹی کا فرزند ارجمند ہے۔ احسن صاحب کے اس فرمان کے بعد میں نے خاور صاحب سے پوچھا کہ تمہارے کپڑے وغیرہ کہاں ہیں۔ جواب میں وہی خاموشی۔ احسن صاحب نے بتایا کہ شراب نوشی کے باعث یہ کپڑے وغیرہ بھی فروخت کر چکے ہیں۔ میں نے دفتر کی چابی خاور صاحب کو دی اور کہا کہ کھانا کھائیے اور جاکر دفتر میں سو رہئے۔ کل آپ کو بانکوٹ روانہ کردیا جائے گا۔ دوسرے دن دفتر آتے ہی میں نے پہلے تو خاور صاحب کو پاجامہ اور قمیص سلوا کر دئے اور چپراسی کو بھیجکر بمبئی کا ٹکٹ جنتا ایکسپریس کا اگلے روز کا منگا دیا۔ اگلے روز میں خود ساتھ جاکر انہیں جنتا ایکسپریس میں سوار کرآیا اور راستہ کے اخراجات نیز بمبئی سے بانکوٹ جانے کے لئے مناسب پیسے دے کر رخصت کیا۔ امید تو یہ تھی کہ یہ شاید راستہ میں ہی اتر جائیں گے یا زیادہ سے زیادہ بمبئی پہنچکر پھر شراب نوشی میں الجھ جائیں گے۔ مگر خدا کے کرم سے یہ بانکوٹ پہنچ گئے اور صوفی صاحب (مرحوم) کا خط بھی آیا کہ خاور بخیریت گھر پہنچ گیا ہے۔

کچھ عرصہ بعد خاور صاحب کی شادی ایک اچھا
لکھی لڑکی سحاب سے ہوگئی اور اب وہ دو تین
کے باپ بھی ہیں۔ اب تک ان کے کم و بیش چھ
مجموعے شائع ہوچکے ہیں اور یہ سب کچھ شراب
کرنے کے بعد ہوا۔ خدا کرے کہ خاور صاحب
منازل طے کریں اور شراب کی لعنت سے ہمیشہ
بچے رہیں۔

غزل

عبدالستار عاصی (کویت)

یوں اہل جنوں گردش ایام سے کھیلے
ساقی سے کبھی کھیلے کبھی جام سے کھیلے

ہر لمحہ تری یاد کا پیغام اجب
ہم اہل جنوں پھر بھی ترے نا

آنکھوں میں چھپائے ہوئے اشکوں کے سمندر
ہنستے ہوئے اکثر غم و آلام سے کھیلے

ہر شخص ترے شہر کا دشمن تھا
ہم تیری عنایت ترے اکرام

ہیں آج بھی تاریخ میں وہ نام نمایاں
جو چڑھ کے صلیبوں پہ ترے نام سے کھیلے

سینے میں چھپائے ہوئے انکا
سورج کی کڑی دھوپ میں آ

عاصی یہ ہر اک گام پہ اپنوں کی عنایت
دانستہ لگائے ہوئے الزام سے کھیلے

مانک ٹالا

"دو اندھے اور ایک ہاتھی"

پریم چند کی کہانیوں "قاتل" اور "عفو" پر دو انتہا پسند نظریوں کا تقابلی مطالعہ

دو اندھوں نے کہیں ہاتھی "دیکھ" لیا یا یک نے اُس کی دُم پکڑلی اور دوسرے نے اُس کی ٹانگ پر ہاتھ پھیرا اور پھر دونوں نابینا چلے اپنی "بصیرت" کے مطابق اُس کا بکھان کرنے۔

کچھ یہی حال جناب ہنس راج رہبر صاحب اور جناب ابو محمد شبلی صاحب کا ہے۔ رہبر صاحب پریم چند کی ایک کہانی "قاتل" کو لے کر انہیں بائیں بازو کی تشدد پسند تحریکوں کا حامی ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ دوسری طرف شبلی صاحب ان کی ایک دوسری کہانی "عفو" / "معافی" کو لے کر انہیں مسلمانوں بلکہ اسلام کا دشمن اور ہندو جارحانہ فرقہ واریت کا نمائندہ ثابت کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

ایک طرف رہبر صاحب بائیں بازو کی انتہا پسند ادبی اور سیاسی تحریکوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور دوسری طرف شبلی صاحب مسلمانوں کے دائیں بازو کی انتہا پسند متعصب، تنگ نظر اور جنونی سیاست آمیز مذہبی اور مذہب آمیز سیاسی جماعتوں اور تحریکوں کے علم بردار ہیں اور انہیں اگر پریم چند کی آنکھ میں کہیں تنکا بھی نظر آجائے تو وہ اُسے اپنی آنکھ کے شہتیر سے بھاری بھرکم ثابت کرنے میں کوشاں ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ دونوں کے نظریات پڑھ کر مجھے خیال آیا کہ دونوں انتہا پسند نظریوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جائے تاکہ فیصلہ ہو سکے کہ دونوں اندھوں میں کون اچھا کھلاڑی ہے۔ پہلے رہبر صاحب کی پیش کردہ کہانی "قاتل" کی تفصیل و تلخیص پیش خدمت ہے۔

منشی پریم چند کی کہانی "قاتل" ان کی کہانیوں کے ایک مجموعہ "آخری تحفہ" میں شامل ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کی اطلاع کے مطابق یہ مجموعہ ۱۹۳۴ء کے ابتدائی مہینوں میں نرائن دت سہگل اینڈ سنز کے ہاں لاہور سے پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا۔ اور "نیرنگِ خیال" کے مارچ ۱۹۳۴ء کے شمارے میں اس کی اشاعت کا اعلان اور اشتہار شائع ہوا تھا (تلاش و توازن۔ پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۱۲۲) یہ کہانی اس سے پہلے کسی اردو رسالہ میں شائع ہوئی یا نہیں اس کے بارے میں کہیں سے بھی کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ بہر حال پریم چند کی زندگی میں یہ کہانی ہندی میں کہیں شائع نہیں ہوئی تھی۔ امرت رائے صاحب نے بعد میں اس کا اردو سے ہندی میں ترجمہ کر کے "گپت دھن" جلد ۲ میں شامل کیا تھا۔

ہنس راج رہبر صاحب نے اپنی کتاب "پریم چند" (تیسرا ایڈیشن۔ مطبوعہ مئی ۱۹۸۰ء ناشر مکتبہ جامعہ دہلی) میں اس کہانی پر "سمر یاترا" کے باب (صفحات ۱۹۱۔ ۱۹۹) میں مفصل بحث کی ہے۔ "سمر یاترا" تھا ایسی کہانیاں ("سمر یاترا اور دیگر کہانیاں") بارہ کہانیوں کا مجموعہ تھا جو ۱۹۳۲ء کے اواخر میں پریم چند نے خود ہی اپنے سرسوتی پریس، بنارس سے ہندی میں شائع کیا تھا اور مارچ ۱۹۳۲ء میں برٹش سرکار نے اسے ضبط کر لیا تھا۔ یہ مجموعہ اردو میں آج تک شائع نہیں ہوا۔ بارہ کہانیوں میں سے صرف چھ کہانیاں اردو کے رسائل یا پریم چند کے اردو کے مجموعوں میں شامل ہیں۔ باقی کی چھ کہانیاں صرف ہندی ہی میں شائع ہوئیں۔ پریم چند کی یہ کہانی یعنی "قاتل" "سمر یاترا" کے مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ لیکن رہبر صاحب نے "سمر یاترا"

"بوڑھی بیوہ جنگِ آزادی میں دل وجان سے شریک تھی۔ دس سال قبل اس کا شوہر ایک باغیانہ تقریر کرنے کے جرم میں سزایاب ہوا تھا۔ جیل میں اس کی صحت خراب ہو گئی اور جیل میں ہی راہیِ عدم ہوا۔ تب سے یہ بیوہ عقیدت آمیز جوش و انہماک سے خدمتِ قوم میں مصروف تھی۔ شروع میں اس کا نوجوان فرزند بھی رضاکاروں میں شامل ہو گیا تھا۔ ادھر پانچ مہینوں سے وہ اس نئی سبھا میں شریک ہو گیا تھا اور اس کے سرگرم کارکنوں میں سمجھا جاتا تھا۔"

ماں کو اپنے اکلوتے بیٹے سے جب اس خفیہ تشدد پسند سبھا میں اس کے شامل ہونے کا پتہ چلا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ اسے اس تنظیم سے الگ ہو جانے کی تلقین کرتی ہے اور اپنی ساری گفتگو میں اعتدال پسند نظریے کی حمایت کرتی ہے لیکن بیٹا جوشِ جوانی میں کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا ہے۔

رہبر صاحب اپنے موقف کو سچا ثابت کرنے کی دھن میں قارئین کے سامنے تصویر کا صرف ایک ہی رخ زیادہ زیادہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی طرف سے پیش کردہ مکالمے پڑھیے۔

دھرم دیو: ـــ مجھے امید نہیں کہ پکٹنگ اور جلوسوں سے ہمیں آزادی حاصل ہو سکے گی۔ یہ اپنی کمزوری کا اور مزدوری کا صریحی اعلان ہے۔ جھنڈیاں نکال کر اور گیت گا کر قومیں آزاد نہیں ہوا کرتیں (اس کے بعد رہبر صاحب اختصار کے لئے اسی مکالمے کے چند الفاظ چھوڑ دیتے ہیں) ـــ یہاں کے لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے [illegible] نے کہا یہیں سوراج مل جائے گا، سب لوگ آنکھیں بند کر کے اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ آدمی گمراہ ہے اور دوسروں کو گمراہ کر رہا ہے۔ یہ لوگ دل میں اس خیال سے خوش ہیں کہ ہم آزادی کے قریب آتے جاتے ہیں ـــ) مگر مجھے تو یہ بالکل بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے۔ لڑکوں کے روٹھنے اور مچلنے پر کھلونے اور مٹھائیاں مل جاتی ہیں [illegible]

اس کی قیمت دینے کو تیار ہوں گے۔"

ماں نے کہا: "اس کی قیمت کیا ہم نہیں دے رہے ہیں؟ ہمارے لاکھوں آدمی جیل نہیں گئے؟ ہم نے ڈنڈے نہیں کھائے؟ ہم نے اپنی جائدادیں ضبط نہیں کرائیں؟"

دھرم دیو: ـــ "اس سے انگریزوں کا کیا نقصان ہوا؟ وہ ہندوستان اس وقت چھوڑیں گے جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ اب وہ لمحہ بھر بھی نہیں رہ سکتے .... (یہ پورا مکالمہ میں اوپر درج کر چکا ہوں)

رہبر صاحب یہاں تک ماں اور بیٹے کے مکالمے پیش کر کے اپنے موقف کو "سچا" ثابت کر کے سبک دوش ہو جاتے ہیں اور فرماتے ہیں "پریم چند اس بات کو کبھی نہیں مانتے کہ لاٹھیاں اور گولیاں کھاتے جاؤ آخر انگریز کا دل پسیج جائے گا اور وہ حکومت انہیں سونپ کر چلے جائیں گے۔"

پریم چند اپنی کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں ـــ

"ماں سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اسے بیوہ ہوئے دس سال ہو گئے تھے۔ یہی لڑکا اس کی زندگی کا سہارا ہے اسی کو سینے سے لگائے محنت مزدوری کر کے اپنے مصیبت کے دن کاٹ رہی ہے وہ اس خیال سے خوش تھی کہ یہ چار پیسے کمائے گا، گھر میں بہو آئے گی۔ ایک ٹکڑا کھاؤں گی اور پڑی رہوں گی۔ آرزوؤں کے پتلے پتلے تنکوں سے اس نے ایک کشتی بنائی تھی ...... اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ کشتی دریا میں ڈوبی جا رہی ہے۔ اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ بیٹا تم کیسی باتیں کرتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو انگریزوں کو قتل کر دینے سے ہم آزاد ہو جائیں گے؟ ہم انگریزوں کے دشمن نہیں۔ ہم اس طرزِ حکومت کے دشمن ہیں۔ اگر یہ طرزِ حکومت ہمارے بھائی بندوں کے ہاتھوں میں ہو اور اس کا بہت بڑا حصہ ہے بھی ـــ تو ہم اس کی بھی اسی طرح مخالفت کریں گے۔ ودیش میں تو کوئی دوسری قوم راج نہیں کرتی تھی پھر بھی روسیوں نے اس حکومت کو اکھاڑ پھینکا۔ [illegible] کہ زار رعایا کی پرورش [illegible]

ہم اس غیر آئینی حکومت کو بدلنا چاہتے ہیں کیں تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ اس سبھا سے اپنا نام کٹوا لو۔ خواہ مخواہ آگ میں نہ کودو۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ نظارہ نہیں دیکھنا چاہتی کہ تم عدالت میں خون کے جرم میں لائے جاؤ ؟

" دھرم دیر پر اس منت آمیز التجا کا کوئی اثر نہ ہوا۔ بولا، " اس کا کوئی خوف نہیں۔ ہم نے اس کے متعلق مکانی احتیاط کرلی ہے، گرفتار ہونا تو حماقت میں داخل ہے۔ ہم لوگ ایسی حکمت سے کام کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی گرفتار نہ ہو،

" ماں کے چہرے پر اب خوف کی جگہ شرمندگی کی جھلک نظر آئی۔ بولی " یہ تو اس سے بھی بدتر ہے۔ بے گناہ سزا پائیں اور قاتل چین سے بیٹھے رہیں۔ یہ شرمناک حرکت ہے، میں اسے کمینہ پن سمجھتی ہوں۔ کسی کو چھپ کر قتل کرنا دغا بازی ہے مگر اپنے عوض اپنے بے گناہ بھائیوں کو پھنسا دینا قوم فروشی ہے۔ ان بے گناہوں کا خون بھی قاتل کی گردن پر ہوگا ؟

" دھرم دیر نے اپنی ماں کی پریشانی کا مزہ لیتے ہوئے کہا " اماں، تم ان باتوں کو نہیں سمجھتیں۔ تم اپنے دھرم پر جاؤ۔ جلوس نکالے جاؤ۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں ہمیں کرنے دو۔ گناہ اور ثواب۔ پاپ اور پن، دھرم اور ادھرم، یہ سب بے معنی الفاظ ہیں۔ جس کام کو تم گناہ سمجھتی ہو اسے میں عین ثواب سمجھتا ہوں۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ سب نسبتی الفاظ ہیں۔ تم نے بھگوت گیتا تو پڑھی ہے کرشن بھگوان نے صاف کہا ہے مارنے والا میں ہوں۔ جلانے والا میں ہوں۔ آدمی نہ کسی کو مارتا ہے، نہ جلا سکتا ہے۔ پھر کہاں رہا تمہارا گناہ ؟ مجھے اس بات کی کیوں شرم ہو کہ میرے عوض کوئی دوسرا مجرم قرار دیا گیا یہ انفرادی جنگ نہیں۔ انگلینڈ کی مجموعی طاقت سے جنگ ہے۔ میں مروں یا میرے عوض کوئی دوسرا مرے۔ اس میں کوئی فرق نہیں۔ جو آدمی قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہے اسے زندہ رہنے کا زیادہ حق ہے ؟

" ماں حیرت سے لڑکے کا منہ دیکھنے لگی۔ اس سے مباحثہ کرنا بے سود تھا۔ اپنی دلیلوں سے وہ اسے قائل نہیں کر سکتی تھی، دھرم دیر کھانا کھا کر اٹھ گیا، مگر وہ مغموم سی بیٹھی رہی۔ اس نے سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی کو قتل کر آیا ہو، یا قتل کرنے جا رہا ہو۔ اس خیال سے اس کے جسم میں رعشہ آگیا۔ عام آدمیوں کی طرح قتل اور خون کی نفرت اس کے جسم کے ایک ایک ذرہ میں بھری ہوئی تھی۔ اس کا اپنا فرزند قتل کا مرتکب ہو اس سے زیادہ شرم، ذلت، حقارت اس کے لئے اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ قومی خدمت کے اس معیار پر جان دیتی تھی جو تیاگ، بے نفسی، خلوص اور صاف دلی کی برکت ہے۔ اس کی نگاہ میں قوم کا خادم وہ تھا جو حقیر ترین مخلوق کا دل بھی نہ دکھائے۔ بلکہ ضرورت پڑنے پر خوشی سے اپنے کو قربان کر دے۔ اگر دھرم دیر کسی غریب کی حمایت میں گولی کا نشانہ بن جاتا تو وہ روتی ضرور۔ مگر گردن اٹھا کر...... لیکن وہ کسی کا خون کر آئے یہ عذاب قہر تھا۔ لعنت تھی...... وہ یہ نوبت ہرگز نہ آنے دے گی کہ اس کا فرزند خون کے جرم میں گرفتار ہو نہ اسے یہ ہی برداشت تھی کہ اس کے جرم کی سزا بے گناہوں کو ملے...... ماں نے دلا سے بیٹے کے دلی جذبات کو دیکھا۔ اس نوجوان کے دل میں خدمت کا کتنا جوش ہے، قوم کا کتنا درد ہے، مظلوموں سے ہمدردی ہے۔ کاش! یہ جوش، یہ درد ہنسا کے پنجہ سے نکل سکتا تو بیداری کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی ؟

آخر ماں کو ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ وہ بھی دھرم دیر کی خفیہ سبھا میں شامل ہو جانے کی خواہش ظاہر کرتی ہے دھرم دیر کے دل میں ماں کی طرف سے کچھ شکوک و شبہات ہیں جنہیں وہ ظاہر کرتا ہے تو ماں کہتی ہے۔

"...... لیکن اب حالات جان لینے کے بعد میں تم سے علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ میں ہمیشہ تمہارے پہلو میں رہوں گی اگر کوئی ایسا موقع آیا تو تم سے پہلے اپنی جان قربان کر دوں گی...... یہ مت سمجھو کہ نازک موقعوں پر ڈر جاؤں گی، چیخوں گی چلاؤں گی۔ ہرگز نہیں۔ سخت سے سخت خطروں کے سامنے تم میری زبان سے ایک چیخ نہ سنو گے......"

حل ہو جاتے ۔ وہ اپنی کہانی جس میں اس طرح کا موڑ دے کر کہانی کے کلائمکس کو زیادہ مؤثر، دیرپا اور گہرا اثر چھوڑنے والا بنا سکتے تھے لیکن رہبر صاحب جو نظریہ پیش کرنے کی سعی و کوشش فرما رہے ہیں اس کا سارے افسانے میں کہیں اشارہ تک نہیں پایا جاتا ۔

اب ہم جناب ابو محمد شبلی صاحب کی طرف پلٹتے ہیں پریم چند صدی تو ۱۹۸۰ء میں منائی گئی تھی لیکن شبلی صاحب فروغ اردو کے پریم چند نمبر ۱۹۷۶ء ہی سے پریم چند کے خلاف اپنی مہم کا آغاز فرما چکے ہیں اور مختلف رسائل میں اپنی کذب بیانیوں، دروغ بافیوں اور افترا پردازیوں کا تعفن پھیلا رہے ہیں پریم چند کو شہرت پرست، اردو دشمن، مسلمان دشمن، اسلام دشمن اور جارحانہ فرقہ واریت کا حامی (بلکہ آر ایس ایس کے نظریات کا پیش رو) ثابت کرنے کی دھن میں پریم چند کی کہانیوں، ناولوں خطوط اور مضامین کو پورے تناظر سے الگ کر کے سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کر رہے ہیں حتیٰ کہ اپنے جھوٹے اور بے بنیاد موقف کو سچا ثابت کرنے کی خاطر ان کی تحریروں میں اپنی طرف سے ترمیم و اضافہ کر کے ان کا مفہوم ہی بدل ڈالنے کی مذموم حرکت سے بھی باز نہیں آئے ۔ میں نے اپنے متعدد مضامین میں اس کی نشاندہی بھی کی ہے ۔ الحمد پریم چند کی تحریروں کو مکمل تناظر میں پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پریم چند ہمیشہ فرقہ وارانہ سیاست کے خلاف رہے ۔ اُن کا قلم ہمیشہ ہندو مسلم ایکتا کے حق میں سینہ سپر رہا ۔ اور وہ ہمیشہ حضرت محمدؐ کی مدح میں رطب اللسان رہے ۔ اسلام کی تعلیمات کے حق میں لکھتے رہے ۔ البتہ جس طرح انہوں نے ہندوؤں کے انتہا پسند شر پسند اور ڈھکوسلے باز لوگوں کو بے نقاب کیا، اسی طرح انہوں نے مسلمانوں کے بھی ایسے ریاکار لوگوں کو بھی عریاں کیا۔ لیکن بہت کم شدت کے ساتھ حتیٰ کہ متعدد جگہوں پر انہوں نے ہندو فرقہ پرستوں کی لعنت کے کوڑے برسائے لیکن مسلمان فرقہ پرستوں کے بارے میں چپ رہے ۔

لیکن شبلی صاحب کی ذہنیت کے لوگوں کے قریب سبھی مسلمان دودھ کے دھلے ہوئے ہوتے ہیں اور ان سے کوئی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔ شبلی صاحب کی جنونیت سے بھری ذہنیت کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ پریم چند کے خلاف لکھتے وقت وہ اسلام اور مسلمانوں کو ایک ہی خانے میں رکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسلام دشمن تھا اس طرح وہ مسلمانوں میں اشتعال پیدا کر کے فرقہ واریت کو ہوا دے رہے ہیں اور بہت حد تک ایسی ذہنیت کے لوگ ہی ملک میں ہندو مسلم فسادات کی تباہی کے ذمہ دار ہیں لیکن ان کی زبان پر لگام دینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہے

پریم چند نے حضرت محمدؐ حضرت علیؓ اور عالم اسلام کے دیگر کئی اکابر کی تعریف و توصیف میں اپنے رسالے "ہنس" اور "جاگرن" کے علاوہ بھی اپنے عہد کے دوسرے رسائل میں متعدد مضامین اور افسانے سپرد قلم کئے۔ ان رسائل کے قارئین کی اکثریت ہندو تھی اس کے علاوہ پریم چند نے اسلام کا وِش درکش (اس نام کا زہریلا درخت) کے خلاف خود بھی لکھا اور دوسروں کو بھی لکھنے کی تلقین کی۔ قرآن شریف کے سورہ بقرہ کا ترجمہ و تفسیر کرنے والے ہندو عالموں کے خلاف لکھا۔ سوامی شردھانند کی کتاب "اندھا اعتقاد اور خفیہ جہاد" کے خلاف لکھا۔ ملکانہ میں راجپوت مسلمانوں کی شدھی کے خلاف لکھا۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے آریہ سماجی ہوتے ہوئے لکھا۔ اس کے باوجود پریم چند شبلی صاحب کی ذہنیت کے لوگوں کے نزدیک گنہگار ہیں کیوں کہ انہوں نے کہیں کہیں تیسوں روزے رکھنے والے، پانچوں نماز پڑھنے والے لیکن رشوت خور اور پاکھنڈی مسلمانوں کے خلاف لکھنے کی جسارت فرما دی ۔

زیر بحث کہانی "عفو / معافی" کا ذکر کرنے سے پہلے منشی پریم چند کی ایک دوسری کہانی کی مختصر ترین تلخیص پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ یہ کہانی اس قابل ہے کہ

سے مکمل طور پر پیش کیا جائے۔ بہرحال کسی دوسرے موقعہ پر یہ کہانی مکمل طور پر پیش کروں گا اور بتاؤں گا کہ پریم چند کے دل میں حضرت محمدؐ اور ان کی تعلیمات کے تئیں کس قدر عقیدت تھی۔

یہ کہانی "سرسوتی" (ہندی مارچ ۱۹۲۴ء) میں نبیؐ کا نیتی نرواہ" کے عنوان سے چھپی تھی بعد میں امرت رائے نے اسے اسی عنوان کے تحت "گپت دھن" جلد ۲ میں شائع کیا اور مان سرودر جلد ۱۲ میں بھی "نیائے" [illegible] شائع کیا۔ اس کہانی کا لُب لباب یہ ہے کہ حضرت محمدؐ ہو ریت پسند اور انصاف پرور انسان تھے۔ یہاں [illegible] حضرت محمدؐ کی ایک بیٹی حضرت زینبؓ جو قریشی قبیلہ کے ایک مقتدر نوجوان ابوالعاص سے شادی شدہ تھی۔ ایک دن حضرت محمدؐ کے پاس آکر کہتی ہے کہ وہ اگرچہ اسلام پر اعتقاد رکھتی ہے لیکن ابھی تک اپنے خاوند کے ڈر سے اسلام قبول نہیں کر سکی۔ لیکن اب وہ اسلام کی آغوش میں آنا چاہتی ہے اور خود حضرتؐ کے ہاتھوں بیعت لینا چاہتی ہے۔ حضرت محمدؐ نے اُسے مسلمان بنانے پر قیل وقال کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت زینبؓ کا خاوند خود اسلام کے خلاف تھا اور وہ اپنی بیٹی کو اس کی مرضی کے بغیر مسلمان نہیں بنانا چاہتے تھے۔ لیکن حضرت زینبؓ کے بہت زور دینے کے بعد حلقہ بگوش اسلام کر لیتے ہیں۔ حضرت زینبؓ اس کے بعد اپنے خاوند کے گھر نہیں جاتی بلکہ یہیں رہتی ہے۔ اُدھر اہل قریش کو پتہ چلا تو وہ ابوالعاص پر بگڑ گئے اور اُسے حضرت زینبؓ کو طلاق دینے پر اصرار کرتے ہیں مگر وہ طلاق دینے سے انکار کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مذہب حضرت زینبؓ کا ذاتی معاملہ ہے۔ اہل قریش انہیں برادری سے خارج کر دیتے ہیں۔ [illegible] حضرت زینبؓ کو مجبور کر کے اپنے گھر واپس لے آتے ہیں۔ [illegible] میں اسلام کے خلاف لڑائی میں شریک ہو کر [illegible] مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

حضرت زینبؓ نے انہیں چھڑانے کیلئے فدیہ کی پیش کش کی۔ لیکن حضرت محمدؐ نے اس معاملے میں دخل انداز ہونے کے لئے انکار کر دیا اور معاملہ مسلمانوں کی پنچایت کے سامنے پیش کر دیا۔ پنچایت نے فیصلہ کیا کہ فدیہ کے عوض پر حضرت زینبؓ اپنے خاوند کو چھوڑ کر مسلمانوں کے پاس واپس آجائیں۔ چنانچہ حضرت زینبؓ اپنے خاوند کی جان بخشی کی خاطر اسے چھوڑ کر حضرت محمدؐ کے پاس آ کر اپنے میکے میں رہنے لگتی ہیں۔ اسی طرح تین سال گزر گئے۔ غیر مسلمان مسلمانوں کو [illegible] رہتے تھے اور ان کے قافلے لوٹ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمان بھی موقع ملنے پر لامذہبوں (یہاں پریم چند نے 'ودھرمی' لکھا ہے جس کا مطلب لامذہب ہوتا ہے) کے قافلے لوٹ لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مسلمانوں نے جو قافلہ لوٹا اس میں ابوالعاص بھی اپنا تجارتی سامان لے کر عراق جا رہے تھے۔ مال اسباب کے ساتھ گرفتار ہو کر ابوالعاص بھی مدینہ میں لائے گئے۔ اور فیصلہ کے لئے پھر حضرت محمدؐ کو کہا گیا، حضرت محمدؐ نے صحابہ کرام سے یہ فرمایا "اس کے بارے میں فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔ یہ میرا داماد ہے۔ میں طرف داری کا گناہ گار ہو جاؤں گا"۔ یہ کہہ کر حضرت محمدؐ اپنے گھر کے اندر چلے گئے۔ زینبؓ رو کر ان کے پیروں پر گر پڑیں اور بولیں "ابا جان آپ نے اوروں کو تو آزاد کر دیا۔ ابوالعاص کیا ان سب سے گیا گزرا ہے"

حضرتؐ نے انہیں زینبؓ انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے کو طرف داری اور بغض وعناد سے بالاتر ہونا چاہئے۔ اگرچہ قانون میں نے بنایا ہے لیکن میں اب اس کا حاکم نہیں خادم ہوں۔ مجھے ابوالعاص سے محبت ہے لیکن اپنی محبت کی خاطر انصاف کا منہ کالا نہیں کر سکتا۔

چنانچہ صحابہ کرام حضرت محمدؐ کے قانون اور انصاف کے تئیں اتنے اونچے خیالات دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھے اور انہوں نے مال اسباب سمیت ابوالعاص کو رہا کر دیا۔

ابوالعاص بھی حضرت محمدؐ کے ان آدرش خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور انہوں نے برضا و رغبت اسلام قبول کرلیا۔

اب آیئے شبلی صاحب کی طرف سے پیش کردہ کہانی "عفو" کی طرف۔ پریم چند کی یہ کہانی اردو میں زمانہ کے مئی ۱۹۲۹ء کے شمارے میں پہلے پہل شائع ہوئی تھی بعد میں پریم چالیسی اور فردوسِ خیال، کہانیوں کے مجموعوں میں شامل کی گئی۔ یہی کہانی "میرے بہترین افسانے" (پریم چند) میں "معافی" کے نام سے بھی شامل ہے لیکن اردو میں چھپنے سے پہلے یہی کہانی ہندی میں کشما (یعنی معافی) کے نام سے "مادھوری" کے جون ۱۹۲۴ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

(یہ تفصیلات ڈاکٹر قمر رئیس کی کتاب "تلاش و توازن" اور ڈاکٹر کنول کشور رگوئنکا کی ہندی کتاب "پریم چند وشوکوش"، جلد ۲ سے حاصل کی گئی ہیں)

"فروغ اردو" کے پریم چند نمبر ۱۹۷۸ء میں شبلی صاحب کا ایک مضمون "منشی پریم چند کے افسانوں میں مسلم کردار" (صفحات ۱۴۴ - ۱۵۷) کے عنوان سے شائع ہوا تھا اس میں انہوں نے پریم چند کے گیارہ افسانوں کے اقتباس اس طرح گمراہ کن انداز میں سیاق و سباق سے الگ کرکے پیش کئے ہیں کہ اردو کے مسلمان قارئین کے دل میں پریم چند کے خلاف انتہائی نفرت کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ شبلی صاحب کی شرپسند اور مفسدہ پرداز ذہنیت کا بھانڈہ میں اپنے متعدد مضامین میں پھوڑ چکا ہوں ان کے اس ایک مضمون کا جواب دینے کے لئے مجھے کئی مضامین لکھنے پڑیں گے کیونکہ ان کہانیوں کو پورے تناظر میں پیش کرنے کے لئے مجھے ان کہانیوں کی تفصیل اور تلخیص پیش کرنی پڑیگی۔

شبلی صاحب اپنے مندرجہ بالا مضمون کی تمہید میں فرماتے ہیں "منشی پریم چند صاحب کے ایک سو سا ٹھ افسانے میری نظر سے گزرے اُن کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُن کا ذہن اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے صاف نہ تھا......... مگر گرھوں اور بیلوں میں جان ڈالنے والے منشی پریم چند اُن انسانی کرداروں کا جن کا تعلق اسلام سے ہے چہرہ اس قدر مسخ کر دیتے ہیں کہ قاری کراہت محسوس کرنے لگتا ہے...."

اس کے بعد شبلی صاحب صرف اپنے مطلب کے پیراگراف نکال کر کہانی سے پیش کرتے ہیں۔ لیکن میں کہانی کی مفصل تلخیص پیش کرتا ہوں جس میں شبلی صاحب کے پیش کردہ مکالمے وغیرہ بھی آجائیں گے اور دیگر تفصیلات بھی تاکہ قارئین کہانی کو مکمل تناظر میں سمجھ سکیں۔

"مسلمانوں کو اسپین پر حکومت کرتے صدیاں گزر چکی تھیں۔ کلیساؤں کی جگہ مسجدوں نے لے لی تھی، گھنٹوں کی بجائے اذان کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ....

عیسائیوں کے باوقار مرد اور عورتیں مسیح کا دامن چھوڑ کر اسلام کے سایہ میں پناہ لے رہے تھے۔ اور مورخ اس بات پر حیران ہیں کہ آج تک وہاں عیسائیوں کا نام و نشان کیوں کر باقی رہا جو عیسائی رہنما مسلمانوں کے سامنے اب تک سر نہ جھکاتے تھے ..... ان میں ایک سوداگر داؤد بھی تھا۔ اپنے علاقہ میں اس نے اسلام کو قدم نہ رکھنے دیا۔ مسلمان داؤد سے خائف رہتے تھے۔ وہ مذہبی فوقیت سے اس پر بس نہ چلتا دیکھ کر قوت کے بل پر اُسے جیتنا چاہتے تھے۔ لیکن داؤد کبھی ان کا سامنا نہ کرتا، ہاں عیسائیوں کے مسلمان ہونے کی خبر پاتا آندھی کی طرح اڑ کر وہاں پہنچتا اور انہیں اپنے مذہب پر مضبوط رہنے کی تلقین کرتا ...."

مسلمانوں نے اسے گھیر کر گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن وہ وہاں سے فرار ہو کر مسلمانوں کی راجدھانی غرناطہ میں پہنچ گیا۔ اور ایک روز تنہائی کی دہشت سے گھبرا کر وہ باغ میں گھومنے کے لئے نکل گیا۔

"داؤد سب سے الگ تھلگ ہو کر ہری ہری گھاس پر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ دن کب آئے گا جب ہمارا ملک

ان سفاکوں کے پنجے سے چھوٹے گا...... اچانک ایک مسلمان نوجوان اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ سرتاپا گستاخ نگاہوں سے اسے دیکھ کر بولا "کیا ابھی تمہارا دل اسلام کی روشنی سے منور نہیں ہوا؟"

"داؤد نے انتہائی متانت سے کہا "اسلام کی روشنی اونچی چوٹیوں کو روشن کر سکتی ہے مگر غاروں سے اس کا گزر نہیں"

"اس نوجوان کا نام جمال تھا۔ انتہائی گہرے تیکھے انداز میں بولا" اس سے تمہارا کیا مطلب ہے"

" داؤد ۔۔ میرا مطلب یہی ہے کہ عیسائیوں میں جو لوگ اونچے درجہ کے ہیں وہ جاگیروں اور سرکاری عہدوں کی ترغیب اور سزا کے خوف سے اسلام قبول کر سکتے ہیں لیکن کمزور اور مفلس عیسائیوں کے لئے اسلام میں وہ آسمانی بادشاہت کہاں جو حضرت مسیح کے دامن میں انہیں نصیب ہوگی۔ اسلام کی تبلیغ تلوار کی نوک پر ہوئی ہے۔ خدمت کے جذبے سے نہیں"

جمال اپنے مذہب کی توہین سن کر بھنا اٹھا مجرم ہو کر بولا " یہ بالکل غلط ہے اسلام کی قوت اس کی رواداری اور مساوات ہے۔ تلوار کی طاقت نہیں"

"اسلام نے مذہب کے نام پر جس قدر خون بہایا ہے اس میں اس کی سبھی مسجدیں غرق ہو سکتی ہیں"

" تلوار نے ہمیشہ سچ کی حفاظت کی ہے"

" داؤد نے اسی انداز میں جواب دیا "جس کو تلوار کا سہارا لینا پڑے وہ صداقت ہرگز نہیں ہو سکتی"

"جمال قومی غرور سے بے قرار ہو کر بولا "خدا کی قسم اگر تم نہتے نہ ہوتے تو تمہیں اسلام کی توہین کرنے کا مزہ چکھا دیتا"

داؤد نے اپنے سینے میں چھپی ہوئی کٹار نکال کر کہا "میں نہتا نہیں ہوں۔ مسلمانوں پر جس روز اتنا اعتبار کروں گا اس روز عیسائی نہ رہوں گا۔ تم اپنے دل کے ارمان نکال لو"

یہاں تک تیس نے دونوں متضاد نظریوں کے ٹکراؤ کو ابھارنے کے لئے پریم چند نے جو مکالمے پیش کئے ہیں نقل کر دئیے ہیں۔ لیکن شبلی صاحب نے صرف عیسائی نوجوان ہی کے مکالمے نقل کئے ہیں تاکہ قارئین صرف تصویر کا ایک رخ ہی دیکھ سکیں۔ بہرحال کہانی اس طرح آگے بڑھتی ہے کہ دونوں نوجوان تلواریں سونت کر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں لیکن بدقسمتی سے جمال مارا جاتا ہے۔ جمال کے گرتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے اور داؤد کو گھیرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن داؤد بچتا بچاتا دوڑتا بھاگتا بہت دور نکل گیا عرب بھی اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ کافی فاصلے پر اسے ایک مدھم سا دیا جلتا نظر آیا جوں توں کر کے وہ وہاں تک پہنچا۔

"ایک چھوٹا سا پھونس کا مکان تھا۔ ایک بوڑھا عرب سامنے قرآن رکھے چراغ کی مدھم روشنی میں پڑھ رہا تھا..

.... عرب نے پوچھا، تو کون ہے"۔

(داؤد نے جواب دیا) "ایک غریب عیسائی ۔ مصیبت میں پھنس گیا ہوں اب آپ ہی پناہ دیں تو میں بچ سکتا ہوں"

"خدا پاک تیری مدد کریں گے۔ تجھ پر کیا مصیبت پڑی ہے"؟

"داؤد نے لجاجت سے کہا، ڈرتا ہوں اگر میں نے کہدیا تو کہیں آپ بھی میرے خون کے پیاسے نہ ہو جائیں"

"جب تو میری پناہ میں آگیا ہے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم مسلمان ہیں، جسے ایک مرتبہ پناہ میں لیتے ہیں اس کی زندگی بھر حفاظت کرتے ہیں"

"میں نے ایک مسلمان نوجوان کو قتل کیا ہے"

"یہ سنتے ہی عرب کا چہرہ بگڑ اٹھا۔ بولا "کیا نام تھا اس کا؟"

"اس کا نام جمال تھا"

عرب سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں گردن کی رگیں تن گئیں۔ چہرہ پر غیر معمولی جلال دوڑ گیا نتھنے پھڑکنے لگے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ذہن میں خوفناک کشمکش جاری ہے اور وہ پوری قوت سے ذہنی مد و جزر کو دبا رہا ہے دو تین منٹ تک وہ اسے یوں ہی بت بنا بیٹھا تاکتا رہا۔ پھر مبہم سے لہجہ میں

بولا۔ آہ ظالم! تو جانتا ہے میں کون ہوں؟ میں اسی نوجوان کا بدقسمت باپ ہوں جسے تو نے بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تو جانتا ہے تو نے مجھ پر کس قدر ظلم کیا ہے۔ تو نے میرے خاندان کا نام مٹا دیا، میرا چراغ گل کر دیا آہ!۔ .... ظالم! اس پر تلوار چلاتے ذرا بھی ترس نہ آیا.... میرا دل چاہتا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے تیری گردن دبوچ کر اس زور سے دباؤں کہ تیری زبان باہر آ جائے...... لیکن نہیں۔ تو نے میری پناہ لی ہے۔ اس وقت فرض میرے ہاتھ باندھے ہوئے ہے۔ رسول پاک کی یہی ہدایت کے مطابق پناہ میں آئے ہوئے پر ہاتھ اٹھانے سے قاصر ہوں میں نہیں چاہتا کہ نبی پاک کے حکم کو توڑ کر دنیا کے ساتھ ساتھ اپنی عاقبت بھی بگاڑوں ..... دنیا تو نے تباہ کی، عاقبت اپنے ہاتھوں کھوؤں۔ نہیں.... صبر کرنا مشکل ہے لیکن صبر کروں گا تا کہ نبی کے سامنے آنکھیں نیچی نہ کرنی پڑیں۔ ... تیرے پیچھے آنے والے وہ بھاگے آ رہے ہیں۔ تو نہیں جانتا کہ عرب لوگ خون کبھی معاف نہیں کرتے،" یہ کہہ کر بوڑھا عرب داؤد کو اپنے گھر کے اندر چھپا لیتا ہے اتنے میں داؤد کا پیچھا کرنے والے پہنچ جاتے ہیں۔

"ایک آدمی نے پوچھا "کیوں شیخ حسن! تو نے ادھر سے کسی کو بھاگتے دیکھا ہے؟"

"ہاں دیکھا ہے"

"اسے پکڑا کیوں نہ لیا؟ وہی جمال کا قاتل ہے"

"یہ جان کر بھی میں نے اسے چھوڑ دیا"

"ایں! غضب خدا کا۔ یہ تم نے کیا کیا؟ جمال حساب کے روز ہمارا دامن پکڑے گا تو ہم کیا جواب دیں گے؟

"تم کہہ دینا کہ تیرے باپ نے تیرے قاتل کو معاف کر دیا"

"عرب نے کبھی قاتل کا خون معاف نہیں کیا"

"یہ ذمہ داری تمہاری ہے میں اپنے سر کیوں لوں"

قصہ مختصر، تعاقب کرنے والے آگے روانہ ہو گئے اور بوڑھا شیخ حسن پھر قرآن پڑھنے لگا لیکن اس کا دل پڑھنے میں نہ لگ سکا۔ دشمن سے بدلہ لینے کی خواہش عرب کی فطرت کا حصہ ہے۔ اس کے لئے لہو کی ندیاں بہہ جاتی تھیں ... اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ ابھی داؤد کے خون سے دل کی پیاس بجھا لے۔ عرب بہادر ہوتے ہیں ان کے لئے مارنا اور کاٹنا کوئی نئی بات نہ تھی..... اس نے تلوار میان سے نکالی اور دبے پاؤں دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا..... آہستگی سے کواڑ کھولے..... داؤد اس کے دلی جذبات بھانپ گیا۔ اسے بوڑھے سے ہمدردی سی ہو گئی اس نے سوچا یہ مذہب کا قصور نہیں، میرے بیٹے کی اگر کسی نے ہتیا کی ہوتی تو میں بھی یوں ہی اس کے خون کا پیاسا ہو جاتا۔ انسانی فطرت کا تقاضا یہی ہے۔ عرب بولا، داؤد تمہیں معلوم ہے بیٹے کی موت کا غم کس قدر گہرا ہوتا ہے؟

"محسوس تو نہیں کر سکتا، البتہ اندازہ کر سکتا ہوں اگر میری زندگی سے اس غم کا ایک جزو بھی مٹ سکے تو یہ سر حاضر ہے میں اسے شوق سے آپ کی نذر کرتا ہوں آپ نے داؤد کا نام سنا ہوگا"

"کیا پیٹر کا بیٹا؟"

"جی ہاں! میں وہی بدنصیب ہوں، میں محض آپ کے بیٹے کا قاتل ہی نہیں اسلام کا بھی دشمن ہوں۔ میری جان لے کر آپ جمال کے خون کا بدلہ ہی نہ لیں گے اپنی قوم اور مذہب کی حقیقی خدمت بھی کریں گے"

"شیخ حسن متانت سے کہا" داؤد میں نے تمہیں معاف کیا۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں عیسائیوں کو بہت سی تکالیف پہنچی ہیں مسلمانوں نے ان پر بے شمار مظالم کئے لیکن یہ اسلام کا نہیں مسلمانوں کا قصور ہے۔ فتح کی نخوت نے ان کی عقل اور احساس چھین لئے ہیں۔ ہمارے مقدس نبی نے یہ تعلیم نہیں دی تھی جس پر ہم آج چل رہے ہیں وہ خود رحم اور نیکی کا معیار ہیں۔ میں اسلام کے نام کو بٹا نہیں لگاؤں گا میری سانڈنی بے لو اور رات بھر میں ہی یہاں سے بھاگ جاؤ..... بھاگو ..... تمہیں ایک لمحہ کے لئے نہ رکنا

دبوں کو تمہاری بو بھی مل گئی تو تمہاری خیر نہیں۔ جاؤ خدا پاک تمہیں گھر بخیریت پہنچائے۔ بوڑھے شیخ حسن اور اس کے بیٹے جمال کے لئے دُعا کرنا۔"

شبلی صاحب کو پریم چند کے ایک سو ساٹھ افسانوں میں ایک بھی افسانہ ایسا نہیں ملا جس میں انہوں نے مسلم کرداروں کو اچھے رنگ میں پیش کیا ہو، کیا انہوں نے "حج اکبر" نہیں پڑھا؟ کیا "عیدگاہ" ان کی نظر سے نہیں گزرا؟ حد تو یہ ہے کہ انہیں "پنچایت یا پنچ پرمیشور" میں بھی اس لئے خرابیاں نظر آ رہی ہیں کہ پریم چند نے کہانی کے مسلمان کردار میں کچھ خامیاں بھر دی ہیں (بہرحال اس پر الگ سے بحث کی جائے گی) کہانی "نیایے" یعنی "انصاف" میں ایسے انسانی کردار جن کا تعلق اسلام سے ہے، کیا پریم چند نے ایسے کرداروں کا چہرہ اس قدر مسخ کر دیا ہے کہ قاری کراہت محسوس کرنے لگتا ہے؟ شبلی صاحب فرما سکتے ہیں کہ انہوں نے یہ کہانی نہیں پڑھی کیوں کہ وہ ہندی میں تھی۔ لیکن ان کا یہ عذرِ گناہ قابلِ قبول نہیں ہے کیوں کہ وہ ہندی اچھی طرح جانتے ہیں چنانچہ انہیں ایسا نزعی مضمون لکھنے سے پہلے پریم چند کی ہندی اور اُردو کی ساری کہانیاں پڑھنی چاہیے تھیں۔ لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ شبلی صاحب کی نیت میں فتور تھا وہ خود اندھی اور بہیمانہ فرقہ واریت کی دلدل میں گلے تک پھنسے ہوئے ہیں لیکن الزام پریم چند پر دھر رہے ہیں۔

شبلی صاحب پریم چند کے خلاف اس کہانی کو لے کر زہر اُگلنے کی تمہید اس طرح فرماتے ہیں "معافی" (عفو) اس افسانے کے ذریعہ منشی پریم چند صاحب نے پیدا کردہ ان واہموں کی تصدیق کی ہے جو مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں پائے جاتے ہیں وہ اپنے جذبات کا اظہار شاید اتنی شدّت کے ساتھ ہند کے ماحول میں ہند کیریکٹر کے ذریعہ نہیں کر سکتے تھے اس لئے انہیں ہسپانیہ (اسپین) کا ماحول اور عیسائی کی مدد لینی پڑی، ڈیوڈ کی زبان سے وہ سب کہلوا دیا جو یہاں کے متعصب ہندو کہتے آئے ہیں۔ موزوں کانٹوں پر تولنے، اور توازن برقرار رکھنے کے لئے شیخ حسن پہلے کردار ہیں جو اچھے رنگ روپ میں میری نظر سے گزرے، حقیقت کی تلخی، کو زیبِ داستان کی شیرینی سے گوارہ بنا نا بھی تھا۔ نیز خاتمہ کلام بھی شیخ حسن کی زبان سے ہی موزوں ہو سکتے تھے؟"

اصل بات یہ ہے کہ پریم چند اپنی اس کہانی کے ذریعے ایک سچے مسلمان کا کردار پیش خدمت کرکے اسلام کی صحیح تعلیمات (جنہیں مسلمان فاتحین نے اسلام کی تبلیغ کے زعم میں مسخ کر دیا تھا) کی نقاب کشائی کرتے ہیں اس مقصد کے لیے انہیں دو گمراہ کرداروں کی ضرورت تھی جو انہوں نے داؤد (عیسائی) اور جمال (مسلمان) کے رول کے لئے تخلیق کئے۔ پریم چند نے ان گمراہ کرداروں کے متضاد خیالات پیش کرتے ہوئے اپنے افسانے کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک انتہائی بھرپور کردار شیخ حسن کی صورت میں پیش کرکے اسلام اور اسلام کی تعلیمات کی رُونمائی کی۔ غالباً اس خیال کے زیر اثر کہ شبلی صاحب کی ذہنیت کے مسلمانوں کی آنکھیں بھی کھُل سکیں کہ اصل اسلام اور اس کی تعلیمات کیا تھیں اور کہ وہ ان تعلیمات کو کس حد تک مسخ کر چکے ہیں ادھر ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ ہندو جنہیں آج تک اسلام کا ایک ہی رُخ دکھلایا گیا ہے وہ بھی اسلام کا دوسرا رُخ دیکھیں اور مسلمانوں کے خلاف جو مفروضات ان کے دلوں میں گھر کر چکے ہیں انہیں دلوں سے نکال پھینکیں۔ میرے اس خیال کی تصدیق اس حقیقت سے بھی ہوتی ہے کہ مندرجہ بالا دونوں کہانیاں لگ بھگ ایک ہی زمانے میں لکھیں اور تقریباً ایک ساتھ ہی دو مختلف ہندی رسالوں میں شائع ہوئیں (دونوں کے شائع ہونے کی تفصیل اوپر پیش کی جا چکی ہے)

لیکن ایک طرف جہاں منشی پریم چند اسلام اور حضرت محمدؐ کی سچی تعلیمات کی تفسیر و تشریح پیش کر گئے

ہندو مسلم اتحاد کی طرف قدم بڑھانا چاہتے تھے ۔ ٹگ بھگ اسی دور میں علامہ اقبال شکوہ میں فرما رہے تھے ۔

پر ترے نام پہ تلوار اٹھائی کس نے ؛ دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں ؛ توڑے مخلوق خداوندی کے پیکر کس نے ؛ کاٹ کر رکھ دیے کفار کے لشکر کس نے ؛ کس نے ٹھنڈا کیا آتش کدۂ ایراں کو ؛ کس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے ۔ منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے ۔

لیکن اس کے باوجود منشی پریم چند خطاوار گردانے جاتے ہیں ۔ اور علامہ اقبال کو اسلام کا علم بردار سمجھا جاتا ہے ۔ اور پھر جب علامہ اقبال خود اس حقیقت کا اعتراف فرماتے ہیں کہ "دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں" ۔ تو پریم چند نے اگر یہ لکھ دیا کہ "کلیساؤں کی جگہ مسجدوں نے لے لی تھی ۔ گھنٹوں کے بجائے اذان کی آوازیں سنائی دیتی تھیں ....." تو آپ کو اس میں قباحت نظر آتی ہے ۔

شبلی صاحب اپنی بات کو یہیں ختم نہیں کرتے بلکہ اور بھی زہر میں بجھے ہوئے تیر چلاتے ہیں ۔ فرماتے ہیں "یہ افسانہ پہلے "عفو" کے نام سے شاید اس وقت لکھا گیا تھا جب منشی پریم چند کا اندازِ فکر دو آتشہ نہیں ہوا تھا جب اسے میرے بہترین افسانے میں شامل کیا گیا تو نظر ثانی کے بعد اس کا عنوان "معافی" ہو گیا ۔ اس لیے کہ لفظ "عفو" سے اسلامی تعلیم "عفو درگزر" کی بو آتی تھی اور درج ذیل آخری پیراگراف بھی محذوف ہو گیا ۔ ڈیوڈ بخیریت گھر پہنچ گیا مگر اب وہ ڈیوڈ نہ تھا ۔ جو اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا ۔ اس کے خیالات میں گویا تغیر آ گیا تھا ۔ اب وہ مسلمانوں کی قدر کرتا تھا اور مسلمانوں کا نام عزت سے لیتا تھا (پریم چالیسی حصہ دوم ص ۲۷۵ مطبوعہ محبوب المطابع پریس دہلی اور فردوسِ خیال)

پریم چند نے اگر ایک مشکل عربی لفظ عفو کو عام فہم "معافی" بنا دیا تو شبلی صاحب کی انتہا پسند عصبی فطرت کو اس سے بھی بہت رنج پہنچا ۔ گر گنگا صاحب اور دوسرے ہندی ادیبوں نے "عفو" کو جب ہندی میں پڑھا تو آسے "افو" سمجھا اور "پریم چند وشو کوش میں اس کہانی کو "افو" کہہ کر پیش کیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا کہ یہ کہانی آفو (عفو) کے نام سے بھی ملتی ہے ۔ اسی دقت کے پیشِ نظر پریم چند نے اس کا سیدھا نام "معافی" رکھ دیا ہوگا ۔ ہندی میں یہی کہانی "کشما" کے نام سے چھپی تھی جس کے معنی بھی معافی کے ہوتے ہیں ۔ لیکن شبلی صاحب کو تو بہرحال پریم چند کے کاموں میں کیڑے نکالنے تھے ۔ حالاں کہ پریم چند نے ساری کہانی میں اسلام کی تعلیم "عفو درگزر" ہی کا بکھان کیا ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ شبلی صاحب کی ذہنیت کے مسلمان خود اس تعلیم سے کوسوں دور ہیں ۔

اب رہی بات مندرجہ بالا پیراگراف کے محذوف کرنے کی تو یہ بات ان لوگوں کی ہی سمجھ میں آ سکتی ہے جنہیں افسانہ اور اس کے لوازمات کو سمجھنے کا شعور ہوتا ہے ۔ باشعور لوگ فوراً یہ بات سمجھ جائیں گے کہ پریم چند نے آخری پیراگراف کو حذف کر کے سمجھداری اور بالغ النظری کا ثبوت دیا ہے اور اسے اپنے صحیح اور فطری مقام پر ختم کر کے اس کا تاثر دو آتشہ بنا دیا ہے ۔

اب شبلی صاحب کے یہ اشارات پھر پڑھیے ۔ "افسانہ کے ابتدائی الفاظ اس واہمہ کی تصدیق کرتے ہیں کہ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں نے مندر کو مسجد بنوایا تھا اور ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا تھا ....."

اور ان کے ساتھ ہی یہ الفاظ بھی ۔ "منشی پریم چند نے پچاس ساٹھ سال پہلے جن خیالات کا اظہار کیا تھا آج آر ۔ ایس ۔ ایس کا نمائندہ اس کی تصدیق کر رہا ہے ۔

"یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان یہاں حملہ آور کی حیثیت سے آئے ۔ تلوار کے زور سے لوگوں کو مسلمان کیا ۔ مندروں کو توڑ کر مسجدیں بنوائیں ۔ ہندوؤں کی بہو بیٹیوں کو اپنے گھروں میں ڈال لیا ..... "

(بلٹز ۲ /نومبر ۱۹۷۷ء صفحہ ۷)

شبلی صاحب نے آر ایس ایس کے نمائندہ کا نام

نہیں لیا۔ غالباً ان کی مراد پی۔ این۔ اوک ہی سے ہے۔ تاہم یہ اقتباس کس کا تحریر کردہ ہے اس سے فرق نہیں پڑتا لیکن شبلی صاحب کی اطلاع کے لئے میں ابن بطوطہ کا وہ اقتباس پیش کر چکا ہوں جس میں بطوطہ نے بتایا ہے کہ دہلی کی مسجد قوت اسلام دراصل ایک مندر تھا جسے مسلمان حملہ آوروں نے مسجد میں تبدیل کر دیا۔ اب ایک مسلمان فاتح اور مورخ مرزا محمد حیدر کی تاریخ رشیدی کے انگریزی ترجمہ (کرزن پریس لنڈن ۱۹۷۲ء کا تیسرا ایڈیشن) سے کچھ اقتباسات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

دو اسی سال کے موسم بہار میں خان نے یہ عہد کر لیا کہ وہ مقدس جنگ تبت کے خلاف لڑیں۔ (اس زمانے میں لداخ تبت کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا اور ان اقتباسات میں جہاں جہاں تبت کا ذکر آتا ہے اسے لداخ سمجھا جائے ـــ مانک ٹالا) ان کے امراء نے اس سے قبل وہاں جنگ کی تھی اور خاصی لوٹ مار کی تھی لیکن ان کی نادانی اور نا سمجھی کی بنا پر اسلام کو فروغ حاصل نہ ہو سکا اور اسی لئے تبت میں ابھی تک بے شمار کفار موجود تھے یہ تعداد ان کے علاوہ تھی جنہیں امراء نے ماتحت کر لیا تھا۔ خان کی عظیم خواہش ہمیشہ یہی تھی کہ مقدس جنگ اللہ کی راہ میں کی جائے۔ اور خاص طور پر اس لئے بھی کہ اس نے درویشانہ خواجوں کے طور طریق اختیار کر لئے تھے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ایمان (عقیدہ۔ مذہب) کی راہ پر لگانے کے لئے مستعد رہتا تھا۔ اور اس یقین کے ساتھ کہ مقدس جنگ ہی نجات کا ذریعہ ہے اور خدا کا وصل حاصل کرنے کا بھی ایک راستہ ہے۔ ان ہی پاکیزہ خیالات کی لہر میں آ کر اس نے ۹۳۸ھ کے آواخر میں تبت پر حملہ بول دیا (ص ۴۰۳)..... مقدس جنگ دراصل اسلام کی بہبود اور استحکام کے لئے ہے اور ایمان کی بنیادیں مضبوط بنانے کا ایک انتہائی مؤثر ذریعہ ہے۔ کفارہ ادا کرنے کے بعد خان ہمیشہ اس موقع کا منتظر رہا کہ کب وہ مقدس جنگ کی خود رہنمائی کر سکے...... (ص ۴۱۷)

مذکورہ سال کے ماہ ذی الحجہ میں مہم لے کر نبرا پہنچا جو تبت کا ماتحت صوبہ ہے۔ پھر میں نے ایک شخص کو تمام ملک میں دعوۃ العام کی نوید دینے کے لئے روانہ کیا کہ احمدؐ کے عقیدہ پر ایمان لانے کے لئے سب کو کھلی دعوت ہے۔ وہ شخص خوش بخت ہے جو ایمان لاتا ہے اور (ان خوشیوں میں) اپنا حصہ حاصل کرتا ہے،، بالآخر ایک بڑی تعداد نے (ہتھیار ڈال دئے اور) ماتحتی قبول کی (SUBMITTED) لیکن اس میں نوبرا حکمران طبقے (CHIEF) کے لوگ شریک نہیں تھے۔ یہ بغاوت پسند لوگ تھے انہوں نے اپنے آپ کو قلعہ بند کر لیا۔ بُرکا پا نامی ایک شخص جو ان کفار کا سردار تھا اس نے اپنے آپ کو اس سلطنت کے خاص قلعہ مُتادار میں قلعہ بند کر لیا۔ میں نے اس قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور مقررہ روز قلعہ میں پہنچ کر اسلام (کے شاہین) کے پنجے کفر کے دست و بازو پر گاڑ دئے۔ دشمنوں کی صفیں تتر بتر ہو گئیں اور وہ ناکامی و نا امیدی اور افراتفری کے عالم میں بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا تاکہ کوئی بھی مفرور بچنے نہ پائے۔ بُرکا پا اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ تہہ تیغ کر دیا گیا۔ ان کے سروں کا مینار بنایا گیا اور اس ملک کے کفار کے دماغوں (سروں) سے اٹھتے ہوئے بخارات نے آسمانوں کی بلندیوں کا رخ کیا۔

(صفحہ ۴۱۷ - ۴۱۸)

لگے ہاتھوں تاریخ رشیدی میں مرزا محمد حیدر کے قلم سے کشمیر کے متعلق بھی چند جملے پڑھ لیجئے۔ "کشمیر کا حلقہ بگوش اسلام ہونا حالیہ واقع ہے..... قطب الدین چالیس روز کے اندر اندر فوت ہو گیا اور اس کا بیٹا سلطان اسکندر تخت نشین ہوا جس نے مسلمانی مذہب (MUSULMAN FAITH) کا استحکام کیا اور سارے بت کدوں کو منہدم کر دیا..... (صفحہ ۴۳۴)

اب ایک تازہ ترین شہادت بھی پیش خدمت ہے خان عبدالغفار خان آزادی کے بعد دو تین چار مرتبہ

علاج اور سیر و تفریح وغیرہ کے لئے ہندوستان تشریف لائے۔ ہندو مسلمان فسادات پر ہر مرتبہ انہوں نے ہندوؤں ہی کو قصوروار ٹھہرایا۔ حالاں کہ تالی کبھی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ بہرحال ہم نے خندہ پیشانی سے اُن کے ارشادات کو سنا اور اپنی خامیوں پر نادم بھی ہوئے۔ انہوں نے اپنے حالیہ دورے میں مسلمانوں اور اسلام کے تعاون سے کیا فرمایا وہ بھی پڑھ لیجئے۔ یہ اقتباس بھی ایک مسلمان اخبار عظیم آباد ایکسپریس (روزنامہ پٹنہ ۱۶ ؍ نومبر ۱۹۸۱ء) سے پیشِ خدمت ہے۔

مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا

"...... میں نے آپ کو حقیقت بتائی اور آپ نے مجھے گالیاں دیں۔ مجھے ہندو کا بچہ اور ہندو کا ایجنٹ کہا مگر اس میں آپ کا قصور نہیں ہے۔ کیوں کہ آپ نے مذہب کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ آپ نے اسلام کو جانا ہی نہیں ہے۔ آپ نے جاننے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ آپ نے یہ کبھی نہیں جانا کہ اسلام یہ ہرگز نہیں سکھاتا کہ آپ دوسرے مذہب کے لوگوں سے نفرت کیجئے۔ ان کا گلا کاٹئے اور اُن کو نقصان پہنچائیے۔

"ہمارے پاس تک جو اسلام پہنچا وہ ادھورا تھا۔ وہ سیاسی راستے سے آیا تھا۔ مذہبی راستے سے نہیں آیا تھا۔ حکومت کے ذریعے سے آیا تھا۔ ظلم و تشدد سے آیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم سب اسلام کے پیروکار ہیں مگر ہم دوسرے لوگوں سے بغض و کینہ رکھتے ہیں نفرت کرتے ہیں۔ وہ اسلام کی نفی کرتے ہیں۔ اسلام سب کے لئے خیر و رحمت بن کر آیا تھا۔ اس لئے بنی نوع انسان کی خدمت ہی اصل اسلام ہے"

ان سب حقائق و شواہد کی موجودگی میں آپ یہ الزام اوک اور پریم چند کے سر پر کیوں تھوپتے ہیں۔ اگر شبلی صاحب کو مزید حوالوں کی ضرورت ہے تو میں تیمور۔ ابوالفضل، عبدالقادر، انیف۔ بدایونی۔ برنی۔ فرشتہ۔ ابنِ بطوطہ۔ امیر خسرو۔ ابنِ خلدون۔ طوسی اور اُس عہد کے دوسرے بیسیوں مسلمان تاریخ دانوں فاتحوں وغیرہ کے روزنامچوں تاریخوں اور سفرناموں سے سینکڑوں حوالے مہیا کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کے باوجود ہم عہدِ گزشتہ کی تلخ باتوں کو بھلا دینا چاہتے ہیں اور امن اور آشتی کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں (لیکن شبلی صاحب کی ذہنیت کے لوگ بار بار ہمارے زخموں کو کھرچنے سے باز نہیں آتے) شبلی صاحب اور ان کی اُمت کے لئے اب ٹیپ کا بند پیش ہے وہ یہ ہے کہ پریم چند نے کہا تھا کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا تھا۔ حیرانی سے آنکھیں مت پھاڑیئے۔ پریم چند کی اپنی تحریر پیش ہے۔

"...... یہ بالکل غلط ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ تلوار کی طاقت سے کوئی مذہب نہیں پھیلتا اور کچھ دنوں کے لئے پھیل بھی جائے تو ہمیشہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ بھارت میں اسلام کے پھیلنے کی وجہ اونچی جاتیوں کے ہندوؤں کا نیچی جاتی کے ہندوؤں پر مظالم تھے... اسلام کی آغوش میں آتے ہی تمام ناپاکیاں اور نابرابریاں دُھل جاتی تھیں۔ وہ مسجد میں امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا تھا۔ بڑے سے بڑے سید زادے کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا تناول کر سکتا تھا..... وہاں کوئی نہیں پوچھتا تھا کہ فلاں شخص کیسا اور کس جاتی (طبقے) کا مسلمان ہے وہاں تو سبھی مسلمان ہیں اس لئے نیچوں نے (یعنی ہندوؤں کے نیچے کے طبقوں نے) اس نئے مذہب کا خوشی سے استقبال کیا اور گاؤں کے گاؤں مسلمان ہو گئے۔ جہاں اونچے طبقوں کے ہندوؤں کا ظلم جتنا زیادہ تھا وہاں یہ مخالفت کی آگ اتنی ہی زیادہ بھڑکی ہوئی تھی اور وہیں اسلام کی تبلیغ بھی خوب ہوئی... ان کی نظروں میں اسلام ایک فاتح دشمن نہیں۔ ایک فراخ دل مذہب تھا۔ یہ ہے اسلام کے پھیلنے کی تاریخ..... تو اسلام تلوار کے زور سے نہیں بلکہ اپنے مذہب کے خصائل کے ظہور کی طاقت پر پھیلا۔ اس لئے پھیلا کہ اس کے یہاں سبھی انسانوں کے حقوق برابر ہیں...." ("ہنس" نومبر ۱۹۳۱ء اودھ پرسنگ ص ۳۷۵ - ۳۷۶)

●●

غزل

ڈاکٹر پرکاش چند بنسل پرکاش (فیروزآباد)

رات کو خواب نظر آئے سنہرے کتنے
صبح دم آنکھ سے رُوپوش ہیں چہرے کتنے

آپ نے ہونٹوں پہ موہوم ہنسی دیکھی ہے
دل کے زخموں کو نہ دیکھا کہ ہیں گہرے کتنے

تیری دُنیا سے بہت دُور چلا جاؤں گا
تیری دُنیا میں ہیں اب زیست پہ پہرے کتنے

اس نئے دَور میں انساں کی یہی فطرت ہے
وقت پڑنے پہ بدل لیتا ہے چہرے کتنے

اب صدا کوئی بھی مظلوم کی سنتا ہی نہیں
حاکمِ وقت ہیں اس دَور کے بہرے کتنے

ان امیروں سے اے پرکاش کوئی یہ کہہ دے
مفلسی لُوٹ چکی دیکھئے سہرے کتنے

غزل

(مقبول آنولوی بانس واڑہ)

اس ناز سے نہ دیکھ مجھے ہو کے بے حجاب
میرا ثوابِ دید بھی بن جائے گا عذاب

جلوہ فگن جو ہو تو سرِ بام بے نقاب
شرما کے منہ چھپائے گا بادل میں آفتاب

محرومیٔ جمال سے بڑھتا ہے اضطراب
نظروں میں رہنے والے نہ کر مجھ سے یوں حجاب

آئینہ کہہ رہا ہے ترے رُو برو یہ بات
تو ہے بیاضِ صبح کہ ہے نُور کی کتاب

دُنیا میں یوں تو اور بھی لاکھوں حسین ہیں
لیکن مری نظر میں فقط تُو ہے لاجواب

اتنی تو ہو یہ عمرِ شبِ میکدہ دراز
جب تک جیوں رہے مرے ساغر میں آفتاب

ظرفِ نظر میں جلوۂ گل کی شراب ہو
مقبول چشمِ شوق اُلٹ دے اگر نقاب

من کہ مکتوب الیہ

بمبئی ۱۲ ارمئی ۱۹۸۲ء

محترمی سرور صاحب ۔ تسلیم

"شانِ ہند" میں جناب کوثر چاندپوری کی کتاب "فکر و شعور" پر آپ کا تبصرہ پڑھنے کے بعد کتاب پڑھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ خاص کر اس لئے بھی کہ آپ نے اس کتاب میں پریم چند پر کوثر صاحب کے ایک مضمون کا بھی ذکر کیا تھا۔ چنانچہ کتاب حاصل کرکے سب سے پہلے کوثر صاحب کا مقالہ "پریم چند (اچھا انسان بڑا ادیب)" پڑھا۔ کوثر صاحب کا مضمون بڑا اچھا ہے لیکن اس میں کچھ فاش غلط بیانیاں موجود ہیں جن کی طرف میں آپ کی اور "شانِ ہند" کے قارئین کی توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ کوثر صاحب صفحہ ۱۲۴ پر فرماتے ہیں۔

"...... لیکن ایسے محققین بھی پیدا ہو گئے ہیں جو سوزِ وطن کی ضبطی اور اس کے نذرِ آتش کئے جانے کے واقعات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ابو محمد شبلی مشہور قلم کار ہیں انہوں نے ڈاکٹر عصمت جاوید کے نثری مضمون (غالباً کاتب کی غلطی سے نثری مضمون کی بجائے نثری مضمون "غصہ میں" لکھا گیا ہے ۔ مانک ٹالا) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے ـــ سوزِ وطن کی کاپیاں جلائی تو نہیں گئیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ بحق سرکار ضبط ہوئیں" (فٹ نوٹ میں عظیم آباد ایکسپریس ۱۳ر جولائی ۱۹۸۰ء کا حوالہ دیا ہے ـــ مانک ٹالا)

میں یہاں نہایت ادب کے ساتھ کوثر صاحب کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے صریحاً غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ آپ نے یہاں یہ تاثر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر عصمت جاوید کے مضمون کا حوالہ دے کر شبلی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ "سوزِ وطن کی کاپیاں جلائی تو نہیں گئی تھیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ بحق سرکار ضبط ہو گئیں"۔

یہ خیال ڈاکٹر عصمت جاوید کا تھا۔ شبلی صاحب نے اس کا حوالہ دیا ہے۔ وہ اس خیال سے قطعاً متفق نہیں ہیں۔ شبلی صاحب نے ۱۳ر جولائی ۱۹۸۰ء کے عظیم آباد ایکسپریس میں سوزِ وطن پر ایک نہایت زہرناک مضمون شائع کیا تھا (جس کا کوثر صاحب نے حوالہ دیا ہے) جس میں انہوں نے صاف طور پر لکھا ہے کہ "سوزِ وطن" بالکل ضبط نہیں ہوئی تھی ـ پریم چند نے شہرت حاصل کرنے کی خاطر "سوزِ وطن" کی کہانی گھڑی ہے اور اب اس کہانی کا ان کے آریہ سماجی حلیف اور ترقی پسند حلیف ڈھنڈورہ پیٹ رہے ہیں ۔

کوثر صاحب نے یقیناً شبلی صاحب کا یہ مضمون پورے کا پورا پڑھا ہوگا اس لئے میں کوثر صاحب کی خدمت میں بصد ادب عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے نہایت غلط طریقے سے شبلی صاحب کا حوالہ دیا ہے اگر آپ کو ڈاکٹر عصمت جاوید صاحب کے مندرجہ بالا خیالات کا حوالہ دینا تھا تو یہ حوالہ دینے کے بعد بریکٹ میں یا فٹ نوٹ میں یہ لکھ سکتے تھے کہ آپ نے ڈاکٹر جاوید صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر کا حوالہ شبلی صاحب کے مضمون سے حاصل کیا ہے ۔

میں نے شبلی صاحب کے اس مضمون کا جواب ۶ /۲ ۱۹/ اپریل ۱۹۸۱ء کے عظیم آباد ایکسپریس میں دیا تھا۔ جس میں ثابت کر دیا تھا کہ شبلی صاحب نہ صرف انتہائی دروغ باف ہیں بلکہ اپنے جھوٹے موقف کی حمایت میں وہ پریم چند اور دوسروں کی تحریروں کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ شبلی صاحب نے مندرجہ بالا مضمون میں پریم چند کے ایک خط میں اپنی طرف سے بریکٹ میں دو لفظوں کا اضافہ کرکے ان کی تحریر کا مفہوم ہی بدل ڈالا تھا۔ شبلی صاحب کو میرے اس مضمون کا جواب دینے کی آج تک ہمت نہیں ہوئی۔

جناب کوثر صاحب اپنے اسی مضمون میں صفحہ ۱۲۲ پر لکھتے ہیں "آج کل ان پر بڑی شدت سے فرقہ پرستی کا الزام لگایا جا رہا ہے حالاں کہ وہ وسیع النظر آدمی تھے، تعصب اور تنگ نگاہی کے عیب سے پاک تھے۔"

کوثر صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ "بڑی شدت سے پریم چند پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے والے" کون حضرات ہیں؟ کوثر صاحب کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ پریم چند پر فرقہ پرستی کا الزام لگانے والوں میں جناب ابو محمد شبلی صاحب سب سے آگے ہیں۔ کوثر صاحب، شبلی صاحب کو مشہور قلم کار لکھتے ہیں۔ اور یہ بات ڈھکی چھپی ہوئی نہیں ہے کہ شبلی صاحب کی "شہرت" کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ذہنی، علمی، اور ادبی یاشتے ین کو اونچا کرنے کے لئے اچھا لے کر پریم چند کو گالیاں دیں۔ اگر اسے "شہرت" کا نام دیا جا سکتا ہے تو یقیناً شبلی صاحب "مشہور قلم کار" ہیں۔

میں کوثر صاحب کی ایک اور غلطی کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اسی مضمون میں (صفحہ ۱۱۹) پر کوثر صاحب فرماتے ہیں "چنانچہ تعلیمات کی ملازمت کے دوران ہی میں انہوں نے یو۔پی میں ابتدائی تعلیم کے عنوان سے ایک مضمون حوالہ قلم کیا جس میں محکمۂ تعلیم پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ مضمون کانپور کے مشہور علمی و ادبی ماہنامہ "زمانہ" میں اشاعت پذیر ہوا۔ اس سلسلہ میں انہیں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہمیرپور کے اجلاس میں حاضر ہونا پڑا ......!"

یو۔پی میں ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں پریم چند کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہمیرپور کے سامنے حاضر ہونے کے بارے میں پریم چند نے آج تک کچھ نہیں لکھا۔ اور نہ ہی کسی محقق نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر کنول کشور رگونکا اور ان کے ساتھی محققوں نے پریم چند پر جو دو ضخیم کتابیں "پریم چند وشو کوش" کے نام سے مرتب کی ہیں ان میں بھی اس مضمون کے سلسلہ میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی خدمت میں حاضر ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دراصل یہ "تحقیق" بھی شبلی صاحب کی ہے، جسے کوثر صاحب نے بغیر حوالہ کے اپنے مضمون میں ذکر کر دیا ہے۔

شبلی صاحب نے "سوزِ وطن" کے خلاف اپنے موقف کی حمایت کے لئے یہ لکھا ہے کہ پریم چند کی جو پیشی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہمیرپور کے سامنے ہوئی تھی اور اس سے پہلے جو قضیہ شروع ہوا تھا وہ "سوزِ وطن" کے سلسلہ میں ہرگز نہیں تھا بلکہ "گمان غالب" ہے کہ یہ پیشی یو۔پی میں ابتدائی تعلیم کے سلسلہ میں ہوئی تھی نہ کہ سوزِ وطن کے سلسلہ میں۔ اور کہ پریم چند نے یہ چکر اپنا امیج بوسٹ (IMAGE BOOST) کرنے کی خاطر چلایا تھا)

امید ہے کہ میری یہ معروضات شانِ ہند کے کسی قریبی شمارے میں شائع کر دی جائیں گی۔ تاکہ پریم چند پر تحقیق کرنے والے حضرات تحقیق کے وقت مندرجہ بالا باتوں کو بھی زیرِ نظر رکھ سکیں۔

خلوص کار

مانک ٹالا ۱۲/۵/۸۲

دفتر ماہنامہ گگن بمبئی ۸۳ ۱۵ رمئی ۸۲ء

محترم سرور بھائی آداب

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔ آج دوپہر کی ڈاک سے اپریل کا "شانِ ہند" موصول ہوا۔ میں عموماً آپ کے شذرات شوق سے پڑھا کرتی ہوں۔ لیکن اس مرتبہ گوشۂ عقیل کے تحت ۵۲ء کے ایک مشاعرے کا حال پڑھنا شروع کیا جو بے حد دلچسپ لگا۔ ان لوگوں کا ذکر جو حقیقی معنوں میں فنکار تھے۔ جو ادب کے لئے زندہ تھے اور اپنے فن کے ساتھ مخلص، شاید اسی لئے اس دور کے شعراء شہرت اور عزت کی بلندیوں پر پہنچے ہوئے تھے۔ اور اس خوبی کا آج کے ادیبوں اور شاعروں میں فقدان ہے۔ نہ ویسے باذوق شائقین و قارئین ہی رہے۔

بہرحال اس خط کے لکھنے کی تحریک آپ کے ان چند جملوں سے ہوئی جو آپ نے تلوک چند محروم کے بارے میں آج سے ۳۰ سال قبل کہے تھے جس میں خصوصی طور پر یہ جملہ "کاش ہمارے شعراء پاکستانی شعراء سے سبق سیکھ سکیں اور محض وقتی واہ واہ کیلئے اپنے ضمیر کو قتل نہ کیا کریں۔" مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ ذہنیت ۳۰ سال پہلے بھی تھی۔

یہ بات صرف ہمارے شعراء کی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کا ہر فرد (ہندو اور مسلمان دونوں) پتہ نہیں کیوں اس احساس کمتری کا شکار ہیں اور آنے بہانے پاکستانیوں کی بے جا اور غلط تعریف کرنا اپنا شیوہ بنالیا ہے جب کہ پاکستان کے ادیب، شاعر، صحافی اور عوام ہندوستان کے سلسلے میں اچھے خیالات اور نیک جذبات کا اظہار کبھی نہیں کرتے تحریر ہو یا تقریر یا زبانی بات چیت وہ ہمیں اچھا نہیں سمجھتے۔ پاکستان مذہب کی بنیاد پر بنا تھا لیکن ہم مذہب ہونے کے باوجود انہوں نے تو کبھی ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اچھا نہیں سمجھا بلکہ وہ جب بھی گئے خلاف بولیں گے۔ جب کہ اس کے برعکس یہاں کا مسلمان اور ہندو بھی ان لوگوں کو فرشتوں سے افضل ثابت کرنے میں پورا زور صرف کرتا ہے۔ مسلمان نے تو یہ اور غلطی کی کہ وہاں کے گن گا گا کر خود اپنے ملک میں اجنبی بن گیا اور آنکھیں کھول کر کبھی نہ تو پاکستان والوں کی تحریریں دیکھیں اور نہ تو ان پر غور کیا۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ وہ لوگ ہمیں ہر لحاظ سے (مسلمانوں کو بھی) برا بھلا کہیں، بے وقعت سمجھیں اور ہم گالیاں کھا کر بے مزہ نہ ہوں۔

سیاسی یا مذہبی جس بنا پر بھی وہ ملک وجود میں آیا آ گیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس ملک اور اس کے باسیوں کے ساتھ ہر لحاظ سے ویسا ہی سلوک کریں جیسا کہ ہم نارمل انداز پر کسی بھی دوسرے ملک سے کرتے ہیں۔ دشمنی اور نفرت تو یقیناً بری چیز ہے لیکن دوسروں کے مقابلے پر خود کو کمتر سمجھنا بھی اچھی بات نہیں ہے۔

پچھلے دنوں اخبار میں ایک خبر دیکھی کہ ایک پاکستانی ناشر نے منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ شائع کیا اس پر وہاں کے اخباروں (دوسرے معانی میں وہاں کے صحافیوں نے) واویلا مچا رکھا ہے اور ان نا سمجھوں کا کہنا ہے کہ پریم چند کی تحریریں شائع کر کے ناشر نے کوئی عقل مندی نہیں کی کاغذ ضائع کیا ہے کیوں کہ منشی پریم چند کی اردو بہت پرانی ہو چکی ہے اور وہ زبان اب متروک ہو چکی ہے اس لئے بے فیض ہے۔ سنا آپ نے سرور بھائی! یہ وہ لوگ کہہ رہے ہیں جنہیں ہم ہمیشہ تعریفوں کے پھول کی مالائیں پہناتے آئے ہیں — انہیں نہیں ہمیں شرم آنی چاہئے کہ ہم اب تک کیا کرتے آئے ہیں۔ کسی پاکستانی "قلم کار" کا یہ کہنا کہ پریم چند کی اردو اب متروک ہو چکی ہے اس لئے ان کی تحریریں بے فیض ہیں ایسا ہی ہے کہ ہم کہنے لگیں کہ غالب، نظیر، داغ، رسوا، میر امن، رجب علی بیگ سرور والی زبان اب متروک ہو چکی ہے اس لئے ان لوگوں سے ہمیں کیا فیض اور اس کا یہ بھی مطلب ہے کہ آج کے پاکستانی قلم کار سو سال بعد مردہ ہو چکے ہوں گے۔

یہ بھی اتفاق ہے کہ رات "محفل یاراں" میں سردار جعفری نے اس بات کا ذکر کیا کہ ہندوستان میں پاکستانیوں کے ساتھ جتنا اچھا سلوک ہے ان پر کوئی دروازہ بند نہیں ہے وہاں یہ بات نہیں۔ ہندوستانی ادیبوں، صحافیوں پر ریڈیو اور ٹی وی کے دروازے بند ہیں۔

اب اگر میں یہ کہوں کہ خامی منشی پریم چند کی اردو میں نہیں ہے بلکہ پاکستانیوں کے دماغ میں ہے تو بہت سارے لوگ ناراض ہو جائیں گے — کیوں کہ عربوں کو گالی دیں لیں گے مگر پاکستانیوں کو برا کہنا ہماری شریعت میں حرام ہے۔

بس اب اجازت، روحی بھابی سے سلام کہئے۔ سنا ہے دہلی میں بارش سے سردی ہو گئی ہے جب کہ بمبئی میں جم کے گرمی ہو رہی ہے۔

آپ کی ہی بہن

شہناز کنول

لندن، ۱۸ مارچ ۸۳ء

مکرمی سرور صاحب — آداب

اکثر شانِ ہند میں اردو زبان سے متعلق مسلمانوں کو صورتِ حال کی حقیقت سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ میں اس رائے سے بالکل متفق ہوں کہ اردو نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ تمام ہندوستان کے اردو بولنے والے افراد کی زبان قرار دی جائے۔

اگر مسلمان دانش ور اس لئے کوشاں ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دی جائے تو کیوں نہ وہ عربی زبان کی طرف

رجوع کریں جو مذہبًا ان سے زیادہ قریب ہے۔ کیوں کہ اُردو زبان تو ہندوستان کی ہر قوم اور ہر مذہب کا فرد بول سکتا ہے۔ اگر اسے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دے دیا جائے تو اُردو کو سخت نقصان پہنچے گا۔

اُردو کے انشاء پرداز اور ادیب صرف مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ دوسری قوموں میں بھی ہیں جو اس زبان کی ترقی کا باعث بنے ہیں۔ لہٰذا اگر اس زبان کو ختم کرنا ہے تو مسلمانوں تک ہی اسے محدود رہنے دیجئے۔ کیوں کہ دیکھا گیا ہے جو زبان بالکل محدود کر دیا جائے اس کے ختم ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے تو کل یہ بھی اعتراض ہوگا کہ مسلمانوں کے علاوہ جو یہ زبان بولتا ہے وہ مسلمان ہے یا اسے مسلمان بن جانا چاہئے۔ یہ مسئلہ دوسری قوموں اور مذاہب اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا کر دے گا۔ اگر ایک مسلمان اُردو ادیب کا انتقال ہوتا ہے تو یہ ضروری نہیں کہ اس کی جگہ اس کی اولاد لے یا کوئی دوسرا مسلمان۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ مسلمانوں میں سب اُردو کے معتقد پیدا ہوں۔ بلکہ اردو کے مسلمان دانش ور حضرات اپنے بچوں کو انگریزی کی تعلیم دلاتے ہیں اور فخر سے کہتے ہیں کہ انہیں اُردو نہیں آتی۔ انگریزی بولتے ہیں۔

اگر غیر مسلموں کی زبان بھی اُردو رہی تو مزید امکانات ہیں کہ ان کی نسل اور قوم میں بھی اس زبان کو وہی درجہ اور اسے زندہ رکھنے کا شوق اور لگن پیدا ہوگی۔

اُردو مسلمانوں ہی کی زبان ہے اس کا پرچار کرنے والوں نے رام لال صاحب پر بھی اعتراض کیا ہے۔ رام لال صاحب نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا تھا کہ ۱۹۷۴ء میں غیر مسلم اردو اسپیکنگ کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی گئی تھی۔ بہت سے مسلمان شعراء و ادیبوں نے اس کا بائیکاٹ بھی کیا۔ کیا ان مسلمان ادیبوں کو اس کا علم نہیں کہ اُردو کی خدمت اور اس کی بقا کیلئے غیر مسلموں نے بھی جد و جہد کی ہے اور کر رہے ہیں۔

میں لندن یونیورسٹی کے انگریز پروفیسر رالف رسل اور ڈاکٹر ڈیوڈ میتھو اُردو زبان کے پروفیسر کے پاس ان کے یونیورسٹی آفس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک انگریز اسکالر نے ان سے دریافت کیا آپ کا لکچر کس دن اور کس مضمون پر ہے؟ انہوں نے جواب اپنی (انگریزی نما اُردو) میں دیا کہ میر انیس کے ایک شعر پر ہے کہ "جب مسافت شب طے کی آفتاب نے"۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کیا ہندوستانی مسلمان یہ بتا سکتے ہیں یہ غیر ملکی غیر قوموں کی زبان کیوں سیکھ رہے ہیں؟۔ کیا وہ یہ زبان سیکھ کر مسلمان ہونا چاہتے ہیں؟۔

اگر ان غیر قوموں پر یہ عیاں ہو جائے کہ یہ تنگ دل اور تنگ نظر ہندی مسلمان اُردو زبان پر اپنی ملکیت ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو یقین جانئے کہ دنیا بھر کی غیر قوموں کے وہ حضرات جو اُردو سے دل چسپی رکھتے ہیں اس زبان کو پڑھنا یا بولنا چھوڑ دیں گے۔ کیوں کہ مسلمانوں نے اپنی قوم، نسل اور مذہب کے ساتھ غداری کر کے جس قدر اپنی قوم کو نقصان پہنچایا ہے کسی قوم کی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی۔

لہٰذا ایسے لوگوں سے میری گزارش ہے کہ اگر اس زبان سے دشمنی کرنی ہے تو اسے صرف مسلمانوں کی زبان قرار دلوایئے۔ اگر اُردو سے دوستی رکھنا ہے تو عربی کو مسلمانوں کی قومی زبان بنانے کی مشترکہ کوشش کیجئے۔

جو قوم، نسل، زبان، کلچر اتحاد پر بنیاد رکھے گی اس کی جڑیں مضبوط ہوں گی ورنہ مسلمان قوم کی طرح اس زبان کا بھی شیرازہ بکھر جائے گا۔ ہندوستان میں دوسری قومیں بھی آباد ہیں وہ اٹھ کھڑی ہوں گی کہ ان کی بھی زبان ان کی قومیت کی بنا پر مانی جائے۔ ملک کے مختلف صوبوں میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں وہاں کے مقامی مسلمان بھی وہی زبان بولتے ہیں جو وہاں کی دوسری آباد قومیں جیسے سندھی۔ گجراتی۔ پنجابی۔ بنگالی، مرہٹی۔ وغیرہ۔

کیا ان علاقوں میں مسلمانوں کو اُردو بولنے پر مجبور کیا جائے
اور دوسری قوموں کو ان کی زبان بولنے پر ؟ اتحاد اور
یکجہتی میں نفاق پیدا کرنے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی
مثبت قدم نہ ہوگا۔

پاکستان میں چار صوبوں میں تقریباً مسلمان ہی ہیں
وہاں کے سیاسی لیڈروں نے اپنی سیاست چمکانے کے
لئے اُردو زبان کا سوال کھڑا کیا۔ اور کچھ نہ بن پڑا تو ایک
لیڈر نے یہاں تک بیان دے دیا کہ یہ زبان پاکستان
کے کسی علاقہ کی زبان نہیں ہے۔ لہٰذا ایک نئی زبان جو چار صوبوں
کی زبان کا مکسچر ہو پورے مُلک پاکستان میں سرکاری زبان
کی حیثیت سے متعارف کرائی جائے۔ کیا ہندوستانی مُسلمان
یہ تجویز پسند کرتے ہیں؟ کیا اس سے اتحاد پیدا ہو سکتا ہے؟۔

مُسلمان قوم مذہب اسلام کے نام پر متحد نہ ہو سکی
تو زبان کے نام پر کس طرح ہوگی۔ یہ زبان کسی مخصوص علاقہ
یا طبقے کی نہیں ہے۔ اُردو کے معنی ترکی زبان میں لشکر کے
ہوتے ہیں جیسے ایک لشکر میں مختلف گروہ اور علاقے کے سپاہی ہوتے
ہیں، اسی طرح اس زبان میں مختلف علاقائی زبانوں کے الفاظ
شامل ہوتے گئے۔ اس سے اس زبان کو تقویت اور ترقی ملی۔
اور رفتہ رفتہ سارے برّاعظم میں پھیل گئی۔

اب اُردو بولی ہی نہیں بلکہ علم و ادب کی بھی زبان بن گئی۔

اردو۔ افغانستان سے برما تک۔
ہمالیہ سے — دکن تک
کراچی ویٹ ورسے — ڈبروگڑھ ونگلو تک
سری نگر و بدری ناتھ سے — مالابار و میسور تک
بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ نیاز مند

ایس۔ ایم عابد نقوی (لندن)

گوہاٹی۔ ۲۴ر مارچ ۸۲ء

برادرم سرور صاحب، مزاج گرامی

جنوری کے شمارے سے پتہ چلا کہ آپ ایک حادثہ سے مجروح
ہوگئے۔ اب کیسی طبیعت ہے۔ شمارہ ہذا کئی دن پہلے ملا تھا مگر
چوں کہ طبیعت خراب تھی یہ خط تاخیر سے لکھا گیا۔ آپ
کا جواب ملنے تک تشویش رہے گی۔

اُردو کے موضوع پر آپ جو کچھ لکھتے رہے ہیں اور آپ کا
جو موقف رہا ہے مجھے اس سے بہت بڑی حد تک اتفاق ہے۔
بات دراصل یہ ہے کہ اُردو میں مفاد پرستوں پر مشتمل ایک
یعنی دائرۃ السّوء پیدا ہو گیا ہے جس میں
اقتدار و مالی منفعت کے حصول کے لئے جا بے جا حربے
استعمال کرنے والے ہندو مُسلمان دونوں شامل رہے ہیں
"متعصب" ہندو ادباء اور مفاد پرست مسلمان ادباء و شعراء دونوں
موردِ الزام ہیں۔ اردو کا مسئلہ میرے خیال میں نہ تو کبھی تھا اور
نہ ہے۔ یہ دام ہم رنگِ زمیں ہے جو عوام دشمن لوگ پھیلائے
ہوئے ہیں۔ دوسری زبان کے مقام پر فائز کر دئے جانے کے
باوجود اردو گورستان کی طرف جا رہی ہے۔ سرمایہ داری طرح
طرح کے گُل کھلاتی رہی ہے اور صحیح وصحت مند بیداری پیدا
ہو جانے تک نہ جانے کتنے اور شاخسانے پیدا کرتی رہے گی صحت نے
اجازت دی تو اس موضوع پر بالتفصیل لکھوں گا۔

آپ صحتیاب ہو جائیں۔ دل کہتا ہے کہ اب آپ اپنی صلاحیتوں
کے ساتھ کام پر آگئے ہوں گے مشوش رہوں گا جلد مطلع فرمائیں۔ کارڈ لائق
سے نوازیں۔ آپ کا رستوگی۔

جھن جھنوں۔

سرور صاحب۔ تسلیم

اس سال راجستھان میں ۷ ہزار شالا اسکول قائم کئے گئے ہیں جن کیلئے
۲۵ لاکھ کی کتابیں محکمہ خرید کر رہا ہے لہٰذا ڈائرکٹر تعلیمات کو
توجہ دلائیے کہ وہ جن اسکولوں میں اُردو جاری ہے انکے لئے اُردو کتب بھی
خرید کریں۔ وزیر تعلیم صوبہ راجستھان نے اپنے بیانات میں یہ بھی کہا ہے کہ
سات ہزار ہی چھوٹی لائبریریاں قائم کرنے کی اسکیم ہے اگر انجمن ترقی اردو یا
دیگر ادارے جو اُردو کے حامی ہیں وہ دلچسپی لیں تو اُردو کتب کی بھی خرید
ہو سکتی ہے صرف اس ضلع میں قریب ۲۰ اسکولوں میں اردو جاری ہے
اور قریب ۵ درجن سے زائد اردو اساتذہ معمور ہیں جو اس طرف توجہ کریں تو اُردو
کی بہت بڑی خدمت کتابوں کی خرید کی شکل میں ہو سکتی ہے۔

نیاز مند:۔ سعید احمد خان سکریٹری آزاد لائبریری

تضمین

گرسرن لال ادیب ۱۴۷ ، مکند نگر ۔ غازی آباد

اگرچہ دشمنِ جاں ہی عدو رہا میرا
ہمیشہ اس سے بھی شیوہ رہا وفا میرا
کبھی جو خوف ہوا دل یہ بول اٹھا میرا
کہو کرے گا حفاظت مری خدا میرا
رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا

یہ سچ ہے غم کی حکایت ہے میرا افسانہ
کیا ہے گردشِ دوراں نے مجھکو دیوانہ
مگر فضول ہے دراصل میرا گھبرانا
خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ
تو ذرہ ذرۂ عالم ہے آشنا میرا

بتاؤں کیف محبت کے کیا مرے ہمدم
نہیں ہے زعمِ خرد سے جنوں کی عظمت کم
جدا ہے سرحدِ ادراک سے مرا عالم
انہیں ہے عقل جو محتاجِ غیر ہے ہردم
مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدعا میرا

غلط سمجھتے ہیں میرا مقام اہلِ زمیں
یہاں کیا ہے گنا ہوں نے مجھ کو لا کے مکیں
زمیں پہ جسم ہے لیکن دماغ اور کہیں
مری حقیقتِ ہستی یہ مشتِ خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے پوچھے کوئی پتہ میرا

ادیب کچھ کہیں چاہے مجھ کو صاحبِ زر
نہیں ہے میری نظر ان کی نکتہ چینی پر
زباں پہ آتا ہے اکبر کا شعر یہ اکثر
غرور اہیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر
سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

غزل

حکیم تسخیر فہمی (رجے پور)

وہ مرحلہ انساں کا جہاں بس نہ چلا ہے
تقدیرِ الٰہی سے وہ منسوب ہوا ہے
اب اس کے تصور سے بھی دل کانپ رہا ہے
یاروں نے مرے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے
لوگوں نے مجھے طنز سے دیوانہ کہا ہے
کیا خوب مری سادہ مزاجی کا صلہ ہے
بے مہریٔ احباب کا بے سود گلہ ہے
ہم آج بھی مخلص ہیں خود اپنی ہی خطا ہے
اک حادثۂ قلب و نظر جب سے ہوا ہے
ماحول اشاروں میں مرے ناچ رہا ہے
حق بات کی تلقین کی جس نے بھی جہاں پر
لوگوں نے اسی شخص پہ پتھراؤ کیا ہے
تقدیر زمانے کی بدلنے کو ہے شاید
دیوانہ کئی روز سے کچھ سوچ رہا ہے
فہمی نہ کہا میں نے اندھیروں کو اجالا
اس جرم پہ مجھ سے مرا ہر دوست خفا ہے

غزل

غوث اُجینی

مرے نالہائے شبِ الم ہیں فروغِ زینتِ آسماں
کبھی چاند تاروں میں ضو فشاں کبھی بن گئے وہ کہکشاں
فقط اک حرم ہی نہیں مکاں ہے ہر اک جگہ ترا آستاں
مری اک جبینِ نیاز ہے کہیں اسے جھکاؤں کہاں کہاں
ہوا جب کسی سے کبھی سامنا وہ نظر جھکا کے چلا گیا
کروں کس سے حالِ زبوں بیاں نہ ملا کوئی بھی مرا رازداں
جسے اپنا سمجھا تھا ہم نوا میں فریبِ دوست میں آگیا
ہوا اس سے راز نہاں عیاں جسے غوث سمجھے تھے رازداں

غزل

ڈاکٹر ستیہ پرکاش تفتہ (کوروکشیتر)

تارِ نظر سے مہرِ درخشاں بھی کٹ گیا
جو تھا ازل میں ایک وہ ٹکڑوں میں بٹ گیا

کچھ اس طرح میں ذات میں اپنی سمٹ گیا
اے تفتہ ہست و بود کا جھگڑا نبٹ گیا

اُس شخص کا نہیں کوئی معیارِ زندگی
جس کا ضمیر گردِ کدورت سے اَٹ گیا

راہِ طلب کی مشکلیں آسان ہو گئیں
دیوانہ جب سے فرض کی راہوں میں ڈٹ گیا

پیش از نمود میں بھی احد تھا تری طرح
دُنیا کے واسطے کئی حصّوں میں بٹ گیا

اُس کے ہی دم قدم سے ہے روشن مری حیات
جو شخص میرے گھر میں اندھیرے اُلٹ گیا

جلنے کا آشیاں کے مجھے کوئی غم نہیں
خوش ہوں کہ گلستاں کا اندھیرا تو چھٹ گیا

تفتہ کتابِ عشق کی بوسیدگی نہ پوچھ
ایک اک ورق الٹنے کی کوشش میں پھٹ گیا

غزل

ڈاکٹر کے کے رشی کوروکشیتر

شامِ اَلم ہے رات سے پہلے
گھور گھٹا برسات سے پہلے

مَیں بھی چپ تھا وہ بھی چپ تھے
کتنی کچھ بات بھی بات سے پہلے

وَعدہ اُن کا وَعدہ ہی تھا
دل جُوئی تھی گھات سے پہلے

ہجر کی راتیں وصل کی گھڑیاں
صدیاں ہیں لمحات سے پہلے

ذاتِ عمل کا ہے یہ تقاضا
خود کو بدل حالات سے پہلے

محفلِ عشق میں جا کر دیکھا
نوحے تھے نغمات سے پہلے

پیار نے دل کو دھڑکن بخشی
پتھر تھا جذبات سے پہلے

برسے ساون تو یوں برسے
بنجر پر باغات سے پہلے

اب کچھ آساں زیست ہوئی
مشکل تھی صدمات سے پہلے

یاد وہ آئیں روز رشی کو
دن کے آخر رات سے پہلے

قطعات

ڈاکٹر تفتہ

کون سچا ہے کون جھوٹا ہے
سب کے باطن میں جھانک لیتا ہوں
جن کو پاسِ خودی نہیں تفتہ
ایسے لوگوں پہ تھوک دیتا ہوں

شاندار و جمیل ہوتی ہے
روشنی کی کفیل ہوتی ہے
پاک نفسی ہی حضرتِ تفتہ
برتری کی دلیل ہوتی ہے

کتنا آسان ہے سنگ دل بننا
کتنا مشکل کریم ہونا ہے
ارتقائے صفاتِ انسانی
آدمی کا حلیم ہونا ہے

مبتلائے عذاب کرتی ہے
گرمِ صد اضطراب کرتی ہے
صاف گوئی تو اس زمانے میں
آدمی کو خراب کرتی ہے

ہریانہ میں نیا بیس (۲۰) نکاتی پروگرام
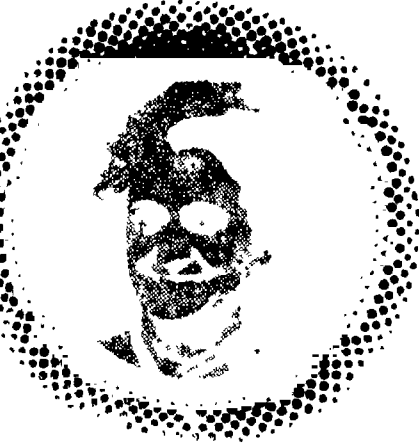
نیا بیس (۲۰) نکاتی پروگرام جسے ایک بہتر اور آسودہ سماج کی تخلیق کے لئے ایک تعمیری کاوش کے چارٹر کی حیثیت سے محترمہ اندرا گاندھی نے قوم کے سامنے پیش کیا اسے ہریانہ کے محنت کش طبقہ نے پورے جوش اور دلی تعاون کے ساتھ اپنایا ہے۔ "یہ شرم ایوا جیتے" نعرہ کے فلسفہ کا نعرہ ہے جس نے زمانۂ قدیم یعنی کروکشیتر میں بھگوان کرشن کے مقدس پیغام کے وقت سے ان کی رہنمائی کی ہے۔ اب یہ ایک نئی اہمیت کا حامل ہے۔

- اب سینچائی کے ذرائع کی تمام تر کوشش کی جارہی ہے اس وقت ۲۰،۱۸ لاکھ ہیکٹر زمین کی سینچائی ہوتی ہے جو آنے والے تین سال کے دوران ۲۴ لاکھ ہیکٹر ہوجائیگی ۶۷،۵ لاکھ ہیکٹر زمین کی سینچائی راوی۔ بیاس کے پانی سے ہوگی جو معاہدہ پر دستخط کرنے کی وزیر اعظم کی کرم فرمائی کا نتیجہ ہے۔
- عالمی بنک کی امداد کے تحت نئے طریقوں کے استعمال سے ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ مکعب فٹ پانی لیجانے کیلئے راستے کے ذریعہ ۱۵۰۰ کیوسک پانی بچایا جارہا ہے۔ اس کام کا آدھا حصہ مکمل ہوچکا ہے۔
- خوراک کی پیداوار میں بتدریج ترقی ہے جو ۶۶ لاکھ ٹن تک پہنچ چکی ہے اور راوی بیاس کے پانی کے پورے طور پر ۹۳ کلومیٹر میں استعمال سے ۱۰۰ لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی۔ اس سلسلہ میں زیادہ کام مکمل ہوچکا ہے۔
- درخت اگاؤ پروگرام ریاست میں بڑے پیمانے پر شروع کیا گیا ہے جو ماضی میں بنجر علاقہ کہا جاتا تھا اب وہ ایک مثال بن گیا ہے۔ ایک سال عرصے میں ۶ کروڑ نئے درخت لگاتا اور اگلے سال میں ۱۲ کروڑ لگانے کا نشانہ نہ صرف ماحول کی بہتری اور جنگلات کی مالیت میں ترقی کا ہوگا بلکہ مزدوروں کو روزگار بھی مہیا کرے گا۔
- ہریانہ کی خصوصی توجہ کا مرکز بجلی کے لئے مالیت کا پھیلاؤ ہے جس کے ذریعے مختلف سکیموں کی تکمیل پر کئی گنا زیادہ فائدہ ہوگا موجودہ میں ۱۱۷۴ M.W. بجلی پیدا ہوتی ہے وہ اگلے دس سال سے کم عرصے میں ۲۰۷۹ M.W. ہوجائے گی۔
- ہریانہ میں تمام ۵۶۳۴ ہریجن بستیوں کو بجلی مل جانے سے وہ فخر محسوس کرنے لگے ہیں جو درست بھی ہے۔ راستوں اور سڑکوں پر بجلی کام کی تکمیل کا پروگرام زندگی کے معیار میں اور بہتری پیدا کرے گا۔
- وہ دیہات جو پانی کے مسئلے سے دوچار ہیں ان کے لئے پینے کا پانی مہیا کرنے کا تیزی سے پروگرام چل رہا ہے اس دہائی کے آخر ایسے تمام دیہات اس سے فیض یاب ہوجائیں گے۔
- زائد زمین کا بٹوارہ اور دیہاتی غریبوں کے لئے رہائشی جگہ کا انتظام قریب قریب مکمل ہے۔
- ہریجن اور پسماندہ طبقوں کی ترقیاتی کارپوریشن نے ان کی سماجی اور مالی ترقی کے لئے ذرائع مہیا کئے ہیں ہریانہ ان تمام نکات کو مستحکم عملی پہنانے کا تہیہ کئے ہوئے ہے تاکہ ترقی کے اس انقلابی پروگرام کا فیض ہر خاندان کو حاصل ہو اور ہمارا رہبر عظیم کا خواب سچا ثابت ہو۔

بھجن لال
چیف منسٹر ہریانہ

جاری کردہ: ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز ہریانہ

عورت

ابو البلاغت حضرت ریاض پنڈوری

ابھی نورِ ازل اک پردۂ وحدت میں پنہاں تھا
ابھی حسنِ حقیقت خود حجابِ بزمِ عرفاں تھا

ابھی خاموشیاں ہر گوشۂ فطرت پہ چھائی تھیں
ابھی رعنائیاں سرمستیاں بن کر نہ آئی تھیں

ابھی تک تھی بقا ساکت، اجل مشغول، فنا ششدر
ابھی تک تھی قضا ششدر، قدر ششدر، رضا ششدر

ابھی جنت کا افسانہ خیالوں میں کہانی تھا
ابھی فرمانِ کن کا حسبِ منشا ترجمانی تھا

ابھی ذرّوں میں ہر تصویرِ موجودات پنہاں تھی
صفاتِ حق کے پردے میں خدا کی ذات پنہاں تھی

ابھی لاہوت کا حیرت فزا عالم نمایاں تھا
ابھی ناسوت کا شیرازۂ ہستی پریشاں تھا

ابھی بے ہوش تھی خوابِ گراں میں ناز کی دنیا
ابھی دنیا سے تھی معدوم سوز و ساز کی دنیا

تجلّی خود سمٹ کر گوشۂ خلوت میں بیٹھی تھی
اطاعت قدرتِ حق شکر کی صورت میں بیٹھی تھی

یکایک حسنِ مطلق بے محابا جوش میں آیا
تڑپ کر عشقِ خوابیدہ حدودِ ہوش میں آیا

صدائے کن کا نعرہ سن کے لی انگڑائی قدرت نے
محبت نے دکھائی شانِ کثرت شانِ وحدت نے

اشارے سے تعلق ہو گیا ناسوت کا عالم
نئی دنیا میں گویا آگیا جبروت کا عالم

ہوئے ہر سو تجلی ریز پھر اسرار تکوین کے
زمیں سے آسماں تک چھا گئے انوار تکوین کے

جمالِ حسن جلوت میں بہ اندازِ کمال آیا
دلِ حق میں فروغِ آفرینش کا خیال آیا

حجاب اُٹھا وہیں نازل ہوئی اک دل نشیں صورت
حسیں، رنگیں جبیں، خورشید رُو، ناز آفریں صورت

تقدس کا جہاں تھا جس کے ہر انداز پہ قرباں
تعلّی، خود پسندی، دل کشی و ناز پر قرباں

ادا، شوخی، نزاکت، دل رُبائی پاسباں جس کے
حیا، غمزہ، کرشمہ، خودستائی، انداز جس کے

قیامت خیز نظارہ خرامِ ناز سے ظاہر
قضا پرور کرشمہ چشمِ افسوں ساز سے ظاہر

رُخِ معصوم نما تھا یا کوئی جنت کی بستی تھی
نگاہِ حشر پرور سر بسر دنیائے مستی تھی

شبِ یلدا سے جذبہ مانگتے تھے کاکلِ پیچاں
مٹے جاتے تھے غمزہ پرستانِ خنجر و پیکاں

مسیحا دم بخود تھا اُس کے اعجازِ تبسم سے
گلستانِ جہاں شاداب تھا حسنِ تکلم سے

عجب رنگینیاں تھیں جلوہ گر اُس کی طبیعت میں
عجب رعنائیاں تھیں اُس کے دلکش قد و قامت میں

ادا میں خودستائی، خودنمائی، خودسری دیکھی
مگر اس خودستائی میں بھی شانِ دلبری دیکھی

تن آسانی و سہل انگاری و عشرت پہ مرتی تھی
مگر جوشِ وفا میں آفتوں سے بھی نہ ڈرتی تھی

ظرافت، دل فریبی، بانکپن طرزِ بیاں میں تھا
لبِ تقریر میں اعجاز تھا جادو زباں میں تھا

زمانے میں وجود اُس کا حیات افروزِ ہستی تھا
جہاں میں رونقِ خمخانہ اُس کا جوشِ مستی تھا

لرزتے تھے ملائک بھی فلک پر نام سے اُس کے
نکل سکتے نہ تھے ہاروت فن بھی دام سے اُس کے

خدا نے حسن میں اُس کے یہ کیسی دل کشی بھر دی
کہ چشمِ مہرِ عالم تاب حیرت آشنا کر دی

کوئی صیاد اسے سمجھا تو کوئی عشوہ گر سمجھا
کوئی دلبر، کوئی دل کش، کوئی جادو نظر سمجھا

ادا و ناز سے محفل میں جب وہ دلرُبا آئی
فضائے غیب سے کانوں میں فوراً یہ صدا آئی

یہی جانِ جہاں، شانِ جہاں، ایمانِ اُلفت ہے
اسی شیریں نوا، رنگیں ادا کا نام عورت ہے

درمیان ایک باضابطہ معاہدہ عمل میں آیا تھا جس کی رُو سے میرے والد پروفیسر سید احتشام حسین مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف "جوش - انسان اور شاعر" کو یو۔پی اکادمی سے شائع ہونا چاہیئے تھا لیکن ایک برس گزر جانے کے بعد مذکورہ بالا کتاب کی اشاعت یو۔پی اکادمی سے ابھی تک نہیں ہو سکی ہے۔ اس سلسلے میں کئی مرتبہ اُردو اکادمی کے سکریٹری اور چیرمین کو زبانی اور تحریری طور پر متوجہ کر چکا ہوں۔ اس کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا ہے۔ بار بار دریافت کئے جانے پر بھی اُردو اکادمی کے عہدیداران نہ تو کوئی فیصلہ کن جواب دے رہے ہیں اور نہ اس بات کی ہی کوئی وضاحت کر رہے ہیں کہ آخر وہ کون سی وجوہ ہیں جن کی بنا پر مذکورہ بالا کتاب کی اشاعت میں دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔

حیرت و افسوس کا مقام ہے کہ اُردو زبان کے ایک بلند مرتبت تنقید نگار کی ایک غیر مطبوعہ تصنیف۔ وہ بھی جوش ملیح آبادی جیسے عظیم شاعر کے فن و شخصیت سے متعلق ہے۔ اسے یو۔پی اردو اکادمی معاہدہ کرنے کے باوجود شائع کرنے سے گریز کر رہی ہے اس سلسلے میں اُردو اکادمی کے عہدے داروں سے میں یہ درخواست بھی کر چکا ہوں کہ اگر اتر پردیش اُردو اکادمی مذکورہ بالا کتاب کو شائع کرنے سے معذور ہے تو کم از کم اس کا مسودہ ہی مجھے واپس کر دے تاکہ میں کسی دوسرے پبلشر یا ادارے سے جلد از جلد مذکورہ بالا کتاب کی اشاعت کرا سکوں لیکن اُردو اکادمی کے عہدیداران مجھے اس کا مسودہ بھی نہیں واپس کر رہے ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اُردو اکادمی کے عہدیداران آخر چاہتے کیا ہیں۔

حالانکہ اتر پردیش اُردو اکادمی وزارۃ قومی یکجہتی، حکومت اتر پردیش کے ماتحت چلنے والا ایک ادبی ثقافتی اور قومی ادارہ ہے۔ تعجب خیز بات ہے کہ پھر بھی وہاں پر بے ضابطگی کا بازار گرم ہے۔ اتنا سب حق تلفی کے ہوتے ہوئے بھی یو۔پی اُردو اکادمی کے عہدے داران کو بالکل بے لگام چھوڑ دیا گیا ہے اور ان سے باز پرس کرنے والا کوئی موجود نہیں ہے۔

میں حکومت اتر پردیش کے ارباب اقتدار سے نہایت ادب کے ساتھ یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اتر پردیش اُردو اکادمی کے عہدیداران پر کسی اصول، کسی اخلاق، کسی ضابطے اور کسی قانون کی کوئی پابندی عاید نہیں ہوتی ہے! میں حکومت اتر پردیش سے انصاف کا طالب ہوں۔

جعفر عسکری
گولا گنج لکھنؤ"

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی نادر شاہی

اُتر پردیش اُردو اکادمی سے یو۔پی کی کچھ لائبریریوں کو مالی امداد دی جاتی ہے۔ اس سال اکادمی کی طرف سے ایسی لائبریریوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ انہیں اخبار "روزگار سماچار" لازمی خریدنا ہوگا اور دوسرا یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو مالی امداد منظور کی گئی ہے اس کا نصف حصہ ان کتابوں کی خریداری پر خرچ کیا جائے جو صرف اتر پردیش اردو اکادمی سے خریدی جائیں۔

اُتر پردیش اُردو اکادمی کی مطبوعات قطعاً ایسی نہیں جو دیہاتی عوام کے مطالعہ میں آ سکیں۔ دیہاتی لوگ ہلکے پھلکے ناولوں خصوصاً جاسوسی ناولوں اور مختصر افسانوں کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے ہیں یا روزناموں میں تاکہ ملک کے حالات اور سیاسیات سے آگاہ ہو سکیں۔ اتر پردیش اُردو اکادمی کی اپنی مطبوعات بہت اچھے ادبی معیار کی ہیں جو یقیناً دیہات کے رہنے والوں کے لئے قابلِ مطالعہ نہیں ہیں مثال کے طور پر اکادمی کی ایک کتاب کا نام ہے "الٰہیات" ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کسی بھی دیہاتی کتب خانہ میں پسند نہیں کی جا سکتی اور اکادمی کے بک ڈپو میں جو کتابیں برائے فروخت رکھی ہوئی ہیں وہ زیادہ تر ایسی ہیں کہ جنہیں کوئی خریدتا ہی نہیں۔ بعض شاعری کے مجموعے جن پر اکادمی نے [illegible] کے تحت انعامات دیئے اور اکادمی ایسی

جیا کا ایک مصرعہ ہے کہ "نام سہگل ہے مگر گلے سے نفرت ہے انہیں"۔ اس چور شاعر کو یہ بھی علم نہیں کہ سہگل ذات ہے نام نہیں۔ سہگل صاحب مرحوم کا نام کندن لال تھا۔ ہندوستان میں لاکھوں سہگل ہیں کیا ان سب کو ہی گانا آنا چاہیے۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ ہم نے بیچارے کنور برنی صاحب کو چور شاعر کیسے کہہ دیا۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ ان حضرت نے ملک کے مشہور شاعر جناب واحی نقوی پٹنہ کی ایک پوری نظم صرف تخلص بدل کر اپنے نام سے اخبار میں چھپوا دی تھی۔ یہ راز افشا ہونے پر شانِ ہند میں مفصل طور پر اس چور شاعر کا حدود اربعہ ناپا گیا تھا کیا غضب ہے کہ گزشتہ چور شاعر کو دوردرشن اپنے ان محفلِ مزاح میں بلاتا ہے۔ حالانکہ مزاح اس چور شاعر کے خاندان سے کوسوں دور بھاگتا ہے۔ اگر دوردرشن والوں نے اپنے آپ اس چور شاعر کو مدعو کیا تو ہمیں دوردرشن کے ذمہ دار حضرات کی اس غیر ذمہ داری۔ عدم واقفیت بدذوقی اور عوام سے کھلواڑ کرنے پہ پُرزور اعتراض ہے۔ اور اگر اس چور شاعر کو کسی سفارش پر ٹی وی پر اپنی شناخت کرانے کا موقع دیا گیا ہے تو سفارش کرنے والے نے یقیناً دوردرشن کو بدنام کرنے اور دوردرشن کے ذمہ داران کو دھوکا دیا ہے۔ بہرکیف دوردرشن والوں کو اپنی اس فروگذاشت پر دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ہاں اس محفل میں ہلال رامپوری اور شہباز امروہوی نے واقعی حق ادا کیا۔

جناب فخرالدین چکی والا (کویت)

نے اطلاع دی ہے کہ شانِ ہند میں اعلان کردہ طرحی مصرعے پر انہیں سینکڑوں غزلیں موصول ہوئی ہیں لہٰذا ہندوستان میں تین غیر جانبدار حضرات کا ایک بورڈ قائم کیا جا رہا ہے جو ان غزلوں پر پوری ذمہ داری کے ساتھ غور و خوض کر کے انعامات کی سفارش کرے گا اور اس بورڈ کے فیصلے کے مطابق مستحق حضرات کو انعام کی رقم بھجوا دی جائے گی۔ نیز یہ فیصلہ شانِ ہند میں بھی شائع کرا دیا جائے گا۔

جناب چکی والا کا ایک اہم اعلان

جناب آرزو سہارنپوری کی مشہور زمانہ تصنیف "بہارستانِ اولیا" اور محترمہ نیلوفر ناہید کی تصنیف "گلہائے عقیدت" ملک بھر کی ایسی مشہور خانقاہوں کے متولی حضرات کو ہدیۃً بھجوائی جائیں گی جن پر زائرین خاصی تعداد میں آتے ہوں تاکہ یہ زائرین ان کتابوں کے مطالعہ سے مستفید ہو سکیں۔ لہٰذا ایسی خانقاہوں کے متولی حضرات اپنا پتہ اور درگاہ عالیہ کا نام مطبوعہ لیٹر فارم پر بھجوائیں تاکہ یہ دونوں کتابیں انہیں بغیر کسی معاوضہ کے دفتر شانِ ہند دہلی سے بھجوا دی جائیں گی۔

غزل

ملک نسیم

آواز دے رہا ہے زمانہ بہار کا
دامن نہ چھوڑ دینا کہیں انتظار کا

ہے میرا عزم راہ میں اب ہمسفر مرا
اب مجھ کو ڈر نہیں گرد و غبار کا

خوشیوں کا اب ادھر سے ذرا بھی گزر نہیں
اب رنج و غم حصار کئے ہیں جوار کا

ہر سنگ اپنا نام لکھانے لگا ہمیں
ہم ذکر کر رہے تھے کسی غمگسار کا

گر جاسکتے ہیں بانٹنا اوروں کے رنج و غم
دل لائیے کہیں سے کسی بیقرار کا

جب آج دیکھا اپنے گریباں میں جھانک کر
چہرہ اتر گیا ہے اک آئینہ دار کا

ہلکی سی اک ہوا سے جڑیں تک اکھڑ گئیں
اب کیا کریں بھروسہ کسی پائیدار کا

دکھا بھی دیا۔ شہر کے بڑے بڑے شیخ بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ ڈپٹی انسپکٹر صاحب نے دت صاحب اور صابر دت صاحب کی موجودگی میں کچھ حضرات سے اشتہار کی بات بھی کی اور یقین دلایا کہ ایک دو دن میں اشتہارات مل جائیں گے۔ مگر ڈپٹی انسپکٹر کا دت صاحب کے ساتھ یہ وعدہ محض وعدہ ہی رہا اور دو ہزار روپے کے بعد ایک پیسہ بھی صابر دت کو وصول نہ ہوا۔

اندور کے اس مشاعرے کے بارے میں یہ طے ہوا تھا کہ اخراجات نکال کر جو بچ رہے گا وہ فن و شخصیت کے قتیل شفائی نمبر کی مدد کے لئے صابر دت صاحب کو دے دیا جائے گا۔ اس مشاعرے کے سلسلے میں تقریباً [illegible] ہزار روپیہ فراہم ہوا۔ اگر صابر دت صاحب چاہتے اور ہوش مندی سے کام لیتے تو کم و بیش نصف روپیہ انہیں مل سکتا تھا مگر وہ اپنے ساتھ بمبئی کے ایسے شعرا کا طائفہ لے گئے جو پانی کی جگہ شراب پیتا تھا اور پھر منتظمین مشاعرہ نے شعرائے کرام کے قیام کے لئے جو بہترین انتظام کر رکھا تھا اسے بھی صابر دت نے شراب کے نشہ میں درہم برہم کرکے شعرا کو ایک ایسے تھرڈ سٹار ہوٹل میں لے گئے جہاں ایک کمرے کا کرایہ پونے چار سو روپیہ تھا۔ صابر دت کے اللوں تللوں کے باعث صرف تین ہزار روپیہ باقی بچا تو انہیں فن و شخصیت کے قتیل شفائی نمبر کے لئے دے دیا گیا۔ مشاعرہ اس قدر سپاٹ گیا کہ اندور کی تاریخ میں ایسا خراب مشاعرہ آج تک نہیں ہوا۔ بمبئی کے ایک شاعر جنہیں بلٹز کے ادارے کا رکن ہونے کا غرور ہے، مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے سامعین کو گالیاں دینے لگے۔ وہ تو خیر ہوئی عزیز اندوری صاحب اور دوسرے مقامی حضرات نے سامعین کو قابو میں رکھا ورنہ کچھ سامعین تو اس شاعر کی پتلون اتار کر انہیں بلٹز کے آفس میں بھیجنے کو تیار تھے اور تو اور قتیل صاحب بھی ناکام رہے اور مشاعرہ ہزار فی صدی فیل رہا۔

"شمع" کے مدیر جناب الیاس دہلوی کے ہاں اشفاق صاحب (محترمہ ماجدہ تبسم کے شوہر نامدار) اور دو اصحاب اور تشریف فرما تھے۔ جن میں ایک صاحب خاص طور کے تھے۔ ملازم چائے لایا تو یہ صاحب فرمانے لگے۔ چائے پر ایک بات یاد آگئی ہے آپ حضرات بھی سنیں گے تو داد دیں گے۔ الیاس صاحب تو اپنے کام میں محو رہے۔ اشفاق صاحب اور میں ان صاحب کی طرف متوجہ ہوئے تو فرمانے لگے کہ کہیں رشتہ طے ہونے کی بات چیت ہو رہی تھی۔ لڑکی اور لڑکا بھی موجود تھے۔ چائے کی پیالی میں شکر ملاتے وقت لڑکا بار بار چمچہ کو پیالی سے ٹکرا رہا تھا۔ جب لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی اور کہا کہ میں اس لڑکے سے شادی نہیں کروں گی۔ کیونکہ اسے اتنی عقل ہی نہیں کہ پیالی میں شکر کس طرح ملائی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ سوسائٹی میں میرے ساتھ نہ چل سکے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ روایت آپ سب کی طرح میں نے بھی اور اشفاق صاحب نے بھی سن رکھی تھی۔ لہٰذا ہم دونوں نے ان صاحب کے اس چٹپٹے انکشاف پر کسی قسم کا ردِ عمل ظاہر نہ کیا اور یہ صاحب کھسیانے ہو کر اپنی چائے کی پیالی میں چمچہ سے شکر ملانے لگے تو چمچے کے بار بار پیالی سے ٹکرانے کی آواز سارے کیبن میں سنائی دے رہی تھی۔ کیبن سے جب باہر آئے تو اشفاق صاحب فرمانے لگے۔ سرور صاحب غالباً یہی صاحب وہ روایتی لڑکے رہے ہوں گے جن سے اس لڑکی نے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

مشاعرہ نمائش مظفر نگر

رحمی الاحسانی

نمائش مظفر نگر کی تقریبات کا آج ۵ مئی ۸۲ء کو آخری دن ہے۔ حسبِ دستور نمائش کے پنڈال میں آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔ جناب نسیم جاوید جو کہ کراچی سے آئے ہوئے ہیں کے ہمراہ اسلامیہ انٹر کالج سے مشاعرہ گاہ کا رُخ کیا ہے اور شعراء بھی طعام سے فراغت پا کر جا رہے ہیں پنڈال میں جا کر دیکھا تو سامعین سے پُر ہے تالیاں بجا کر مشاعرہ شروع کرانے کا مظاہرہ کر رہے ہیں چوں کہ مجوزہ صدر جناب خورشید عالم خاں وزیر اسٹیٹ برائے سیاحت و شہری ہوابازی تشریف نہیں لائے ہیں اس لئے اس مشاعرہ کے کنوینر محمد منظر صاحب صدارت کے لئے جناب سعید مرتضیٰ صاحب کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں۔ سعید مرتضیٰ صاحب کا تالیوں سے خیر مقدم کیا گیا ہے رزمی صاحب تائید فرما رہے ہیں اور آپ مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے ہیں۔ منظر صاحب اعلان کر رہے ہیں کہ آج کا مشاعرہ حضرت جوش و فراق و احسان دانش کی یاد میں منعقد ہو رہا ہے اور سعید مرتضیٰ صاحب ان کی تصاویر کی گل پوشی کریں گے۔ یہ تصاویر اسٹیج پر ہی جانبِ غرب ایک کونے میں رکھی ہوئی ہیں۔ سعید مرتضیٰ صاحب نے گل پوشی کی تو اس پر پھر تالیاں گونج اٹھی ہیں۔ تصاویر کے اوپر جو بینر آویزاں ہے اس پر اردو میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ شاید اس کمی کو اور حضرات نے بھی محسوس کیا ہو۔ ادھر نظامت کے لئے منظر صاحب یاد فرما رہے ہیں ملک زادہ منظور احمد منظور کو۔ اس پر بھی تالیاں شباب پر ہیں اور ملک زادہ منظور صاحب نہایت سنجیدگی اور پُر وقار انداز سے فرما رہے ہیں۔

جنابِ صدر خواتین و سامعین حضرات مجھے اس بات کا شدید احساس ہے کہ تاخیر ہو چکی ہے کیوں کہ بیچ میں تالیاں بھی بجیں۔ میں آپ کا زیادہ وقت لے کر اپنی عزت خطرہ میں نہیں ڈالوں گا۔ ہند و پاک میں ان ہستیوں یعنی جوش و فراق و احسان دانش پر مقالے لکھے جا رہے ہیں اور کئی حضرات ریسرچ کر رہے ہیں اب میں ذرا سی دیر میں ان کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ پھر خراجِ عقیدت پیش کر کے عبدالحق سحر مظفر نگری کو دعوتِ غزل دے رہے ہیں دیکھا تو ایک نوعمر بچہ نگر وا یوں ترنم کا مظاہرہ کرنے چلا ہے ؎

ہم تو سمجھے تھے کہ گھر میں کچھ اُجالا ہو گیا
غور سے دیکھا تو اک سائے سے رشتہ ہو گیا

آؤ اس دُنیا کو اب اپنا سمجھنا چھوڑ دیں
کل کہیں کہنا نہ پڑ جائے کہ دھوکا ہو گیا

یہ اچانک کس لئے ہاتھوں میں پتھر آ گئے
وہ تو اک پاگل تھا بیچارہ تمہیں کیا ہو گیا

سحر صاحب مشاعرہ کا اچھا آغاز کر کے محفل کو گرما کر جا رہے ہیں پھر ایک مقامی مترنم شاعر نجم مظفر نگری آ کر غزل سرا ہیں ؎

جب سے بدلے وقت کے تیور ایسے ہوئے بیگانے لوگ
برسوں تک جو ساتھ رہے تھے وہ نہ ہمیں پہچانے لوگ

شیش محل کے رہنے والو یہ پتھراؤ ٹھیک نہیں
ہم تو چلو دیوانہ ٹھہرا سب تو نہیں دیوانے لوگ

داد کا شور خوشگوار کم ہوا تو اسی دل کشی سے محفل کو گرما رہے ہیں ؎

میرا ہرگز ہاتھ نہیں ہے اس گھر کی رُسوائی میں
ناحق کو حق کہنے والے میری ایک نہ مانے لوگ

اپنوں کی ہشیاری دیکھو غیروں کی کیا بات کریں

پہلے چھوڑی چنگاری پھر آئے آگ بجھانے لوگ

داد نے ہنگامہ کا رُوپ دھار لیا ہے اور نجم صاحب خوب خوب داد لوٹتے آ رہے ہیں اس عالم میں اختر گوالیاری غزل الاپ رہے ہیں ؎

دل نے اک چیز بڑی بیش بہا مانگی ہے
حسنِ مغرور کی فطرت سے وفا مانگی ہے

داد مطلع ہی سے شباب پہ ہے اور آپ ترنم کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

مصلحت ہے کہ توجہ ہے کہ یہ سازش ہے
ایک دشمن نے مرے حق میں دعا مانگی ہے

اہلِ ذوق کی محفل ہے اب داد کا عالم نہ پوچھئے کئی بار دہرا کر ہلک رہے ہیں ؎

گردشِ وقت کی تلخی سے پریشاں ہو کر
کتنا کم ظرف ہے وہ جس نے قضا مانگی ہے

زندگی ایک سزا ہی سہی لیکن اختر
ہم نے ہر دور میں جینے کی دعا مانگی ہے

اختر صاحب محفل کو چونکا کر داد وصول کئے اپنی جگہ آ رہے ہیں اور انجم عرفانی تالیوں کی جھنکار میں آ کر گرج رہے ہیں ؎

نالہ کوئی اب اپنا رسا ہی نہیں ہوتا
فریاد کا حق ہے کہ ادا ہی نہیں ہوتا

ہم کب سے یہاں کھینچ رہے عدل کی زنجیر
دروازۂ انصاف ہے کہ وا ہی نہیں ہوتا

یہ کیسی عدالت ہے یہاں کیسے ہیں منصف
قاتل کو جہاں خوفِ سزا ہی نہیں ہوتا

وہ ظلم یہ اس طرح کمربستہ ہیں جیسے
مظلوم کا دنیا میں خدا ہی نہیں ہوتا

انجم صاحب نے جس گھن گرج سے محفل گرمائی ہے اسی طرح ہر شعر پر آہ اور واہ نے پنڈال کو اڑانے کی کوشش کی ہے پھر اپنی مشہور نظم لہو سنا کر داد کی جھولیاں بھرے تالیوں کے بے ہنگم شور میں جا رہے ہیں اور سلیم کھتولوی پرانی غزل الاپ رہے ہیں ؎

وہ اور نیا اک ستم ایجاد کرے ہے
پر نوچ کے صیاد جو آزاد کرے ہے

آنکھوں میں بٹھا کے کبھی نظروں سے گرا کے
وہ روز نیا اک ستم ایجاد کرے ہے

عاشق جو ہوا کرتا ہے مر جاتا ہے گھٹ کر
نالہ ہی کرے ہے نہ وہ فریاد کرے ہے

سلیم صاحب بھی داد پا کر چلتے بنے اور مظفر رزمی کیرانوی نے آ کر غزل چھیڑی ہے ؎

ہر ایک تشنہ دہن کو سراب ملتا ہے
قدم قدم پہ نیا انقلاب ملتا ہے

ہمیں کہاں یہ سلیقہ کہ تم سے بات کریں
کسی سے کب کوئی خانہ خراب ملتا ہے

ملے ہے یوں تو ہر اک در سے کچھ نہ کچھ سب کو
تمہارے در سے مگر بے حساب ملتا ہے

اب داد دینے والے بے حال ہو چلے ہیں اور رزمی صاحب اسی دلربائی سے الاپ رہے ہیں ؎

نہ جانے کتنے حجابات اور باقی ہیں
وہ خواب میں بھی ہمیں محوِ خواب ملتا ہے

پھر داد نقطۂ عروج سے مولے ہے اور آپ کامران پلٹ رہے ہیں ادھر رنگِ محفل اور ذائقہ بدلنے کے لئے کرگس سہسوانی آ کر رواں دواں سنا رہے ہیں سنئے ؎

سارے ملک میں افراتفری ہت تیری ایسی کی تیسی
شہروں شہروں غنڈہ گردی ہت تیری ایسی کی تیسی
باپو جی کی بات نہ رکھی ہت تیری ایسی کی تیسی
انساں کھیلیں خون کی ہولی ہت تیری ایسی کی تیسی
بی بی سی بھی بول رہا ہے امریکہ بھی کہہ تو رہا ہے
خوب ہے یہ کلجا ڈھو کر بھی ہت تیری ایسی کی تیسی

کرگس صاحب محفل کو زعفران زار بنا کر جا رہے ہیں اور اب انجم جبل پوری فرما رہے ہیں ؎

روشنی کی سازشوں میں ظلمتیں بھی ہیں شریک
دل میں بچ کر آ گئے تو رات میں لٹ جاؤ گے

داد وصول کرتے ہوئے عنایت کر رہے ہیں ؎

زلفوں کے بادلوں کے تلے چل رہے ہیں ہم
برسات ہو رہی ہے مگر جل رہے ہیں ہم
تم نے تو ہم کو خواب سمجھ کے بھلا دیا
اے طالبانِ عشق ٹھہر چل رہے ہیں ہم

انجم صاحب بھی داد سمیٹے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور شانتی صبا آکر یوں نغمگی بکھیرنے چلی ہیں ؎

غنچہ و گل جو بہاروں میں سنور جاتے ہیں
تیری تصویر کے کچھ رنگ بکھر جاتے ہیں
دل تو اپنی تجلّی سے مجلّا کر دے
تیری نظروں سے تو آئینے سنور جاتے ہیں
ڈوبنے والے کسی موڑ پہ آئیں گے ضرور
موج کے پاؤں کناروں پہ ٹھہر جاتے ہیں

صبا صاحبہ نے خوب سماں باندھا ہے پھر فریاکشوں کا احترام کرتے ہوئے الاپ رہی ہیں ؎

خبر نہیں ہمیں جانے کدھر سے گزرے ہیں
قدم قدم پہ رہ خیر و شر سے گزرے ہیں
ہزار بار وہ ترکِ تعلقات کے بعد
نظر بچا کے مری رہگزر سے گزرے ہیں

سامنے والے من چلے اور نوجوان اچھل کود کر رہے ہیں اور آپ اسی دلکشی سے لہک رہی ہیں ؎

بنا لئے ہیں زمانے نے کتنے افسانے
جو چار اشک مری چشم تر سے گزرے ہیں
فلک کے چاند ستارو انہیں تلاش کرو
بڑے حسین مسافر ادھر سے گزرے ہیں

صبا صاحبہ ایک اور ایک اور کے شور میں سُنی ان سُنی کر کے پلٹ آئی ہیں شور و غل ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے اس عالمِ کیف و سرور اور نغمگی کی فضا میں منظور صاحب فرما رہے ہیں اب جو بھی شاعر آئے گا وہ قربانی کا بکرا بنے گا میں خود تو قربانی کا بکرا بننے سے رہا اس لئے کہ قربانی بھی بے عیب جانور کی ہوتی ہے اور کیوں نہ اس قربانی کا بکرا کریمی الاحسانی کو بنا دوں۔ یہ اعلان سُن کر میں دم بخود رہ گیا یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی معذرت چاہی مگر ع

کون سنتا تھا فغانِ درویش

والا منظر تھا۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش کے مصداق تعمیلِ حکم میں عرض کیا۔ سب سے پہلے استادِ محترم حضرت احسان دانش صاحب مرحوم کا ایک شعر تبرکاً سن لیجئے گا ؎

کس کس کی زباں روکنے جاؤں تری خاطر
کس کس کی تباہی میں ترا ہاتھ نہیں ہے

اور اب میرے تین چار شعر سُن کر ممنونِ کرم فرمایئے پیشگی شکریہ ؎

یہ رشکِ خلد جہنم میں ڈھل گیا کیسے
سوال یہ ہے کہ یہ شہر جل گیا کیسے
جو دن میں بچ گئے وہ لوگ شب کو سوچتے ہیں
ہمارے سر سے ہر اک خطرہ ٹل گیا کیسے
ابھی تھا رشکِ بہاراں ابھی ہے راکھ کا ڈھیر
چمن کا آج یہ نقشہ بدل گیا کیسے
وہ جس کو دعوئ انسانیت رہا یارو!
وہ خود نفاق کے سانچے میں ڈھل گیا کیسے

آیئے پھر اسی محفلِ غزل میں چلئے اب سنئے خوش گلو شاعر اطہر عنایتی رامپوری سے۔ غزل سرا ہیں ؎

غزل کے دلربا لہجہ میں یوں

لیجئے یار لوگ سننے کے موڈ میں نہیں ہیں دوسری غزل سنایئے یہ غزل سن چکے ہیں ہر چیخ رہے ہیں پھر اطہر صاحب دوسری غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

خط اُن کے اپنے ہاتھ کا آتا نہیں کوئی
کیا حادثہ ہوا ہے بتاتا نہیں کوئی
جب سے بتا دیا ہے نجومی نے میرا نام
اپنی ہتھیلیوں کو دکھاتا نہیں کوئی
دنیا جوان کیا ہوئی میرے پڑوس کی

آنچل میں جگنوؤں کو چھپاتا نہیں کوئی ..

لیجئے اطہر مائک چھوڑ رہے ہیں غالباً موڈ خراب ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی سامعین بدذوقی اور کورنظری کا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر دو چار باذوق کسی شاعر کی غزل کسی اور مشاعرہ میں سن آئے ہیں تو وہ کیوں اس مشاعرہ میں اس غزل کو سننا گوارا نہیں کرتے یہاں والوں کے لئے تو یہ غزل ابھی نئی ہے انہیں کیوں محروم رکھا جاتا ہے آیئے اب نظیر نگری کے مرد قلندر عالم فتحپوری سے بھی یہ پرانے اشعار سن لیجئے گا ؎

بے وفائی بھی وفاؤں کی سزا ٹھہرے ہے
ہر خطا اُن کی ہماری ہی خطا ٹھہرے ہے
دل جلاؤ کہ اندھیروں سے گزرنا ہے تمہیں
کہیں طوفانوں میں مٹی کا دیا ٹھہرے ہے
ایک ہم ہیں کہ رقیبوں سے بھی کرتے ہیں نباہ
ورنہ کانٹوں پہ کہیں آبلہ پا ٹھہرے ہے

عالم صاحب آج گلو خلاصی کر کے مائک سے کھسک رہے ہیں اور ملک زادہ منظور احمد منظور عطا کر رہے ہیں ؎

چہرے پہ سارے شہر کے گرد ملال ہے
جو دل کا حال ہے وہی دلی کا حال ہے
الجھن ... کرب ۔ انتشار
وہ جبر ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے

داد اس شعر کا حق ہے لہذا خوب خوب داد دی جا رہی ہے اور آپ یہ مژدۂ جانفزا سن رہے ہیں کہ ملکہ نسیم سے ان کا غزل سنئے۔ نسیم صاحبہ متانت سے سنا رہی ہیں ؎

کتاب زندگی کا ہر ورق اس طرح بکھرا ہے
خزاں میں جس طرح شاخوں سے پتے ٹوٹ جاتے ہیں
محبت کے احساں سے گزر جانا نہیں آساں
... پر چلنے سے چھالے پھوٹ جاتے ہیں
... طرح بکھری ہوئی رشتوں کی زنجیریں
کسی بچے سے جس طرح کھلونے ٹوٹ جاتے ہیں
غم دوراں نے میرا ماضی ایسے چھینا ہے
کہ جیسے بھیڑ میں ماؤں سے بچے چھوٹ جاتے ہیں

نسیم صاحبہ خوب خوب داد پا کر اپنی جگہ آ رہی ہیں مگر جلوہ اور ترنم کے شیدائیوں کو ضرور مایوسی ہوئی ہو گی کیونکہ نسیم صاحبہ تحت ہی سے غزل سنائی ہے۔ لیجئے اب انجم بہار لوری ماشاء اللہ باریش مبارک تشریف لے آئے ہیں اور غزل سرا ہیں ؎

غم ہی غم نہیں ہوتے کچھ خوشی بھی ہوتی ہے
ظلمتوں کے سینے میں روشنی بھی ہوتی ہے
عمر بھر ترستی ہے ہلکے سے تبسم کو
ان بھری بہاروں میں وہ کلی بھی ہوتی ہے
زیست درد پیہم ہے اور درد پیہم میں
تلخیاں بھی ہوتی ہیں چاشنی بھی ہوتی ہے

میں نے انجم صاحب سے عرض کیا اب جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے کا دھندا بھی شروع کر دیجئے وہ بمبئی وہاں آپ ایسے بہروپیوں کی بڑی ضرورت اور مانگ ہے اس پر وہ ہنس دیئے اور کہنے لگے بلاں ایسا ہی۔ دیکھا تو ہلال سیوہاروی سنی ان سنی کرتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

غریبی کو مٹا دینے کی باتیں صرف باتیں ہیں
جو خود دولت کے بھوکے ہوں غریبی کیا مٹائیں گے
غریبوں کا لہو تو آپ کی کاروں کا ڈیزل ہے
غریبی مٹ گئی تو آپ کیا رکشے چلائیں گے

اس بھرپور طنزیہ پنڈال میں بھونچال سا آیا ہے کئی دہرا کر کتوں کی کانفرنس سنا کر محفل کو باؤ ہوا قہقہوں پر اتار کر تالیوں کے شور میں پلٹ رہے ہیں۔ اب کوئی آصف صہبا بریلوی آ کر ایک عجیب ترنم غزل چھیڑ رہے ہیں ؎

درد دل کو مرے قرار نہیں
غالباً عشق پائیدار نہیں
چاک دامن ہے ہر گل و غنچہ
گلستاں میں ابھی بہار نہیں

اب یار لوگ تالیوں سے داد دے رہے ہیں آپ

ہر شعر کے بعد بار بار ؎

درد دل کو مرے قرار نہیں

پڑھ رہے ہیں اس پر مولانا ہنسی مذاق کا نشانہ بن گئے آپ تالیوں کی تاب نہ لا کر چلتے بنے اور ساتھ ہی ایم۔ آر۔ قاسمی جو خود کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا اسٹوڈنٹ بتلاتے ہیں ایک نظم سنا کر چلتا بنا لئے گئے۔ لیجئے وسیم بریلوی تالیوں کی جھنکار میں آگئے ہیں سلام علیکم —— ایک آواز —— وعلیکم السلام —— وسیم صاحب —— ایک قہقہہ —— اور آپ غزل سرا ہیں ؎

اک کہانی سی دل پر لکھی رہ گئی
وہ نظر جو مجھے دیکھتی رہ گئی

رنگ سارے ہی کوئی چرا لے گیا
میری تصویر ادھوری پڑی رہ گئی

ایک کیمرہ مین حرکت میں آیا تو یار لوگ بیچ اٹھے ہٹ جائیے اور پھر یک زبان ہو کر بولے ؎

میری تصویر ادھوری پڑی رہ گئی

اللہ تیرا شکر ہے —— وسیم صاحب مسکرا کر بولے اور کیمرہ مین وسیم صاحب کی تصویر لے اڑا۔ قدرے سکوت کے بعد پھر بیچ و بیچ سے محفل کو چونکا رہے ہیں ؎

لوگ بازار میں آ کے بک بھی گئے
میری قیمت لگی کی لگی رہ گئی

دیکھئے پھر پنڈال میں بھونچال سا آیا ہے میں سوچ رہا ہوں اب اس شعر کے بعد اس معیار کا اور بھی شعر سنائے گا کہ نہیں —— ؟ ارشاد ہوتا ہے ؎

وہ تو کمرہ سے اٹھ کر چلا بھی گیا
بات کرتی ہوئی خامشی رہ گئی

بس وہی اب ہوا کی نگاہوں میں ہیں
جن چراغوں میں کچھ روشنی رہ گئی

وسیم صاحب آج فرمائشوں کو نظر انداز کر کے تالیوں کے شور میں آ رہے ہیں اور ادھر کیف بھوپالی ضد کر رہے ہیں کہ میں شمیم جے پوری سے پہلے نہیں پڑھوں گا میں بڑا شاعر ہوں وغیرہ۔ اس پہ یار لوگ بھی اسٹیج پر کھڑے ہو گئے ہیں اور احتجاج کر رہے ہیں کہ کیف صاحب ہی پڑھیں گے ادھر پُر لطف بات یہ ہوئی کہ شمیم صاحب نے مائک پر آکر اعلان کیا کہ میں بھی کیف صاحب کے بعد پڑھوں گا۔ اس مرحلہ پر ڈاکٹر منظور صاحب نے سوجھ بوجھ اور دانش مندی سے کام لے کر اعلان کیا کہ یہ معاملہ صدر صاحب پر چھوڑا جاتا ہے وہ جسے چاہیں پڑھوائیں گے پہلے آپ شاہی صبا صاحبہ سے ایک غزل سنئے اس پژمردگی میں صبا صاحبہ ایک حسین غزل چھیڑ کر ماحول کو خوشگوار بنانے چلی ہیں ؎

اب ان کی جفاؤں پر احساس وفا کا ہے
دو شکلیں نظر آئیں یہ آئینہ ایسا ہے

چہرے کے نقابوں نے چہرے ہی بدل ڈالے
جلوہ بھی تماشا ہے پردہ بھی تماشا ہے

اب داد دینے والے کھڑے ہو کر داد دے رہے ہیں پنڈال انگڑائیاں سی لے رہا ہے اور آپ لہک رہی ہیں ؎

وعدوں کی لکیروں کو پڑھ کے نہیں سمجھے ہم
اک ڈوبنے والا ہی طوفاں کو سمجھتا ہے

صبا صاحبہ رنگ محفل بدل کر کامراں پلٹ رہی ہیں ادھر جناب سید مرتضیٰ صاحب صدر مشاعرہ نے فیصلہ صادر فرمایا کہ کیف بھوپالی صاحب غزل سنائیں۔ اس پر تالیاں شباب پر ہیں اس اعلان پر کیف صاحب بے چون و چرا مائک پر آکر اپنی دھن میں الاپ رہے ہیں ؎

دھڑکنوں کی نگری میں دولوں کی بستی میں
ہم نے گھر بنایا ہے زلزلوں کی بستی میں

ٹھنڈے ٹھنڈے گیتوں سے دل کے زخم بھرتا ہوں
برف لے کے آیا ہوں دل جلوں کی بستی میں

گالیوں کی بارش ہے پتھروں کی آندھی ہے
ایک میں برا نکلا سب بھلوں کی بستی میں

داد کا عالم نہ پوچھئے ایک تو کیف صاحب عالم سرور میں دوسرے اللہ کی نیت کاری اور طرز ادائیگی نے سونے پہ سہاگہ کا

کام کیا ہے۔ ایک ہلڑ بازی ہے اب اونگھتے اور سوتے ہوئے بھی آنکھیں مَل کر دیکھ رہے ہیں یہ کیا ہو رہا ہے اور آپ لہرا رہے ہیں ؎

دل سے کھیلنے والے باز آ لڑکپن سے
آئینہ کی ہستی کیا ٹوٹ جائے گا چھن سے
شب کو چاندنی بن کر جھانکتا ہے اک چہرہ
نیم اور املی کی پتیوں کی چلمن سے
عطر جیسی خوشبو ہے برف جیسی ٹھنڈک ہے
یہ ہوائیں آتی ہیں جانے کس کے آنگن سے

کیف صاحب نے رنگِ محفل بدل ڈالا اور زناٹے کے ساتھ مائک سے جدا ہو رہے ہیں ادھر شمیم جے پوری تالیوں کی جھنکار میں آ گئے ہیں۔ پہلے بھی یہ غزل پیش کر چکا ہوں آج پھر سنیے گا ؎

جو تو نے کی ہے توجہ تو انتہا کر دے
مجھی کو سارے زمانے کا غم عطا کر دے
مجھے فراق کے اس غم سے آشنا کر دے
نفس نفس کو جو پاکیزگی عطا کر دے
میں باز آیا امیدِ وصال سے یارب
وہ بیوفا ہے اسے اور بے وفا کر دے
یہ چاہتا ہوں کہ احسان نہ لوں مسیحا کا
دیا ہے درد تو اب اس کو لا دوا کر دے
تری خوشی کی بہار رہے تو کم نہ ہوں لیکن
خدا تجھے مرے غم سے بھی آشنا کر دے

شمیم صاحب اور داد لازم و ملزوم۔ لہٰذا شمیم صاحب محفل کو معطر کر کے شاداں آ رہے ہیں اور اب ایک لطیفہ سنیئے جب کیف صاحب غزل سُنا رہے تھے تو ایک شاعر شمیم صاحب کی خوب خوب تعریف کرتے رہے آپ ایسے ہیں ویسے ہیں ڈبل پیسے ہیں آپ کا ایک مقام اور ایک درجہ ہے اور جب شمیم صاحب سُنانے کے لئے آئے تو کیف پنڈال چھوڑ کر چلتے بنے اس وقت پھر یہی شاعر اپنے ساتھ والے دوست سے کہہ رہے تھے یہ دونوں کچھ بھی نہیں ہیں ان میں کوئی بڑا وڑا نہیں ہے دونوں یوں ہی ہیں اس پر کئی دوست مُسکرا رہے تھے۔ شمیم صاحب کے ساتھ ہی پہلا دور پونے تین بجے ختم ہو کر دوسرا دور تقریباً پونے چار تک نہایت کامیابی کے ساتھ چلا خوب سُنا گیا اور مجموعی طور پر کئی سال کے بعد آج کا مشاعرہ نہایت کامیاب اور لاجواب رہا امسال یہ بھی اچھی بات ہوئی کہ مشاعرہ کو سبھی نے سُنا اور کامیاب کرایا ٹھیک بارہ بجے جناب سٹی مجسٹریٹ صاحب مظفر نگر بھی تشریف لے آئے تھے

اس مشاعرہ کو کامیاب کرانے میں محمد منظر صاحب اور سید مرتضیٰ صاحب سابق ایم۔ پی نے خصوصی دلچسپی لی اگر مدعو شعرائے کرام جنہوں نے وعدہ بھی کیا تھا آج کے مشاعرہ میں شرکت کرتے تو اور چار چاند لگ جاتے حالاں کہ ان کے مطالبات اور منہ مانگے دام بھی منظور کر لئے گئے تھے لیکن وہ وقت پر نہ آسکے یہ طریقہ انتہائی غلط اور مذموم ہے۔ کنوینر صاحب کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے کیا اس طرح کنوینر صاحب کی پوزیشن خراب نہیں ہوتی ہے — ؟ اس وعدہ خلافی پر کیا عدالت کے دروازہ پر دستک دی جا سکتی ہے — ؟ اگر ایسا قانون ہے تو منظر صاحب اس بار ضرور یہ نیک قدم اٹھائیں ـــ خدا حافظ

میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

(صفحہ ۲۲ کا بقیہ)

کر دیں گے بس سارا قصہ پاک ہو جائے گا مگر یاد رکھو جب تم ایم ایل اے صاحب سے ملو تو کم سے کم پانسو روپے ان کی مٹھی میں ضرور دبا آنا۔ بھتیا بنا غرض کے کون کسی کے کام آتا ہے اور پرائی آگ میں کودتا ہے۔ سعید احمد احمقوں کی طرح تجربہ کار اور جہاندیدہ گھاگ سکھا کا منہ تکنے لگا۔ ●●

(صفحہ ۲۴ کا بقیہ) جب وہ اسٹیج پر پہونچا تو ماڈل اپنے دستِ نازک سے مصور کو انعام دے رہی تھی اور ہال پُر زور تالیوں سے گونج رہا تھا

ایطا

(ابوالبلاغت)
حضرت رتن پنڈوروی

اصنافِ نظم میں ایطا کی بحث بھی ٹیڑھی کھیر ہے۔ تذکیر و تانیث کی طرح اس کے متعلق شعراء میں اکثر مباحثے اور اُلجھنیں رہتی ہیں اس لئے ضروری ہے کہ یہاں اس پر مکمل و مفصل بحث کی جائے اور ایک خاص لائحہ عمل تیار کیا جائے۔

ایطا بالکسر پائمال کردن و مکرر کردن قافیہ۔ گویا قافیہ میں کلمۂ آخر متحد المعنی کی تکرار کو ایطا کہتے ہیں اور یہ ہمیشہ مطلع میں ہوتا ہے جب دونوں مصرعوں کے کلمۂ آخر کے ایک ہی معنی ہوں تو یہ عجیب واقع ہوتا ہے مثلاً تاجور کا قافیہ ہنرور رکھیں تو یہ "ور" دونوں جگہ ایک ہی معنی رکھتا ہے اگر اس کو نکال ڈالیں تو تاج اور ہنر باقی رہ جاتے ہیں جو بامعنی لفظ ہیں اور ان میں روی مشترک نہیں۔ اسی طرح دردمند اور حاجت مند میں مند ہر جگہ ایک ہی معنی میں ہے اگر ایسے قافیے مطلع میں آجائیں تو یہ ایطا ہے۔ یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ رہنا اور بہنا میں آخر کا کلمہ "نا" مشترک ہے یہاں بھی ایطا ہونا چاہئے اس کا جواب یہ ہے کہ آخری کلمہ "نا" دُور کرنے کے بعد روی کا اصلی حرف "ہ" باقی رہ جاتا ہے جو دونوں طرف مشترک ہے اس لئے یہ ایطا نہیں۔

ایطا کی بڑی پہچان یہ ہے کہ مشترکہ علامت حرفِ روی کو نکالنے کے بعد اگر باقی لفظ بامعنی ہیں اور ہم قافیہ نہیں ہیں تو یہ ایطا ہے مثلاً دوستی اور دشمنی میں یائے مصدری مشترک ہے اسے الگ کر دینے کے بعد دوست اور دشمن دو بامعنی لفظ باقی رہتے ہیں جو ہم قافیہ نہیں لیکن یہ ایطا ہے اسی قبیل سے ہے یہ شعر؎

نگاہ حسن میں پہلی سی برہمی نہ رہی
جو دشمنی سے عیاں تھی وہ دوستی نہ رہی

برہمی اور دوستی میں یائے معروف ایک ہی نوع کی ہے اس کو علٰحدہ کرنے کے بعد برہم اور دوست باقی رہ جاتے ہیں جو ہم قافیہ نہیں ہیں اور دونوں بامعنی ہیں اس لئے یہ ایطا ہے۔ یہاں یہ نقطہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایسے الفاظ میں اگر یائے مصدری مشترک نہیں ہے یعنی ایک یے مصدری ہے اور ایک نسبتی یا فاعلی تو اسے ایطا نہیں کہنا چاہئے مثلاً شاعری اور دہلوی۔ زندگی اور آدمی۔ بےکسی اور مشتری وغیرہ۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اگر ایک لفظ ہندی کا ہو اور ایک فارسی کا تو ایطا نہیں ہوتا مثلاً "سرکشی ہوتی" کا قافیہ "ملی ہوتی" "دل کشی ہوتی" کا قافیہ "لگی ہوتی" "زندگی ہوتی" کا قافیہ "کرکری ہوتی"۔ اگر دونوں لفظ فارسی کے ہوں یا دونوں اردو کے ہوں تو ان میں ایطا کا امکان ہو سکتا ہے خواہ دونوں جگہ یائے مصدری ہو یا یائے نسبتی یا یائے فاعلی۔ یہی صورت "لگایا اور بجھایا"۔ "جما اور بنا" "جھکا اور ملا"۔ "بنا اور بہا" میں ہے یہی عیب "دانا بینا" اور "خنداں گریاں" میں ہے۔

اس عیب سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ مشترکہ علامت دُور کرنے کے بعد باقی حصوں کو پرکھنا چاہئے اگر دونوں بےمعنی رہ جائیں یا کوئی ایک بےمعنی ہو تو ایطا نہیں مثلاً لگا کے ساتھ بِلا، بتا، دکھا وغیرہ قافیے۔ یا دوستی کے ساتھ زندگی۔ بندگی کا قافیہ۔ ایک اور ضروری احتیاط یہ بھی ہے کہ جب مطلع کہا جائے تو ایک قافیہ ایسا تلاش اور توجہ سے رکھا جائے جس کا روی اصلی ہو جیسے سُنا، کہا وغیرہ قوافی ہیں۔ تھا تبا۔ لا، حا

آ قافیے ایسے ہیں جن کی ردی اصلی ہے۔ اسی طرح روشنی، بے خودی وغیرہ میں بندگی، زندگی، تیرگی۔ کلی، کھتی۔ یہی قافیے ایسے ہیں جن کی یائے آخر اصلی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اضافی ردی بنانے کے لئے جب ایک یا کئی حرف بڑھائے جائیں وہ اگر ایک ہی قسم کے ہوں تو ایطا ہے اور اگر مختلف قسم کے ہوں تو ایطا نہیں۔ مثلاً اسیران وحیبان میں دونوں جگہ الف نون جمع کا ہے اس لئے ایطا ہے یا لگا، بجھا میں دونوں جگہ الف امر کا ہے اس لئے ایطا ہے۔ اسکے برعکس اگر آدمی اور دوستی کو ہم قافیہ لائیں تو ایطا نہیں ہوگا کیوں کہ آدمی کی "ی" یائے نسبتی ہے اور دوستی کی "ی" یائے مصدری ہے۔

ایطا کی دو قسمیں ہیں۔ خفی[۱] - جلی[۲]

ایطائے خفی وہ ہے کہ جس میں کلمۂ آخر متحد المعنی کی تکرار بادی النظر میں نمایاں نہ ہو جیسے دانا۔ بینا اگر چہ الف اس میں زائد اور مکرر ہے لیکن بسبب کثرت استعمال کے جزوِ کلمہ معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح کا دش کا قافیہ سازش۔ آنکھیں کا قافیہ نظریں۔ آب کا قافیہ گلاب۔ بتانا کا قافیہ اٹھانا۔ بجھاؤ کا بٹھاؤ۔ دکھادو کا لگادو۔ بتاؤ کا بناؤ۔ خنداں کا گریاں۔ رنجور کا مزدور۔ دانش کا بینش۔ شاہا کا خداوندا۔

اہلِ قافیہ نے ایطائے خفی کی ایک صورت اور بھی بیان کی ہے کہ اگر قافیہ کا حرفِ آخر نکالنے کے بعد الفاظ سالم بامعنی اور خلافِ قافیہ باقی رہیں تو ایطائے جلی ہے جیسے چلنا اور کھانا میں اور اگر حرفِ آخر نکالنے کے بعد لفظ سالم باقی نہ رہے تو ایطائے خفی ہے جیسے چلانا اور دکھانا میں۔ الف تعدیہ حرفِ روی ہے اس کو نکالنے کے بعد چل اور دکھ۔ چوں کہ دکھ امر نہیں ہو سکتا لہٰذا دکھا پورا فعل ہے اور دکھ دکھا کا غیر سالم ٹکڑا ہے اس لئے اس الف کو جزوِ فعل سمجھا جائے گا اور اس کو ایطائے خفی کہیں گے کیوں کہ تکرار حرفِ روی کی ظاہر نہیں ہوتی۔

ایطائے جلی وہ ہے کہ اس میں تکرار کلمہ کی ظاہر ہو جیسے ستم گر اور کاریگر میں "گر" کا زائد اور مکرر ہونا خوب ظاہر ہے اسی طرح سخن ور کا قافیہ ہنر ور باغبان کا پاسبان۔ عقل مند کا دردمند۔ جفاکار کا زیاں کار۔ فسوں گر کا رفوگر۔ جہاں گیر کا دل گیر جیسے یہ شعر

کیا ہو گئے وہ داغ جہاں گیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دل گیر کے دل کے

مرزا غالب نے کہا ہے کہ ایطا اسے کہتے ہیں کہ دو کلمے ایک ہی صورت کے ہوں جیسے الف فاعل گویا۔ بینا۔ شنوا کا اور ایسا ہی الف ونون جمع مثلاً چراغاں جواناں کے اور ایسا ہی الف نون مانند گریاں اور خنداں کے پس اگر یہ مطلع میں آپڑے تو یہ ایطائے جلی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر ایک جگہ قافیہ میں الف اصلی ہو اور ایک جگہ الف وصلی ہو اور دونوں روی بنائیں تو ایطا نہیں ہے جیسے ؂

مائلِ دید کسی گل کا جو پایا مجھکو
شکلِ نرگس ہمہ تن چشم بنایا مجھکو

پایا اور بنایا میں پا امر ہے اس کا الف جدا نہیں ہو سکتا بنا متعدی ہے اس کا الف جدا ہو سکتا ہے اس الفِ تعدیہ کہیں گے۔ اس لئے دونوں کے معنی جدا جدا ہیں اس لئے قافیہ جائز ہے ؂

میں نے کہا ہاتھ مت لگا مجھ کو
اس نے اک داغِ دل دیا مجھ کو

اس شعر میں لگا امر ہے اور دیا ماضی متعدی ہے اس لئے تکرار معنی نہیں ہے۔ پس ایک جگہ حرف روی امر ہو اور دوسرے مصرعہ میں ماضی ہو تو ایطا نہ ہوں اگر دونوں جگہ یہی لفظ ماضی میں ہوتا تو ایطا جلی کہا جاتا مثلاً ؂

جب وہ ماہِ تمام ہاتھ لگا
تاب و طاقت نے تب جواب دیا

دونوں جگہ الف ماضی ہے اس لئے ایطائے جلی ہے۔
بعض اساتذہ کا خیال ہے کہ متحد الالفاظ مگر مختلف المعنی الفاظ ہم قافیہ ہو سکتے ہیں جیسے ؎

دل کی بستی عجیب بستی ہے
روز اُجڑتی ہے روز بستی ہے

مگر راقم الحروف کے نزدیک یہ خیال درست نہیں کیوں کہ روی کے پہلے دونوں طرف حرف مشترک کا آنا معیوب ہے اگرچہ اساتذہ کے یہاں ایسی مثالیں ملتی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ عیب کو عیب نہ سمجھا جائے۔
نوح ناروی حرفِ روی سے پہلے ہر دو جانب حروفِ مشترک کو عیب سمجھتے تھے۔ مثلاً ؎

نہیں یہ دُختر برہمن ہے
دین و ایمان کی بلکہ دشمن ہے

برہمن اور دُشمن میں حرفِ نون سے پہلے ہر دو جانب میم تھا اس لئے نوح صاحب نے یوں تصحیح فرمائی ؎

نہیں یہ دُختر برہمن ہے
دین و ایماں کی بلکہ رہزن ہے

اسی قبیل سے ہیں یہ شعر ؎

تیرے سینے میں کبھی بھڑکی بھی ہے عبرت کی آگ
تیری نبضوں میں کبھی مچلی بھی ہے غیرت کی آگ

خاک میں مل کے بھی میں اس کو جو دشمن سمجھا
گردشِ چرخ کو میں گردشِ دامن سمجھا

بعض حضرات اس کو قافیہ متواتر کہہ کر ٹال دیتے ہیں اور بعض متحد الالفاظ مگر مختلف المعنی کی آڑ لیتے ہیں لیکن یہ سب کچھ عیب ہی تو ہے اس سے بچنا چاہئے۔
بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ایطا نہیں صرف حروفِ مشترک پر صرف روی کا اشتباہ ہے چلو اشتباہ ہی سہی آخر عیب تو ہے
حضرت جوش ملسیانی مرحوم کے دیوان میں یہ شعر پڑھا تو حیرت ہوئی ؎

سب پوچھتے ہیں جیتے رہا نامہ بر کہاں
اپنی خبر نہیں مجھے اُن کی خبر کہاں

اس شعر میں دخیل مشترک ہے جو معیوب ہے۔ راقم الحروف نے قبلہ مرحوم کی خدمت میں خط لکھا کہ حیرت ہے آپ جیسا استاد بھی اس قسم کا قافیہ باندھے اس میں حرف روی کا پہلا حرف "ب" دونوں طرف مشترک ہے کیا آپ اسے عیب نہیں سمجھتے؟
جواب میں جوش صاحب نے فرمایا کہ "داغ اور میرا تو یہ مسلّم رہا تھا" داغ کا مطلع ہے ؎

جس جگہ جاتے ہو آتے ہو پشیماں ہو کر
تم کو جانا نہیں آتا ابھی مہماں ہو کر

لیکن اس کے باوجود میں یہ صورت حسنِ قافیہ کے خلاف ہی سمجھتا ہوں اور حسن انجمن کے قوافی مطلع میں نہیں لکھتا یہ مطلع معلوم نہیں کیوں اس طرح ہو گیا اب چونکہ مطبوعہ اور شاملِ دیوان ہے اس لئے ترمیم کی ضرورت بے سود ہے۔

"دودھا انسپکٹر"

ڈاکٹر اودے سن ارمان
بلادی

لکھنؤ سے کچھ ہی دور پچھم میں بالا متو نام کی ایک بستی کا سعید احمد لکھنؤ میں رکشا چلاتا تھا دن بھر رکشا چلانے کے بعد شام کو رائل ہوٹل کے سامنے چوڑی چکلی سڑک سے ملے ہوئے فٹ پاتھ پہ رکشا کھڑا کر کے اس کی سیٹ پہ ٹانگیں سکیڑ کر لیٹ جاتا دن بھر کا تھکا ہارا ہوتا لیٹتے ہی نیند آجاتی اکثر راہ گیر اس کو اس حالت میں بھی سکھ کی نیند سوتے دیکھ کر کہتے ہاں بھئی نیند تو سولی پر بھی آجاتی ہے اور کچھ لوگ ملک کی غریبی پر من ہی من افسوس کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے تھے یہ تاثرات وہاں سے گزرنے والے عوام کے تھے لیکن رائل ہوٹل میں آنے جانے والے ایم۔ ایل۔ اے صاحبان تو شاید سعید کی طرف دیکھتے بھی نہ تھے ان کی نظر میں یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں ان کو سیاست کے داؤ پیچ ہی سے فرصت نہیں ملتی. پارٹیوں میں جاتا۔ میٹنگ اٹینڈ کرنا وزیروں اور افسران سے مل کر کوٹا پرمٹ والوں کے مسئلے سلجھانا۔ ان کے پاس ایسی ایسی معمولی معمولی باتوں پر دھیان دینے کے لئے وقت ہی نہیں بچتا۔

سعید روز اپنے گاؤں نہیں جاتا تھا۔ کیونکہ روز روز گھر آنے جانے میں خرچ بھی ہوتا تھا اور آمدنی بھی ماری جاتی تھی کیونکہ گاؤں سے لکھنؤ آنے میں کافی وقت لگ جاتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے گھر سے چلتے وقت ابا ابا کر کے اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے تھے اور گھر پہ رہنے کی ضد کرتے تھے۔ سعید چاہتا تو یہی تھا کہ بچوں میں رہے ان کی بھولی بھالی باتیں سنے اور سکھ سے وقت بتائے مگر اس کی یہ قدرتی ممتا روزگار کی دشمن تھی بچے بیچارے کیا جانیں کہ ابا کا گھر رہنا گھنے کے لئے کتنا مضر ثابت ہوگا۔ سعید بچوں سے بڑی مشکل سے پیچھا چھڑا کر لکھنؤ چلا آتا روزی روٹی کے لئے وہ اپنے معصوم بچوں کا خلوص و پیار جس بے رحمی کے ساتھ ٹھکرا کے آتا تھا وہی جانتا تھا راستے بھر اس کا دل روتا رہتا تھا اور "چلو اندر جاؤ۔ ابھی کام پہ جا رہا ہوں" بچوں کے لئے کہے گئے الفاظ اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے سے مارتے رہتے تھے بچے پھٹکار کھا کر ایک طرف سہم کر کھڑے ہو جاتے تھے جیسے آپریشن تھیٹر میں جاتے ہوئے روگی کے تیماردار مایوسی سے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ سعید جب کسی جوڑے کو رکشا سے ان کے گھر پہنچاتا تھا تو اسے اپنی شادی کا سماں یاد آجاتا تھا جب وہ اپنی دلہن کے ساتھ کسی کے رکشے پہ بیٹھ کر اپنے گھر تک گیا تھا بھانت بھانت کی دل خوش کن یادیں اس کی بھولتی ہوئی سپنوں کے بیچ ابھر ابھر کر اس کی تکان اتار دیتی تھیں جب وہ اپنے رکشا میں بچوں کو بٹھا کر لے جاتا تھا اور وہ بچے بیٹھے بیٹھے رکشے میں شرارتیں کرتے تھے تو اسے اپنے بچے یاد آجاتے تھے اور ان کی معصوم باتیں یاد آجاتی تھیں اور وہ چلتے چلتے ہنس پڑتا تھا۔ کچھ سواریاں جب اس کو کم مزدوری دیتی تھیں اور جھگڑا کرتی تھیں تو اسے انگریز سواریاں یاد آجاتی تھیں جو مقررہ مزدوری دینے کے علاوہ بخشش دے کر جاتی تھیں جب وہ اوپر کے پیسے لینے سے انکار کر دیتا تھا تو وہ ٹپ ٹپ کہہ کر اس کا کندھا پیار سے تھپتھپا اس کی جیب میں زبردستی سرکا دیتے تھے وہ ٹپ کا مطلب بھی نہیں جانتا تھا کسی پڑھے لکھے سے اس نے ٹپ کا مطلب پوچھا تو خوشی سے پھولے نہ

اور کبھی انکار نہیں کرتا تھا۔ انگریز لوگ ایسا کیوں کرتے تھے؟ اس سوال کا جواب اسے آج تک نہیں ملا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا ہی تھا کہ ہندوستانی لوگ انگریزوں کو بہت برا کہتے ہیں ایسا کیوں ہے۔ انگریزوں نے کچھ ظلم بھی کیا ہوگا تو اُن سے کہیں زیادہ ہندوستان میں پہلے حکمرانوں نے کیا ہے سالوں گنگا جمنا کا پانی سرخ رہا ہے" اسی طرح وہ گھنٹوں سوچتا رہا مگر ان سوالات کا جواب اس کے دماغ کے کسی کونے سے بھی سر اٹھا کے جھانکتا دکھائی نہ دیا اپنے دل و دماغ سے نہ پا سکا۔

ایک دن وہ کچھ سوچ رہا تھا اور خیالات میں اتنا کھو گیا تھا کہ راستے کا کچھ خیال نہیں رہا اور سامنے سے آتی ہوئی موٹر سائیکل سے اس کا ٹکراؤ ہو گیا وہ تو خیر گزری جو ہڈی نہیں ٹوٹی صرف زخم ہی ہوا اور لنگڑا لنگڑا کر چلتا پھرتا رہا اور اسی حالت میں ہی رکشہ چلاتا رہا۔

ایک دن شام کو فٹ پاتھ پر رکشے میں بیٹھے بیٹھے وہ کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے سڑک کے پار عالی شان مکانوں پر جا پڑی آج اسے نیند نہیں آ رہی تھی کیوں کہ بجلی چمک رہی تھی اور بارش کا کھٹکا تھا بادل اس کے گاؤں کی طرف سے امنڈ رہا تھا اس کے چپر بوسیدہ تھے اور ٹپکتے تھے وہ سوچ سوچ کر دکھی ہو رہا تھا کہ اگر بارش ہو گئی تو تمام بچے رات بھر شکھ سے سو نہ سکیں گے۔ سوچتے سوچتے اس کی نظر کھڑکیوں پر جا پڑی جن پر پردے لٹک رہے تھے اور پنکھا چل رہا تھا پردوں کے بار بار ہلنے سے روشنی لہراتی ہوئی باہر نکلتی معلوم دے رہی تھی اپنے رکشے پر چھن چھن کے آتا ہوا اُجالا دیکھ کر وہ سوچتا کہ "جتنا اجالا میرے رکشے پر آ رہا ہے اگر کسی رئیس کے محل کا اتنا اُجالا میرے گھر پر آتا ہوتا تو مجھے مٹی کے تیل کا دیا جلانا نہیں پڑتا مگر یہ اُجالا غریبوں تک نہیں پہنچ سکے گا۔ ایک یہ لوگ ہیں جو اپنے بال بچوں میں رنگ رلیاں منا رہے ہیں اور ایک ہم غریب ہیں کہ شام کو بھی اپنے گھر نہیں جا سکتے"، اسی طرح سوچتے سوچتے

وہ رکشہ چلانے سے متنفر ہو گیا اور اس جذبہ کو گھٹنے کے درد، ڈھلتی ہوئی عمر جسمانی کمزوری اور بال بچوں کی ممتا نے اور ہوا دی۔ دھیرے دھیرے اس نے رکشا چلانے کا دھندہ ہی چھوڑ دیا رکشا بیچ ڈالا جب وہ گھر پہنچا اور سب حالات گھر والوں کو بتائے تو بچے خوشی سے تالیاں بجانے لگے کوئی اس کے دامن سے لپٹ گیا کوئی گلے میں لٹک گیا کوئی گود میں لیٹ گیا وہ رہ رہ کے سب بچوں پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ سعید کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور سوچ رہا تھا کہ "یہ قدم تو مجھے پہلے ہی اٹھانا چاہیئے تھا" مگر اس کی بیوی آمنہ کا چہرہ اُداس تھا سعید اس کا راز ایک ہی نظر میں بھانپ گیا اور بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا "تم بے فکر رہو میں بے کار اور نکما گھر نہیں بیٹھا رہوں گا" "تمہارا کیا ہے یہ سب تو میری جان کو کھاتے ہیں رکشا چلانے سے گھر کا کچھ تو خرچ چلتا تھا اب تم نے رکشا بھی بیچ ڈالا ہے تو ان سب کا کیا ہوگا۔؟"

"بس بس سُن لیا زبان بند کرو"، اس نے بیوی کو ڈانٹ دیا۔ "مگر میں پوچھتی ہوں کہ اب کرو گے کیا؟"۔ "سکھا نائی کے ساتھ دودھ بیچنے لکھنؤ جایا کروں گا اس کام میں رکشا چلانے سے کم محنت ہوگی گزارے لائق بھی کچھ نہ کچھ روز کما لیا کروں گا اور شام کو اپنے گھر آ کر پیر پھیلا کر سکھ کی نیند سویا کروں گا۔ دیکھو سکھا کے گھر ایک بھینس بندھی ہے مکان پکا ہے اچھا کھاتا پیتا ہے سب بچوں کے شادی بیاہ اچھے خاصے ڈھنگ سے کر دئے کسی کے آگے ہاتھ تک نہیں پھیلایا یہ دودھ کے کام سے پہلے اس کے پاس کیا تھا۔

"ٹھیک ہے تم دن نکلتے ہی سکھا سے دودھ بیچنے کے طریقے سیکھ لو اور برتن خرید لو" بیوی نے کہا اور کھانا بنانے چلی گئی۔ دوسرے دن وہ جب سکھا کے گھر پہنچا اور اس سے مشورہ کیا تو وہ بولا "سعید میاں تم سے یہ کام نہیں ہو سکے گا"

"کیوں"

"کیوں کہ تم ایمان دار آدمی ہو اور ایماندار آدمی اس کام میں سپھل نہیں ہو سکتا" سکھا بولا۔

"کیا ایمان داری سے کوئی کام نہیں کیا جا سکتا؟"

"میں تمہاری ہمت نہیں توڑتا تجربہ کر لو خرید لاؤ بیس کلو کا ایک ڈبہ اور بس کل سے میرے ساتھ چلا کرو"

"تجربہ کیا کرنا جب پانی کی ایک بوند نہیں ملاؤں گا تو کوئی میرا کیا کرے گا"

"دودھ انسپکٹر کسی کو خالص دودھ بیچنے ہی کب دیتا ہے" سکھا نے اپنے تجربہ کی بنا پر کہا۔ مگر سعید پر اس کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سعید سکھا کی نصیحت کو اپنی خوشحالی اور ترقی میں رکاوٹ ڈالنے کا بہانہ سمجھ رہا تھا لہذا اس نے دودھ کا کام شروع کر دیا جس سے اسے سارا خرچ نکال کر دس روپے روز بچ جاتے تھے اور صبح شام کو بچوں کی چائے کے لئے دودھ بھی بچ جاتا تھا۔

اب وہ بہت خوش تھا۔ یہی وہ چاہتا بھی تھا مگر جنتا پارٹی کی حکومت کی طرح سعید کی یہ خوشی زیادہ دنوں تک نہیں چلی۔ ایک دن دودھ کا انسپکٹر راستے میں مل گیا اور دودھ سیمپل بھر کر لے گیا۔

سعید نے لکھنؤ سے لوٹ کر سارا حال سکھا کو کہہ سنایا سکھا [illegible] سوچ میں پڑ گیا پھر بولا "تم دن نکلتے ہی سو [illegible] اس کے ہاتھ میں تھما آؤ ورنہ مصیبت میں پھنس جاؤ گے"

"کیوں" سعید نے چونک کر پوچھا۔

"دودھ میں پانی ثابت کر کے جرمانہ بھی کرا سکتا ہے اور سزا بھی کرا سکتا ہے"

"مگر میرا دودھ تو خالص ہے"

"مگر تمہارے پاس اس کا ثبوت کیا ہے وہ جس دودھ میں سے سیمپل بھر کر لے گیا ہے اس کا ایک نمونہ نمبر لگا کر تمہیں تھوڑے ہی دے گیا ہے جس کی بنا پر تم اپنی سچائی کا ثبوت پیش کر سکو وہ سیمپل کی شیشی میں سرنج سے پانی ملا سکتا ہے ڈاکٹر اور اس کی ملی بھگت ہوتی ہے ہماری مانو تو سو روپے ہر مہینہ اس کے گھر جیسے ہم پہنچاتے رہے تم بھی پہنچاتے رہو اور مزے سے دودھ میں پانی ملا کر بیچتے رہو اور اگر ایمانداری پر رہے تو دین دنیا دونوں ہی سے جاتے رہو گے"

"خدا تو دیکھتا ہے سانچ کو آنچ نہیں ہوتی ہے میں رس میں بس نہیں ملاؤں گا ایمان بیچ کر جینے سے تو مر جانا اچھا ہوتا ہے"

سکھا کی بات صحیح ثابت ہوئی انسپکٹر نے اس کے دودھ میں پانی ثابت کر دیا تھا جس پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا تھا یہ جان کر سعید کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کی طرح چپ رہ گیا اس نے اپنی سچائی اور ایمانداری کا یہ ہولناک انجام دیکھا تو اسے سکھا کی بات سچ معلوم ہوئی وہ سکھا کے پاس گیا اور سب حال کہہ سنایا۔

"اب کیا سوچا" سکھا نے پوچھا۔

"دودھ بیچنا چھوڑ دوں گا اور بلاک سے مرغی لے کر پالوں گا ان کے انڈے بیچا کروں گا اس دودھ سے اچھا رہوں گا"

"اس چکر میں مت پڑو مرغیوں میں بیماری پھیل گئی تو سب کا خاتمہ ہو جائے گا دیکھتے ہی دیکھتے رہ جاؤ گے، دودھ ہی بیچو مگر جیسے سب بیچتے ہیں ویسے بیچو مزے آ جائیں گے یہی انسپکٹر تمہارے پاس تک نہیں پھٹکے گا"

"جو بھی ہو میں کسی کو رشوت نہیں دے سکوں گا۔ دودھ میں پانی نہیں ملا پاؤں گا، تم کیسے بھی ہو اب کی بار اس کیس سے چھٹکارا دلا دو"

سکھا نے اسے ترکیب سمجھائی اور امید دلائی کہ تم جرمانے سے بچ سکتے ہو۔

"مگر کیسے؟" سعید نے جلدی سے پوچھا

"اپنے ایم۔ایل۔اے صاحب، تمہاری سفارش

(بقیہ صفحہ ۱۴ پر)

ماڈل

شام بارک پوری
(بنگلہ دیش)

اس وقت دفتر تھا قبل از وقت چھٹی ہو گئی۔ صابر
ڑک کے کنارے کھڑا بس کا انتظار کرنے لگا۔ ہلکی ہلکی
دھوپ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ شام کی ٹھنڈی ہوا
بک خرامی سے چل رہی تھی کافی دیر ہوئی لیکن بس نہ
ئی آخر کار وہ بور ہو کر پیدل ہی چل پڑا۔ راستے میں
ور جاوید کا گھر پڑتا ہے جب اس کے گھر کے قریب پہنچا
وہ ٹھٹھک گیا اور کسی انجانے خیال کے زیر اثر اندر داخل
ا۔ مصور اس وقت ایک بھکارن کو ماڈل بنائے برش
رنگوں سے کھیل رہا تھا تصویر میں بھکارن محرومی اور
ن کی تصویر بنی ہوئی تھی اس کی زندگی کا کرب اپنے
ری ہیبتناکی سے جلوہ گر تھا مصور اسے دیکھ کر بڑے
اک سے ملا۔

"آؤ۔ آؤ۔ بھائی صابر"
کیا کوئی تصویر بنا رہے ہو؟ اس نے ایک اچٹتی سی
ناہ بھکارن پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں" مصور نے رنگوں کی پلیٹ ایک طرف رکھ
اور برش دھونے لگا۔ "اتنے دنوں کہاں رہے؟"
"بس آوارہ بادلوں کی طرح بھٹکتا رہا" اس نے
ہلکی ہنسی کے ساتھ کہا۔
"تم تو شاعر ہوتے جا رہے ہو"
"اور اپنے متعلق حضور کا کیا خیال ہے؟ مصور
ا کسی شاعر کے حسین خیال سے کم نہیں اس میں لفظوں کی
مائے رنگوں کا ہیر پھیر ہے"
"خیر، اس وقت ایک ایسی شاہکار تصویر بنا رہا
وں کہ انسانیت ہلا کر رکھ دے گا جاوید بولا
ل آرٹ گیلری میں تصویر دلیے کا مقابلہ ہے اس لئے
یہ بھکارن ماڈلنگ کر رہی ہے دعا کرو میری تصویر معیار
پر پوری اترے اور حاصل نمائش قرار دی جائے" یہ
مصور نے بھکارن کی طرف اشارہ کیا۔
شاید تمہارے ذہن میں بھکارن کا کوئی اچھوتا
آرٹ منڈلا رہا ہے جب ہی اضطراب تکمیل تک پہنچانے
کے لئے ایک بھکارن کو ماڈل بنائے ہو؟ اس نے بھکارن
پر ایک گہری نظر ڈالی۔ "بھکارن کو کتنے پیسو لیے
میں تیار کیا؟"
تمہارا کیا خیال ہے؟ مصور مسکرایا۔
شاید یہاں بھیک مانگنے آئی ہوگی اور تم نے کچھ
پیسوں کے عوض اسے ماڈل بننے پر راضی کر لیا ہوگا
نہ جانے ہمارے ملک میں انسانوں کے ساتھ ایسا
سلوک کب تک روا رکھا جائے گا۔ بھوک آدمی
کے غیور جذبہ کو روند ڈالتی ہے اور اسی پر یہ عالم
مجبوری جب بھکاری کا پیشہ اختیار کر لیتا ہے تو
لوگ نفرت سے دیکھتے ہیں حکومت اور ہمارے رہنما
اس کا جواز اور حل کیوں تلاش نہیں کرتے۔ یہ بھوک ہی
ہے جب انسان کو ستاتی ہے تو اپنا ضمیر بیچ دیتا ہے
اور جب ایک عورت کو ستاتی ہے تو وہ اپنا جسم بیچنے پر
مجبور ہو جاتی ہے" اس کے چہرے پر کرب اور بے چینی
کے آثار دکھائی دینے لگے۔
"اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنی آنکھوں سے
جو دیکھتا ہے وہ حقیقت نہیں ہوتی" مصور نے ایک تیز
نظر بھکارن پر ڈالی جو عجیب سی نظروں سے صابر کو
دیکھ رہی تھی۔
تعجب ہے کہ ایک فنکار کا درد مند دل رکھتے ہوئے

ایسی باتیں کر رہے ہو" مسعود مسکرایا اور اسے بیٹھنے کا اشارہ کر کے رنگ لانے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ صابر غور سے بھکارن کا جائزہ لینے لگا وہ یاس و محرومی کا پیکر تھی الجھی الجھی گرد آلود زلفیں، آنکھوں میں غربت کی ویرانی اور بوسیدہ لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا جس سے اس کا گورا چٹا بدن جھلک رہا تھا اس کے نقش و نگار اس قدر دیدہ زیب اور جاذب نظر تھے کہ آدمی دیکھتا ہی رہ جائے بھکارن بھی ایسی پری پیکر اور حسین و جمیل ہو سکتی ہے یہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ آ سکتا تھا۔ کبھی کبھی گدڑی میں لعل یا کیچڑ میں بھی کنول کھلتے ہیں مگر زمانے کی ٹھوکروں نے کس طرح اس کا حسن پامال کر کے رکھ دیا ہے وہ موسم بہار کا مرجھایا ہوا پھول معلوم ہو رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا۔ آپ بے حد مصیبت زدہ اور مجبور نظر آتی ہیں؟" نہ جانے کیوں وہ اس کے لئے اپنے دل میں ہمدردی محسوس کر رہا تھا۔

"جی ہاں" اس کی آواز میں لوچ تھا جس سے زندگی کا دردناک ساز چھڑ گیا، "میری زندگی غم و مصیبت کا سنگم رہی ہے فرحت و راحت کیا ہوتی ہے یہ میں نہیں جانتی کیوں کہ اس لطیف شے سے محروم ہوں میں نے بچپن میں جب آنکھ کھولی تو اپنے پاس سبھوں کو بھیک مانگتے پایا کچھ لوگ میری جوانی خریدنا چاہتے تھے۔ میرے حسن کے پرستار ہزاروں پیدا ہو گئے جو میری عصمت کا سودا کرنا چاہتے تھے۔ پھر سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے کیا بیر؟"

میرے ماں باپ غریب و لاچار تھے۔ وہ میری جوانی کی حفاظت کس طرح کر سکتے تھے میں اکثر گھروں میں برتن مانجھنے یا جھاڑو دینے کا کام کرنے لگی مگر وہاں بھی ہوس پرستوں کی للچائی ہوئی نظریں مجھ پر پڑنے لگیں ادھر چند دنوں سے میرا باپ سخت بیمار تھا دوا دارو کے لئے تو پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے نا جب ہمیں کھانے کے لئے سوکھی روٹی ہی نہیں ملتی تو پھر دوا کے لئے پیسے کہاں سے لائیں! میں جگہ جگہ پیسے مانگنے گئی مگر سب ہی میری بھرپور جوانی کی قیمت لگانا چاہتے تھے میں بھٹکتی بھٹکتی ان تصویروں والے بابو کے پاس آئی تو انہوں نے کچھ پیسوں کے عوض مجھے یہاں بٹھا لیا۔"

"مگر تم بھیک کیوں مانگتی ہو؟"

"اب بھیک نہ مانگوں تو کیا طوائف بن جاؤں؟"

"تم تو دنیا کی ستائی ہوئی معلوم ہوتی ہو، شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

"شادی ——! بابو ایک بھکارن سے کون شادی کرے گا، ویسے کچھ لوگ تیار ہو ہی جائیں گے، پھر چار دن کی چاندنی اور اندھیری رات ہے۔"

"دنیا میں سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے"

"تو پھر آپ ہی کیوں نہیں کر لیتے مجھ سے شادی۔"

بھکارن کی آنکھوں میں عجیب سی چمک عود کر آئی اور لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ۔

"میں ...... میں ......" وہ گھبرا گیا۔

"کیوں؟ —— میں نہ کہتی تھی کہ دھواں دھار تقریر کرنے والے ہزاروں مل جائیں گے مگر جب ان کی باری آتی ہے تو بوکھلا جاتے ہیں" اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

صابر سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور وہ جز بز ہو کر رہ گیا جاوید اندر کمرے میں نہ جانے کیا کر رہا تھا اس نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی وقت کافی ہو چکا تھا اس لئے اس سے ملے بغیر خیالات کے ہجوم میں گھرا واپسی کے لئے باہر نکل آیا۔ بھکارن کی گفتگو نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

صابر میری ٹائم کے دفتر میں کلرک تھا عرصہ تک بی۔ اے کی ڈگری جیب میں ڈالے نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہا۔ "نو ویکنسی" کا بورڈ دیکھتے دیکھتے وہ نوکری سے مایوس ہو چکا تھا جوتے کے تلے گھس گئے تھے۔ (باقی)

اخبار دیکھتا اور جہاں کہیں بھی نوکری کی ضرورت کا اشتہار دیکھتا جھٹ سے عرضی روانہ کر دیتا بعض دفعہ انٹرویو کے لئے بلایا جاتا لیکن شومئی قسمت سے انجام نا امیدی ہی ہوا کرتا۔ بالآخر کافی تگ و دو کے بعد اس نے اس وقت نوکری پائی جب آرزو جوان ہو کر بوڑھی ہو چکی تھی یاس کے دیپ بجھ چکے تھے تب نوکری نے اسے خوش آمدید کہا۔

تنخواہ ڈیڑھ سو روپے تھی اس مہنگائی کے دور میں بمشکل ہی پورے ماہ کا خرچ چلا سکتا تھا۔ طعام اور دیگر اخراجات کے بعد اس کے پاس بمشکل ہی کچھ روپے بچ سکتے تھے وہ بس کے کرایہ کی نذر ہو جاتے اکثر وہ پیسے بچانے کے لئے گھر سے دفتر کی طرف پیدل چل پڑتا تاکہ بچے ہوئے روپے سے کتابیں خرید سکے اسے ادب سے بے حد دلچسپی تھی کتابوں کا مطالعہ اس کے دماغ کو جلا بخشتا تھا۔ اس کے شعور میں معلومات کی کلیاں شگفتگی و تازگی کا نیا باب کھولتیں اور وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا جو خوابوں سے نزدیک اور بیدار کا سے دور ہوتی ہے۔

اس کا اس دنیا میں کوئی بھی نہ تھا والدین بچپن میں مر چکے تھے اس نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو چچا کا دست نگر پایا چچا نے ہی اسے تعلیم دلوائی۔ اس نے فرسٹ ڈویژن میں گریجویشن کیا تھا کہ ملک کا بٹوارہ ہو گیا شہروں میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی ایک انسان دوسرے انسان کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ ماؤں بہنوں کی عصمت لوٹی جا رہی تھی۔ ہر طرف آگ ہی آگ، خون ہی خون تھا۔ انسانیت ننگی ناچ رہی تھی اس فساد میں اس کے خاندان کے کل افراد مارے گئے چچا جو آخری سہارا تھے وہ بھی اس خونی کھیل میں اس سے جدا ہو گئے بمشکل وہ اپنی جان بچا کر مہاجر کی حیثیت سے پاکستان چلا آیا یہ خانماں برباد لوگوں کا ایک سیلاب تھا جو پاکستان میں امنڈ آیا تھا۔ ہر طرف بھوک، بے کاری

اپنے قدم جما رہی تھی۔ اس کا وجود لاکھوں مہاجرین میں ایک حقیر کیڑے کی مانند تھا چنانچہ وہ اپنی بھوک اور بے کاری سے لڑنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور نوکری کی تلاش شروع کر دی آخر کار اس کی کوشش رائیگاں نہ گئی اور وہ نوکری پانے میں کامیاب ہو گیا۔

وہ ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ جاتا اور فائلوں سے نپٹنے لگتا دفتر میں نہ کسی بحث میں حصہ لیتا اور نہ ہی کسی سے کچھ سروکار رکھتا۔ لنچ میں اس کے ساتھی زمانے بھر کی سیاست کے متعلق تبصرہ و تنقید کرتے رہتے مگر وہ ان باتوں میں ٹانگ نہیں اڑانا چاہتا تھا اس کے ساتھی اسے بالکل ہی "خشکی" سمجھتے تھے۔ بسا اوقات دبے دبے لفظوں میں اسے عجیب پیرایہ سمجھانے کا کہہ کر تاؤ دلانا چاہتے مگر ان باتوں سے اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی وہ ایک کان سے سنتا اور دوسرے کان سے اڑا دیتا جب کلرکوں نے دیکھا کہ وہ ان کی باتوں کا اثر ہی نہیں لیتا تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے۔

اس شہر میں وہ یکہ و تنہا تھا اس کی زندگی اس کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تھی جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی، وہ نہ صرف کم گو تھا بلکہ حساس دل بھی تھا۔ جب کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھتا تو اس کا دل بھر آتا اور حتی المقدور اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتا۔ نہ ہی اس نے کسی سے میل جول بڑھایا تھا اور نہ دوستی۔ لے دے کر ایک مصور تھا جس کے پاس اکثر اوقات وہ چلا جایا کرتا تھا وہ فنکار سے اکثر مصوری کے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات کیا کرتا اور خاموشی سے آرٹسٹ کو برش سے کینوس پر تصویر بناتے دیکھا کرتا۔ جب وہ دو رنگوں کی آمیزش سے تیسرا رنگ بناتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ زندگی اور موت کے امتزاج سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔ کچھ تصویریں ایسی بھی ہوتیں جن کی آڑی ترچھی لکیروں سے ایسا جان پڑتا جیسے زندگی غم و خوشی اور مسرت و تشو

کا جو نا پنے معصومیت کے ساتھ فضا کے میں آجاگر ہے ۔۔
اسے بھی پینٹنگ سے لگاؤ تھا۔ کالج کے زمانے میں اس نے
فائن آرٹ لے رکھا تھا چنانچہ وہ آرٹسٹ سے مصوری
کی مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا ۔

مصور اس کے جذبے کی بے حد قدر کرتا تھا چنانچہ
نہ صرف اس کی حوصلہ افزائی کیا کرتا تھا بلکہ مصوری
کے نئے نئے گر بھی بتایا کرتا تھا ۔

مصور جاوید ایسی تصویریں بنایا کرتا جس میں
رنج و غم کی پرچھائیاں جاگزیں ہوتیں ۔ المناک ماحول
کی تصویر کشی میں وہ ماہر تھا ایسی تصویریں بنایا کرتا
جن سے حقیقت کا گمان ہوتا اور یہی فن کا معراج تھا۔
اس کے کمرے میں چاروں طرف بے شمار تصویریں آویزاں
تھیں کسی میں قحط کے ڈراؤنے واقعات نمایاں تھے تو
کسی میں بھوک بھیڑیوں کی طرح جبڑے پھاڑے انسان کو
نگلنے کے لئے بے قرار تھی ۔ کسی میں غریبوں کا کرب و
اضطراب تھا تو کسی میں بھکاریوں کی زندگی جلتی ہوئی
آگ میں محصور تھی ، یہ فن سالہا سال کی محنتوں کا نتیجہ تھا
وہ تصویروں پر تصویریں بناتا رہا دن میں دو بار مشکل
سے آدھے پیٹ کھانا نصیب ہوتا اور کبھی تمام دن
میں ایک ہی بار اسے روٹی ملتی ۔ فاقہ مستی ، بیروزگاری
اور تہی دستی کے باوجود رنگ اور کینیوس کی محتاجی
سبھی کچھ جھیلتا رہا لیکن اس نے حوصلہ نہیں ہارا ۔

آرٹ گیلری کی بلڈنگ نیلے ، پیلے ، سرخ ، سبز
قمقموں سے اس طرح سجی ہوئی تھی جیسے آسمان پر تاروں
کا جال ، پارکنگ شیڈ پر کاروں کی قطاریں لگی ہوئی
تھیں شہر کی اشرافیہ متمول گھرانے کے لوگ ، افسران
بالا اور آرٹ کے شیدائیوں سے ہال کھچا کھچ بھرا ہوا
تھا اس بھیڑ میں صابر بھی ایک کونے میں کھڑا سگریٹ کے
کش لگا رہا تھا جاوید بھی ہال کے اندر جاتا اور
بے چینی سے باہر نکل آتا ۔ استقبالیہ کمیٹی چیف گیسٹ
کا انتظار میں بے صبری کا اظہار کر رہے تھے جن کے آتے

ہی انعام کا اعلان کیا جانے والا تھا ججصاحبان پہلے
ہی طے کر چکے تھے انہیں صرف اپنے فیصلے سے چیف
گیسٹ کو آگاہ کرنا تھا ۔ آخر خدا خدا کر کے وہ گھڑی
آ پہنچی اور شہر کے سب سے بڑے صنعت کار ، تاجر ،
ممبر پارلیمنٹ کی شیورلیٹ روشنیوں کے سیلاب پر
جگمگاتی ہوئی پورٹیکو میں آکر ٹھہر گئی ۔ افسران منتظم
تمام مصور تیزی سے گاڑی کی طرف لپکے سیٹھ عثمان
مسکراتے چہرے کے ساتھ گیٹ سے برآمد ہوئے اور
باری باری سب ہی استقبال کرنے والوں سے مصافحہ کیا
صابر پر جیسے حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو سیٹھ
عثمان کے پیچھے پیچھے زرق برق میں ملبوس وہی بھکارن
نمودار ہوئی تھی ۔ ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ اور
آنکھوں میں شوخ قندیلیں روشن تھیں ۔ تمام
لوگ سمٹ کر ہال میں جمع ہو چکے تھے سیٹھ عثمان
ماہ رخ کے ساتھ ججوں کے درمیان جاکر بیٹھ گئے فوراً
کارروائی پر چند ہی منٹ پرانا ؤنسر نے بھکارن کی
تصویر کو اول انعام کا مستحق قرار دیا اس کے بعد
سیٹھ عثمان نے فن اور فنکار پر ایک دھواں دار
تقریر کی ۔

صابر حیرت اور سوچ کی کشتی میں ہچکولے کھاتا
اپنے مصور دوست کو اس کی کامیابی پر مبارک باد
دینے پہنچا تب جاوید نے ہنستے ہوئے صابر کو
حقیقت حال سے آگاہ کیا ۔

یار بات یہ ہے کہ سیٹھ صاحب کی صاحبزادی جو
ایڈونچر کی دلدادہ ہے اس نے شوقیہ ماڈلنگ کا کام کیا کر
ہے اس دن اس نے ایکٹنگ کی انتہا کر دی ۔ علاوہ ازیں
مجھے منع کر رکھا تھا کہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ بھی نہ
بتاؤں "

عین اسی وقت اناؤنسر نے اعلان کیا " مصور
جاوید صاحب فوراً اسٹیج پر تشریف لائیں اور ایک
روپیہ کا نقد انعام حاصل کریں "

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

غزل

شاہ کوکب القادری
(دکونچ)

حوادث ہم پہ گزرے کارواں در کارواں اب تک
نہ ہم کو کر سکی پامال رفتارِ جہاں اب تک

مزاج اُن [illegible] نادوں کا [illegible] اب تک
رہا ہے بجلیوں کی زد میں جن کا آشیاں اب تک

امید و بیم کی موجیں تلاطم خیز ہیں کتنی
اچھلتی ڈوبتی ہے کشتیِ عمرِ رواں اب تک

نہ سمجھے آج تک وہ قدر و قیمت خونِ انساں کی
جنھوں نے خونِ انساں کو کیا ہے رائگاں اب تک

ادھر جلوہ نمایاں ہے، ادھر آئینہ حیراں ہے
یہ نظارہ، نظر کا لے رہا ہے امتحاں اب تک

لکیریں بن کے کچھ یادیں ابھر آئی ہیں ماتھے پر
انہیں یادوں میں پوشیدہ ہے دل کی داستاں اب تک

ہمارے پیچھے صدیوں سے بہاریں چلتی رہتی ہیں
چلا کرتا ہے کانٹوں پہ ہمارا کارواں اب تک

یہ جلوہ حسن کا جلوہ ہے یہ پردہ حسن کا پردہ ہے
کسی پر ہو سکا ظاہر نہ یہ رازِ نہاں اب تک

ستم دیکھے ذرا کوئی یہ اربابِ سیاست کا
وطن میں اپنے ہی مظلوم ہے اردو زباں اب تک

دلی و میر و غالب سے، فراق و جوش تک کوکب
ادب اردو کا ہے سرمایۂ ہندوستاں اب تک

غزل

جولیس نحیف دہلوی

آپ کی نظروں میں ہوں بے شک بُرا کہیے مجھے
کہنے کہیے بے تکلف بے وفا کہیے مجھے

چھپ کے کیوں میری بُرائی آپ کرتے ہیں جناب
آپ نے کہنا ہے جو بھی برملا کہیے مجھے

آپ نے مجھ سے یکایک کیسے آنکھیں پھیر لیں
کس خطا کی آپ نے دی ہے سزا کہیے مجھے

سارا عالم باوفا کہتا ہے مجھ کو جانِ جاں
آپ نے تو بے وفا کہنا ہی تھا کہیے مجھے

آپ پہلے دل کے آئینے میں خود کو دیکھ لیں
پھر زبانِ شوق سے اپنی بُرا کہیے مجھے

کیا علاج دل کریں گے چارہ گر میرا نحیف
دردِ الفت کا مریضِ لادوا کہیے مجھے

غزل

کاشف کنند دکوی

سفرِ حیات کا زیر و زبر سا لگتا ہے
جو راہزن ہے وہی راہبر سا لگتا ہے

وفا کا نام نہ لو محترم خدا کے لئے
وفا کے نام سے اب مجھ کو ڈر سا لگتا ہے

ہمیشہ ہم نے اسی سے فریب کھایا ہے
جو شخص دیکھنے میں معتبر سا لگتا ہے

تمام عمر گزر جائے اور تمام نہ ہو
فسانہ عشق کا جو مختصر سا لگتا ہے

چمن تجھی کو مبارک ہو باغباں تیرا
مجھے تو دشت بھی اب اپنا گھر سا لگتا ہے

عجیب حال ہے کاشف جہانِ الفت کا
ستم شعار ہے جو چارہ گر سا لگتا ہے

دی بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک بلڈنگ ۸۱، محمد علی روڈ، بمبئی ۳۰۰۰۰۳

بینکاری کے تمام امور بشمولہ غیر ملکی زر مبادلہ کا لین دین انجام دیتا ہے اس کے علاوہ آپ کا معیارِ زندگی بلند کرنے میں آپ کی ہمت افزائی کرتا ہے اور جدید اقسام کے گھریلو استعمال کے سامان کے حصول میں آسان شرائط پر آپ کی مدد کرتا ہے۔

یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء سے سود کی شرحیں

۱- سیونگ ڈپازٹس پر

(سیونگز اکاؤنٹس پر (چیک سہولت کے ساتھ) ۵ فیصد سالانہ)

۲- فکسڈ ڈپازٹس پر ۲ مارچ ۱۹۸۱ء سے

۱- ۱۵ سے ۴۵ دن تک ۳½ فیصد سالانہ	۵- ۹ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ایک سال سے کم ۶½ فیصد سالانہ
۲- ۴۶ سے ۹۰ دن تک ۴ ״ ״	۶- ایک سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۲ سال تک ۸½ ״ ״
۳- ۹۱ سے زیادہ مگر ۶ ماہ سے کم ۵ ״ ״	۷- ۲ سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۳ سال تک ۹½ ״ ״
۴- ۶ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ۹ ماہ سے کم ۵.۵ ״ ״	۸- ۳ سال اور اس سے زیادہ عرصہ پر ۱۱ ״ ״

مندرجہ بالا شرح انٹرسٹ تمام شیڈولڈ اور نیشنلائیزڈ بینکوں سے ایک فی صدی زیادہ ہے

دہلی برانچ

3655 نیتاجی سبھاش مارگ، دریاگنج، نئی دہلی 110002

فون:- 264374 — 268266

منیجنگ ڈائریکٹر
زین جی رنگون والا

دہلی زونل منیجر
تسنیم کاظم

حیات و فن

جناب محمد خالد عابدی
(آل انڈیا ریڈیو اندور)

امیر علی شبنم اُجینی

آپ ۱۸۹۱ء میں اجین میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی، اُردو اور دینیات وغیرہ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ کچھ تعلیم اسکول میں بھی حاصل کی۔ جب شعر کہنے کا شوق ہوا تو حافظ غنی محمد گوالیاری اور سید کرامت علی اسیر ایسے اساتذہ سے سلسلۂ تلمذ قائم کیا۔ آپ نے تقریباً سبھی مقبول اصناف پر طبع آزمائی کی تھی۔ آپ "بزم محمودیہ" کے بانی مبانی تھے۔ آپ کا کلام لطافت، ظرافت، فصاحت اور بلاغت کا آئینہ دار ہے۔ آپ مشاعروں اور نشستوں میں شرکت تو کرتے تھے لیکن جب سے مترنم شاعروں کے سامنے اچھے اور کہنہ مشق شاعروں کی ناقدری دیکھی تو کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں خود ہی فرماتے ہیں ؎

تضحیک و تمسخر کے یہ اوچھے ہتھیار
یہ بزم میں شاعر کا تمسخر کردار
بدذوقی و کج فہمی کی ارزانی ہے
گر جائے نہ کیوں شعر و ادب کا معیار

تقریباً چھ ماہ کی علالت کے بعد ۴؍ اپریل ۱۹۶۵ء کو آپ کا انتقال ہوا۔ نمونہ کلام اس طرح ہے ؎

جام مئے توحید کا پینا سیکھو
اخلاقِ شہنشاہِ مدینہ سیکھو
کچھ یاد رہے حق اور پڑوسی کے حقوق
زندہ جو تمہیں رہنا ہے تو جینا سیکھو

رہنما، قائد و لیڈر ہیں گرفتارِ ہوس
اُن کے کاندھوں پہ بہت بوجھ ہیں معصوموں کے
عیش و عشرت میں گم ہیں انہیں فرصت ہی کہاں
کام آئیں بھی تو کس طرح یہ مظلوموں کے

یہ چار تنکے بچے ہیں جو آشیانے کے
کھٹک رہے ہیں نظر میں یہی زمانے کے
ہیں چار دن کی بہاریں فقط چمن والو
مری نظر میں ہے انجام مسکرانے کے
چمن میں پھول میں کلیوں میں برگ شاخوں میں
بہت مقام ہیں شبنم کو آشیانے کے

جو رسم الفت کی آڑ لے کر سنا گئے ہیں ہزار باتیں
ہو سکا تو مقابلے میں کریں گے ہم سے اُن سے چار باتیں
بہار آتے ہی ہو رہی تھیں چمن میں دیوانہ وار باتیں
بڑے مزے لے کے کر رہے تھے چمن میں پھولوں سے خار باتیں
فلک پہ دعویٰ کا تھا بجلیوں کا زمیں پہ آبِ رواں کا نقشہ
کچھ اس طرح سے گرج گرج کر وہ کر گئے شعلہ بار باتیں
زمانہ سمجھا نہ ہم ہی سمجھے یہ راز کیا ہے خدا ہی جانے
جنونِ الفت میں آج ہوتے ہیں جو دیوانہ وار باتیں
سوائے اب خامشی کے شبنم نہیں چمن میں کوئی سہارا
سنائیں کس کو سنانے والے ہزار ہیں اور ہزار باتیں

حیدر علی حیدر

آپ کا نام ملا حیدر علی بن ملا حسن علی المتخلص

... سلطان احمد صدیقی نے آپ کے تعارف میں لکھا ہے کہ آپ داؤدی بوہرا خاندان میں ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اردو، فارسی، عربی اور گجراتی کی حاصل کی۔ شعر و شاعری کا شوق جوانی میں ہوا، آپ نے انیس و دبیر کے کلام کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ جلوسوں میں اساتذہ کے مراثی، سلام و نوحے پڑھنے سے طبیعت موزوں ہوئی اور شعر کہنے لگے۔ حضرت مضطر خیرآبادی اور بعدہ حضرت سید کرامت علی تبسم سے اصلاح لی۔ آپ نے قطعہ، رباعی، نعت، سلام، منقبت اور نوحے وغیرہ لکھے ہیں۔ یہ سلام و مراثی اکثر مجالس میں پڑھے جاتے تھے۔ نیز دہلی اور لکھنؤ سے شائع ہو چکے ہیں آپ اپنے فن میں استاد تھے۔ بالخصوص بوہروں میں آپ نے ذوق شاعری پیدا کیا۔ آپ کے کلام میں زبان و بیان میں قدرت، روانی و معنی آفرینی پائی جاتی ہے ۱۹۶۶ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

نمونۂ کلام (رباعیات)

اس بات کو ہر وقت تو رکھ مد نظر
نا فہم نہ بن سوچ ذرا اے حیدر
ذلت دے کہ عزت دوں میں چاہوں جس کو
قرآں میں فرماتا ہے ربِ اکبر

بے شکرِ خدا، وردِ زباں شام و سحر
مولا کا ہے لطف و کرم ہے مجھ پر
ہوں شاہ کی اس بندہ نوازی کے نثار
سرکار نے بخشا ہے تخلص حیدر

کیا جانے وہ کیا بکتے ہیں کیا کہتے ہیں
کہتے ہیں وہ بے جا کہ بجا کہتے ہیں
وہ مرد ہیں جو کہتے ہیں منہ پر حیدر
نامرد پس پشت برا کہتے ہیں

صادق ہیں جو وعدے کو وفا کرتے ہیں
جھوٹے ہیں دغاباز دغا کرتے ہیں
پیشانی پہ لکھا نہیں لیکن حیدر
ہم باتوں سے پہچان لیا کرتے ہیں

طعنہ سنتا ہوں، ظلم سہتا ہوں
لغو گوئی سے دور رہتا ہوں
صدق باتیں پسند ہیں حیدر
صاف کہتا ہوں منہ پہ کہتا ہوں

تکلیف زمانے کے سہا کرتے ہیں
کرتے ہیں شکایت نہ گلہ کرتے ہیں
صابر انہیں کہتے ہیں جہاں میں حیدر
ہر حال میں جو شکرِ خدا کرتے ہیں

غزل

(پروفیسر فرید قریشی سحر کویت)

دل کو تیری آرزو کا راز سمجھانا پڑا
یوں ترے کوچے سے ہم کو بار بار جانا پڑا

میں مزاجِ گلستاں سے جب کبھی واقف ہوا
پھر قفس کی تیلیوں کو آشیاں کہنا پڑا

زندگی پانا جہاں میں کس قدر دشوار تھا
زندگی کے واسطے جینا پڑا مرنا پڑا

عزم، ہمت، حوصلہ سب کچھ تری چاہت سے تھا
تیری فرقت میں مجھے کیا کیا نہ غم سہنا پڑا

آرزو کی یہ سزا کچھ کم نہ تھی میرے لئے
اک تبسم کے لئے جب عمر بھر رونا پڑا

ان سے پوچھے کوئی آخر تلخیوں کی داستاں
تلخیاں پی کر زمانے کی جنہیں ہنسنا پڑا

بجلیاں کب تک جلاتیں آشیاں میرا سحر
ضد میں ہر شاخِ شجر پر آشیاں رکھنا پڑا

غزل

(عبد المجید نجم کویت)

خدا جانے تمناؤں کا خوں ہوگا یہاں کب تک
لکھی جائے گی خونِ دل سے میری داستاں کب تک

تو اپنے عشق میں جذبِ دروں پیدا تو کر پہلے
تو پھر یہ حسن بے پرواہ نہ ہوگا مہرباں کب تک

اگر جلتا ہے میرا آشیاں جل جائے۔ غم یہ ہے
کہ زد سے برق کی آخر بچے گا گلستاں کب تک

تصور چھوڑ کر اک دن حقیقت بن کے چلے آؤ
کہ ہر آہٹ پہ آنے کا مجھے ہوگا گماں کب تک

لبوں پر جانِ مضطر ہے تماشہ دیکھ تو آکر
کہ فرقت میں تڑپتا ہے تمہارا نیم جاں کب تک

جنونِ سجدہ ریزی ڈھونڈ ہی لے گا اسے اک دن
رہے گا دور مجھ سے تیرا سنگِ آستاں کب تک

جفا و جور کی آخر تو اک دن انتہا ہوگی
ستم ڈھائے گا آخر نجم پر اے آسماں کب تک

غزل

(عبد الستار عاصی)
(کویت)

مہکی فضا میں خوشبو تو اندازہ ہوگیا
آئی بہار زخمِ جگر تازہ ہوگیا

بکھرا ہے کرچیوں میں مرے دل کا آئینہ
یوں منتشر حیات کا شیرازہ ہوگیا

مقتل سے رنگ اڑ کے شفق میں نمود ہے
جو چہرۂ افق کے لئے غازہ ہوگیا

محدود ہو کے رہ گئے سوچوں کے دائرے
مجبور کا جنونِ فکر کا خمیازہ ہوگیا

دستک یہ اس نے دی ہے دردِ دل پہ آج پھر
برسوں کا بند جس پہ تھا دروازہ ہوگیا

عاصی نہ ہوگئے سنگِ طلسماتی شہر کے
مڑ کر نہ دیکھنا اگر آوازہ ہوگیا

غزل

(شاہد رتلامی)

سفرِ قلم کا بہت ہی طویل ہوتا ہے
نہ ہو شعور تو خالق ذلیل ہوتا ہے

تلاشِ یار میں تکمیلِ جستجو کے لئے
جنوں کا نقشِ قدم خود دلیل ہوتا ہے

جہاں کسی نے انا الحق کہا بہ زعمِ انا
مزاجِ وقت وہیں پر علیل ہوتا ہے

خبر نہیں ہے یہ فرعونِ وقت کو شاید
انا کی راہ میں دریائے نیل ہوتا ہے

پرائی آگ بجھائے جو اپنے اشکوں سے
وہی تو وقت کا شاہد خلیل ہوتا ہے

غزل

(کرشن دیو مرواہا۔ وقار اکبر آبادی)

نگاہِ برقِ تاباں کا نشانہ ہوتا جاتا ہے
منور اب ہمارا آشیانہ ہوتا جاتا ہے

جواں مردی کی ہم اُمید کیا رکھیں جوانوں سے
کہ ہر انداز اُن کا اب زنانہ ہوتا جاتا ہے

کوئی اُن شوخ نظروں کا نیا انداز تو دیکھے
کہ ہر پیر و جواں اُن کا نشانہ ہوتا جاتا ہے

مسلسل رہ کے ہم مانوس اس سے ہو گئے اتنے
قفس اپنا بشکلِ آشیانہ ہوتا جاتا ہے

یہی پیغام ہے ہر اک نفس کا زندگانی کے
رہو ہشیار! پورا آب و دانہ ہوتا جاتا ہے

مروت ہے نہ پہلی سی، محبت ہے نہ پہلی سی
کہ اب تو منتشر ہر اک گھرانہ ہوتا جاتا ہے

پتہ کیا ہم کو تنکے اس کے کس دن کب بکھر جائیں
وقارؔ اب تو قفسِ تن کا پرانا ہوتا جاتا ہے

غزل

(خلیل انجم کامٹی)

دل قیدِ غمِ عشق سے آزاد نہیں ہے
پابندِ وفا خوگرِ فریاد نہیں ہے

بلبل ہو کہ گل کوئی یہاں شاد نہیں ہے
رہنے کی جگہ گلشنِ ایجاد نہیں ہے

اس دور کے انسان کو سب یاد ہے لیکن
اک رسمِ محبت ہی فقط یاد نہیں ہے

جینا ہے تو راحت کی تمنا سے گزر جا
ہے کون جو اس راہ میں برباد نہیں ہے

پامالِ تمنا ہی سہی راہِ وفا میں
مایوس مگر انجمؔ ناشاد نہیں ہے

غزل

فخر واحدی۔ میخانہ قت

کچھ رند نہیں ساری محفل ہی بہکتی
ساقی تری آنکھوں سے جس وقت چھلکتی
اُس حسنِ سراپا کی وہ چال خرا ما
پھولوں سے لدی ڈالی جس طرح لچکتی
کس طرح سکوں پاؤں تنہائی کی راتوں
سینے میں مرے ہر وقت اک پھانس کھٹکتی
محلوں میں جو رہتے ہیں احساس انہیں ک
فٹ پاتھ پہ اک دنیا کس طرح سسکتی
کتنی مترنم ہے اے فخرؔ شبِ وع
کانوں میں ہر اک لمحہ پایل سی کھنکتی

غزل

ڈاکٹر پرکاش چندر بنسل پرکاش شری رف

اے زندگی تو شہر میں بدنام ہو چکی
اب گھر کو لوٹ جا کہ تری شام ہو چکی
کیا ڈھونڈتے ہو آج کے انسان میں
غیرت تو اس کی دن گئے نیلام ہو چکی
کس طرح اب بجھائیے گا تشنہ کامیا
یہ زندگی تو ٹوٹا ہوا جام ہو چکی
عمرِ رواں ٹھہر جا ہمیں روک لے ت
معلوم ہو رہا ہے تری شام ہو چکی
محفل میں اُن کی لہجۂ فریاد کو بدل
اے دل ترا پکار یہاں عام ہو چکی
ساقی کی چشمِ مست کا یہ فیضِ خاص
جاگیر میکدہ بھی مرے نام ہو چکی
پرکاشؔ میرے سر پہ بھی الزام آئے
اُن کی گلی میں عاشقی بدنام ہو چکی

نظر میں رہتا ہے

(مقبول نصیر آبادی)

یہ کس کا عکس مری چشمِ تر میں رہتا ہے
یہ کون پردۂ دردِ جگر میں رہتا ہے

عجیب بات ہے کہ جنہیں کبھی سے بیگانہ
وہ ایک شخص جو میرے ہی گھر میں رہتا ہے

مرا جگر ہے کہ رہتا ہوں اس نشیمن میں
ہمیشہ جو زدِ برق و شرر میں رہتا ہے

نظر میں ان کی ہے کیا چیز وسعتِ دریا
سفینہ جن کا ہمیشہ بھنور میں رہتا ہے

یہ کم ہے کیا کہ سلامت ہو رہے اس گھر میں
کہ زلزلہ جہاں دیوار و در میں رہتا ہے

ہے مشکلات ہی سے کھیلنا مری فطرت
ہجومِ سنگ مری رہگزر میں رہتا ہے

کوئی تو بات یقیناً ہے جب ہی مقبول
سخنوروں کی ہمیشہ نظر میں رہتا ہے

غزل

ملکہ نسیم
ہوشنگ آباد

لبوں پہ آہ نہیں آنکھ اشکبار نہیں
تمہاری یاد میں ہے دل بھی بیقرار نہیں

اب اور زخم نہ دے مجھ کو گردشِ دوراں
ابھی تو ماضی کے زخموں ہی کا شمار نہیں

یہ صبر و ضبط کی مجبوریاں ارے توبہ
بہار میں بھی گریباں تار تار نہیں

ابھی نہ مجھ سے تقاضا کرو وفاؤں کا
ابھی زمانہ کے حالات سازگار نہیں

نسیم مجھ کو نہ مل پائے گی تیری منزل
ترے نصیب میں گر راہ کا غبار نہیں

باب انتقاد

سرور غزنوی

تاریخ اطبائے بہار (جلد اول)

مولفہ حکیم محمد اسرار الحق پروفیسر گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ

پیش لفظ از جناب حکیم مولانا عبدالاحد صاحب سابق پرنسپل گورنمنٹ طبی کالج پٹنہ اور مقدمہ مولف کے قلم جادو رقم کا رہینِ منت ہے۔ صوبہ بہار مذہبی، علمی، تاریخی اور طبی حیثیت سے ایک قابلِ ذکر مقام کا حامل رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں مولف نے تقریباً پونے دو صد ایسے اطبائے کرام کا تذکرہ تحریر فرمایا ہے جنہوں نے بہار اسٹیٹ کو طبی لحاظ سے سرفراز رکھنے میں مدد دی اکثر حکیموں کے خاص خاص نسخے دیکر کتاب کی افادیت و اہمیت کو بڑھایا گیا ہے یہ کتاب ایسی ہے کہ ہر طبیب اسے اپنے مطالعہ میں رکھے تو اس کے تجربات میں جہاں اضافہ ہوگا وہاں اسے کئی ایسے صدری نسخے بھی ہاتھ آئیں گے جن کے استعمال سے وہ اپنے زیرِ اثر مریضوں کو حیاتِ ثانی دلانے میں طبی مدد دے سکے گا اور اس کی شہرت میں اضافہ ہوگا۔ یہ کتاب عام گھروں میں بھی رکھی جانے کے قابل ہے ہر شخص اس میں درج شدہ کئی نسخوں سے اپنے اہل و عیال کی بیماریوں کا علاج کر سکتا بلاشک و شبہ یہ کتاب طبِ یونانی و آیورویدک میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے ضخامت ۲۲ x ۱۸ / ۸ سائز کے ۱۹۴ صفحات اور قیمت بارہ روپیہ۔ یہ کتاب بہار اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے مولف کے پتے انوار منزل محلہ دریاپور قطب الدین لین پٹنہ نمبر ۴ ۸۰۰۰ بہار سے اور دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے مل سکتی ہے۔

من کہ مکتوب الیہ

کوبنج ۱۶ر جولائی ۸۲ء
سردار بھائی
آداب و نیاز
کل شام کو راشٹرپتی کے انتخاب کا نتیجہ ریڈیو سے نشر ہو گیا عالیجناب گیانی ذیل سنگھ کی کامیابی پر خوشی ہوئی اسی وقت ایک قطعہ تاریخ تہنیتی کہہ کر معرفتِ کے آج کی ڈاک سے دلی روانہ کر دیا ہے قطعہ تاریخ آپ کی بھی نذر کر رہا ہوں

قطعۂ تاریخ کامیابی نو منتخب صدر ہندوستان
عالیجناب عزت مآب سردار گیانی ذیل سنگھ صاحب
صدارت ہند کی تم کو مبارک ذیل سنگھ صاحب
تمہاری فتح یہ جمہوریت کی اک نشانی ہے
تمہاری کامیابی پر خوشی ہے سارے بھارت کو
مبارک ہو کہ اب دلی تمہاری راجدھانی ہے
ترقی دیش کی ہوگی تمہاری رہنمائی میں
تمہاری ذات سے وابستہ ملکی کامرانی ہے
نگاہِ لطف رکھے گا ذرا اردو زباں پر بھی
ادب اردو کا بھی سرمایۂ ہندوستانی ہے
الف سے اندراجی کہہ کہی تاریخ کوکب نے
تمہاری فتح کی، ”فتحِ عظیم الشان گیانی“ ہے
۱۹۸۲ء
شاہ کوکب القادری

گرامی قدر سردار صاحب
تسلیمات
جن حضرات نے منشی پریم چند صاحب کے ساتھ تعصب سے کام لیا ہے وہ کوئی بھی ہوں انھوں نے انسانیت اور اردو ادب کے ساتھ ظلم کیا ہے منشی پریم چند کا

ثانی اردو ادب آج تک پیدا نہیں کرسکا۔
فقط ڈاکٹر محمد یٰسین گھاتا کھنڈی
سہارنپور (یو۔پی)

۴۴ر سکندر نگر۔ غازی آباد
کرم فرمائے بندہ۔ تسلیم
آپ کی ادبی جسارت و جرأت مجھے پسند ہے منشی پریم چند میرے کرم فرماؤں میں تھے۔ ان کے متعلق آپ نے جس طرح لکھا ہے اکثر ہندو نہیں لکھ سکتے کیوں کہ وہ ڈرتے ہیں کہ فرقہ پرست نہ سمجھ لیے جائیں۔ یقینی ایک نقاد کو بے خوف اور بے تعصب ہو کر لکھنا چاہیئے پروردگارِ عالم آپ کو جلد شفا عطا کرے تاکہ آپ اردو زبان کی مخلصانہ خدمت انجام دیتے رہیں۔
خیر اندیش۔
ادیب لکھنوی

ذرا ٹھہریئے!

JULY 1982 Phone : 273602 Regd. [illegible]370

THE SHAN-E-HIND MONTHLY NEW DELHI-110002

Regd. with the Registrar of Newspaper at R. No. 644/[illegible]

چاند سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے اور گرمی دانے خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک یونانی دَوا ہے جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے لئے دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جِلد جل بھی جایا کرتی ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دُور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے اور ان تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبّے اور کھُجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور پھر آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

قیمت: چھ روپے

شرع لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

آپ کا نقصان
ہمارا نقصان
بے ٹکٹ مسافر!
آپ بچ نہیں سکتے
• انڈین ریلویز ایک عوامی فائدہ کی خدمت ہے جو کہ ہر روز تقریباً دس لاکھ مسافروں کو راحت پہنچاتی ہیں، اس کا نقصان لوگوں کا اپنا نقصان ہے۔
• آپ کو زیادہ سے زیادہ بہتر خدمت مہیا کر سکیں۔ اس کے لئے ہماری مدد کیجئے۔ ذمہ دار شہری کے ناطے آپ کا سہیوگ ہم سنجیدگی سے چاہتے ہیں۔
جب بھی آپ سفر کریں۔ ٹکٹ ضرور خریدیں
• بغیر ٹکٹ سفر انڈین ریلویز ایکٹ کے تحت قابل گرفتاری ایک جرم ہے۔
ناردرن ریلوے

अफ़ग़ानिस्तान मैत्री संघ

Friends of Afghanistan Association

फोन : 3035

गोवर्धन दरवाजा भरतपुर

निमन्त्रण-पत्र

प्रिय बन्धुवर,

आपको सहर्ष सूचित किया जाता है कि अफगानिस्तान मैत्री संघ, राजस्थान शाखा का अखिल प्रान्तीय अधिवेशन दि० 1 -19 सितम्बर, 1982 को भरतपुर में (परशुराम धर्मशाला में) सम्पन्न हो रहा है।

इस अधिवेशन में श्री राम जेठमलानी, एम० पी०, श्री सिकन्दर बख्त, भू० पू० केन्द्रीय मंत्री, श्री आरिफबेग, भू० पू० केन्द्रीय राज्यमंत्री, संघ के केन्द्रीय महामंत्री आचार्य धर्मेन्द्रनाथ एवं डॉ० प्रशान्त वेदालंकार आदि प्रमुख वक्ता होंगे। अधिवेशन की अध्यक्षता श्री अजीतसिंह सागर, एडवोकेट करेंगे।

आपसे अनुरोध है कि अधिक से अधिक कार्यकर्ता बन्धुओं के साथ पधारें।

विशेष निमंत्रित बन्धु :

श्री एम०एस० शाकिर अध्यक्ष, अफगानिस्तान मैत्री संघ आंध्रप्रदेश	श्री महेश जेठमलानी एडवोकेट अध्यक्ष, महाराष्ट्र शाखा	श्री फारूख अब्दुल्ला अध्यक्ष, काश्मीर शाखा
डॉ० हमीद कुरैशी अध्यक्ष, मध्यप्रदेश शाखा	श्री चमनलाल गुप्ता अध्यक्ष, जम्मू शाखा	श्री मौलाना इमदाद साबरी अध्यक्ष, दिल्ली शाखा

कार्यक्रम

दिनांक 18 सितम्बर, 1982

उद्घाटन	प्रातः 10 बजे	परशुराम धर्मशाला, रेल्वे स्टेशन के सामने
प्रतिनिधि सम्मेलन	प्रातः 10.30 बजे से 1 बजे दोपहर तक	,,
भोजनावकाश	दोपहर 1 बजे से 3 बजे अपराह्न तक	,,
विश्राम	अपराह्न 4 बजे तक	,,
खुला अधिवेशन	अपराह्न 4 बजे से 6 बजे साय तक	,,
आम सभा	सायं 7.30 बजे से	लक्ष्मण मन्दिर

दिनांक 19 सितम्बर, 1982

प्रतिनिधि सम्मेलन	प्रातः 10 बजे से 1 बजे दोपहर तक	परशुराम धर्मशाला, रेल्वे स्टेशन के सामने
समापन-पत्र	अपराह्न 3 बजे से	,,

(प्रतिनिधिगण अपना बैज 5/- देकर ले लें, भोजन शुल्क भी इसी में शामिल है)

निवेदक :

[illegible]राज गोपाल [illegible], भरतपुर जिला	अजीत सिंह सागर अध्यक्ष, राजस्थान प्रदेश	चौधरी हरिकिशन अध्यक्ष, स्वागत समिति

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
امن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی
آزادی ایڈیشن

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

محبوبۂ وطن ہے مری جان جگر
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست
دنیا امن کو آبیاری

زرِ سالانہ ۱۸/-
فی پرچہ ۲/-

شمارہ نمبر ۸		اگست سنہ ۱۹۸۲ء		جلد نمبر ۴۳

پندرہ اگست

توصیف علی عاصی بی۔ اے

حُریت کی داستان پندرہ اگست — سرفروشی کا بیان پندرہ اگست
جہدِ حق کی ایک تاریخ عظیم — عزمِ محکم کا نشان پندرہ اگست
حاملانِ شوق کی راہِ طلب — منزلوں کا رازداں پندرہ اگست
جن کے ہاتھوں سے بنی تقدیرِ نو — آن کا اک عزمِ جواں پندرہ اگست
عظمتِ قومی کی راہوں کا ستوں — فکرِ قومی کا نشاں پندرہ اگست
ایک نیا افسانۂ فکر و نظر — جذبِ دل کا ترجماں پندرہ اگست
شامِ غم کا اختتامِ دلپذیر — صبحِ نو کا رازداں پندرہ اگست
خوں ہوا صدیوں کا جن کے واسطے — ایسے خوابوں کا بیاں پندرہ اگست
ہیں جہاں حیرت میں اربابِ خرد — وہ جنوں کی داستاں پندرہ اگست
باہمی انس و محبت کا نقیب — ربطِ باہم کا بیاں پندرہ اگست
سرفروشانِ وفا کا بابِ نو — جرأتوں کی داستاں پندرہ اگست
زندگی کے سازِ نو کی اک ترنگ — نغمۂ قلبِ جواں پندرہ اگست
جس سے بدلی صحنِ عالم کی فضا — وہ بہارِ گلستاں پندرہ اگست
ہے حقیقت [illegible] خوشیوں کا امیں — وہ پیامِ شادماں پندرہ اگست

جس سے عاصیؔ سربلند اپنا ہوا
ہے وہ عظمت کا نشاں پندرہ اگست

تعمیرِ نو

"از" ہامنت مہنت رتی پنڈوروی

زمانے کی ہوا بدلی، فضا بدلی، چمن بدلا — زمیں بدلی، زماں بدلا، فلک کا بھی چلن بدلا
تبھی پھر محفلِ جمہوریت رنگِ سخن بدلا — تکلم کیوں نہ بدلے جب زباں بدلا دہن بدلا

بدلتی روشنی میں تم بھی اے اہلِ وطن بدلو
بلندی پر اڑو پستی کا اب عہدِ کہن بدلو

پرانی ذہنیت بدلو، قدامت کا جہاں بدلو — جھکے رہتے تھے جن پر وہ پرانے آستاں بدلو
پرانے وقت کے گویا زمین و آسماں بدلو — اٹھو اب تو ذرا برطانوی ہندوستاں بدلو

تمہارے ہر قدم پر منزلیں قربان ہو جائیں
زمانے بھر کی عقلیں دیکھ کر حیران ہو جائیں

تمہارے دل میں پیدا ہو فراخی ہفت کشور کی — تمہاری آنکھ سے پھر جائے پتلی چشمِ اختر کی
لرزتی ہو تمہارے سامنے ہیبت سکندر کی — نہ لائے تاب آہن بھی تمہارے تیز خنجر کی

ارادوں میں ہمالہ سے بھی بڑھ کر استواری ہو
درِ دولت پہ حاضر ہاتھ باندھے کامگاری ہو

تمہیں دشمن کو بھی حسنِ عمل سے رام کرنا ہے — جہاں کی نامور قوموں میں اپنا نام کرنا ہے
جہاں خود کامیابی داد دے وہ کام کرنا ہے — تنفر کو مٹا کر دوستی کو عام کرنا ہے

تمہیں حبِ وطن کی آرزو بے چین رکھتی ہو
تمہاری زندگی الفت کا نصب العین رکھتی ہو

جواہر کا تخیل جس میں ہو سردار کا دل ہو — وفا نیتا جی کی ہو باپو کا وہ ایثار کامل ہو
تلک کا عزمِ راسخ مالوی کا شوق حاصل ہو — تمہیں ہر نقشِ پا منزل ہو ہر اک موج ساحل ہو

تمنا سامنے آئے کمالِ ارتقا بن کر
وطن کے سر پہ سایہ ڈال دو بالِ ہما بن کر

ترقی یافتہ ڈھب سے ہو پھر تعمیر بھارت کی — نظر آتی ہو ہر شے عالمِ تصویر بھارت کی
درخشاں ہو مثالِ مہر و مہ تقدیر بھارت کی — زبانِ مغرب و مشرق پہ ہو توقیر بھارت کی

تمہاری ہر صدا سے امن کا پیغام ملتا ہو
نگاہوں سے شرابِ دلبری کا جام ملتا ہو

مزا جب ہے یہاں انگلینڈ صنعت سیکھنے آئے — بصد اخلاص امریکہ تجارت سیکھنے آئے
عرب علم و ہنر یونان حکمت سیکھنے آئے — زراعت چین تو یورپ تجارت سیکھنے آئے

نئی تعمیر میں اپنا وطن جنت نشاں کر دو
بیاباں کو رتی حسنِ عمل سے گلستاں کر دو

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد

اردو اکاڈمی دلّی

اردو کے عاشقوں، ہندی کے پریمیوں اور پنجابی پر مر مٹنے والوں نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ دلّی میں بھی اردو اکاڈمی ہندی اکاڈمی اور پنجابی اکاڈمی قائم کرے۔ یہ تینوں اکاڈمیاں قائم کر دی گئیں اور تین بے کاروں کو ان اکاڈمیوں کا سیکریٹری بنا کر بٹھا دیا گیا تو ساتھ ہی عوام کا مطالبہ پورا کر دیا گیا۔ ان اکاڈمیوں کو قائم کرتے وقت جو لائحۂ عمل بنایا گیا وہ بڑا ہی خوشگوار اور خوش کن تھا۔ اردو اور پنجابی والوں کا تو پتہ نہیں مگر ہندی اکاڈمی کے سکریٹری اور دیگر اصحاب نے ٹی۔ وی پر ایک مباحثہ میں ہندی اکاڈمی کے [illegible] شدہ پروگرام کے بارے میں جو بلند بانگ دعوے کئے تھے انہیں سنتے ہوئے دلی حکومت کی داد دیتے ہی بنتی تھی کہ کس انداز سے عوام کو اُتو بنایا گیا ہے۔ ہندی اور پنجابی اکاڈمیوں کی کارگزاری کا تو خیر ہمیں کچھ علم نہیں مگر اردو اکاڈمی کا یہ حال ہے کہ [illegible] کی پہلی منزل پر نصف کمرہ الاٹ کیا گیا ہے باقی نصف کمرے میں کسی دوسری اکاڈمی کا دفتر ہے۔ اردو اکاڈمی کے سکریٹری صاحب کو اگر کچھ لکھنا ہو تو وہ اڑوس پڑوس کے کسی سرکاری دفتر سے کاغذ کے دو شیٹ مانگ کر کام چلاتے ہیں۔ مگر اس ستم ظریفی کی داد دی جانی چاہئے کہ اردو اکاڈمی کے لئے کار خریدی گئی ہے۔ (ہندی اور پنجابی اکاڈمیوں کے لئے بھی کاریں خریدی گئی ہیں) چونکہ جو روپیہ ان اکاڈمیوں کے لئے الاٹ کیا گیا تھا اس میں سے کسی زبان کی ترقی یا تحفظ کے لئے ابھی تک ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کیا گیا لہٰذا سابقہ ۳۱ مارچ کو یہ روپیہ ختم کرنا ہی تھا۔ دلی کے سابق لفٹیننٹ گورنر جناب [illegible] صاحب کے حکم سے ہر اکاڈمی کے لئے ایک ایک کار خریدی گئی یعنی صحیح معنوں میں بے کاروں کو با کار بنا دیا گیا کیونکہ ظاہر ہے کہ ان کار [illegible]

پر ہم یا آپ تو بیٹھنے سے رہے لے دے کے یہی سکریٹری صاحبان ہی انہیں استعمال کریں گے۔

اردو اکاڈمی کے نامزد ممبران سے ہم دریافت کرتے ہیں کہ وہ اتنا تو بتانے کی تکلیف گوارا کریں کہ دلّی کی اردو اکاڈمی نے اب تک کون سے ایسے کام انجام دئے ہیں جن سے اردو کو کچھ تقویت ملی ہو۔

جناب جگ موہن صاحب لفٹیننٹ گورنر کے ہاتھوں ہی یہ اکاڈمیاں ظہور میں آئی تھیں اور تقریباً سوا سال کے بعد وہ پھر اپنے سابقہ مقام پر تشریف لے آئے ہیں۔ ہم انہیں سے گزارش کریں گے کہ وہ ان اکاڈمیوں کا محاسبہ کریں اور دیکھیں کہ ان اکاڈمیوں نے واقعی کچھ کام کیا ہے یا محض سرکاری روپیہ جو اصل میں عوام کا ہی ہوتا ہے اسے ضائع کیا گیا ہے۔

اردو اکیڈیمی اُترپردیش کی چارسو بیسی

اُترپردیش اردو اکاڈمی نے گزشتہ مالی سال کے اختتام پر اردو کتب کے مصنفین کو جو انعامات دئے جانے کا اعلان کیا یا مسودات پر جزوی امداد منظور کی یا لائبریریوں کے لئے مالی امداد کی منظوری دی گئی ان میں وہ حضرات جو محض لکھنؤ کے رہنے والے تھے انہیں ۳۱ مارچ تک رقوم کی ادائیگی کر دی گئی تاکہ مقامی حضرات بار بار مطالبہ نہ کریں یا دفتر اکاڈمی میں آکر بازپرس نہ کریں کہ مالی سال کے اختتام تک رقوم کی ادائیگی کیوں نہیں کی گئی مگر بیرونی حضرات کو یہ رقوم ۱۰ اگست کے وسط میں ادا کی گئیں چار ساڑھے چار ماہ تک یہ ادائیگیاں کیوں نہ کی گئیں اس کا جواب اردو اکاڈمی اترپردیش کے ذمہ دار حضرات سے سرکاری طور پر پوچھا جانا ضروری ہے۔ کیونکہ اکاڈمی کی اس تاخیر کے باعث جناب [illegible] چار ماہ تک وظیفہ کی رقم نہ ملنے کے باعث علاج کے لئے دوا دارو نہ خرید سکے اور راہی ملک [illegible]

... آج پیدا کرنے والے وزیر اعلیٰ جو فعال ہونے کا دعویٰ کرتے ... کیا وہ آس پہلو پر اُردو اکاڈمی کا محاسبہ کرنے کے لئے کوئی ... قدم اُٹھائیں گے۔

... ستھان اُردو اکاڈمی کے سابق سکریٹری سرکاری طور پر تحقیقات ہونی چاہئے

... ستھان اُردو اکاڈمی کے سابق سکریٹری ایک اردو ناخواندہ ... وزیر کے تھے۔ اسے ہے جنہیں اس مسلمان وزیر نے اکاڈمی ... سکریٹری بنادیا۔ اکاڈمی کا سرکاری ٹیلی فون سکریٹری صاحب ... نے گھر میں لگوا رکھا تھا اس لئے سکریٹری صاحب کے اہل و عیال ... اس ٹیلی فون کو اس بے دردی سے استعمال کیا کہ ٹیلی فون ... بل ڈیڑھ ہزار روپیہ کے قریب آنے لگا چونکہ سکریٹری صاحب ... سسرال دہلی میں ہے لہٰذا ان کی بیگم اور بچے دن میں کئی کئی ... دہلی سے براہِ راست فون پر رابطہ قائم کرتے اور سکریٹری ... کی بیگم صاحبہ اپنی والدہ یا بہن سے دریافت فرماتیں اماں ... کیا پکا ہے آپا نے آج کون سا کپڑا خریدا ہے۔ جے پور ... تو دلی ایسے پان نہیں ملتے۔ غرضیکہ اس سرکاری ٹیلی فون ... بے دردی سے استعمال کیا گیا کہ اکاڈمی کا ہزار ہا روپیہ ... شغل میں ہی ضائع کر دیا گیا۔ اب وہی ٹیلی فون ہے ... اس کا بل دو تین صد روپیہ سے نہیں بڑھتا جب کہ اس میں ... فون کا کرایہ بھی شامل ہے۔

اگر کوئی قانون ایسا ہو کہ جس کی رُو سے اُردو اکاڈمیوں ... بھی محاسبہ کیا جا سکے تو راجستھان اُردو اکاڈمی کے سابق ... سکریٹری سے بھی ٹیلی فون کے اس ناجائز استعمال پر ہزار ہا ... روپیہ برباد کئے جانے کی باز پرس ہونی چاہئے۔

... جعلی پاکستانی ویزا کا دھندہ عروج پر

... جاتا ہے کہ جعلی پاکستانی ویزا کے متعدد واقعات پاکستانی ... سفارت خانہ کے افسروں نے حکومتِ ہند کے نوٹس میں لائے ... حکومت نے کچھ لوگوں کو اس دھندے میں ملوث پاتے ہوئے ... کے خلاف کارروائی بھی کی مگر قانونی خامیوں کے باعث

ایسے لوگوں کی عدالتوں میں فوری طور پر ضمانتوں پر رہائی عمل میں آنے کے باعث انہی حضرات نے یہ دھندہ اور بھی تیزی اور بے خوفی سے جاری رکھا چنانچہ پچھلے ہفتہ بھی یہی چار حضرات اسی دھندے میں ملوث پائے گئے یہ خبر بھی گرم ہے کہ مراد آباد، بریلی، آگرہ، رامپور وغیرہ کئی مقامات پر جعلی پاکستانی ویزے بنائے جانے کا باقاعدہ دھندا جاری ہے۔ پاکستانی ویزا پر جو ابھو سنگ مشین سے مہر لگائی جاتی ہے ان جعل سازوں نے ایسی ہی ابھو سنگ مشینیں بھی بنوالی ہیں اور ہر پاکستانی ویزا آفیسر کے جعلی دستخط بنانے کی مہارت بھی ان لوگوں نے حاصل کرلی ہے۔

پاکستانی سفارت خانہ کو اس قسم کے جعلی ویزوں کا علم جبھی ہو سکتا ہے جب اس قسم کا کوئی پاسپورٹ (جس پر جعلی ویزا جاری کیا جا چکا ہو) سفارت خانہ میں دوبارہ پیش کیا جائے۔ یہ جعلی ویزے پانچ صد سے ایک ہزار روپیہ تک معاوضہ لے کر دئے جاتے ہیں اور اس طرح سے ویزے حاصل کرنے والے وہ لوگ ہیں جو یا تو اسمگلنگ کا کام کرتے ہیں یا وہ لوگ ہیں جو پاکستان جا کر واپس آنا نہیں چاہتے کیونکہ پاکستان میں کمائی کے ذرائع ہندوستان سے زیادہ ہیں اور وہاں مزدوری کی اجرت یہاں کے مقابلہ میں کافی زائد ہے اور یا پھر وہ لوگ ان جعلی ویزوں کا سہارا لیتے ہیں جنہیں پاکستان جا کر وہاں سے خلیجی ممالک کی طرف جانا ہوتا ہے کیوں کہ ہندوستان کی بہ نسبت پاکستان میں وہ سہولتیں بہتر طور پر مہیا ہیں جن کی وجہ سے یہ حضرات خلیجی ممالک میں آسانی سے جا سکتے ہیں۔

مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کے جعلی ویزوں سے پاکستانی معیشت اثر انداز ہوتی ہے اور حکومتِ ہند کا فرض ہے کہ وہ دوستانہ فضا کو اور بھی صاف کرنے کے لئے پاکستانی سفارت خانہ کی اس سلسلہ میں پوری طرح سے مدد کرے اور جعلی ویزے بنانے والوں کے لئے سخت قوانین بنائے جائیں۔ اس مسئلہ کا حل بہتر طور پر اور فوری طور پر اگر یہ کر دیا جائے کہ ایسے مجرموں کو

[پا]کستانی سفارت خانے کے حوالے کر دیا جائے یا دوسرے لفظوں [میں] پاکستانی حکومت کے سپرد کر دیا جائے تو پاکستانی پولیس ایسے [مجر]موں کا "سمری ٹرائل" کے ذریعے جو بڑا حال کرے گی اس [کے] پیشِ نظر پھر کوئی دل گردے والا ہی پاکستانی جعلی [پاسپورٹ] بنانے کا ناجائز دھندہ کر سکے گا۔

امید ہے کہ حکومتِ ہند اس سلسلے میں کوئی فوری عملی قدم اٹھائے گی کیوں کہ سننے میں آیا ہے کہ اب یہ جعل ساز سعودی عرب کے بھی جعلی ویزے بنانے لگے ہیں۔

نائب وزیر مالیات اور نیشنلائیزڈ بینک

مسٹر جنار دھن پجاری نائب وزیر مالیات نے بمبئی اور دہلی کے نیشنلائیزڈ بینکوں میں پچھلے دنوں اچانک تشریف لے جا کر بینکوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کچھ بینکوں میں کام ٹھیک ڈھنگ سے نہیں ہو رہا ہے مگر پجاری صاحب کے ان اچانک بغیر اطلاعی دوروں سے بینکوں کی کارکردگی میں قدرے سُدھار ہوا ہے مگر بیرونی چیکوں کی کلیرنگ میں ابھی تک کسی قسم کی پیش رفت نہیں ہوئی جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ جو بینک نیشنلائیزڈ نہیں ہیں ان کی کارکردگی ان بینکوں کی بہ نسبت کہیں بہتر ہے جو کہ نیشنلائیزڈ ہیں۔

مثال کے طور پر دینا بینک کی برانچ امین آباد لکھنؤ نے ہمارے دو چیکوں کو جو کہ دینا بینک دریا گنج برانچ کی معرفت کلیرنگ کے لئے بھجوائے گئے تھے کئی ماہ تک ردی کی ٹوکری میں ڈالے رکھا۔ اور کئی بار کی یاد دہانی اور ٹیلیگرام دینے پر بھی امین آباد برانچ دینا بینک نے دریا گنج برانچ کو کوئی جواب نہ دیا۔ تب دریا گنج کی دینا بینک برانچ نے ان دونوں چیکوں کی رقم ہمارے حساب میں جمع کر کے امین آباد برانچ کو اس کی اطلاع دی۔ اگر دینا بینک دریا گنج کی برانچ اس سلسلے میں ہماری مدد نہ کرتی تو شاید یہ معاملہ ابھی تک ویسے کا ویسے ہی لٹکتا رہتا۔

ضرورت ہے کہ مسٹر جنار دھن پجاری بینکوں کے متعلقین اعلیٰ کو یہ ہدایات جاری کریں کہ بیرونی چیکوں کی کلیرنگ میں ہر ممکن طور پر تیزی لائی جائے تاکہ پارٹیوں کا روپیہ ناجائز طور پر بے کار نہ پڑا رہے۔

ڈاکٹر تارا چند رستوگی کو صدمہ

۲۰ اگست کی صبح کو پہاڑ کی مٹی کا سیلاب دیوار توڑ کر ڈاکٹر تارا چند رستوگی کے مکان میں داخل ہو گیا جس کے باعث ڈاکٹر رستوگی کی بیوی جو آیور ویدک ڈاکٹر تھیں۔ ایک لڑکی بعمر آٹھ سال اور ایک لڑکا بعمر چھ سال اور ایک لڑکے کی بیوی ہلاک ہو گئے۔

ڈاکٹر رستوگی کے اس صدمہ میں ایڈیٹر شانِ ہند برابر کا شریک ہے۔ ڈاکٹر رستوگی نے جو اردو کی خدمت کی ہے بالخصوص اقبالیات کو جو نئے موضوعات دئے ہیں اور اسمیہ ادبیات کے تراجم کئے ہیں اس کی تعریف جس قدر بھی کی جائے کم ہے اور ان کی انگریزی تصنیف جو صوفی ازم اور اسلامی تصوف پر شائع ہوئی ہے وہ تو اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک اچھوتی اور قابلِ قدر تصنیف ہے۔

اس وقت ڈاکٹر صاحب جس مصیبت میں ہیں اس کا تصور ہی انسانی ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ گھر کی تباہی، بیوی، بچوں اور بہو کی ہلاکت سے ان کا دماغ ماؤف ہو چکا ہے اور ذہنی طور پر وہ دیوانگی کی حد کو چھو چکے ہیں ایسی قابلِ رحم حالت میں حکومتِ ہند کا فرض ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی ہر ممکن مدد کرے اور ان کی ادبی پنشن مقرر کی جانی انتہائی ضروری ہے اس سلسلے میں ملک بھر کی اردو اکاڈمیوں کا بھی فرض ہے کہ اردو کے اس محسن کی اس مشکل وقت میں ہر ممکن مدد کریں۔ شانِ ہند اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

(صفحہ ۱۰ کا بقیہ) مُردہ آنکھیں بھی پانی کے چھینٹے کو تیل کا چشمہ سمجھ کر گلاب کے پودے پر ایک بڑا سا پھول اُگ آیا تھا۔

گلاب کے اس پھول کا رنگ غیر معمولی حد تک گہرا سیاہ تھا۔

گلاب شہزادے کی کہانی ختم ہو چکی تھی مگر کسی [illegible] اسے شناخت

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

عبداللہ کمال ایک اچھے شاعر ہیں بمبئی کے ایک مسلمان گھرانے میں ان کا آنا جانا تھا اس گھرانے کی ایک لڑکی مُغل لائن (حج کے موقع پر یہ کمپنی عازمین حج کے لئے سمندری جہازوں کا انتظام کرتی ہے) میں ملازمت کرتی تھی اور معقول تنخواہ پاتی تھی۔ بدقسمتی سے یہ لڑکی شعر و شاعری کی دلدادہ تھی لہذا جب بھی عبداللہ کمال اس گھرانے میں جاتے تو کسی نہ کسی بہانے اپنے اشعار سناتے جن پر یہ لڑکی دل کھول کر داد دیتی اور اس داد کو عبداللہ کمال نے اپنی جنسی تسکین کی تکمیل کے لئے ایک گُڈ سگنل سمجھا اور انہوں نے اس لڑکی سے راہ و رسم بڑھانے کے لئے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جو اکثر آوارہ مزاج نوجوانوں کا شیوہ ہے۔ لڑکی میچور ڈ تھی اور ویسے بھی بمبئی میں مسلمان لڑکیوں کے لئے موزوں لڑکے ملنا مشکل ہے لہذا عبداللہ کمال کی لچھے دار باتوں، ان کے جدیدیت آمیز عشقیہ شعروں اور روشن مستقبل کے سنہرے خوابوں نے لڑکی کے دل و دماغ میں اپنا گھر علیحدہ بسانے کے جراثیم پیدا کر دئیے۔ لڑکی جانتی تھی کہ اس کے والدین عبداللہ کمال سے شادی کرنے کی اجازت قطعاً نہیں دیں گے۔ کیونکہ عبداللہ کمال کی عدم موجودگی میں اس کے والدین عبداللہ کمال سے بیزاری کا اظہار کرتے تھے اور اس کا ہر روز گھر میں آنا بُرا سمجھتے تھے۔ بہر کیف حُسن و عشق کی خفیہ اسکیم کے مطابق ایک دن عبداللہ کمال اور اس لڑکی نے بمبئی میں کسی مولوی سے نکاح پڑھوا لیا۔ گھر والوں کو پتہ چلا تو انہوں نے صاف لفظوں میں بیٹی سے کہہ دیا کہ اُس نے اپنی مرضی سے شادی کی ہے لہذا اب اُس کا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ حسن و عشق ایسے حالات کا پہلے ہی حل سوچ لیا کرتے ہیں۔ لہذا سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق لڑکی نے اپنے کپڑے، معمولی ساز یور، بستر اور بینک کی پاس بک اٹھائی اور عبداللہ کمال کی پناہ میں آگئی مگر عبداللہ کمال تو خود پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ لہذا

عبداللہ کمال لڑکی کو ساتھ لے کر دہلی چلے آئے اور شاہدرہ میں ایک کمرہ کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔ لڑکی پر عشق کا بھوت سوار تھا اس نے بلا عذر عبداللہ کمال کی ہر صلاح و مشورہ پر عمل کرتے ہوئے اپنا اکاؤنٹ دہلی ٹرانسفر کروا لیا جس سے کسی حد تک عبداللہ کمال کو مالی طور پر اطمینان ہو گیا اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں ملازمت حاصل کر لی۔ دو چار ماہ میں ہی لڑکی کی پاس بک عبداللہ کمال نے ردّی کاغذ میں تبدیل کر دی یعنی تمام روپیہ ختم کر دیا۔ اس عرصہ میں لڑکی پر یہ راز بھی عیاں ہو گیا کہ عبداللہ کمال شادی شدہ ہیں اور ان کے دو تین بچے بھی ہیں۔ لڑکی نے احتجاج کیا تو عبداللہ کمال ایک روز چپکے سے دہلی چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ لڑکی نے ایک دو دن انتظار کے بعد انجمن ترقی اردو ہند کے دفتر میں آکر پوچھ تاچھ کی تو پتہ چلا کہ وہ تو نوکری چھوڑ کر چلے گئے ہیں اب لڑکی کو اپنے عشق اپنے ذوقِ شاعری اور ماں باپ سے بغاوت اور مرد کی اصلیت کا احساس ہوا اور اسے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا مکان کا کرایہ بھی دو ماہ سے ادا نہیں کیا تھا مالک مکان ہندو تھا اس نے اور اس کی بیوی نے لڑکی سے کہا کہ وہ کرایہ مکان کا بقایا وغیرہ کچھ نہیں چاہتے اگر لڑکی اپنے ماں باپ کے ہاں بمبئی جانا چاہے تو وہ اسے اخراجاتِ راہ بھی دینے کو تیار ہیں مگر لڑکی جانتی تھی کہ ماں باپ اسے گھر کی دہلیز پر قدم رکھنے نہیں دیں گے۔ لہذا عبداللہ کمال نے اس عرصہ میں دو ایک جن اصحاب سے اپنی بیوی کا تعارف کرایا تھا یہ لڑکی صاحب کے ہاں گئی اور اپنی بپتا سنائی [illegible] نے اسے صلاح دی کر وا لیا [illegible] سامان اُٹھا کر [illegible] لے آئیں اور جب تک انہیں کوئی کام نہیں مل جاتا آن [illegible]

سنا ہیں سلیم شیرازی بھی عبداللہ کمال کی شاعر برادری کے ہی
ایک رکن تھے لہذا باتیں بنانے اور سنہرے خواب دکھانے
میں یہ عبداللہ کمال سے بھی دو قدم آگے نکلے چنانچہ یہ لڑکی
شاہدہ کمال کو چھوڑ کر اوکھلا میں سلیم شیرازی کے ہاں پناہ
گزین ہو گئی۔

ایک دن سلیم شیرازی کا ٹیلی فون دفترِ شانِ ہند میں
آیا۔ فرمانے لگے کہ مجھے انصاری صاحب کی زبانی معلوم ہوا
کہ آپ کو دفتر کے لئے کلرک کی ضرورت ہے۔ میرا جواب سنے بغیر
فرمانے لگے کہ ایک مصیبت زدہ لڑکی ہے اردو انگریزی میں
خاصی مہارت رکھتی ہے اگر آپ اسے دفتر میں کام
دے دیں تو مجھ پر احسان ہوگا عرض کیا بھائی اگر لڑکی کا
ہینڈ رائٹنگ اچھا ہے تو ضرور رکھ لیا جائے گا۔ تین
چار دن کے بعد یہ صاحبزادی دفترِ شانِ ہند میں ایک صاحب
کے ساتھ آئیں اور سلیم شیرازی کے حوالے سے تعارف کرایا
کوئی بات اگر اس لڑکی سے دریافت کی جاتی تو جواب یہ [illegible]
دیتے ان کی تعریف دریافت کی گئی تو فرمانے لگے میں پرتاپ
اخبار میں کام کرتا ہوں ان صاحب نے ہر ممکن کوشش کی کہ
یہ لڑکی دفترِ شانِ ہند میں کام حاصل نہ کر سکے اور میں خوش
تھا کہ جان بچی۔ تین چار دنوں کے بعد یہ صاحبزادی اکیلی
آئیں اور کہنے لگیں کہ وہ صاحب مجھے اپنے جال میں پھنسانا
چاہتے تھے اور یہاں جہاں بھی میرے ساتھ گئے۔ یہی کوئی
نہ کوئی اڑنگا ایسا لگا دیا کہ میرا کام بنتے بنتے رہ گیا۔ وہ
کہتے تھے کہ تمہیں نوکری کرنے کی کیا ضرورت ہے تم میرے
ساتھ رہو مجھے معقول تنخواہ ملتی ہے بڑے آرام سے گزر ہو
جائے گی مگر میں نے ان کی [illegible] کو خیر باد کہہ
کر انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم
صاحب سے مشورہ کیا تو انہوں نے مجھے آپ کے ہاں بھجوایا
ہے اور کہا ہے کہ سعید صاحب اگر تمہیں بغیر تنخواہ بھی اپنے
دفتر میں رکھیں تو منظور کر لینا کیونکہ میرے خیال میں
دفترِ شانِ ہند [illegible] تمہیں اور کہیں نہ مل سکے گی
میں نے ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کو فون کیا تو انہوں نے بھی
الفاظ دہرائے۔ اور یہ لڑکی دفترِ شانِ ہند میں کام کرنے لگی
دس بارہ دنوں کے بعد یہ لڑکی جب کام پہ آئی تو اس کی
آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے رات بھر روتی رہی ہو۔
دریافت کیا تو زار و قطار رونے لگی۔ میری بیوی اسے دوسرے
کمرے میں لے گئیں اور اس سے دریافت کیا تو اس نے بتایا
کہ سلیم شیرازی نے اپنی بیوی کو میکے بھجوا دیا اور جب میں
شام کو ان کے ہاں پہنچی تو پوچھا کہ بھابھی کہاں ہیں تو
انہوں نے بتایا کہ وہ کسی ضروری کام سے اپنے میکے
چلی گئی ہیں اور پھر سلیم شیرازی اپنی اصلیت پر اتر آئے
اور کہنے لگے کہ تمہیں میں نے اپنے مکان میں رکھا ہوا ہے
تمہیں کام بھی دلوا دیا ہے (حالانکہ اسے یہ ملازمت
ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کے فرمان پر ملی تھی) اب ہمیں اس کا
انعام ملنا چاہئے چنانچہ اس سے اچھا موقع اور کیا ہوگا
کہ بیوی یہاں ہے نہیں اور کسی قسم کا خطرہ نہیں اور اس کے
بعد سلیم شیرازی سلیم شیطانی بن کر دست درازی پہ
اتر آئے اور میں نے چیخ و پکار شروع کی تو سلیم شیرازی
نے غصے کی حالت میں میرا سامان باہر پھینک دیا اور مجھے
بھی گھر سے نکال دیا۔ رات بھر میں نے پڑوس کے ایک
گھرانے میں گزاری اور اب مجھے کچھ نہیں سوجھتا کہ کہاں
رہوں (دروغ بر گردنِ راوی)

میں اور میری بیوی نے باہم مشورہ کے بعد اس سے کہا کہ تم
دفتر کے آدمی کو ساتھ لے جاؤ اور اپنا سامان اٹھا کر ہمارے
ہاں آجاؤ، ہم دونوں میاں بیوی اس گھر میں رہتے ہیں
تمہاری بھی جگہ نکل آئے گی جب تک کوئی دوسرا معقول
انتظام نہیں ہوتا ہمارے ہاں رہو۔ جوں ہی یہ لڑکی
دفتر کے آدمی کے ساتھ نور نگر اوکھلا پہنچی تو اس کا چچا زاد بھائی
بس اسٹینڈ پر نظر آیا جو دہلی جانے کے لئے بس کا انتظار
کر رہا تھا اور دہلی میں وہ کسی اچھے سرکاری عہدے پہ تھا
اسے اپنی اس چچا زاد بہن کی از خود شادی کا علم تھا اور وہ
باپ سے بغاوت کا بھی [illegible] اسے سامان سمیت [illegible]
اور چند دنوں میں اس نے اس لڑکی کا سامان [illegible] بھجوا کر معاملہ
سلجھا دیا اور [illegible] چلی گئی۔

آل انڈیا مشاعرہ کیرانہ

کیفی [illegible] انصاری

کیرانہ (مظفرنگر) کا میلہ چھڑیاں بارش اور خرابیِ موسم کے باعث کسی قدر تاخیر سے ہو رہا ہے اس میلہ کی تقریبات میں جہاں کھیل تماشے قوالیاں، کوی سمیلن ہوتے ہیں وہاں ایک آل انڈیا مشاعرہ بھی ہوتا ہے چنانچہ میلہ کی تاریخوں کے ساتھ مشاعرہ کی بھی تاریخیں بدلتی رہی ہیں۔

آج ۸ جون ۸۲ء کی شب میں میلہ گراؤنڈ میں یہ محفلِ شعر و سخن منعقد ہو رہی ہے سوا گیارہ ہو چلے ہیں جناب مظفر رزمی صاحب مشاعرہ کے افتتاح کی رسم کے لئے جناب مقصود احمد صاحب (شاملی) سے ایک شمع روشن کرا رہے ہیں اور صدارت فرما رہے ہیں مسٹر جے، پی گرگ صاحب دونوں کو ہار پہنائے جا رہے ہیں اس پر تالیاں گونج اٹھی ہیں —!

ادھر پنڈال سامعین و اہلِ ذوق سے بھر چکا ہے ایک طرف مستورات کے بیٹھنے کے لئے انتظام کر دیا گیا ہے دوسری طرف اسٹیج کے ہر دو جانب کرسیاں اور صوفہ سیٹ بھی نظر آ رہے ہیں چونکہ یہ میلہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی علیہ الرحمۃ اجمیری کی یاد میں سالہا سال سے ہوتا چلا آ رہا ہے اور برسہا برس پہلے یہاں کے باشندے قومی یک جہتی سے آشنا ہو چکے تھے کیوں کہ اس میلہ میں بلا تفریقِ مذہب و ملت سب شرکت کرتے آ رہے ہیں۔ خواجہ صاحب نے سفر کے دوران یہاں بھی تین دن قیام فرمایا تھا۔ روایت یہی ہے اب آگے منتظمینِ مشاعرہ کا آغاز ہمیشہ سے نعت شریف سے ہوتا آ رہا ہے لہٰذا آج بھی نعت شریف ہی سے مشاعرہ شروع کرایا جا رہا ہے دہلی کے مشہور مترنم شاعر جمیل تاباں [illegible]

ان دنوں نمازیں بھی پڑھ رہے ہیں احتراماً ٹوپی یا کم از کم رومال سر پر رکھ لینا چاہئے تھا لیکن بہرحال یہ شاعر رہتے) لحنِ داؤدی میں نعت پیش کر رہے ہیں ؎

اے فخرِ دو عالم شہِ ابرار حبیبہ
اے وجہِ بہارِ بہارِ گلزارِ مدینہ

ہے دل میں بہت حسرتِ دیدارِ مدینہ
قدموں میں بلا لیجئے سرکارِ مدینہ

[illegible] داماں نظر کے چلا ہوں
کہتے ہیں کہ کعبہ ہے دربارِ مدینہ

حسرت ہے سدا دیدہ و دل پر مرے تاباں
ہوتی ہی رہے بارشِ انوارِ مدینہ

تاباں صاحب تالیوں کے شور میں اپنی جگہ جا رہے ہیں اور فیضی میرٹھی غزل سرا ہیں ؎

دیدہ و دل جل گیا ہے [illegible] نم کیجئے
کس طرح اس سے بیاں حالِ غم کیجئے

ہو رگِ جاں کے قریب پھر بھی مگر کہتے ہو دور
ہو سکے تو اور بھی کچھ فاصلہ کم کیجئے

زرد پتوں کا بھی گلشن سے تعلق تھا ضرور
بلبلو کیوں غنچہ و گل کا ہی ماتم کیجئے

فیضی صاحب داد وصول کرتے ایک اور ایک ادب کے شور میں مائک سے ہٹ رہے ہیں اور ڈاکٹر [illegible] کیرانوی رواں دواں ہیں ؎

جشن پہ جشن منائے [illegible] کس کا ہے
جام پہ جام چڑھا [illegible] کس کا ہے

سنا کر جا رہے ہیں غالباً [illegible]
محفل کے [illegible]

ارے واہ ـــــ ایک آواز ـــــ ایک اور ایک اور ایک اور
[illegible] ان، پھر آپ ایک پر اور غزل سے
پلا بھی ساقی واہ کیا [illegible] ہے
یہ کیسا جام چھلکا ہے کہ جام خالی ہے
گلشن کے خوب سماں باندھ کر کامران آ رہے ہیں اور تالیوں
کی گونج میں [illegible] اور عجیب ڈرامائی انداز میں راحت
اندوری اگر گرج رہے ہیں ـــ

جہاں آنکھیں کسی کے جگنو چمک رہے ہوں گے
اب اپنے گاؤں میں امرود پک رہے ہوں گے
نہ راستہ روکو اے میرے شہر کی سڑکو!
مرے کھلونے مری راہ تک رہے ہوں گے
سنبھال کر رکھو مگر میری انگلیوں کے نشاں
تمہارے ہاتھ پہ اب تک چمک رہے ہوں گے

حاضرین نے ایک ہنگامہ مچا دیا ہے اور آپ اسی طرح گرج
اور برس رہے ہیں ـــ

تیرے چھپر کے نیچے تھیں مری عیاشیاں
اور مرے اعمال کا سایہ مرے بچوں پہ تھا

داد دینے والے تالیوں پر اتر آئے ہیں ایسا دھماکا اور بھونچال
سا آیا ہے کہ پنڈال اڑنے کو ہو گیا لوگ کھڑے ہو گئے اور
راحت بھی فاتح محفل بنے چنگھاڑ رہے ہیں آپ سُنی
ان سُنی کرتے ہوئے آ رہے ہیں دیکھا تو [illegible] مظفر نگری
مائک پر آ گئے ہیں اور غزل سرا ہیں ـــ

صلیب و دار پہ اک دن سجا کے دیکھا ہے
ہمیں تھے اہل وفا آزما کے دیکھا ہے
رُلا کے ہم کو سنا ہے کہ تو بھی روتا ہے
ہمارے سامنے آ پھر رُلا کے دیکھ ابھی
نظر نہ آئیں گے ہم قہقہوں کی محفل میں
جو دیکھنا ہے تو آنسو بہا کے دیکھا ہے
تجھے بھلانے کا وعدہ تو کر لیا ہم نے
مگر [illegible] بھلا کے دیکھا ہے

[illegible] صاحب خوب [illegible] وصول کئے جا رہے
ہیں اور اب ہلال سیوہاروی نے بچھڑوں کے حضور سنا کر
داد پائی کہ بس لطف آ گیا نظم اس درجہ لاجواب طنزیہ تھی
ہر بند کو کئی کئی بار سنا افسوس کہ میں دو بند ہی نوٹ کر
سکا ملاحظہ فرمائیے ـــ

تم کبھی پل بھر میں بدل جاتے ہو دنیا کی طرح
بے سبب آ کے پلٹ جاتے ہو مینا کی طرح
دل بدل کے کبھی آ جاتے ہو نیتا کی طرح
ایک ہے روپ تو سو روپ دکھاتے کیوں ہو
یہ تو بتلاؤ کہ تم رات میں آتے کیوں ہو
کشتی وصل شب تار میں کھے سکتے تھے
زخم دیتے ہوئے مرہم بھی تو دے سکتے تھے
بوسہ لینا تھا تو آہستہ بھی لے سکتے تھے
اس قدر شدت جذبات دکھاتے کیوں ہو
یہ تو بتلاؤ کہ تم رات میں آتے کیوں ہو

ہلال صاحب بچھڑوں کے حضور میں سنا کر اور بے انتہا داد
پا کر مائک سے ہٹے تو دیکھا کہ تالیوں کی جھنکار میں وسیم بریلوی
آ کر [illegible] کر رہے ہیں ـــ

آج کا زمانہ اسی کا لگے
وہ جو پیاسا نہ ہو اور پیاسا لگے
اس کو چاہا بھی میں نے کچھ اس طرح
وہ کہیں بھی رہے صرف میرا لگے
میں خرید دوں تجھے تو خرید لے مجھے
گاؤں میں پھر کوئی ایسا میلا لگے

پنڈال میں ایک بھونچال سا آیا ہے کئی بار دہرا کر محفل کو
گرما رہے ہیں ـــ

رات بھر جھیل کی گود میں سو کے بھی
صبح کو چاند کیوں پیاسا سا لگے
ایک دل تھا اسے جانے کیا ہو گیا
اے وسیم ان دنوں کچھ نہ اچھا لگے

وسیم صاحب محفل میں تشنگی بکھیر کر مائک سے کھسکنا
چاہتے ہیں لیکن ایک گیت اور سنا کر تالیوں کے شور میں

رہزن و رہبر سبھی کمار جی کی نظروں میں ہیں
رفتہ رفتہ سب کا افسانہ رقم ہو جائے گا

اے سراپا حسن نخوت چھوڑ دل ہاتھوں میں لے
دل اگر جھک جائے گا تو سر قلم ہو جائے گا

شمیم صاحب کے ساتھ ہی پونے چار بجے پہلا دور ختم ہو رہا ہے دوسرے دور میں بھی شعراء کو خوب خوب سُنا اور پسند کیا گیا ادھر فرماتشین شباب پر تھیں اُدھر مسجد کا مؤذن پکارا اللہ اکبر اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے، اللہ سب سے بڑا ہے) اور تمام فرماتشین دم بخود اور چپ ہیں یکدم پورا مجمع اٹھ کھڑا ہوا۔ اگر ابھی اذان نہ ہوئی ہوتی تو یقیناً یہ مشاعرہ بھور یا اور چلتا

جناب نسیم صابری ایگزیکیٹو آفیسر میونسپل بورڈ کیرانہ جناب مظفر رزمی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ ہر سال ایک لاجواب مشاعرہ سُنوا دیتے ہیں اور اب کیا عرض کروں ایک عدد سلام قبول فرمائیے ۔۔۔ !●●

(ص ۲۷ کا بقیہ)

. . . . لیکن حقیقت یہ ہے کہ پریم چند نے برہمنوں، پانڈوں، مہنتوں، سادھوؤں سود خور بنیوں اور ہندوؤں کے اسی قبیلے کے پاکھنڈی اور سماج دشمن عناصر کی کردار نگاری میں اپنے قلم کی جس قدر جولانیاں دکھائی ہیں اس درجے کے مسلمان کرداروں کی نقشہ کشی میں پریم چند نے اپنے قلم کے جوہر کا عشر عشیر بھی نہیں دکھایا۔ ●●

دی بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

ہیڈ آفس: مرکنٹائل کوآپریٹو بینک بلڈنگ، ۷۸ محمد علی روڈ، بمبئی ۴۰۰۰۰۳

بینک کاری کے تمام اُمور بشمولہ غیر ملکی زرِ مبادلہ کا لین دین سے انجام دیتا ہے اس کے علاوہ آپ کا معیارِ زندگی بلند کرنے میں آپ کی ہمت افزائی کرتا ہے اور جملہ اقسام کے گھریلو استعمال کے سامان کے حصول میں آسان شرائط پر آپ کی مدد کرتا ہے

یکم اکتوبر ۱۹۷۹ء سے سود کی شرحیں

۱۔ سیونگ ڈپازٹس پر

(سیونگز اکاؤنٹس پر چیک سہولت کے ساتھ ۶ فیصد سالانہ)

۲۔ فکسڈ ڈپازٹس پر ۲ مارچ ۱۹۸۱ء سے

۱۔ ۱۵ سے ۴۵ دن تک ۳½ فیصد سالانہ
۲۔ ۴۶ سے ۹۰ دن تک ۴ " "
۳۔ ۹۱ دن سے زیادہ مگر ۶ ماہ سے کم ۵ " "
۴۔ ۶ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ۹ ماہ سے کم ۵٫۵ " "
۵۔ ۹ ماہ اور اس سے زیادہ مگر ایک سال سے کم ۶½ فیصد سالانہ
۶۔ ایک سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۲ سال تک ۸½ " "
۷۔ ۲ سال اور اس سے زیادہ مگر بشمولہ ۳ سال تک ۹½ " "
۸۔ ۳ سال اور اس سے زیادہ عرصہ پر ۱۱ " "

مندرجہ بالا شرح انٹرسٹ تمام شیڈولڈ اور نیشنلائیڈ بینکوں سے ایک فیصدی زیادہ ہے

دہلی برانچ

365 نیتاجی سبھاش مارگ، دریا گنج، نئی دہلی 110002

فون 264374 — 268266

برانچ منیجر: شمیم کاظم — دہلی زونل منیجر

ڈائریکٹر انچارج: ... گون والا

آفسٹ پرنٹنگ
طباعت کے آخری مراحل میں

منشی پریم چند کے افسانوں میں مسلم کردار

"پنچایت" اور "آہ بے کس" کا تقابلی مطالعہ

"پنچایت" کا شمار پریم چند کی بہترین کہانیوں میں ہوتا
.. ہند و مسلم یک جہتی کے موضوع پر لکھی گئی پریم چند کی
بھی کہانیوں اور ناولوں میں اس کہانی کو سر فہرست رکھا
سکتا ہے۔

یہ کہانی ماہنامہ "زمانہ" کی مئی، جون ۱۹۱۶ء کی مشترکہ
اعت میں اردو میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ
دی میں "پنچ پرمیشور" کے نام سے ہندی ماہنامہ "سرسوتی"
جون ۱۹۱۶ء کے شمارے میں بھی اشاعت پذیر ہوئی۔
اصل اردو اور اس کا ہندی ترجمہ ایک ہی ساتھ ہندی
ر اردو کے مشہور ماہناموں میں جون ۱۹۱۶ء میں شائع
ہے۔

یہ کہانی یقیناً مولانا عبدالماجد دریابادی جو خود اپنے
کو اسلام کے بارے میں انتہائی FANATIC کہتے
نے بھی پڑھی ہوگی۔ مولانا محمد علی جن کے مسلمانوں اور
سلام کے بارے میں خیالات سب پر روز روشن کی طرح
ں ہیں ان کی نظر سے بھی یہ کہانی ضرور گزری ہوگی۔ حتیٰ کہ
عباس حسین صاحب ایڈیٹر "تمدن" جنہوں نے بقول
مد شبلی پریم چند پر "متعصب اور فرقہ پرست" ہونے
زام لگایا تھا، نے بھی اس کہانی کو ضرور پڑھا ہوگا۔
یکن اس کہانی کے پڑھنے کے بعد آج تک کسی بھی انتہا پسند
سلمان شخصیت نے پریم چند پر اس کہانی کے موضوع یا
دکو لے کر فرقہ پرست ہونے کا یا "وہ انسانی کردار
کا تعلق اسلام سے ہے کا چہرہ مسخ کر دینے کا الزام
ہیں لگایا۔

لیکن اس کہانی کی پہلی اشاعت کے ٹھیک باسٹھ
سال بعد "فروغ اردو" کے پریم چند نمبر میں "منشی پریم
چند کے افسانوں میں مسلم کردار" (ص ۱۴۴ - ۱۵۷ء)
میں پریم چند کو "جارحانہ فرقہ پرست" ہونے کا مجرم
گردانتے ہوئے ان پر جو الزام عائد کئے گئے ہیں، شبلی
صاحب کی "فرد جرم" کی سب سے پہلی شق پریم چند کی
یہی کہانی ہے۔

پریم چند نے اپنی پہلی پانچ کہانیوں کے مجموعہ
"سوز وطن" کی بے ضابطہ ضبطی کے سلسلے کی تفصیلات
پیش کرتے وقت کلکٹر کے مندرجہ ذیل الفاظ لکھنے
کی جسارت کر دی تھی: "اپنی خوش قسمتی سمجھو انگریزوں
کی عملداری میں ہو۔ مغلوں کی حکومت ہوتی تو تمہارے
دونوں ہاتھ کاٹ لئے جاتے۔" مغل چونکہ اتفاق
سے مسلمان تھے۔ اس لئے شبلی صاحب کی رگ حمیت پھڑک
پھڑک کے پھوٹ پڑی اور شبلی صاحب نے سوز وطن کا شاخسانہ
کھڑا کر کے اپنی "تحقیق" کے جوہر دکھاتے ہوئے یہ ثابت
کر دیا" کہ پریم چند شہرت کے پیچھے بھاگنے والے ادیب
تھے اور کہ انہوں نے اپنے امیج کو بوسٹ BOOST
کرنے کی خاطر خوب نون مرچ لگا کر یہ سارا افسانہ اپنے
زرخیز ذہن کی مدد سے گھڑ کر دنیا کو بے وقوف بنایا۔
اسی طرح "پنچایت" کی مندرجہ ذیل سطور کے
پڑھنے کے بعد شبلی صاحب کا ذہنی تجزیہ کرنے کے
بعد میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ شبلی صاحب کا خون
کھول اٹھا اور انہوں نے قلم کے نام پر لٹھ اٹھا کر پریم چند پر

ہوا یہ وار کرنے شروع کر دئے۔ پریم چند کے الفاظ یہ ہیں۔
"شیخ جمن کی ایک بوڑھی خالہ تھیں ان کے پاس کچھ تھوڑی سی ملکیت تھی۔۔۔۔ جمن نے وعدے وعید کے سبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملکیت اپنے نام کرالی تھی۔ خالہ جان کی خوب خاطر داریاں ہوئی تھیں۔ خوب میٹھے لقمے اور چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے مگر رجسٹری کی مہر ہوتے ہی ان خاطر داریوں پر بھی مہر ہو گئی۔۔۔۔۔۔ آخر ایک روز خالہ جان نے جمن سے کہا: بیٹا تمہارے ساتھ تو میرا نباہ نہ ہوگا تم مجھے روپے دیدیا کرو میں اپنا الگ پکا لوں گی۔ ادھر جمن نے کچھ بھی دھیان لانے سے انکار کر دیا۔ مانگ ٹالا۔۔۔۔۔۔ میرا خون چوس لو۔ کوئی تمہارے ہی سمجھا تھا کہ تم خواجہ خضر کی حیات لے کر آئی ہو۔۔۔۔۔ خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سن سکتی تھیں۔ جامہ سے باہر ہو کر پنچائت کی دھمکی دے دی۔ جمن ہنسے جیسے وہ فاتحانہ ہنسی جو شکاری کے لبوں پر ہرن کو جال کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نظر آتی ہے۔۔۔۔۔۔ پنچایت کی صدا کس کے حق میں اٹھے گی اس کے متعلق شیخ جمن کو اندیشہ نہیں تھا۔ قرب و جوار میں ایسا کون تھا جو ان کا شرمندۂ منت نہ ہو؟ کون تھا جو ان کی دشمنی کو حقیر سمجھے۔۔۔۔۔۔ آسمان کے فرشتے پنچایت کرنے آئیں گے نہیں؟ مریض نے آپ ہی دوا طلب کی"۔

مغلوں کی طرح شیخ جمن بھی اتفاق سے مسلمان تھے چنانچہ شبلی صاحب کی رگِ حمیت یہ کس طرح گوارہ کر سکتی تھی کہ وہ ہندو ہو کر ایک مسلمان کو بے ایمان کہنے کی ہمت کریں۔

اس کہانی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے میں اس کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔

جمن شیخ اور الگو چودھری دونوں دوست تھے شیخ جمن کے والد شیخ جمراتی سے دونوں نے مدرسے میں ایک ساتھ تعلیم پائی تھی ہم نوالہ ہم پیالہ نہ ہونے کے باوجود دونوں پکے دوست تھے۔ جمن نے جب خالہ کی جائداد ہڑپ کر کے اسے نان و نفقہ سے بھی محروم کر دیا تو بڑھیا نے پنچایت بلائی جمن کو یقین تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے خلاف فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں کریں گے اور جب الگو چودھری کا نام سرپنچ کے طور پر پیش کیا گیا تو شیخ جمن کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی کیونکہ وہ ان کا بچپن کا دوست تھا۔ لیکن الگو چودھری نے بطور سرپنچ اپنی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے تمام حقائق اور بیانات کی روشنی میں شیخ جمن کے خلاف فیصلہ دیا۔ اس فیصلہ نے الگو اور جمن کی دوستی کی جڑیں ہلا دیں تناور درخت حق کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکا۔ وہ اب ملتے تھے مگر تیر و خنجر کی طرح۔ جمن کے دل سے دوست کی غداری کا خیال دور نہ ہوتا تھا اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔

الگو نے اپنا ایک بیل سمجھو سیٹھ کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا جس کی قیمت سمجھو نے ایک ماہ کے بعد دینے کا وعدہ کیا۔ سمجھو نے ایک ماہ کے اندر اندر گاؤں اور شہر کے درمیان مال ڈھوتے ڈھوتے بیل کو مار ڈالا۔ الگو بیل کی قیمت مانگتا تو ٹکا سا جواب دے دیتا۔ آخر الگو نے بھی پنچائت بلوائی اور سمجھو نے نہایت چالاکی سے جمن کو سرپنچ بنوا دیا۔ الگو کی امیدوں پر اوس پڑ گئی کیونکہ جمن بدلے کی آگ میں جل رہا تھا اور جمن کو الگو سے بدلہ لینے کا اس سے بہتر موقع کب ہاتھ لگنے والا تھا لیکن جمن نے سرپنچ کی گدی پر بیٹھتے ہی اپنی ذمہ داری کا احساس کیا۔ "اپنی ذمہ داریوں کا احساس اکثر ہماری تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح ہوتا ہے اور گمراہی کے عالم میں معتبر رہنما"۔ چنانچہ جمن نے سب حالات اور واقعات کا جائزہ لے کر فیصلہ الگو چودھری کے حق میں سنایا۔ "یہ فیصلہ سنتے ہی الگو چودھری کھڑے ہو گئے۔ اٹھ کر جمن کے سامنے آئے اور زور سے ہانک لگائی پنچ پرمیشوری کی جے۔"

"گھنٹہ بھر کے بعد جمن شیخ الگو چودھری کے پاس آئے اور ان کے گلے سے لپٹ کر بولے: بھیا! جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے میں دل سے تمہارا جانی دشمن تھا مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر

کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔ انصاف کے سوا
سے کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ بھی خدا کی شان ہے۔ آج
یقین آ گیا کہ پنچ کا حکم خدا کا حکم ہے۔"
انگو رونے لگے۔ دل صاف ہو گئے۔ دوستی کا مرجھایا
درخت پھر ہرا ہو گیا۔ اب وہ باطل کی زمین پر نہیں حق اور
انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔"

یہ تھی وہ کہانی جسے لے کر پریم چند نے ہندو مسلم
یک جہتی کا شاندار محل کھڑا کیا لیکن شبلی صاحب کی
کج نظری اور شر پسندی کا سانحہ اس میں بھی پریم چند کی آنکھ
کے تنکے پکڑ پکڑ کر نکالنے شروع کر دئے اس لئے کہ پریم چند
ایک مسلمان کردار یعنی شیخ جمن کو برے رنگ میں پیش
کیوں کیا یعنی اگر کسی کردار کے ہاتھوں اپنی خالہ کی جائداد
ہڑپ کر لینے کی خواہش دکھائی تھی تو یہ کام وہ الگو چودھری سے بھی
لے سکتے تھے۔ انہوں نے شیخ جمن کا گلا پکڑانے کی جسارت کس
طرح اور کیوں کر کر ڈالی۔

اس ساری کہانی میں پریم چند نے گاؤں کے ہندو
کی حرص اور طمع کا ذکر اس قدر تفصیل سے کیا ہے کہ
دل سے عاری لوگ بھی پریم چند کے قلم کو چومنے پر تیار ہو
گئے لیکن شبلی صاحب کے دل میں تو گرہ اسی وقت پڑ گئی
جب پریم چند نے ایک مسلم کردار ایسا پیش کر دیا کہ علم کی
بے پایاں دولت کے باوجود حرص و ہوس نے اس کا پیچھا
نہیں چھوڑا تھا اور اس نے اپنی بوڑھی بے آسرا خالہ کی جائداد
ہڑپ کر کے اسے خدا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

اس کہانی کے مقابلے میں پریم چند نے "آہ بیکس"
میں ایک ہندو کردار منشی رام سیوک کی حرص و طمع کی
کردار نگاری میں قلم کی جو جولانیاں دکھائی ہیں اس
کے مقابلے میں شیخ جمن کا کردار ایک دم پس منظر میں
پڑ جاتا ہے جس کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

"منشی رام سیوک موضع چاند پور کے ایک ممتاز رئیس
تھے اور [illegible] ملکے اوصاف حمیدہ سے بہرہ ور، وسیلۂ
معاش اتنا ہی وسیع تھا جتنی انسان کی حماقتیں اور
کمزوریاں۔ یہی ان کی املاک اور جائداد تھی ...... یہ
پیشہ محض اعزاز کے لئے تھا ورنہ اُن کی گزران کی صورت
بہت قرب و جوار کی بے کس مگر فارغ البال بیوائیں
اور سادہ لوح مگر خوش حال بڈھوں کی خوش اعتقادی
تھی۔ بیوائیں اپنا روپیہ ان کی امانت میں رکھتیں، بوڑھے
اپنی پونجی ناخلف لڑکوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے
کے لئے انہیں سونپتے اور روپیہ ایک دفعہ ان کی مٹھی
میں جا کر پھر نکلنا نہیں جانتا تھا۔ وہ حسب ضرورت
کبھی کبھی قرض بھی لیتے تھے۔ بلا قرض لئے کس کا کام چل
سکتا ہے؟ صبح کو شام کے وعدے پر روپیہ لیتے مگر وہ
شام کبھی نہیں آتی تھی۔ خلاصہ یہ کہ منشی جی قرض لے کر
دینا نہیں جانتے تھے اور یہ ان کا خاندانی وصف تھا۔
اس خاندان کی یہ رسم قدیم تھی۔"

"یہ معاملات اکثر منشی جی کے آرام میں مخل ہوا کرتے
تھے قانون اور عدالت کا تو انہیں کوئی خوف نہ تھا۔ اس میدان
میں ان کا سامنا کرنا پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرنا تھا۔
لیکن جب بعض شریر النفس لوگ خواہ مخواہ ان سے بدظن
ہو جاتے ان کی خوش نیتی پر شبہ کرتے اور ان کے منہ پر
علانیہ بدزبانیوں پر اتر آتے تو منشی جی کو بڑا صدمہ ہوتا
اس قسم کے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ ہر جگہ
ایسے تنگ ظرف حضرات موجود رہتے ہیں جنہیں دوسروں
کی تحقیر میں مزا آتا ہے انہیں بدخواہوں کی شہ پا کر بعض
چھوٹے چھوٹے آدمی منشی جی کے منہ [illegible] آ جاتے تھے ورنہ
ایک کنجڑن کا اتنا حوصلہ نہیں ہو سکتا تھا کہ ان کے گھر
جا کر ان کی شان میں نازیبا کلمات منہ سے نکالے۔
منشی جی اس کے پرانے گاہک تھے برسوں تک اس سے
سبزی لی تھی اگر دام نہ دئے تو کنجڑن کو صبر کرنا چاہئے تھا
جلد یا دیر میں مل ہی جاتے مگر وہ بدزبان عورت دو
سال ہی میں گھبرا گئی اور چند آنے پیسوں کے لئے ایک
معزز آدمی کی آبرو ریزی کی ......"

مندرجہ بالا الفاظ میں پریم چند منشی رام سیوک

اپدیش کے اعلیٰ خانوادے کی تعریف و توصیف کے بعد کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مونگا نام کی ایک بیوہ برہمنی تھی جس کا شوہر برما کی لڑائی میں مارا گیا تھا اور سرکار نے اس کے حسن خدمات کے صلے میں مونگا کو پانچ سو روپے دیئے تھے۔ جو اس نے منشی رام سیوک کو سونپ دیئے تھے اور ہر ماہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر گزارا کرتی رہی۔ مگر بیوہ بڑھیا ایسی سخت جان تھی کہ مرنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ آخر تنگ آ کر منشی جی نے مونگا سے کہا " مونگا! تمہیں مرنا ہے کہ نہیں؟ صاف صاف کہدو تاکہ میں اپنے مرنے کی فکر کروں " منشی جی کے یہ الفاظ سن کر مونگا کو ہوش آیا اور اس نے منشی جی سے حساب کرنے کو کہا۔ منشی جی نے ٹھینگا دکھایا کہ تمہارے حساب میں کچھ باقی نہیں ہے۔ سکینے مونگا کے حساب سے پورے ایک سو روپے منشی جی کی طرف سے واجب الادا تھے "اس نے منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا پورے سو تم نے دبائے ہیں، میں ایک ایک کوڑی لوں گی — مگر بے کسوں کا غصہ پٹاخے کی آواز ہے جس سے بچے ڈر جاتے ہیں اور اثر کچھ نہیں ہوتا "

بڑھیا نے پنچایت بٹھائی ".... پنچایت بیٹھی گاؤں کے آدمی جمع ہوئے منشی جی نیت اور معاملے کے صاف تھے انہیں پنچوں کا کیا خوف .... پگڑیاں کی نگری ہے پنچوں نے منشی جی کو رہا کر دیا پنچایت ختم ہو گئی — اور مونگا کو اب کسی خیال سے تسکین نہ ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھا کہ یہاں نہیں دیا نہ سہی وہاں کہاں جائے گا "

لیکن مونگا نے صبر نہیں کیا "اپنے جھونپڑے پر بیٹھی وہ رات دن انہیں صدق دل سے دعائیں دیا کرتی اور اکثر دعاؤں میں ایسے شاعرانہ انداز تھے، ایسے رنگین استعارے استعمال کرتی کہ سن کر حیرت ہوتی تھی "

رفتہ رفتہ وہ عورت پاگل ہو جاتی ہے اور ننگے پاؤں ننگے بدن مرگھٹ میں گھومتی رہتی ہے کبھی گاؤں میں آ کر منشی رام سیوک کے گھر کے سامنے اس کا قصیدہ پڑھتی ہے یہاں پریم چند نے منشی رام سیوک کے لڑکے رام غلام کا

کردار پیش کیا ہے "اس کی (مونگا کی) یہ ہیئت کذائی دیکھ کر لوگ ڈر جاتے تھے اب کوئی اسے مزاح کے طور پر بھی نہیں چھیڑتا۔ اگر وہ کبھی گاؤں میں نکل آتی تو عورتیں گھروں کے کواڑ بند کر لیتیں۔ مرد کترا کر نکل جاتے۔ اور بچے چیخ کر بھاگ جاتے۔ مگر کوئی لڑکا نہ بھاگتا تو یہ منشی رام سیوک کا صاحبزادہ رام غلام تھا باپ میں جو کسر رہ گئی تھی وہ ان کی ذات میں پوری ہو گئی تھی — لڑکوں کا اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ گاؤں کے کانے اور لنگڑے آدمی اس کی صورت سے بیزار تھے۔ ... وہ مونگا کے پیچھے تالیاں بجاتا۔ کتوں کو ساتھ لئے اس وقت تک رہتا جب تک وہ غریب تنگ آ کر نکل نہ جاتی...... آپ ہی آپ گھنٹوں باتیں کیا کرتی جس میں رام سیوک کے گوشت، ہڈی، پوست، آنکھیں، کلیجہ وغیرہ کھانے، مسلنے، نوچنے، گھسوٹنے کی پُر جوش خواہش کا اظہار ہوتا تھا اور جب یہ خواہش بے تابی کی حد تک پہنچ جاتی تو رام سیوک کے مکان کی طرف منہ کر کے بلند اور ڈراؤنی آواز سے ہانک لگاتی "تیرا لہو پیوں گی" منشی رام سیوک بڑے حوصلہ و جگر کے آدمی تھے نہ انہیں دیوانی کا خوف تھا نہ فوجداری کا۔ مگر مونگا کے ان خوفناک نعروں کو سن کر وہ بھی سہم جاتے تھے ہمیں انسانی انصاف کا چاہے خوف نہ ہو...... مگر خدائی انصاف کا خوف ہر انسان کے دل میں خلقی طور پر موجود ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایسے مبارک اتفاقات پیش آ جاتے ہیں جب نفس کے نیچے دبا ہوا یہ خیال اوپر آ جاتا ہے۔ مونگا کی وحشت ناک شب گردی رام سیوک کے لئے یہی مبارک اتفاق تھی اور ان کے لئے ان کی بیوی کے لئے جو ایک فرماں بردار عورت کی طرح ہر بات میں نہ صرف اپنے شوہر کا ساتھ دیتی تھی بلکہ آئے دن کے مباحثوں اور مناظروں میں زیادہ نمایاں حصہ لیا کرتی تھی۔ فرقہ اناث میں ان کے زور بیان کا عام شہرہ تھا۔ زبانی معاملات ہمیشہ وہی طے کرتی

...ا کا حصول تھی جو کہتے تھے کہ منشی جی کی دکان پر سر ہوتی
...یہ فیض ان کی بیوی کو حاصل تھا۔ زور بیان میں انہیں
...ملکہ تھا جو منشی جی کو زور تحریر میں اور یہ دونوں پاک
...میں اکثر عالم مجبوری میں مشورہ کرتیں کہ اب کیا کرنا
...ہے۔"

منشی پریم چند نے رام سیوک کی بیوی کا نام ناگن
...ہے اور باپ بیٹے کے اوصاف حمیدہ بیان کرنے
...ناگن کی تصویر کشی بھی خوب کی ہے یعنی [illegible]
...اب است یہ قصہ مختصر ایک رات مونگا ان کے مکان
...ہر دھرنا دے کر بیٹھ گئی اور "تیرا لہو پیوں گی" کہنے
...لگاتی۔ میاں بیوی نے سب جتن کئے مگر وہ وہاں سے
...۔ ان کے گھر کے باہر سینکڑوں لوگ جمع ہو کر تماشا
...نے لگے۔ رام سیوک کے فرماں بردار سپوت رام غلام
...یک ہانڈی میں گائے کا گوبر گھولا اور ساری غلاظت
...پر لا کر انڈیل دی اور پھر اس کے چھینٹے تماشائیوں
...ال دئے۔ غریب مونگا لت پت ہو گئی اور اٹھ کر
...غلام کی طرف دوڑی۔ صدہا تماشائیوں کے کپڑے
...ہو گئے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ منشی رام سیوک
...دروازہ ہے یہاں اسی طرح مدارات کی جاتی ہے۔
بھاگ چلو ورنہ اب کے کوئی اس سے اچھی خاطر
...جائے گی۔ ادھر مطلع صاف ہوا۔ ادھر رام غلام
...نے جا کر خوب ہنسا اور خوب تالیاں بجائیں۔
...جی نے اس مجموعۂ ناجائز کو ایسی آسانی اور خوبصورتی
...ہا دینے کی تدبیر پہ اپنے سعادت مند لڑکے کی پیٹھ
...ی۔ مگر سب بھاگے۔ مونگا جوں کی توں بیٹھی رہی۔
قصہ مختصر ـــــ مونگا ان کے دروازے کے باہر
...بھی جان دے دیتی ہے۔ اس کی لاش اٹھا کر
...نے لگانے کے لئے ان کی مدد کو کوئی تیار نہیں ہوتا
...تھک ہار کر باپ بیٹا مل کر اس کی لاش کو ایک
...پر لاد کر گنگا کے کنارے لے جاتے ہیں۔

پریم چند نے منشی رام سیوک کی بدنامی کا جو نقشہ
کھینچا ہے قارئین کے پیش خدمت ہے۔

"یہ ذکر دگارن میں کیسی ہل چل مچی اور منشی رام سیوک کیسے ذلیل ہوئے فضول ہے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ایسے غیر معمولی واقعہ پر جتنی ہل چل مچ سکتی ہے اس سے کچھ زیادہ ہی مچی اور منشی جی کی جتنی ذلت ہونی چاہئے تھی اس سے ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔ گاؤں کا چمار بھی ان کے ہاتھ کا پانی پینے کا یا انہیں چھونے کا روادار نہ تھا۔ اگر کسی کے گھر میں کوئی گائے بندھی بندھی مر جاتی ہے تو وہ شخص مہینوں در در بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ نہ حجام اس کی حجامت بنائے نہ کہار اس کا پانی بھرے۔ نہ کوئی اسے چھوئے۔ یہ گئو ہتیا کا پرائشچت ہے۔ برہم ہتیا کی سزائیں اس سے بدرجہا سخت اور ذلتیں بدرجہا زیادہ ہیں۔ مونگا یہ جانتی تھی اور اسی لئے اس دروازے پر آکر مری تھی۔ وہ جو زندہ رہ کر کچھ نہیں کر سکتی مر کر [illegible] سکتی ہوں گوبر کا اپلا جب جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو سادھو سنت لوگ اسے ماتھے پر چڑھاتے ہیں۔ پتھر کا ڈھیلا آگ میں جل کر آگ سے بھی زیادہ اور قاتل ہو جاتا ہے۔"

پریم چند کی مندرجہ بالا دونوں کہانیاں پڑھ کر وہی شخص پریم چند پر مسلم (یا اسلام) دشمنی کا الزام لگا سکتا ہے جس کے دماغ میں خلل ہو یا جو انتہائی شر پسند اور فتنہ پرداز ہو۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ پریم چند زندگی بھر ہندو مسلمان یک جہتی کے لئے کوشاں رہے اور اس کی حمایت میں کہانیاں، ناول اور بیسیوں مضامین سپرد قلم کئے۔ ہندوؤں کو ان کی تنگ نظری اور کوتاہ بینی پر لعنت اور ملامت کے کوڑے برساتے رہے حتی کہ کئی جگہوں پر انہوں نے اس عہد کے مسلمانوں کے غلط موقف کی حمایت بھی کی۔ لیکن اس کے باوجود پریم چند شبلی صاحب اور ان کی "امت" کے نزدیک اس لئے قابل گردن زدنی ہیں کہ انہوں نے کہیں کہیں کچھ بر خود غلط قسم کے مسلمانوں

(بقیہ صفحہ [illegible])

غزل

ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی

ہم کعبے کے دیوار و در و بام سے کھیلے
بت خانہ کی محفل میں بھی اصنام سے کھیلے

ہم کفر سے کھیلے کبھی اسلام سے کھیلے
یعنی کہ رہِ شوق میں ہر گام سے کھیلے

کیا خوب تھی گلزارِ محبت کی سکونت
دانے سے کھیلے کبھی دام سے کھیلے

ممکن ہی نہیں پہنچے وہ معراجِ بقا تک
جب تک کہ بشر زیست کے الزام سے کھیلے

جتنی بھی چڑھی ہم پہ گناہوں کی کثافت
اُتنا ہی زیادہ ترے اکرام سے کھیلے

جیسے بھی ہمیں گردشِ دوراں نے کھلایا
اُس طرز پہ ہم گردشِ ایام سے کھیلے

آخر کو کٹی عمر یونہی لہو و لعب میں
ہم صبح سے کھیلے تو کبھی شام سے کھیلے

دُنیا کی محبت کو دل و جاں سے بھلا کر
ہم دہر کے میدان میں آرام سے کھیلے

اس شوقِ شہادت پہ ہے قاتل کو بھی حیرت
ہم سر پہ کفن باندھ کے صمصام سے کھیلے

ساون کا مہینہ ہے گھٹا چھائی ہے گھر کر
توبہ کو بھی ہے شوق کہ وہ جام سے کھیلے

حاصل نہ ہوئی منزلِ مقصود خدایا
ہم مسجد و مندر میں ترے نام سے کھیلے

برگشتگیٔ عقل نے کیا ناچ نچایا
خوشیوں کے تصور میں ہم آلام سے کھیلے

اک یہ بھی کرشمہ ہے رتن حسنِ نظر کا
ہم اُن کو خدا مان کے اصنام سے کھیلے

غزل

[illegible]

زندگی میں اپنی جب تک غم نہ ہوں
یہ بھی ممکن ہے کہ ہم پھر ہم نہ ہوں

ہے دلِ ناداں ابھی ناپختہ کار
اِس کی گستاخی پہ وہ برہم نہ ہوں

کس کو شکوہ ہے جفا و جور کا
ہاں اگر یہ نعمتیں پیہم نہ ہوں

زندگی میں خوش مزاجی چاہئے
جیتے جی تو موت کے ماتم نہ ہوں

پاس ہو کر بھی رہیں کوسوں پرے
ایسے بھی انسان کے ہمدم نہ ہوں

اب غمِ دُنیا سے فرصت ہی نہیں
آپ مجھ سے اس لئے برہم نہ ہوں

جگمگاتا ہی رہے دل کا جہاں
مہر و ماہِ آرزو مدھم نہ ہوں

[illegible]

قطعات

جولئیس نحیف دہلوی

جس کے ہاتھوں میں جام ہوتا ہے
قابلِ احترام ہوتا ہے
پینے والوں کی انجمن میں نحیف
اس کو پہلے سلام ہوتا ہے

مجھ کو ہر ایک سے محبت ہے
میں بھلا کس پہ وار کرتا ہوں
دوستوں کا تو ذکر کیا ہے نحیف
دشمنوں کو بھی پیار کرتا ہوں

کیوں ستاتے ہو مجھ غریب کو تم
یہ کہو میں نے کیا بگاڑا ہے
تیر و نشتر چبھو کے سینے میں

گلاب شہزادے کی کہانی

حیدر قریشی

بھانت بھیلے ہوئے صحرا میں جب رات کا ایک پہر گزر نے
ے باوجود کسی کو نیند نہ آئی تو چاروں درویش اُٹھ کر بیٹھ گئے
پہلے درویش نے تجویز پیش کی کہ رات کاٹنے کے لئے اپنی اپنی
ونی کہانی سُنائی جائے سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور
پہلے درویش سے کہا کہ وہ خود اپنی زندگی کی کسی کہانی سے ابتدا
کرے۔

لمبے بالوں والا پہلا درویش تھوڑا آگے کو جُھکا اور پھر یوں
گویا ہوا۔

"میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے"۔
گلابی رنگ کو تم خوب پہچانتے ہو گے خون سُرخ رنگ کا ہوتا
ہے خون میں سفید رنگ ملا دیں تو وہ گلابی بن جاتا ہے لیکن
ر خون ویسے ہی کہیں جم جائے تو سیاہ ہو جاتا ہے ــــ خیر
میں کہہ رہا تھا ــــ میری کہانی گلاب شہزادے کی کہانی ہے
لیکن اس کے لئے مجھے عملاً بتانا پڑے گا۔
یہ کہہ کر پہلے درویش نے اپنے تھیلے سے گلاب کی ایک قلم
الی اور اسے ریت میں گاڑ دیا۔ "میری کہانی کا باقی حصہ اس
لم کے بڑھنے تک ادھورا رہے گا اس لئے بہتر ہے کہ آپ لوگ
ری باری اپنی کہانیاں سُنائیں ــــ میں آخر میں اپنی کہانی
مل کروں گا"۔

پہلے درویش کی اس بات پر دوسرے درویش نے اپنی
ہانی شروع کی۔

"میری کہانی عام سی ہے۔ میری بیوی نے اپنی آنکھوں کے
اڈوں اور ہونٹوں کے منتر سے مجھے ایک گدھا بنا دیا تھا اور میں
ا صدیوں سے بوجھ اُٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ پھر ایک دن مجھے
ا ایک "اسم" مل گیا۔ میں گدھے سے انسان بن گیا اور تب
امنے اپنے اسی "اسم" کے زور سے اپنی بیوی کو گھوڑی میں
تبدیل کر دیا"۔
تیسرا اور چوتھا، دونوں درویش اس کی کہانی بڑی
دلچسپی سے سُن رہے تھے جب کہ پہلا درویش گلاب کی اس
قلم کو دیکھ رہا تھا جس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے سے کانٹے
چپکے ہوئے تھے ــــ قلم آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔
"اب مجھے صحیح طور پر یاد نہیں رہا کہ پھر میں نے اسے
تانگے میں جوت دیا تھا، گھوڑ دوڑ کے کلب میں لے گیا تھا
یا ویسے ہی اسے سرپٹ دوڑاتا رہا ــــ یا پھر پتہ نہیں
وہ خود ہی سرپٹ دوڑتی رہی .... دوڑتی رہی ...."
"پھر ــــ کیا ہوا؟"
تیسرے اور چوتھے درویش نے بڑے اشتیاق اور تجسس
سے پوچھا۔
پہلا درویش ابھی تک گلاب کی اس بڑھتی ہوئی قلم
کو دیکھ رہا تھا۔
"پھر ــــ؟" دوسرے درویش نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیا۔
"پھر ــــ جب میری بیوی اپنی پہلی تنخواہ لائی تھی تو اس کا
چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا، اس نے اپنی آدھی تنخواہ
گھر کے اخراجات میں ڈال دی اور بقیہ آدھی بچوں کے مستقبل
کے لئے بنک میں جمع کرا دی۔ اور پھر ہمیشہ ہی اس کا یہی
طریق رہا۔ میری اور اس کی تنخواہ سے ہمارا گھرانا خوشحال
ہو گیا البتہ وہ اپنے باس کی بہت تعریف کرتی رہتی تھی۔ وہ
اس کا ضرورت سے زیادہ ہی خیال رکھتے تھے"۔
اچانک دوسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم پر
پڑی جو اس عرصہ میں حیرت انگیز طور پر دوگنی ہو گئی تھی اور
اب اس میں ننھے ننھے پتے بھی پھوٹ رہے تھے۔ اسے یوں
لگا جیسے کانٹوں میں پھنسی ہوئی گلاب کی پوری قلم کسی نے

اس کے حلق میں ٹھونس دی ہو۔

اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر بے اختیار پکارا — — "پانی ۔۔۔!"

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کی قلم کچھ اور سرسبز ہو گئی اور سبز پتوں کے ساتھ ایک سرخ پتا بھی ابھر آیا۔

دوسرے درویش نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی تینوں درویشوں نے دیکھا کہ بے انت پھیلے ہوئے صحرا نے خود کو خاصا سمیٹ لیا ہے۔ رات کا دوسرا پہر گزر چکا تھا۔

تیسرے درویش نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی کہانی شروع کی۔

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں تاریخ اور جغرافیے سے مجھے گہری دلچسپی ہے اور میرا تعلق بھی آثار قدیمہ سے ہے۔ تین بچوں کی پیدائش کے بعد میری بیوی نے مشورہ دیا کہ میں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کروں۔"

چوتھا درویش اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

پہلا درویش اب بھی گلاب کی اس پھیلتی پھولتی قلم کو دیکھ رہا تھا۔

"ایک دفعہ ایک کھنڈر سے کئی ہزار سالہ پرانی کھوپڑی دریافت ہوئی تو اس کے مطالعہ کے لئے مجھے بھی بلایا گیا، کھوپڑی کے مطالعہ کے بعد جب میں گھر آیا تو اپنی میز کے نیچے کاٹھ کباڑ میں سے کوئی چیز ڈھونڈتے ہوئے مجھے ایک مڑا ہوا تڑا مڑا غبارہ مل گیا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کھوپڑی اس غبارے میں موجود ہو اور وہ کھوپڑی میرے اپنے بیٹے کی ہو"!

چوتھا درویش اس کی کہانی میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

پہلا درویش گلاب کی اس مسلسل بڑھتی ہوئی قلم کو دیکھ رہا تھا جس میں سے اب شاخیں بھی پھوٹنے لگی تھیں۔

"میں خوف سے کانپ اٹھا۔ مجھے لگا میں نے اپنے بیٹے کو قتل کر کے اس کے سر کو محض کھوپڑی بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو اپنا خوف بتایا۔ بالآخر میرا خوف اس کی ضد پر غالب آ گیا۔ جس دن اس نے مجھے خوشخبری سنائی — مجھے یوں لگا جیسے ہزاروں برس پہلے کھو جانے والی میری قیمتی چیز مجھے دوبارہ ملنے والی ہے"۔

تیسرے درویش کی نظر گلاب کی اس قلم کی طرف اٹھ گئی جو اب گلاب کے پھیلتے پودے میں ڈھل گئی تھی۔

اسے یوں لگا جیسے گلاب کا پودا اس کے اندر موجود ہے اور کوئی اسے اس کے حلق سے باہر کھینچ رہا ہے۔ وہ خوف سے چلایا، "پانی"۔ پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔

گلاب کا پودا کچھ اور پھیل گیا اس کے سبز پتوں میں ایک اور سرخ پتا ابھر آیا۔

تیسرے درویش نے خوف زدہ آنکھوں سے یہ منظر دیکھا اور دم توڑ دیا۔

باقی دونوں درویشوں نے دیکھا کہ بے انت پھیلے ہوئے صحرا نے خود کو آدھا سمیٹ لیا ہے۔ رات کا تیسرا پہر گزر چکا تھا۔

چوتھے درویش نے مشکوک نظروں سے پہلے درویش کو دیکھا اور قدرے چوکنا ہو کر اپنی کہانی بیان کرنے لگا۔

"یہ کہانی دراصل میری نہیں۔ میرے ایک دوست کی ہے میں اسے اسی کی زبان میں بیان کروں گا"، چوتھے درویش نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"میرا بھائی گہری نیند سویا ہوا تھا اور میں اس کے کمرے میں بیٹھا اپنا کوئی کام کر رہا تھا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ میرے بھائی کی ناک سے شہد کی ایک مکھی نکلی — قریب ہی پانی کا ایک ٹب پڑا تھا جس میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تیر رہا تھا جو شاید کسی بچے نے ڈال دیا تھا — شہد کی مکھی اڑ کر لکڑی کے اس ٹکڑے پر جا بیٹھی۔ کچھ دیر بعد پھر اڑی اور میرے بھائی کی ناک میں داخل ہو گئی۔

میں یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا؟

"اچھا — پھر کیا ہوا؟" پہلے درویش کی مسکراہٹ بڑی سفاک تھی، وہ اب بھی گلاب کے اس پودے کو دیکھ رہا تھا جو مسلسل پھلتا پھولتا جا رہا تھا۔

"پھر — پھر —" چوتھا درویش خوفزدہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھ کر بولا۔

"پھر میرا بھائی بیدار ہو گیا۔ اس نے مجھے اپنا ایک حیرت انگیز خواب سنایا — اس نے بتایا کہ وہ کسی دریا کے کنارے کھڑا تھا کہ لکڑی کا ایک بڑا سا تختہ تیرتا ہوا اس کے قدموں میں آ گیا اور وہ اس پر سوار ہو گیا جب وہ تختہ اُسے دوسرے کنارے پر لے گیا تو اس نے دیکھا کہ وہ جگہ خزانوں سے بھری پڑی ہے مگر وہ اکیلا یہ خزانے نہ اٹھا سکتا تھا اس لئے دوسرے ساتھیوں کو لینے کے لئے واپس آ گیا۔"

"حیرت ہے — حیرت ہے" پہلا درویش بڑے مکارانہ انداز میں بولا اس کی نظریں اب بھی گلاب کے اس پودے پر گڑی تھی جو اب بڑی شان سے لہلہا رہا تھا۔

چوتھا درویش گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں بھائی کا خواب سمجھ گیا۔ میں نے اسے مار دیا۔ اور وہ جگہ جہاں ٹب پڑا تھا اور شہد کی مکھی لکڑی کے ٹکڑے پر تیرتی رہی تھی، اسے کھود ڈالا۔ وہاں واقعی خزانے تھے — مگر — مگر —"

"مگر کیا؟" پہلے درویش کے لہجے میں تشویش کی ہلکی سی پرچھائیں ابھری چوتھے درویش کی نظریں اس لہلہاتے ہوئے گلاب کے پودے پر پڑیں اور پھر وہی کیفیت۔

"پانی —"

پہلے درویش نے جلدی سے پانی کا کوزہ اس کے منہ سے لگا دیا۔ مگر چوتھے درویش نے کوزہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

پانی پیا۔

پھر گلاب کے پودے میں ایک اور سرخ پتے کو ابھرتے ہوئے دیکھا۔ خوف سے جھرجھری لی۔

"مگر کیا؟" پہلے درویش نے اسے جھنجھوڑ کر پوچھا۔

"مگر.... یہ پانی میرے دوست کا نہیں.... میری اپنی ہے..... اپنی...."

اور پھر چوتھے درویش نے بھی دم توڑ دیا۔

سارے صحرا نے خود کو سمیٹ کر پہلے درویش کے قدموں میں ڈال دیا۔

رات کا آخری پہر گزر چکا تھا۔

پو پھوٹ رہی تھی

پہلے درویش کے وحشیانہ قہقہے صحرا میں گونجنے لگے۔

ہا ہا ہا — اب اس صحرائی علاقے کی تیل کی دولت کا میں تنہا مالک ہوں۔ ایٹمی جنگ میں جتنے لوگ بھی بچ گئے ہوں گے سب میری رعایا ہیں اور میں اس نئے عہد کا حکمراں — عظیم حکمراں — ہا ہا ہا....؟

اچانک اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ اس نے کوزے کو دیکھا کوزہ خالی ہو چکا تھا۔

وہ گھبرا گیا

اور پھر پانی کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔

سمٹا ہوا صحرا پھر سے پھیلنے لگا۔

وہ دوڑتا رہا — دوڑتا رہا —

اور سمٹا ہوا صحرا پھیلتا رہا — پھیلتا رہا —

سورج نصف النہار تک پہنچ گیا اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔

اس کے سامنے تیل کے چشموں کا ذخیرہ تھا۔ کنوؤں کی بجائے چشمے

مگر پانی!

پیاس کی شدت

شدید تھکاوٹ

اور مسلسل پھیلتا ہوا صحرا۔

وہ تیل کے چشمے پر ہی پیاس بجھانے کے لئے جھک گیا اس کا جسم باہر پڑا تھا سر پانی کے چشمے میں ڈوبا ہوا تھا پھیلی ہوئی بانہیں آدھی سے زیادہ چشمے اور باقی بانہیں اور لمبے لمبے بال پانی میں لہراتے ہوئے تیر رہے تھے۔ اس

(بقیہ صفحہ ۱۴۲ پر)

غزل

پارساکوثری جے پوری

وحشتِ عشق مجھے اب کہاں لے آئی ہے
پیشوائی کو جہاں پر میری رسوائی ہے

بھولنے والے مجھے تیرے تغافل کی قسم
دل مرا آج بھی تیرا ہی تمنائی ہے

پرتوِ حسن سے دیوانہ بنایا جس نے
وہ ستمگر ہی مرا آج تماشائی ہے

آئینہ دیکھ کے چہرے کو چھپانے والے
کیا تجھے اب مری تصویر نظر آتی ہے

خلشِ غم کے سوا کچھ نہیں ملتا ہے وہاں
اُن کی محفل سے تو بہتر مری تنہائی ہے

یہ تو مانا کہ سمندر کی بھی حد ہے لیکن
میرے اس غم کی بھی یارب کوئی گہرائی ہے

پھر نہ چھن جائے کہیں پرسشِ احوال نہ کر
ہم نشیں آج تو مدت میں ہنسی آئی ہے

اور بھی بڑھ گیا دیوانہ جنوں کی حد سے
اُس نے جب ہنس کے کہا یہ میرا سودائی ہے

پارسا کیوں نہ پیوں توڑ کے توبہ اپنی
اُن کی صورت مجھے ساغر میں نظر آئی ہے

رُباعیات

ڈاکٹر شگفتہ کروکشیتر

ہستی کے طلسمات کا یہ رازِ قدیم
ہاں، کھول سکے اس کو نہ دانا نہ حکیم
اے فکرِ رسا سر نہ کھپا اور ادھر
اعداد نکالے گی نہ اس کے تقویم

اس دور کی تہذیب کا منظر پُرہول
انسان کا انسان سے رویّہ لاحول
یارانِ طریقت نے بھی خوب کہا
اخلاق و خیالات بقدرِ ماحول

ہنس ہنس کے رُلاتے ہیں تو اپنے شگفتہ
چھُرے کے جو لگاتے ہیں تو اپنے شگفتہ
اپنوں سے خبردار ہی رہنا بہتر
مٹی میں ملاتے ہیں تو اپنے شگفتہ

آلام و غم و رنج و محن دیکھے ہیں
جیتے جی کئی دار و رسن دیکھے ہیں
دُنیا کی نہ کر بات ہمارے آگے
دُنیا کے بہت ہم نے چلن دیکھے ہیں

طرحی غزل

نور کوہلی (آگرہ)

چُپ بھی رہنے نہ دیا حال بھی کہنے نہ دیا
دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا

کیوں نہ دے داد زمانہ ہمیں ضبطِ غم کی
ایک بھی اشک کبھی آنکھ سے بہنے نہ دیا

بات کی بات میں کس کس کا بھرم کھُل جاتا
اہلِ ثروت نے مگر کچھ مجھے کہنے نہ دیا

صرف اس ڈر سے نہ آجائے کہیں ذکر اُن کا
قصۂ غم مرے دل نے مجھے کہنے نہ دیا

مجھ سے رکھتے ہیں حسد کتنی زمانے والے
دردِ اُلفت بھی خوشی سے مجھے سہنے نہ دیا

کلیوں کو ہنسنے کی دینی پڑی کتنی قیمت
صحنِ گلشن میں کسی نے انہیں رہنے نہ دیا

محفلِ دہر میں اے نورؔ وقار اس کا ہے
جس نے خود کو کبھی جذبات میں بہنے نہ دیا

غزل

عبدالستار عاصی دہلوی (کویت)

وہ بال و پر کہاں وہ اڑانوں کے سلسلے
اب ہیں قفس میں غم کے فسانوں کے سلسلے
بکھرے ہوائے غم سے جو اوراقِ زندگی
پھر جاگ اٹھے گزشتہ زمانوں کے سلسلے
گزرا ہے اس طرف سے کوئی کاروانِ حشر
یہ کہہ رہے ہیں جلتے مکانوں کے سلسلے
انسان کا ضمیر نہ سو جائے پھر کہیں
دن رات گونجتے ہیں اذانوں کے سلسلے
عاصی رہِ وفا کا سفر ہے بہت کٹھن
ہیں دور تک نظر میں چٹانوں کے سلسلے

غزل

بسمل مراد نگر

رغبت خزاں سے ہے نہ محبت بہار سے
فرصت کہاں ہے دل کو غمِ روزگار سے
شبنم ہے اشک ریز تو نالاں ہے عندلیب
برسا ہے غم کچھ اس طرح ابرِ بہار سے
بدمست سیرِ باغ نہ ہوں اہلِ گلستاں
وابستہ آندھیاں بھی ہیں فصلِ بہار سے
دارا کا کچھ نشاں نہ سکندر کا کچھ پتہ
کوئی بچا نہ گردشِ لیل و نہار سے
قسمت کا گل تو کھلتا نہیں بسملِ حزیں
کب تک بچاؤں ہوش کے دامن کو خار سے

دلّی کی چھوٹی صنعتیں

دلّی کے صنعتی فروغ میں ان کا زبردست حصّہ

دلّی نے آزادی کے بعد ملک میں جدید چھوٹی صنعتوں کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے اپنا نمایاں مقام بنا لیا ہے آج دلّی میں کروڑ روپے کے سرمایہ کی حامل تقریباً ۴۵ ہزار صنعتی اکائیاں مصروفِ پیداوار ہیں ان میں مختلف قسم کا ۲۱۹۶ روپے قیمت کا جدید ساز و سامان ہر سال تیار کیا جا رہا ہے ان صنعتوں سے تقریباً ۴ لاکھ ۵۰ ہزار افراد وابستہ ہیں دلّی آمدنی کا ۱۵ء۷ فیصد حصہ صنعتی پیداوار سے حاصل ہوتا ہے۔

صنعتی فروغ پر خاص توجہ

صنعتی ترقیاتی پروگرام اور ان کی نمایاں خصوصیات

★ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں مصارف ۷۷ء۲۱۶۱ لاکھ روپے سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے دوران اخراجات ۵۰ء۴۴۵ لاکھ روپے سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران مصارف کے لئے ۹۸ ★ ایک صنعتی بستی میں الیکٹرانکس صنعت کے لئے صنعتی پلاٹ تیار، الیکٹرانکس کی جانچ و اصلاح مرکز کی عمارت کی تعمیر مکمل ★ رانی جھانسی روڈ پر ۶۰۰ فیکٹریوں والے کئی منزلہ کمپلیکس زیر تعمیر ہے اگلے سال ان کی الاٹمنٹ عمل میں آ جائے گی ان کی تعمیر مکمل ہونے پر تقریباً ۱۲,۵۰۰ اشخاص کو روزگار دستیاب ہوگا ★ پٹ پڑ گنج میں ۶۰ اراضی پر ۹ صنعتی بستیاں تعمیر کی جا رہی ہیں ان کی تعمیر آئندہ سال میں مکمل ہو جائے گی اس پروگرام کے پورا ہو جانے پر ۲۵ ہزار لوگوں کو روزگار میسر ہوگا ... اور ... کرنے کی اسکیم زیر عمل ہے ★ جھلمل طاہر پور میں چھ اجتماعی کئی منزلہ فیکٹریوں کی تعمیر جلد ہی شروع کی جا رہی ہے ان کی تعمیر پر تقریباً ... روپے صرف ہوں گے اراضی پہلے ہی حاصل کر لی گئی ہے تعمیرات کا کام شروع کیا جانے والا ہے ★ دلّی کی چھوٹی صنعتوں کی ترقیاتی کارپوریشن کے ذریعہ میں تیار کئے گئے ایک ہزار پلاٹوں کی تقسیم کا کام جلد ہی کیا جا رہا ہے اس سے تقریباً ۱۵ ہزار لوگوں کو روزگار ملے گا ★ ... دستی کرگھوں کے ... کی الاٹمنٹ کا کام تقریباً مکمل

کم شرح سود پر قرضوں کی فراہمی

★ اس سال چھوٹی اور گھریلو صنعتی اکائیوں کے لئے ۴ فیصد شرح سود پر ۱۸ لاکھ روپے کی رقم دستیاب ہے۔ ★ انجینئر صنعت کاروں کو مالی شرح سود میں کافی کمی کر کے یعنی صرف ۷ فیصد شرح سود پر قرضوں کی فراہمی۔

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و اشاعت
دلّی انتظامیہ دلّی

ڈی آئی پی/منصوبہ بندی/ — ۸۲/۸

چند بہترین کتب

کتاب	مصنف	قیمت
تقیل شفائی نمبر	فن و شخصیت	۶۰/-
فیض احمد فیض نمبر	"	۷۰/-
غزل نمبر	"	۶۰/-
آپ بیتی نمبر	"	۵۰/-
مہندر ناتھ نمبر	"	۵۰/-
کملیشور نمبر	"	۵۰/-
ہندی کے مسلمان شعراء	رتن پنڈوروی	۵۱/-
مان سروور	ڈاکٹر ارمان	۲۱/-
یادوں کی برات	جوش ملیح آبادی	۴۵/-
ناقابلِ فراموش	سردار دیوان سنگھ مفتون	۳۵/-
جذباتِ مشرق	"	۲۵/-
ہزار داستان	فراق گورکھپوری	۵/-
نتھو کا غرور	واجدہ تبسم	۳۰/-
نتھو کا زخم	"	۳۰/-
نتھو اترائی	"	۳۰/-
نتھو کا بوجھ	"	۳۰/-
جیسے دریا	"	۲۵/-
ٹیڑھی لکیریں	سیما سوری	۱۲/۵۰
اونچی دکان	"	۱۲/۵۰
تیسری انگلی	"	۱۲/۵۰
داستانِ حور	الیاس سیتاپوری	۱۵/-
شہزادی کا نیلام	"	۱۵/-
بالاخانے کی دلہن	"	۱۵/-
حرم سرا	"	۱۵/-
عجائب خانۂ عشق	"	۱۵/-
چاند کا خدا		۱۰/-
اردو اسالیب نثر	شاہین	۲۵/-
مقالاتِ اقبال		۵/-

کتاب	مصنف	قیمت
ناگ کا بدن	الیاس سیتاپوری	۱۰/-
اندر کا آدمی	"	۱۰/-
راجندر سنگھ بیدی فن و شخصیت	ڈاکٹر مصطفیٰ	۲۵/-
کاشف	کاشف اندوری	۱۲/-
پیامِ نظر	رتن پنڈوروی	۱۵/-
اندازِ نظر	"	۱۵/-
بہشتِ نظر	"	۱۵/-
چراغِ منزل	دواکر راہی	۲۵/-
کربِ خود کلامی	اعجاز صدیقی	۱۵/-
بدنام کتاب	فکر تونسوی	۱۲/-
آخری کتاب	فکر تونسوی	۱۴/-
فکر نامہ	"	۱۶/-
لختِ جگر	جگر جالندھری	۱۰/۲۵
خاموش آواز	جاں نثار اختر	۲۵/-
آئینہ سکندر	قمر مرادآبادی	۱۰/-
تریا چلتر	شفیق صدیقی	۸/-
تجلیات	زار علامی	۱۰/-
کلیدِ عروض	"	۲۷/-
تبصرے	کریمی الاحسانی	۲۰/-
آئینۂ راز	راز لائلپوری	۱۵/-
نوائے ازل	ازل دہلوی	۱۰/-
متوازی سائے	آزاد بہاولپوری	۸/-
یادوں کے سائے	ممتاز مرزا	۲۰/-
آئینۂ عروض و قافیہ	علامہ طالب	۶/-
سحر نغمہ	ساحر ہوشیارپوری	۱۵/-
خراشیں	سہگل	۱۰/-
غالبیات چند عنوانات	کالیداس گپتا رضا	۵۰/-
ادبی تاخذ [illegible]	ل احمد اکبرآبادی	۱۸/۷۵

دفتر شاعر ہند فلیٹ ۸، انصار ۱۶، مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اُردو دنیائے افسانہ نگاری میں ایک نیا اُبھرتا نام

ڈاکٹر اُودے سرن ارمان

جو ہندی افسانوی دنیا میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ہندی افسانہ نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں

اگر آپ

قومی یک جہتی کے دلدادہ ہیں، یا ہندو مسلم اتحاد کے حامی، یا دیہات (گاؤں) کی سادہ اور پاک فضا میں زندگی بسر کرنے والوں کی سج داری، عزت و ناموس پر مرمٹنا، باہمی رفاقت اور غیر فرقہ وارانہ روابط کی دلکش، سچی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں۔ نیز جہیز اور دیگر مجلسی بُرائیوں کو دُور کرنے کی حمایت کرتے ہیں تو ——— پڑھئے

مان سروور

جو ڈاکٹر اُودے سرن ارمان کے اکیس (۲۱) ایسے اچھوتے اور دل و دماغ پر اثر کرنے والے سچائی پر مبنی اُردو افسانوں کا مجموعہ ہے جو اپنی دلکشی، بہترین لکھائی چھپائی اور دیدہ زیب قومی یک جہتی کے رنگوں میں آپ کی نظروں کو دعوتِ مطالعہ دے گا۔ قیمت ——— =/۲۱ روپے علاوہ محصول ڈاک

یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کسی بھی افسانہ کو شروع کریں اور بغیر پورا پڑھے ہی کتاب کو رکھ دیں......

مان سروور کا انگریزی ایڈیشن بھی بہت جلد منصۂ شہود پر آ رہا ہے، جسے انگریزی کا جامہ پہنایا ہے جناب ادیب لکھنوی ریٹائرڈ پرنسپل رام رتن انٹر کالج بلاری نے۔ اس کے علاوہ مان سروور کا ہندی ایڈیشن شائع ہو گیا ہے جو ہر اچھے بک سیلرز کے ہاں دستیاب ہے (قیمت پندرہ روپے)

——— ملنے کا پتہ ———

یو۔ ایس۔ اے سپتال

پوسٹ بلاری ضلع مُراد آباد یوپی

نوٹ:۔ دفتر ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے بھی یہ کتابیں دستیاب ہیں

اعتماد

مشتاق [illegible]

میں بیکار تھا مجھے ملازمت کی تلاش تھی۔

بہت انکار سننے اور دھکے کھانے کے بعد مجھے ملازمت مل گئی۔ یہ ملازمت میرے تصور اور میرے ذہنی معیار سے کم تر تھی لیکن میں نے اسے بخوشی قبول کر لیا۔

جب مجھے ملازمت ملی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے اندر بہت تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں، میں سر جھکانا سیکھ گیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے افسر مجھ سے خوش رہیں۔ مجھ پر اعتماد کریں مجھے اپنا فرمانبردار سمجھیں۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی خوشنودی کا ہر طرح سے خیال رکھوں گا وہ جو کام کہیں گے توجہ اور تندہی سے کروں گا۔ جب وہ مجھے بلائیں گے تو سر جھکا کر مؤدب بن کر ان کی بات سنوں گا اپنی زبان اور عمل سے ثابت کروں گا کہ مجھ سے زیادہ وفادار پورے دفتر میں کوئی دوسرا کلرک نہیں ہے۔

دفتر کے پرانے اور سینئر کارکن مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے، بعض اوقات میری عادات کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ پہلے دبے دبے سرگوشیوں میں پھر میرے سامنے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا یہ لوگ جو چاہیں کہیں، میرے بارے میں جو بھی رائے قائم کریں میں اپنی ڈگر پر چلتا رہوں گا۔

میں سمجھتا تھا میرے افسر مجھ سے خوش ہیں، مجھ پر مہربان ہیں۔ میرا دل مطمئن تھا میں اپنا کام بڑی توجہ اور محنت سے کرتا میرے ساتھی میرا مذاق اڑاتے تھے لیکن میں ان کی پرواہ نہ کرتا تھا۔

میری زندگی ایک دائرے میں گھوم رہی تھی۔

صبح سویرے اٹھتا۔ ناشتہ کر کے بس میں بیٹھتا ایک [illegible] کرتا دفتر پہنچ جانے کی جلدیوں [illegible] ایک نظر ڈال لیتا۔ پھر [illegible] چیزوں کو خود جھاڑ کر میز کو صاف کرتا، چپراسی مسکراتا رہتا۔ اس کے بعد میں اپنے کام میں جُٹ جاتا۔ ایک بجے لنچ ٹائم پر دفتر کی کینٹین میں کچھ کھاتا پیتا اور لنچ کا وقت ختم ہونے سے پہلے پھر اپنی میز پر پہنچ جاتا۔ جب تک اس روز کا کام ختم نہ ہوتا فائلوں پر سر کھپاتا رہتا۔ مجھے اپنے کام سے عشق تھا۔ کام ختم کر کے میں دفتر سے نکلتا شام کا دھندلکا پھیل چکا ہوتا۔ ٹہلتے ٹہلتے میں ایک خاص تیسرے درجے کے ہوٹل کے اندر پہنچ جاتا رات کا کھانا کھاتا اور پھر ٹہلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچتا۔ کچھ دیر ریڈیو سنتا اور پھر سو جاتا۔

ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مجھے پانچ سو روپے تنخواہ ملتی تھی ان پانچ سو روپوں میں سے ایک سو روپیہ ہر ماہ اپنی ماں کو گاؤں منی آرڈر کر دیتا چار سو روپوں میں بڑی آسانی سے اپنا گزارہ کر لیتا تھا میرے اخراجات محدود تھے مہینے میں چار جوڑی کپڑوں کی دھلائی، صابن، ٹوتھ پیسٹ کا خرچ پچاس روپے کمرے کا کرایہ، صبح کا ناشتہ دوپہر کا کھانا، رات کا کھانا۔ ہاں جمعہ کو چھٹی کے دن میں فلم ضرور دیکھتا تھا ہر مہینے میں دس بیس روپے بچا ہی لیتا تھا۔ نہ میں سگریٹ پیتا تھا نہ بار بار چائے۔ دوستوں کا روگ بھی میں نے نہ پالا تھا آگے پیچھے ایک بوڑھی ماں کے سوا کوئی نہ تھا جو آبائی گاؤں میں چھوٹے سے کچے گھر میں زندگی کے دن گزار رہی تھی۔

کبھی میرے دل میں بڑے ارمان تھے۔ زندگی کا آسودگی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش بہت شدید تھی لیکن [illegible] سب خواہشوں اور امیدوں کو [illegible] کی طرح چاٹ لیا تھا [illegible] اب زندگی ایک دائرے میں گھوم رہی تھی دفتر [illegible] کمرہ۔ بس ۱

احساس ہوا کہ میں فوری ملاقات میں دفتر سے باہر نکل جاؤں تو میرے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی پھر میں نے محسوس کیا کہ میں مسکرا رہا ہوں۔ میرا جی چاہا کہ کاش اس وقت میرے پاس آئینہ ہوتا تو میں اس میں اپنا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ سکتا۔

اپنی میز پر بیٹھ کر میں نے پھر فائل کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ ضروری فائل میرے سامنے پڑی رہی۔ میرے دفتر کے ساتھی حیرت اور دلچسپی سے مجھے بے کار بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ دو ایک نے مجھے پر اسرار استفہامیہ انداز سے دیکھا، پھر ایک سینیر کلرک بول اٹھا۔

"سر کیا بات ہے طبیعت تو ٹھیک ہے"

میں نے کوئی جواب نہ دیا خاموش رہا۔ وہ کلرک شاید پہلا تھا کہ مجھے پتہ تھا کہ وہ مجھ پر ہنس رہے تھے۔ پھر ایک حیرانگی بات ہوئی میں نے ان کے قہقہوں میں اپنے قہقہے کی آواز بھی سنی۔ میں ہنس رہا تھا۔

وہ سب مجھے حیرت سے دیکھنے لگے ان کے قہقہوں نے دم توڑ دیا لیکن میرا قہقہہ گونجتا رہا۔ میں کئی منٹوں تک اکیلا ہی ہنستا رہا۔ وہ سب اب پریشان دکھائی دینے لگے تھے پھر خاموشی چھا گئی لیکن میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور قہقہے کی آواز سن رہا تھا جو مجھے اچھی لگ رہی تھی۔

میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا ضروری فائل میرے سامنے بند پڑی تھی۔ پھر دفتر کے کلرک اور ساتھی اُٹھنے لگے ایک ایک کر کے۔ دفتر کا وقت ختم ہونے والا تھا۔

چپراسی اینڈتا ہوا میری میز کے پاس آ کر بولا۔ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں" میں اٹھا۔ میں نے فائل اٹھائی۔

صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ میرا افسر مجھے بیٹھنے کے لئے اشارہ کرتا، جانے مجھے کیا ہوا کہ میں بڑے اطمینان سے بے جھجک اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔

میں نے وہ فائل اپنے افسر کے سامنے رکھ دی۔

میرا سر جھکا ہوا نہیں تھا۔ نہ ہی میں کرسی میں سکڑا سمٹا بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے میرے افسر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ نے کام ختم کر لیا"

میں نے اپنے افسر کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں اور بولا۔

"جی نہیں سر۔ میں نے آج کوئی کام نہیں کیا"

حیرت اور غصے کے آثار مجھے اپنے افسر کے چہرے پر صاف دکھائی دئے۔

"آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے آپ کو حکم دیا تھا کہ یہ فائل بہت ضروری ہے، اس کا آج نمٹ جانا بہت ضروری تھا۔ آپ نے کام کیوں نہیں کیا؟"

میری آنکھیں اب بھی افسر کی آنکھوں کو گھور رہی تھیں۔

"سر، آج مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے"

"کیا کہہ رہے ہو تم؟" افسر آپے سے باہر ہو گیا۔

"کیسا اعتماد۔۔۔؟"

"سر پچھلے چار سال میں ایک دن بھی ایسا نہیں آیا جب میں نے اپنا کام کل پر ٹالا ہو میں نے آپ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا لیکن آج جب آپ نے مجھے یہ فائل دے کر ہدایت کی کہ اسے آج ہی نمٹنا چاہئے تو مجھے محسوس ہوا کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔ آپ مجھے آج تک پہچانے ہی نہیں۔ اس لئے۔۔۔۔"

میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔

میرے جسم میں لرزش پیدا ہو گئی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ میری آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں۔

میں نے آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اپنے افسر کی طرف دیکھا۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا تھا اور وہ مجھے گھور رہا تھا۔ میں آنسو بہاتا اس کے کمرے سے باہر نکلا ـــ میرے ساتھیوں نے میرے چہرے پر بہتے آنسوؤں کو دیکھا اور مجھے گھورتے رہ گئے۔ آنسو پونچھے بغیر میں دفتر سے باہر نکل گیا۔

اقبال کا فلسفۂ اتحادِ ملی

[illegible]

علامہ اقبال کا فلسفۂ حیات فلسفۂ خودی کا اساسی پیغام تھا یعنی
یہی پیغام حرکت و مساعات نے اقبال کو شعراء کی صف میں وہ
مقام عطا کیا جو آج تک اردو زبان کے کسی شاعر کو شاید ہی
نصیب ہوا ہو۔ انہوں نے شاعری کو ایک پیغام بنا کر دنیا کے
سامنے پیش کیا جو اردو زبان و ادب کو فلسفۂ حیات کا
ایک تحفہ ہے جس نے اردو شاعری کو ایک نیا راستہ دکھایا اور
ایک نئی منزل کی نشاندہی کی اسی لئے اقبال کی مختلف حیثیتیں
متعین کی گئی ہیں وہ فلسفی بھی ہیں مفکر بھی شاعر بھی ہیں
اور حکیم الامت بھی، دانش ور بھی تھے، مصلح بھی، محب وطن
بھی اور ملت کے غمخوار بھی۔ غرض اقبال نے جتنے بھی نظریات
پیش کئے ہیں وہ سب خود اپنی جگہ علیحدہ علیحدہ فلسفۂ حیات
کے وہ شعبے ہیں جن پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔

آج ہمارا موضوع [illegible] فکر اقبال کا فلسفۂ اتحاد ملی ہے
اقبال تمام دنیا کے مسلمانوں میں ایک ایسا اتحاد چاہتے تھے
جس کے فکر و عمل گفتار و کردار سیاسی معاشرتی اور مذہبی
یگانگت اور [illegible] قوامی رشتوں اور آفاقی
نظریات [illegible] اس طرح منسلک کر دے جو حشر تک قائم
و دائم رہے اور مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی چھاپ ان کی
انفرادی زندگی کے ہر شعبے پر رہے۔ جہاں تک اس نظریے اور
اس خیال کا سوال ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے
بیشتر دانشوروں اور مفکروں کی طرح اقبال بھی اپنے اس
نظریے میں انتہائی مخلص اور جذبے سے سرشار تھے اور
انہی فکر اور جستجو کے اس معاملے میں [illegible]
[illegible] مطالعے اور غور۔ مشاہدات اور
تاریخ کی روشنی میں اقبال کا یہ نظریہ قابل عمل نظر نہیں آتا
اسلام کی پوری تاریخ میں خلافت کے چند برسوں کے علاوہ
مسلمانوں میں کبھی بھی ملی اتحاد نہیں رہا اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ
وسلم کی وفات کے فوراً بعد جب کہ ابھی رسول خدا کی تجہیز
و تکفین بھی نہ ہو پائی تھی آپس کے ذاتی اختلافات جو
دور نبوت میں دبے ہوئے تھے کھل کر سامنے آ گئے اور
سقیفہ بنو ساعدہ میں انصار اور مہاجرین کے درمیان
اختلافات کھل کر سامنے آ گئے اور تلواریں نکل آئی تھیں
مگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی دانش وری اور دور اندیشی
نے اس خطرے کو فوری طور پر ٹال دیا مگر در پردہ ریشہ دوانیاں
جاری رہیں اور حضرت ابوبکرؓ خلیفۂ اول کے ڈھائی سالہ
دور میں بھی منافقین کے زبردست فتنے اٹھے مگر دب گئے پھر
حضرت عمرؓ خلیفۂ دوم کا گیارہ سالہ دور اسلام کا
زریں دور کہا جاتا ہے وہ منافقین کی ریشہ دوانیوں اور
مسلمانوں کی آپس کی در پردہ مناقشتوں سے خالی نہیں رہا اور
خلیفۂ دوم انہیں ریشہ دوانیوں کے شکار ہو کر مسجد میں ایک
یہودی کے ہاتھوں شہید ہو گئے اس المیے کے بعد فتنوں کو
کھلی چھوٹ مل گئی اور حضرت عثمان غنیؓ خلیفۂ سوم کا دور
کھلی بغاوت، ریشہ دوانیوں اور آپس کی عداوتوں کا
دور بن گیا اور وہ اپنے گھر میں ہی مسلمانوں کے ہاتھوں سے
شہید ہو گئے اس کے بعد خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کے دور
میں حالات اور بھی زیادہ خراب ہو گئے اور جنگ جمل جو حضرت علیؓ
اور حضرت عائشہؓ زوجہ رسول کے درمیان ہوئی اس میں
ہزاروں مہاجرین اور صحابہ رسول شہید ہوئے۔ پھر
جنگ صفین حضرت علیؓ اور حضرت امیر معاویہ کے درمیان ہوئی
اور ہزاروں صحابہ رسول اللہ اس میں بھی شہید ہوئے اس کے
بعد خلافت اہل بیت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ایک حضرت
علیؓ اور دوسرا حضرت امیر معاویہ کے قبضے میں آیا۔ پھر

ان کے عہد میں خلافت عرب کا پابند رہا۔ حضرت عثمان کو شہید کیا گیا اور حضرت
علی کو بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں شہید ہونا پڑا۔ ان کے بیٹے امام حسین کے
بیٹوں بھتیجوں بھائیوں اور قریبی رشتہ داروں کو کربلا کے میدان میں
مسلمانوں نے ہی شہید کر دیا۔ ان کے عہد خلافت بنو امیہ کو عباسیوں
نے ختم کیا اور عباسیوں کی خلافت بھی آپس کے اختلافات کی
نذر ہوئی۔ پھر مغلوں عثمانیوں، ترکوں افغانوں وغیرہ کے خاندان
برسر اقتدار آتے گئے اور آپس کی ریشہ دوانیوں کے شکار ہوتے
گئے اور مذہبی عقائد کے اعتبار سے بھی مسلمان مختلف فرقوں میں
تقسیم ہوتے گئے مثلاً شیعہ، سنی، خارجی، نصیری، اہل قرآن،
اہل حدیث، اسمٰعیلی وغیرہ وغیرہ۔ اور اب تو اس دور میں مسلمانوں
میں مذہبی اعتبار سے سیکڑوں فرقے پیدا ہوگئے ہیں۔

آج کے ایٹمی دور کی انتہائی ترقی یافتہ دنیا میں دیکھئے
عرب ملکوں میں کیا ہو رہا ہے جب کہ عربوں کی زبان ایک، مذہب ایک
معاشرہ ایک، ثقافت ایک، جغرافیائی اور تاریخی پس منظر ایک
ہوتے ہوئے بھی عرب مختلف کیمپوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ان کا
آپس کا اتحاد پارہ پارہ ہو چکا ہے جس کی سزا میں ان کو اسرائیل
کے وجود کے عذاب کا سامنا ہے اور وہ اپنی مقدس سرزمین
کے ایک بڑے حصے اور قبلہ اول سے محروم ہو چکے ہیں۔ اسی طرح
مصر، پاکستان، ایران، عراق، بنگلہ دیش، ترکی، شام، لبنان،
یمن وغیرہ ممالک میں مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے دست و
گریباں ہیں اور آئے دن ان ملکوں میں بہت عرصے سے خون کی
ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ خلافت الٰہیہ کا خاتمہ اور بعد کی نام نہاد
خلافت کا بھی فنا ہو جانا، ترکوں اور عربوں کے درمیان
زمانہ ماضی کے شدید اختلافات، عربوں ترکوں مغلوں افغانوں
عثمانیوں ایرانیوں اور بربروں کی مسلم سلطنتوں کا ایک ایک
کر کے مٹ جانا یہ سب کچھ مسلمانان عالم کے آپس کے نفاق کی
خونیں داستانیں ہیں جو تاریخ سے مٹائی نہیں جا سکتیں۔ افریقی
مسلم ممالک کا آپس میں تناؤ بھی طویل تخریبی سرگرمیوں کی
ایک کڑی ہے۔ غرض کہ خلافت راشدہ کے عہد کی پوری مسلم تاریخ
تقریباً ساڑھے تیرہ سو سالوں کی یا اس سے بھی کچھ زیادہ مسلمانوں
کے آپس میں نفاق، اختلاف، جنگ و جدال اور خونریزی کی ایک
خونیں داستان ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانان عالم کبھی بھی کسی دور میں بھی آج
تک متفق اور متحد نہیں رہے اور مذہب و ملت کے نام پر بھی کوئی
طاقت ان کو یکجا نہ کر سکی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی
مشہور کتاب "انڈیا ونس فریڈم"
(India Wins Freedom) میں واضح طور پر
اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اسلام [illegible] کہ مسلمانوں کو مذہب کی بنیاد پر متحد کرنے
میں کامیاب نہ ہو سکا" سمجھ میں نہیں آتا کہ اقبال اپنے اس
شعر میں کس دور کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں:۔

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

کسی مصلح، مفکر یا دانشور کے ان نظریات کا کیا جواز ہو سکتا ہے
جو ناقابل عمل ہوں اور انسانی تاریخ میں عملی اعتبار سے
وہ قطعی ناممکن ہوں۔

اقبال کا اتحاد ملی کا نظریہ اور فلسفہ بالکل ایسا ہی ہے
اقبال یہ بھی کہتے ہیں۔

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ ایرانی رہے باقی نہ افغانی نہ تورانی

اس شعر کا اطلاق تاریخ کے کس دور پر ہوتا ہے اور اقبال کا
یہ نظریہ کب صحیح ثابت ہوا یہ بات بعید از قیاس ہے
اس لئے کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ کسی مفکر اور
مصلح کو اپنے افکار اور نظریات کی بنیاد پر صرف قیاس پر یا
خوش فہمی یا حسین تصورات پر قائم کرنا مستحسن طریقہ نہیں
اقبال کا یہ شعر بھی حسین تصورات پر مبنی ہے اور قطعی غیر فطری ہے
جسے مسلم قوم کے لئے پیغام کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال کہتے ہیں

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

تاریخ [illegible] میں مسلم سلاطین اور صاحب اقتدار نے
کبھی اپنے عیش و عشرت میں غریبوں اور مفلسوں کو شریک
نہیں کیا بلکہ ہمیشہ ان کا استحصال کیا پھر ہم اقبال کے نظریے
کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔ یہ بھی پیغام اقبال ہے کہ

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

عملی زندگی میں مسلمان سرمایہ داری، شہنشاہیت اور آمریت نے
غلاموں اور غریبوں کو وہ درجہ کبھی نہیں دیا جس کا اقبال نے
دعویٰ کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب اسلام نے شہنشاہیت
آمریت اور سرمایہ داری کی شدت سے مخالفت کی ہے اور تمام
انسانوں کو بلا تفریق مذہب ملت و رنگ و نسل برابر کا درجہ دینے
کا حکم دیا ہے پھر بھی پوری تاریخ میں خلافت راشدہ کے دور کے
علاوہ مسلمان حکام کے دستور حکومت آج تک آمریت شہنشاہیت
اور سرمایہ داری کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اسلام نے ذات
پات اور اونچ نیچ کے تصور کو ٹھکرایا ہے مگر مسلمانوں کے معاشرے
سے ذات پات اور اونچ نیچ کے تصور کی جڑیں ابتدا سے ہی
اتنی گہری ہیں جنہیں اکھاڑ پھینکنا آسان کام نہیں۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا
جہاں ہمارا۔ اقبال کا یہ نظریہ بھی تاریخ اور حقائق نے
غلط ثابت کر دیا ہے۔ ماضی میں عربوں نے ترکوں کا قتل عام
کیا ترکوں نے عربوں کو تہ تیغ کیا امویوں نے عباسیوں کے خون
سے ہولی کھیلی اور عباسیوں نے امویوں کو خون میں نہلایا۔
اور یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے بنگلہ دیش
میں وہ مسلمان جو غیر بنگالی تھے لاکھوں کی تعداد میں بنگالی
مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور لاکھوں بنگالی مسلمانوں کو
غیر بنگالی مسلمانوں نے شہید کر دیا۔ بنگلہ دیش خون میں ڈوب
کر پاکستان سے الگ ہو گیا۔ ہندوستانی مسلمانوں یعنی تارکین
وطن کے ساتھ پاکستان میں کیا سلوک ہوا وہ کسی سے پوشیدہ
نہیں۔ ایران میں غیر ایرانی مسلمانوں کو دوسرے درجے کا اور [illegible]
کو ایرانی مسلمان کس بے دردی سے روزانہ قتل کر رہے ہیں
اس سے پوری دنیا واقف ہے پھر ہم کیسے تسلیم کر لیں کہ دنیا بھر میں

مسلمانوں کے ملکوں پر ہر عقیدے اور ہر قوم و رنگ و نسل کے
مسلمانوں کا مساوی حق ہے اور یہ کہ یہ ممالک مسلمانوں کی قومی
ملی وطن کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اقبال نے اپنی شاعری کے دور اولیں میں جو پیغام دیا
وہ تمام انسانوں کے لئے ہے اور قوم پرستی اور حب الوطنی کے
جس جذبے کی تبلیغ کی ہے وہ فطرت کے عین مطابق بھی ہے
بین الاقوامی بھی ہے اور آفاقی بھی اور اس پیغام کی عظمت
تاریخی حقائق سے ثابت بھی ہے لیکن اقبال کی شاعری کا
دوسرا دور اسلامی نظریات کا دور ہے جب وہ شاعر ملت
حکیم الامت اور خالص مسلمانوں کے شاعر بنے تو انہوں نے
اپنے نظریات اور فلسفے کی رو سے اپنے کو فرقہ پرستی کی زنجیر
سے جکڑ لیا اور انہوں نے ملت اسلامیہ کے سامنے ایسے نظریات
پیش کئے جن کی نفی خود ان کی ملت نے تاریخ اور حقائق سے
کر دی اور ان کے نظریات عملی دنیا سے دور ہوائی قلعہ ہو کر
رہ گئے۔

اقبال نے کہا ہے کہ

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہے آفاق

یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی کہ چودہ سو سالہ اسلامی
تاریخ میں اقبال کی مراد ایسے کس مومن سے ہے جس میں آفاق
گم ہے خود خلافت الٰہیہ کے بارے میں بھی مسلمانوں کے مختلف
فرقوں میں شدید اختلافات ہیں اور متفقہ طور پر آج تک
یہ طے نہیں پا سکا کہ کون سا دور خلافت الٰہیہ کا دور کہا
جا سکتا ہے۔ اور تو اور احادیث نبوی کے بارے میں بھی
مسلمانوں کے فرقوں میں شدید اختلافات ہیں ایک فرقہ دوسرے
فرقے کی تسلیم شدہ احادیث نبوی کو صحیح نہیں مانتا۔ مثال
کے طور پر شیعہ فرقہ، اہل حدیث، اہل سنت والجماعت،
وغیرہ۔ بعض فرقے تو کسی حدیث کو بھی تسلیم نہیں کرتے مثلاً
اہل قرآن۔ حد یہ ہے کہ قرآن کے بارے میں اور آیات کی
تفسیر و معانی میں بھی مسلمانوں میں اختلافات ہیں یہاں تک
کہ اب تو مسلمانوں میں ایک ایسا فرقہ بھی [illegible]

اس کا گھر ہی تو ہے تھا۔ مسلسل اس کا کاروبار
دیکھتی رہی۔

ستارہ نے پیسے اکٹھے کر کے پہلا قدم اٹھا دیا اس نے
کمال مہارت سے دیکھا۔ اب عطیہ کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہونے
لگا اور اسکا رہن سہن کی تعریف تھی۔ چند ماہ اسی طرح گزر گئے
اس کا بچپن کا جو خواب تھا اس کا قد بھی بڑھتا جاتا
اس کو یہ سب کسی اور کا جو دینا تھا اس کا ذکر
کس سے کرتی۔ سوچتی رہی خدا کو یاد کرنے کے۔ پھر وہ خدا کو نئے
نام سے یاد کرتی۔ تمام اسے یاد تھے دہرا دئے۔

اس کی حالت شکار ہی بھیڑ میں پھنسے ہوئے اس جانور کی سی تھی
جو گھبرا گھبرا کر پیچھے اور تھکے ہوئے سانس لیتا ہے!۔

اس کو اپنے گھر کا خیال آنے لگا۔ لیکن ماں باپ کے
پاس جا کر اسے کون سا چین نصیب ہو جائے گا۔ محلے والے
پڑوسی اور جاننے والے کیا کہیں گے ہو سکتا ہے ان کی رنجش
چھوٹا سا ہی صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے ماں اور بوڑھا باپ
چل بسیں اور چھوٹی بہن پر کیا اثر پڑے گا۔ اس کی زندگی
بھی تباہ و برباد ہو جائے گی یہ خیالات اسے ستانے لگے
اور اس نے لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس سے ساری
خوشیاں اور مسرتیں چھن چکی تھیں۔ ناز و نعم میں پلی بڑھی تھی
اب وقت کے ہاتھوں میں اس کا مقدر کھیل رہا تھا۔

ایک دن اچانک خواب سے چونکی اور خوف سے بڑبڑانے
لگی اے خدا یہ سب میرے ساتھ کیا ہوا؟ یہ کس جرم کی سزا ہے
نہ معلوم کتنے لوگوں کو وقت نے بے وقت کر دیا تھا۔ اس نے
اپنی ایک سہیلی سے ذکر کیا تو اس نے کہا عطیہ گھبراتی کیوں
ہو یہاں کراچی میں بہت سے ایسے ڈاکٹر ہیں اور نرسیں بھی
جو پیسے کرانے والے کو جنم لینے سے پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں
"یہ تو پاپ ہے گناہ ہے" وہ سہیلی سے کہنے لگی۔

"ہاں پیسے کے سامنے کوئی نہیں سوچتا۔ کیا ثواب ہے
کیا گناہ ہے۔ کیا ضابطہ ہے کیا انسانیت ہے" "یہاں
زندگی نہیں پیسہ عزیز ہے۔" "اس شہر میں لوگ راتوں
رات دولت مند بن جاتے ہیں"

"ہاں میں نے بھی سنا ہے" عطیہ مری ہوئی آواز میں
بولی۔ لیکن اکثر اس میں ماں کی بھی جان جانے کا خطرہ ہوتا
ہے۔ کیا مجھے اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا اپنی موت
کے خوف سے وہ چیخ پڑی۔۔۔ میں کسی بھی حالت میں مرنا
نہیں چاہتی اور اگر پولیس کو اطلاع ہو گئی تو وہ مجھے پکڑ لیجائے
گی۔۔۔ اتنی پریشان کیوں ہوتی ہو سہیلی نے کہا۔ "کیا تجھے
معلوم نہیں اس بڑے عالیشان شہر میں پیسے سے کیا نہیں ہوتا
کسی کی بھی جان لی جا سکتی ہے۔ اس اسلامی قانون شریعت والے ملک
میں سب کچھ ہو رہا ہے۔ اسلام کے ٹھیکیدار اسلام کی دیواروں
کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ اسلام کا تو صرف نام ہے۔ پیسہ پھینکو
تماشا دیکھو۔ روزانہ دن دہاڑے قتل ہوتا، ڈکیتی، لوٹ
مار کا بازار گرم ہے۔ پاکیزگی سر بازار نیلام ہو رہی ہے۔ شرافت
کا جنازہ نکلتا ہے۔" وہ چیخ اٹھی میرے خدا میں پیسوں
کا انتظام کس طرح کروں گی؟ کاش اس شہر میں نہ آتی
لاہور ہی میں بھوکی پیاسی مر جاتی۔ عطیہ روتے ہوئے
آنسوؤں سے اپنے چہرے کو تر کر رہی تھی۔ لیکن ان آنسوؤں
سے آنے والا طوفان تھوڑی رک سکتا ہے۔ جب دن
قریب آ گئے تو ایک پڑوسی نیک عورت نے مدد کی۔ بیٹی
مذہب میں ایک زندگی کو ختم کرنا بڑا گناہ ہے ایک
ایسا گناہ جو کئی پشتوں تک آدمی کا پیچھا کرتا ہے۔ جس کو
خدا نے زندگی عطا کی ہے اسے زندہ رہنے کا بھی حق ہے
تم دوسرے محلے میں چلو تمہارا وقت بہت قریب آ گیا
ہے اس مشکل کو آسانی سے حل کرا دوں۔ اللہ آپ کو
خوش رکھے۔ کہتے ہیں ایسے وقت پر خدا کو بھی ترس
آ جاتا ہے کوئی نہ کوئی ایسی مشکل کے وقت نیک بندہ مل ہی
جاتا ہے۔ عطیہ دیواروں سے ٹکریں مار رہی تھی بچہ بڑی
مشکل سے پیدا ہوا اس کا جسم لہراتے ہوئے جھنڈے
طرح کانپ رہا تھا۔ لیکن اسے نئی زندگی مل گئی ہے تو زندہ
کی دین تھی۔ قصور وار ہی سہی لیکن یہ تو معصوم ہے۔ یہ
خیالات عطیہ کے ذہن میں گردش کرنے لگے وہ بڑی محبت
سے بچے کو دودھ پلاتی اور اسی طرح اپنے غموں کا مداوا

ئی کوشش کرنے لگی۔

اب عطیہ کام پر نہیں جا سکتی تھی کچھ دن تک اس نیک عورت
پیدا ہی اور سوچتی رہی ایسے نیک لوگ اس دنیا میں موجود
کیوں نہیں۔ معاشرے کی بدحالی اور عورت کی بے بسی
میں سمجھتا۔ میں بیگم اور ڈرائیور کے اس سلوک سے جو
نے اس بھکارن سے کیا تھا دل ہی دل میں شرمسار
تھا کہ معاً مجھے یاد آیا کہ ایک روز جب میں اپنے دوست
کے اپنے دفتر میں ٹھنڈا شربت پی رہا تھا تو یہ لڑکی
کی تلاش میں مجھ تک بھی پہنچی تھی۔ لیکن یہ لڑکی یہاں
ہی اور بھکارن کے روپ میں اس بھکارن کو دیکھ کر
حیران تھا۔ حلیہ بدلا ہوا، بدن پر تار تار ساڑی چہرے
پے شہر کی گرد و غبار اور ڈیزل کا دھواں آنکھوں
میں تمناؤں کے پالے اور بے ترتیب بال ہوا میں
ہے تھے۔

میرا ذہن عجیب کشمکش میں مبتلا تھا۔ کب تک۔ آخر
تک یہ مجبوری کے بچے پیدا ہوتے رہیں گے؟ کب تک
اس معاشرے میں یہ اندھیر رہے گا؟ کب تک ملاوٹ
ہیں مجبوری کا شکار ہو کر کسمپرسی کی زندگی گزاریں
در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے ہر ایک کے پیچھے
بھاگتی ہوئی پھیرے بازار میں پھریں گی۔

دل میں ہیجانی کیفیت تھی ناامیدی سے ذکر کرتا ہوں
لیے تلخیاں حلق میں اس کی روح کی چیخ زبان سے
رہی تھی۔ آپ کو ہمیشہ اپنے ملک و قوم کی فکر دامن گیر
رہتی ہے۔ اپنے گھر کی فکر کیجیے اور عیش سے زندگی گزاریے۔
رسے جیسا کہ کہتا ہے جگر میں ہے" ہم یہ سب
کر اپنی آسائش و آرام کیوں خراب کریں "میری بیوی
خود غرض ہو سکتی ہے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔
دوسرے دن تک میرے دل و دماغ میں اس بھکارن
کا خیال رہا۔ اس امید پر کہ اس سے دریافت کروں۔ کیا ماں
آئی ہے؟ کون ہے؟ شام کو جب اسی راستے سے جب
ملتی ہوئی تاریکی میں ہم رہے تھے میں اسی جگہ جا تھم

کھڑا ہو گیا۔ عالی شان مسجد کے مینار دور سے "اللہ اکبر"
کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک سفید کار اسی ٹریفک
لائٹ کے سامنے رکی۔ پیپلز پارٹی کا ترنگا جھنڈا لہرا
رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر جید کالر کے کوٹ میں ملبوس کوئی
وزیر بیٹھا تھا۔ اتفاقیہ میرے کانوں سے وہی آواز ٹکرائی
"اے ایمان والو اس دکھیاری کی طرف دیکھو" ... بابو جی
اللہ کے نام پر" میری نظریں اس آواز کے تعاقب میں
دوڑنے لگیں۔ ٹریفک رکا ہوا تھا۔ شاید قائد اعظم کے
مزار پر کوئی غیر ملکی مہمان پھول چڑھانے آیا تھا۔
بھکارن اس کار والے کی طرف نہیں گئی پاس سے گزر کر
موٹر رکشہ میں بیٹھے ہوئے مسافر سے مخاطب ہوئی۔ بابا۔
وہ بھیک لے کر تیسرے اسکوٹر سوار کی طرف بڑھ گئی
ہر بار اس نے کار کی طرف حقارت سے دیکھا لیکن کچھ
نہیں مانگا۔ میرا تجسس بڑھ گیا غالباً مانگنے والوں کو
بھی تجربہ ہوتا ہے۔ اب اسے بھی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس سے
پوچھنے میں اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ کار والے سے
کیوں نہیں مانگتی؟

منہ بناتے ہوئے بولی "بابو ان جھنڈوں کو میں
پہچانتی ہوں۔ ہر عمارت پر، درخت پر، گھر دل پر ادھر
اور ہر جگہ پر لہرا رہے ہیں اور جب یہ نعرے گونج رہا
تک گونج رہے تھے۔ "ایوب کی موت سرمایہ داری کی موت
ہے۔ اور بنگلہ دیش میں پھنسے ہوئے لوگوں کو مغربی پاکستان
بلانے کے لئے نعروں اور تقریروں میں نفرت تھی ہر ملک
رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں ملک توڑنے کے بعد ہم نے وطن
سے رشتے بھی توڑ لئے تھے۔ ان جھنڈے والی کاروں سے
ہم لوگوں کو کیا ملے گا۔ دھکے۔

"بابو مجھے دھکے نہیں روٹی چاہئے روٹی"

میں عطیہ کے اس طمانچے کا ارتعاش فضا میں محسوس
کر رہا تھا۔ سنگدل سماج کی ستائی ہوئی عورت کی ایک
ایسی فریاد تھی جو ہمارے مذہب معاشرے پر تازیانے
پہ تازیانے لگا رہی تھی۔ کبھی سماج کے متعلق سوچا

(بقیہ صفحہ [illegible])

دیکھتے ایک نے [illegible] دوسرے کی کھوپڑی اتار دی، بھینس گولی کی آواز سن کر بھڑک اٹھی وہاں پہنچ گئی اور وہیں ہلاک ہونے میں گولی مارنے والے کو پھانسی دے دی گئی!

ان تمام دیہاتی واقعات نے میرے سامنے فطری موت کی اہمیت اور اجاگر کر دی! جس کے نتیجہ میں مجھ پر بے پناہ خوف مسلط ہو گیا کہ کہیں ناگہانی نہ مارا جاؤں! چنانچہ میں جس طرح دیہات کے ہاں گیا تھا اسی جلدی سے گھر پہنچ گیا، میرا گھر دیہات میں ہے!

دیہات میں میں نے ایک نہایت شریف الطبع اور معتمد کسان سے گندم خریدی جو بالکل خالص تھی مگر اتنی مہنگی کہ میں اپنے بیوی بچوں کے لئے خریدنے سے قاصر تھا! مجھے ملاوٹ شدہ اور خالص اشیاء کا فوراً پتہ چل جاتا ہے کیونکہ میں ایک ایسے محکمہ میں کیمیکل تجزیہ کار کے فرائض انجام دیتا رہا ہوں جو حکومت نے قائم کر رکھا تھا کہ لوگوں کو فروخت ہونے والی اشیاء سے صرف لے کر ان کا تجزیہ کیا جائے۔ ملاوٹ ہو تو ملاوٹ کرنے والے کو مروجہ قانون کے تحت سزا دی جائے مگر جب میں نے تجزیہ کے بعد ہر نمونہ میں ملاوٹ کی اطلاع اپنے حکام کو دی تو فیصلہ [illegible] کر دیے حکومت کی ساکھ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں! خدا خدا کر کے میں نے اپنی جان چھڑائی اور ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی! اور اب میں ملاوٹ کی اس دنیا سے علیحدگی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا مجھ پر یہ خوف تھا کہ اگر میں دنیا میں رہا تو ملاوٹ شدہ اشیاء کھانے سے جو میری موت واقع ہو گی وہ غیر فطری ہو گی! اسی طرح گولی یا کسی دوسری چیز سے واقع ہونے والی موت کا خوف مجھ پر مسلط تھا کیونکہ میں فطری موت کے لمس کے لطف سے قدرتی طور پر آشنا تھا اس لئے مجھ پر اس نعمت غیر مترقبہ کی اہمیت عام لوگوں سے زیادہ آشکار تھی، میں اسے کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔ جب میں اس دنیا کو چھوڑنے کا قصد کر کے گھر سے نکلنے لگا۔ میرے ایک کندھے پر آٹا [illegible] کی بوری تھی دوسرے پر خالص پانی کی مشک جو بہت مشکل سے ملا اور ایک خالی پیالہ — ان سب کو میں نے ٹھونک بجا کر لیا تھا ان میں ذرا سی بھی ملاوٹ نہ تھی کہ پیالے کی مٹی میں بھی — گندم اور پانی کی مقدار میں نے لی تھی جتنا ضروری تھی وہ جنگل میں ادھر گندم اور پانی ختم ہوتا ادھر فطری موت سے ملاقات ہو جاتی! یہی میری منزل تھی۔ میں اپنی منزل کی تلاش میں گھر سے نکلنے لگا تو میرے چھوٹے بچے نے ہاتھ تھام لیا!

"پاپا! — آپ ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟"

"جنگل میں"

"کیوں؟" اس نے معصوم سا سوال کیا!

"اس لئے کہ دنیا کا حقیقی لطف ناپید ہے!"

"میں [illegible] سکے گا؟" میں نے فلسفہ بیان کیا جسے وہ نہ [illegible]

"کب واپس آؤ گے؟"

"کبھی نہیں —!" میں نے جواب دیا! وہ میری طرف دیکھنے لگا جس کی آنکھوں میں آنسو لہرا رہے تھے، میری کوری آنکھیں اور ماں کے پیہم آنسو دیکھ کر روحانی کا شکار ہو گیا اور کرب سے رونے لگا! اس بچے کو اس کی ماں بھی رونے لگی اور میرے پاؤں میں آنسوؤں کی زنجیر پڑ جاتی — میں تیزی سے جنگل کی طرف کھسکتا ہوا! خوف میرے حواس پر مسلط تھا مگر جب میں گھر سے نکلا تو وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر ایک رقیب کی طرح تعاقب کرنے لگا۔ وہ میرے پاؤں پر پاؤں رکھتا آ رہا تھا! اور میرا ہر نقش قدم مٹاتا چلا آ رہا تھا میں تیز سے [illegible] اور تیزی سے، حتیٰ کہ دوڑا تو کچھ فاصلے کے بعد مجھے ذرا سکون ملا! کیونکہ وہ [illegible] میرے تعاقب میں چلتا چلتا تھک چکا تھا اور ٹھہر گیا تھا، میرا تعاقب ختم ہوا تو مجھے یک گونہ خوشی ملی! اس وقت میری خوشی اور بڑھ گئی جب میں نے اپنے آپ کو جنگل میں پایا، مگر جوں ہی میں نے خوشی سے [illegible] اٹھا کر سامنے دیکھا تو میری چیخ نکل گئی [illegible]

بورے جنگل میں گونجنے لگی! سامنے شیر دم دبا رہا تھا اور سانپ لہرا رہا
تھا۔ "گویا انسان کے مقدر میں فطری موت ہے ہی نہیں!"
"ہو سکتا ہے انسان کے مقدر میں نہ ہو مگر میری تقدیر میں یہ ضرور
ہے اس لیے کہ میں نے اپنی تقدیر خود بنائی ہے، میں فطری موت
مروں گا"۔

مرتا ہوا جو بوڑھے وید سے علیحدہ ہو کر میری ذات کا حصہ
بن گیا تھا: اس نے دیا ہوا تحفہ یاد دلایا —!
"زہر کی چٹکی"
"وہ میرے تہمد کے پلو میں بندھی ہے —!" میں نے کہا اور
جب دوسری دفعہ بوجھل قدموں کے ساتھ بوجھل پلکیں اٹھائیں تو نہ
سامنے شیر تھا اور نہ سانپ —! جنگل کے اس پہلو پر تو میں نے
سوچا بھی نہ تھا — بس! سوچا تھا تبھی تو زہر کی چٹکی لینے کیلئے
اتنی طویل مسافت کا دکھ اٹھایا تھا۔"

میں ایک غار میں رہنے لگا! خالص گندم کی پوری بوری
مرے پاس تھی؛ خالص پانی کی پوری مشک میرے پاس تھی جو مری
فطرت کا سامان تھی اور غیر فطری موت کا توڑ — زہر کی چٹکی
بھی مرے پاس تھی! ناگ اور شیر مجھے اس دن کے بعد نظر نہیں
آئے البتہ ایک جنگلی مرغ اور ہرن نہ صرف مجھے روز نظر آتے
بلکہ مری نظر میں سما گئے اور میں ان کی نظر میں! وہ مرے بہت
قریب آ گئے، دوست بن گئے اور مرے ساتھ ہی غار میں رہنے
لگے! میں مرغ کی آواز میں زندگی کا ترنم محسوس کرتا اور جب ہرن
اڑتا تو میں خود کو غیر فطری موت سے کہیں دور آفاق کی وسعتوں
میں گم پاتا جہاں وہ پہنچ ہی نہیں پاتی مگر خدا کی مرضی —
میں سوچتا اور زخمی ہو کر پھڑپھڑاتا ہوا غار کے منہ میں آن گرا!،
ہرن بدک گیا مگر بھاگا نہیں، میں نے اس کا دودھ دوہا اور پیالہ
مرغ کے آگے رکھ دیا! وہ جو کچھ اس میں ڈال کر دیر سے میرے
اسے ٹھیک ہو گیا! یہ دودھ بھی غیر فطری موت سے بچانے کا
اچھا ٹانک تھا مگر اب — میں ہرن کو اس وقت شیخ چلی کی مرغی
کی طرح ذبح کر دینا چاہتا تھا جب مری بقیہ گندم اور پانی چوری
ہو گیا! یقیناً وہ شخص چرا لے گیا ہوگا جو مری طرح فطری موت
کی تلاش میں خالص گندم اور پانی لے کر آیا ہوگا اور اس کا یہ
سامان اسی مقصد کے لئے جنگل میں آنے والا ایک اور شخص لے گیا
ہوگا! — مری فطری موت ابھی دو ایک منزلیں دور تھی
لیکن غیر فطری موت تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھی جس سے
بچنے کے لئے میں نے چاہا کہ فی الفور مرغ کو پکڑ کر کھا جاؤں
ہرن کے گوشت سے پیٹ کا جہنم بھروں مگر — مرغ اڑ گیا
اور ہرن بھاگ گیا! ساتھ ہی مجھے یہ علم ہوا کہ میں جس غار میں
رہتا ہوں اس کے ہی دوسرے حصے میں شیر رہتا ہے اور ناگ
کا گھر بھی وہیں ہے! ہرن یا مرغ تو میں نے ذبح نہیں کیا تھا
مگر شیر نے گوشت کی بو سونگھ لی تھی — یہ میرا اپنا گوشت
تھا! شیر کے ساتھ ساتھ سانپ بھی اپنا حق جتا رہا تھا "یہ ممکن
نہیں!" میرے اندر کا وہ نہایت مصمم ارادہ سے بولا کیونکہ
میرے پاس آخری حربے کے طور پر فطری زندگی کے ان دونوں
دشمنوں کو ختم کرنے کے لیے زہر کی چٹکی موجود تھی!

سانپ نے دوسرے طرف کے غار سے آنے والے کھنڈر
میں سے منہ نکالا! تا کہ مجھے ڈس سکے! پیالہ میں دوہا ہوا ہرن
کا آخری دودھ پڑا تھا میں نے آدھی چٹکی اس میں ڈالی اور
پیالہ ناگ کے منہ کے آگے کر دیا! اس کا اندر کا سانس اندر
رہ گیا اور باہر کا باہر دودھ کا پیالہ ثابت و سالم پڑا رہا۔

ناگ کی غیر فطری موت پر شیر بپھر گیا۔ وہ چنگھاڑا
تھا بقیہ آدھی چٹکی غار کے اس طرف والے تالاب میں ڈال
آیا جہاں سے شیر پانی پیتا! پانی پینے کا ارادہ کرتے ہی
اس کا خاتمہ ہو گیا اور میں خوش ہوا کہ اب مری فطری موت کا
کوئی دشمن باقی نہیں رہا' مگر دوسرے ہی لمحہ مجھے احساس ہوا
کہ گندم اور پانی چرایا گیا ہے ختم نہیں ہوا کہ مری فطری موت
کی منزل ابھی دور ہے اس احساس کے ساتھ ہی مجھے بھوک
اور پیاس کی شدت کا احساس ہوا! شدت بڑھتی گئی
اور خوف دبے پاؤں آ کر مجھ پر جھپٹ پڑا۔ میں پلٹ کر اس
ملاوٹ کی دنیا میں واپس جانے پر خود کو آمادہ نہ کر سکا!
میں اپنے کہے کی تکذیب کرنے کا عادی نہیں! —

بھوک! — بھوک!!

پیاس —! پیاس —!! پیاس —!!!

(بقیہ ص ۲۱ پر)

(بقیہ کچھ علاج یار ......)

اس علاقے کے بہت سے جوان فوج میں بھرتی تھے اور وہ اپنے گھروں کو لفافوں میں کرنسی نوٹ رجسٹری کرا دیتے تھے۔ چھیدا داس جب ان بے پڑھے لوگوں کو یہ رجسٹری لفافے ڈلیور کرتا تو وہ ان لفافوں کو کھول کر چھیدا داس سے ہی پڑھواتے تھے جس سے چھیدا داس کو معلوم ہوا کہ ان خطوط میں کرنسی نوٹ ہوتے ہیں۔ چھیدا داس نے یہ نوٹ نکالنے شروع کر دئے۔

ابھی ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ محکمہ ڈاک کا انسپکٹر اور میل اوورسیئر ہمارے ہاں ڈاک خانہ کا انسپکشن کرنے بغیر کسی اطلاع کے آگئے۔ انہوں نے آتے ہی کیش وغیرہ گنا جو پورا تھا میرے والد اس معاملہ میں بڑے خوددار تھے کیا مجال کہ سرکاری کیش سے ایک پیسہ بھی خرچ کر لیں خواہ ان پر قیامت ہی کیوں نہ ٹوٹ پڑے۔ بات کو انسپکٹر نے میرے والد کو بلایا اور رازداری سے کہنے لگے کہ اعلیٰ افسران کو شکایت آئی ہے کہ فوجی جوان جو کرنسی نوٹ رجسٹرڈ لفافوں میں اپنے گھروں کو بھیجتے ہیں وہ نکال لئے جاتے ہیں اور انہوں نے ایک خط دکھایا جو گاؤں کی ایک لڑکی نے اپنے خاوند جو کہ دور دراز کسی مقام پر فوج میں تھا کو لکھوایا تھا۔ اس نے یہ خط چھیدا داس ہی سے لکھوایا تھا جس میں لکھا تھا کہ آپ نے جو نوٹ لفافے میں بھیجے تھے وہ مجھے مل گئے ہیں آئندہ بھی اسی طرح بھیجنا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ اس لڑکی نے لکھوایا یہ تھا کہ تمہارا خط تو مل گیا مگر خط میں روپیہ بھیجنے کا جو ذکر ہے وہ لفافے سے نہیں نکلا۔ مگر چھیدا داس چونکہ خود روپیہ نکال چکا تھا لہٰذا اس نے یہ لکھ دیا کہ روپیہ مل گیا ہے آئندہ بھی اسی طریقے سے روپیہ بھیجنا۔ اب چھیدا داس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس لڑکی نے دوسرا خط کسی اور سے لکھوا کر اپنے شوہر کو پوسٹ کرایا تھا کہ اسے روپیہ نہیں ملا اور وہ تنگ ہے جلدی روپیہ بھیجو۔ اس فوجی نوجوان نے دونوں خط اپنے کمانڈنگ آفیسر کو دے دئے جنہوں نے ان کو پھر کے سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفیسر کو اس شکایت کے ساتھ بھجوا دئے۔ صحیح آدمی بھجوا کر کسی گاؤں سے چھیدا کو بلوایا گیا اور انسپکٹر نے پہلے تو اس سے نرمی سے پوچھا مگر جب چھیدا داس ٹال مٹول کرتا رہا۔ آخر انسپکٹر نے اس سے ذرا سختی سے پوچھا تو اس کے ہاتھ پیر کانپنے لگے کہ اس ساری کارروائی میں ہی چھیدا داس نے اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔ گاؤں کا چوکیدار بھیج کر پولیس اسٹیشن لائل پور بھجوایا گیا اور انسپکٹر نے وہاں سے پولیس بلوا کر چھیدا داس کو اس کے حوالے کر دیا۔ مقدمہ عدالت میں گیا میرے والد صاحب اور میری گواہی بھی ہوئی اور چھیدا داس کو ایک سال کی قید بامشقت کی سزا ہو گئی۔ ●

(بقیہ بلبل چہ گفت ......)

آئے ہوئے ہیں انہیں کتابیں جلد سے جلد بھجوائی جا رہی ہیں جن حضرات کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے انہیں ۲۵ فیصد رعایت دی جائے گی۔ بک ڈپو والوں کو کم از کم پانچ جلدوں پر ۳۳ ۱/۳ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔ کتاب کی قیمت گیارہ روپیہ ہے۔ ایک کتاب پر محصول ڈاک پانچ روپے لگتا ہے۔ عام لائبریریوں کو پندرہ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔

ماں سروور

جناب ڈاکٹر ... ارکان صاحب کے قومی یکجہتی اور گاؤں کی پاک فضا میں ہندو مسلم اتحاد پر بہترین افسانوں کا یہ مجموعہ اردو میں چھپ کر تیار ہے۔ کتاب اتنی خوبصورت ہے کہ آپ دیکھتے ہی رہ جائیں۔ اس کتاب کی قیمت اکیس روپیہ ہے۔ لائبریریوں کو ۱۵ فیصد دکانداروں کو کم از کم ۵ جلدوں پر ۳۳ ۱/۳ فیصد کمیشن دیا جائے گا۔ جن حضرات کے آرڈرز آ چکے ہیں انہیں کتاب روانہ کی جا رہی ہے۔ ●

فارسی والوں کے عروضی تصرفات

ڈاکٹر آزاد گلاٹی
(پٹیالہ)

مقیاس الاشعار صفحہ ۲۰۵ پر زحافات سے متعلق کچھ ارشادات اس طرح ہیں۔ "مصنف المعجم نے جملہ زحافات مذکورہ سے چودہ زحافات کو مختص باعاریض و ضرب لکھا ہے وہ یہ ہیں۔ قصر، حذف، ہتم، جبّ، زلل، جدع، تخنیق، قلس، جحف، اسباغ، اذالت، ترفیل۔ باقی ازاحیف کا لانا تمام اجزائے بیت میں جائز لکھا ہے کچھ اختصاص بادائل ارکان کا نہیں۔ پس بنا برایں تحقیق کے کسف، قطع، وقف، زحافات، عام ٹھہرے۔"

مولف یعنی صاحب مقیاس الاشعار کہتا ہے کہ تجسس سے معلوم ہوا ہے کہ قصر و حذف بھی زحافات عامہ سے ہیں......

اب یہاں مخالفت ہوتی ہے قول محقق سے کہ انہوں نے وقف، کسف، قطع، قصر، حذف کو مختص باعاریض لکھا ہے جس طرح پر عروض بھی ہے لیکن فارسی میں ان کو عام قرار دینا منجملہ تصرفات فارسیہ ہے۔

اس قول کی حقیقت پرکھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اولاً اس نتیجہ پر پہنچا جائے کہ فارسی والوں کو آخر اس قسم کے تصرفات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس لئے نہیں کہ ان کا مقصد اختراعات، اضافات اور تصرفات کرنا تھا بلکہ اسلئے کہ وہ عربی عروض میں الجھ کر رہ گئے اور صحیح حل نہ ملنے پر اس قسم کے تصرفات پر مجبور ہو گئے اگر فارسی والے محقق طوسی کی طرح عروض میں کچھ اضافہ فرماتے تو ان کا یہ قدم مستحسن ہو سکتا تھا لیکن

......ع ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

چند مثالیں صرف اس لئے پیش کرتا ہوں کہ آپ فارسی والوں کے تصرفات کی حقیقت سے واقف ہو جائیں۔

یگانہ نے چراغ سخن صفحہ ۸۹ پر بحر متدارک کی امثلہ میں یہ شعر دیا ہے ؎

سنبل سیہ بر سمن مزن
لشکر حبش بر تتن مزن

یہ شعر صحیح بحور اور صحیح زحافات سے حاصل کردہ مندرجہ ذیل اوزان سے بآسانی تقطیع ہو سکتا تھا۔

بحر قریب اشتر مکفوف محذوف ... فاعلن مفاعیل فاعلاتن
بحر منسرح مسدس مرفوع مخبون مرفوع ... فاعلن مفاعیلن فاعلن
بحر خفیف مکفوف سالم مربوع ... فاعلات مستفعلن فعلن

مگر چنگیزی صاحب جب اس شعر کا صحیح وزن تحقیق نہ کر سکے تو فارسی عروضی تصرفات کے پیش نظر اس کا یہ وزن تحقیق فرمایا ...... "فاعلن فعل فاعلن فعل" اور عروضی نام یہ تجویز فرمایا۔ متدارک مثمن مخبون مقطوع۔

یگانہ نے کہنے کو تو یہ بات کہہ دی اور دیگر عروضی اسکے اس تحقیق کردہ وزن پر ایمان بھی لے آئے مگر کسی بھی عروضی نے اس کے صحیح یا غلط ہونے کو نہ پرکھا۔

یگانہ بحث زحافات میں صفحہ ۶۸ پر لکھتے ہیں کہ زحاف قطع عروض و ضرب سے مخصوص ہے خبن اور قطع کا اجتماع تو درست ہے مگر مخبون مقطوع رکن کا حشو میں کیا کام لہذا وزن غلط ہوا یعنی یگانہ اپنے ہی قول پر پابند نہ رہ سکے اور صحیح وزن تحقیق نہ ہونے کی صورت میں غیر حقیقی وزن لکھ مارا۔

فارسی والوں نے یگانہ کی طرح اسی قسم کی بے راہ روی اختیار کی ہے اور بغیر سوچے سمجھے عروضی تصرفات کر کے عروض کی صورت بگاڑ دی۔

آیئے اب اس قول (وقف، کسف، قطع، قصر اور حذف زحافات کو عام قرار دینا منجملہ تصرفات فارسیہ ہے) کو پرکھیں اور دیکھیں کہ اس قول میں کتنی جان ہے۔

میں نذارِ علاقی کہتا ہوں ۔

وقف: زحافِ وقف کا عمل آخرِ رکن وتد مفروق پہ ہوتا ہے اور اس کی رو سے وتد مفروق کا متحرک دوم ساکن ہو جاتا ہے وتد مفروق صدر، ابتدا یا حشوین میں کبھی موقوف ہو کر آتا ہی نہیں ہمیشہ عروض و ضرب ہی میں یہ صورت اختیار کرتا ہے۔ بقاعدہ تقطیع صدر و ابتدا اور حشوین میں ساکن دوم یعنی موقوف ہمیشہ متحرک ہو کر آتا ہے اس لئے زحافِ وقف کا صحیح مقام عروض و ضرب کے علاوہ دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ اب وہ لوگ جو صاحب مقیاس الاشعار کے ہم نوا ہیں خود فیصلہ فرمائیں کہ فارسی والوں کے اس تصرف میں کتنی جان ہے ۔

کشف: ۔ یعنی اسقاط متحرک [illegible] بر وتد مفروق از آخر رکن ۔

جب صدر و ابتدا اور حشوین کو وتد مفروق کے متحرک دوم کا موقوف کرنا ہی گوارا نہیں تو کشف کا عمل یعنی متحرک دوم کا اسقاط کرنا کیوں کر گوارا ہو سکتا ہے ۔

بحر مقتضب مثمن مزاحف کا یہ وزن دیکھئے

مفعولُ　مفاعلن　مفعولُ　مفاعلن

مرفوع　مخبون　مرفوع　مخبون

زحاف تخنیق کے سبب یہ وزن اس طرح بھی ہو سکتا ہے ۔

"مفعولن فاعلن مفعولن فاعلن"

یہی وہ مقام ہے جہاں فارسی والوں نے دھوکا کھایا ہے اور غلطی سے دونوں جگہ مفعولن کو مکشوف سمجھ لیا حالانکہ یہاں مکشوف کا وجود ہی نہیں ۔

زحاف تخنیق کی تعریف ملاحظہ ہو ...... وتد مجموع سے پہلا حرف ساکن کرنا اور ما قبل رکن کے حرف آخر متحرک سے پیوست کرنا ۔

مفعولُ مفاعلن میں دوسرے رکن کا مفا وتد مجموع اس کے پہلے حرف میم کو جو متحرک ہے ساکن کیا اور ما قبل رکن مفعول کے حرف آخر متحرک "ل" سے پیوست کیا۔

یعنی مفعولم فاعلن بنا ۔ مفعولم کے عوض مفعولن رکھ لیا گیا

قصر: ۔ یعنی اسقاط حرف متحرک ہ سبب خفیف از آخر رکن ۔

یہ زحاف مندرجہ ذیل ارکان سالم میں وارد ہوتا ہے۔

فعولن	سے	فعولْ	بسکون لام
مفاعی لن	سے	مفاعیل	بسکون لام یعنی فعولان
فاعلاتن	سے	فاعلان	بسکون نون سے
فاع لاتن	سے	فاع لاتْ	بسکون تا نون سے
مس تفع لن	سے	مس تفع لْ	بسکون لام یعنی مفعولن

جیسا کہ بسلسلۂ وقف پہلے لکھا جا چکا ہے یہاں بھی وہی صورت ہے لہٰذا فارسی والوں کا یہ کہنا کہ یہ زحاف بھی عام سراسر غلط ہے ۔

(نوٹ) معلوم ہونا چاہئے کہ مس تفع لْ یعنی مفعولن میں "لن" ہرگز سبب خفیف نہیں بلکہ اس نے زحاف کے زیر اثر یہ صورت اختیار کی ہے ۔

حذف: ۔ اسقاط سبب خفیف از آخر رکن ۔

جب صدر و ابتدا اور حشوین کو قصر ہی گوارا نہیں تو حذف کے گوارا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

قطع: ۔ صدر و ابتدا اور حشوین کو زحاف "عزج" (جس کے ذریعہ رکن کے آخر سے وتد مجموع کے متحرک دوم کو ساکن کیا جاتا ہے) کا عمل ہی گوارا نہیں تو رکن کے آخر سے وتد مجموع کے ایک حرف متحرک کو ساقط کرنا کیونکر گوارا ہو سکتا ہے۔

فارسی والوں کے جملہ تصرفات گمراہ کن ہیں۔ خدا نے چاہا تو آئندہ دوسرے زحافات پر روشنی ڈالوں گا

اچہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے
ی دانے خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک یونانی دَوا
جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے
بادیتے ہیں مگر ختم نہیں کرپاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جِلد جل بھی جایا
تا ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دُور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے
ور ان تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبے اور کھجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے او
آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

ت: ۱ چھ روپے

شیخ لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

ٹیلیفون نمبر [illegible] رجسٹرار آف نیوز پیپرز انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۲۲/۵۷ رجسٹرڈ نمبر ڈی ایل ۲۰/۳۰۰۰

ہر ذرۂ وطن سے ہے نیا امن ہمکو پیار
[illegible] ہوں [illegible]
دنیا تو گوالیار ہی

ماہنامہ
شانِ ہند
دہلی

سالانہ ۱۸/- روپے
فی پرچہ ۲/- روپے

ایڈیٹر
سعود قریشی

جلد نمبر [illegible] | اکتوبر ۱۹۸۲ء | شمارہ نمبر ۱۰

پیغام برِ امن

جناب توصیف علوی کیرتپوری

وہ اہنسا کا نیا پیغام بر
جنگ آزادی کا سالار عظیم
شانتی کا وہ زمانے میں نقیب
گلستاں کو جس نے بخشی ہے بہار
جس کا ہر اک گام منزل کا امیں
جس نے دنیا کو دیا پیغام نو
شہیدان وطن کا پیشوا
وہ کہ جس کی بزم ہو بزم زندگی
وہ شکستہ کشتیوں کا ناخدا
غمگساروں کے وہ دل کی روشنی
قوم کا وہ ایک مردِ جری
وہ کہ جس نے دیپ جلا ہر موڑ کو
وہ کہ جس سے ہو گئی روشن فضا
وہ کہ جس نے دی اندھیروں کو کرن

وہ جہاں میں اک نرالا راہبر
حریت کا وہ نشانِ خوش نظر
وہ جہاں میں امن کا پیغامبر
جس نے گلشن کو دیا خونِ جگر
ہر قدم ہے جس کا نقشِ معتبر
جس نے بخشے ہیں نئے فکر و نظر
قافلۂ شوق کا وہ راہبر
وہ کہ جس کا جام، جامِ معتبر
وہ کہ ہر دردِ جگر کا چارہ گر
مفکروں کا وہ نیا نورِ سحر
زندگی کی منزلوں کا راہبر
وہ کہ چمکی جس سے ہر اک رہگزر
وہ کہ جس نے جگمگائے بام و در
وہ کہ شامِ غم کو دی جس نے سحر

ہند کی وہ عظمتوں کا اک ستون
وہ نئی قدروں کی شانِ معتبر

[illegible] ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے [illegible] کے صفحات [illegible] پریس چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی [illegible]
سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند [illegible] انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

محمد ﷺ مکہ سے مدینہ کیوں بھاگا؟ (نعوذ باللہ)

(نقلِ کفر کفر نباشد)

سیاسی پارٹیوں کو جب مسلمانوں کے ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے تو لیڈر ایسی لچھے دار باتیں کرتے ہیں کہ جیسے وہ مذہب اسلام قبول کر چکے ہیں اور حکومتی پارٹی تو مسلمانوں کے لئے چند نقبات تریکی مخصوص کر دیتی ہے تاکہ مسلمان دانشور ان ٹکڑوں کی تقسیم پہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں اور انہیں نقبات تریکی حصول کے لئے حکومت کا ساتھ دینا ہی پڑے۔ مگر عملی طور پر مسلمانوں کی مذہبی یا سیاسی سلامتی یا اس کے تحفظ میں ان سیاسی پارٹیوں یا حکومتی پارٹی کا کردار کیا رہتا ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔

"مہاراشٹرا" میں کانگریس آئی کی حکومت ہے چیف منسٹر بھونسلے صاحب سے پہلے جناب انتولے وہاں کے وزیر اعلیٰ تھے۔ انتولے صاحب کے عہد میں "پونا ایجوکیشنل بورڈ" قائم کیا گیا تھا۔ چنانچہ اسی بورڈ کی نگرانی میں آٹھویں جماعت کی درسی کتاب "تاریخ" "इतिहास" شائع کی گئی ہے اس کتاب کا ایک سبق "اسلام دھرم کا عروج" میں پیغمبر اسلام کا ذکر کرتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جنہیں ہم "نقلِ کفر کفر نباشد" کے تحت نقل کر رہے ہیں۔

"محمد پیغمبر یہ پاروں کی ایک ٹولی کے ساتھ مکہ شامل گیا۔ محمد مکہ سے مدینہ کیوں بھاگا؟"

(نعوذ باللہ)

ایک سیکولر حکومت کی اپنی پارٹی کی ریاستی حکومت کا قائم کیا ہوا [illegible] کا ادارہ ملک کی ایک بڑی اقلیت کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کا سبب بنا ہے اور سوال یہ ہے کہ نہ تو ریاستی اور نہ ہی مرکزی نے اس غلطی کو سہواً ہوئی ہے یا دیدہ دانستہ طور پر کی گئی ہے کو دور کرنے کی کوششیں کی ہے اور نہ ہی کوئی ایسا حکم جاری ہوا ہے کہ جب تک اس کتاب سے اس قسم کے قابلِ اعتراض جملے حذف نہیں کر دئے جاتے اس کتاب کی فروخت بند کر دی جائے۔ اور اسکولوں میں یہ کتاب نہ پڑھائی جائے۔ بلکہ مذکورہ کتاب بازار میں فروخت ہو رہی ہے اور اسکولوں کے طالب علموں کو اسے خریدنا لازمی ہے۔

ایک طرف تو ہم قومی یک جہتی، مذہبی رواداری اور دوسرے مذاہب کا احترام کرنا وغیرہ خوش کن الفاظ کا استعمال کرتے نہیں تھکتے قومی یک جہتی کے لئے جلسوں، مشاعروں [illegible] پر لاکھوں روپیہ ضائع کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہم درسی کتابوں میں دوسروں کے مذہبی جذبات تک کا خیال نہیں رکھتے کیا وزیر اعظم صاحبہ مہاراشٹرا کے وزیر اعلیٰ کو یہ حکم دیں گی کہ وہ اس مذہبی دل آزاری والی کتاب کو فوراً درسی کتب کی فہرست سے خارج کریں تاکہ آئندہ درسی کتابوں کے مصنف اور ایسی کتابوں کو منظور کرنے والے ذمہ دار حضرات اپنی ذمہ داری کا احساس بہتر انداز سے کر سکیں۔ نیز اس کتاب کو ترتیب دینے والے مصنف اور اس کتاب کو درسی نصاب میں شامل کرنے والے ذمہ دار حضرات کو مذہبی منافرت پھیلانے کے جرم میں قرار واقعی سزائیں دی جائیں تاکہ آئندہ اس قسم کی گھٹیا حرکت نہ ہو سکے۔

وزیر اعظم [illegible]

اور [illegible]

[illegible]

مشہور کیا تھا لیکن اگر سو بار بھی ہم کہیں تو ہمارے ادیب، شاعر،
صحافی، علما، فنکار، مفکر، جناب سلامت علی مہدی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
سلامت کی ہیجانہ زندگی کے واقعات کے بارے میں اگر ہم بھرپور مبالغہ
بھی کریں تو سو دو حصے زیادہ نہیں ہوں گے۔ مگر ہمارے سلامت علی مہدی
کی غلط بیانیوں، جھوٹ وافترا۔ عیاری اور جھوٹی بیماری [illegible]
سے روپیہ اینٹھنے، مظلومین جمشید پور کے نام پر روپیہ کی فراہمی۔
جناب یہ وقت نہیں ہوگا کہ نام نامی کے غلط استعمال اور سیکڑوں دوسرے
بے بنیاد اور خالص جھوٹ وافترا کی بنیاد پر کئے گئے حملوں کی
زبانی قلم کشی سے روپیہ اینٹھنے کے واقعات کو اگر جمع کیا جائے
اور اس کام پر انٹلی جنس بیورو اور خفیہ پولیس کے اعلیٰ افسروں کو
متعین کیا جائے اور یہ لوگ انتہائی اختصار سے بھی کام لیں تو کئی
سال تک سلامت علی مہدی صاحب کے کارہائے نمایاں کی تفصیل
مکمل نہ کر سکیں گے اور سیکڑوں جلدوں میں بھی اس کی عیاریوں کی
داستانیں نہ سما سکیں گی اور نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ سلامت علی
مہدی نے اپنی شاطرانہ چالوں سے چند معتدد حضرات کی سفارش
سے وزیر اعظم ریلیف فنڈ سے چھ ماہ ہوئے پانچ ہزار روپیہ حاصل
کیا۔ وزیر اعظم کا ریلیف فنڈ ایک ایسی قومی امانت ہے جسے وزیر
اعظم ملک میں آفات ارضی وسماوی سے متاثر ہونے والے
عوام پر یا دوسری جائز امدادی ضروریات پر صرف کرتی ہیں مگر
ایک ایسے شخص کو جو عادتاً شرابی ہو اور جو کسی بھی حیات بخش دوا
کے مقابلہ میں شراب کو اولیت اور ترجیح دیتا ہو اسے علاج کے
لئے وزیر اعظم ریلیف فنڈ سے پانچ ہزار روپیہ دیا جانا
یقینی طور پر اس قومی امانت کا ناجائز استعمال ہے۔ وزیر اعظم
صاحبہ سے کن حضرات نے سلامت علی مہدی کو اس امداد کے لئے
سفارش کی یا انہیں قائل کیا ان حضرات نے یقینی اور سو فیصدی
جھوٹ [illegible] وزیر اعظم سے جھوٹ بولا ہے اور اس قومی مقدس فنڈ
سے پانچ ہزار روپیہ کا ناجائز استعمال کرایا ہے۔
کیا یہ حضرات جنہوں نے وزیر اعظم صاحبہ سے سلامت علی
مہدی کی مدد کے لئے سفارش کی وہ [illegible] سکتے ہیں کہ وہ
سلامت علی مہدی کے [illegible]
[illegible] اور

ایڈیٹر جناب رحمٰن نیر صاحب کا یہ [illegible] بیان چھپا تھا
کہ سلامت علی مہدی جو مظلومین جمشید پور کے نام پر روپیہ جمع
کر رہا ہے اس سے ان کا یا بیسویں صدی کا کوئی تعلق نہیں ہے
کیا سفارش کرنے والے یہ حضرات اس سے لاعلم ہیں کہ مظلومین
جمشید پور کے نام پر سلامت علی مہدی نے کم از کم پچاس ہزار
روپیہ اینٹھا۔ کئی ہزار روپیہ کے ڈرافٹ اور منی آرڈر تو جناب
رحمٰن نیر صاحب نے واپس کئے جو غلطی سے دفتر بیسویں صدی
میں سلامت علی مہدی کے نام آگئے تھے۔ اور کیا یہ حضرات
بتا سکتے ہیں کہ سلامت علی مہدی نے مظلومین جمشید پور کے
لئے پچیس مکان بنوا کر انہیں پوری طرح سے آباد کرنے کے دعوے
کی تکمیل تو درکنار جمشید پور جا کر کسی مظلوم کی آنکھ کا آنسو
بھی پونچھا۔ یا ان پانچ ہزار روپیوں کو علاج پر صرف کیا۔

سلامت علی مہدی کی شراب نوشی اور رنڈی بازی کا
ایک معمولی سا واقعہ بھی سن لیجئے ۔۔۔ سلامت علی مہدی نے
ایک رسالہ جاری کیا نام یاد تو نہیں رہا کیونکہ انہوں نے درجنوں
رسالے جاری کئے اور عوام سے روپیہ اینٹھ کر انہیں بند کر دیا۔
یہ اس رسالے کے دس بیس پرچے ساتھ لے کر بمبئی گئے اور نور محمدی
ہوٹل کے مالک جناب حکیم صاحب سے کہا کہ رسالہ تو چھپ گیا ہے
مگر اسے ایجنٹوں کے ہاں بھجوانے کے لئے ڈاک محصول کے لئے روپیہ
نہیں ہے اگر آپ اس کا انتظام کر دیں تو بیس دنوں میں کئی ہزار
روپیہ میرے پاس وی، پی وصول ہونے پر آجائے گا اور میرا کام
بھی چل نکلے گا چنانچہ حکیم صاحب نے اپنے دوستوں سے
سلامت علی مہدی کی اس مشکل کا ذکر کیا تو حکیم صاحب کی
کوششوں سے قریباً چار ہزار روپیہ فراہم ہو گیا جس میں
حکیم صاحب کا بھی عطیہ شامل تھا۔ جس روز یہ روپیہ سلامت علی
مہدی کے حوالے کیا گیا اسی رات انہوں نے ہوٹل میں اپنے احباب
کو دعوت شاہد وشراب دی اور [illegible] جب شراب کا خمار اترا
تو ان کے پاس کل بارہ سو روپیہ باقی تھا چنانچہ چپکے سے
[illegible] کا ٹکٹ خریدا اور دہلی آگئے حکیم صاحب نے اس
[illegible]
[illegible]

ہو کر بعد جناب یوسف صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے
لہ ان کے سامنے دُہرایا کہ رسالہ چھپ چکا ہے ڈاک محصول
یا پانچ ہزار روپیہ درکار ہے وی پی وصول ہوتے ہی واپس
. تیلہ یوسف صاحب کو جھوٹ، فریب اور غلط بیانی سے
ںنانچہ سلامت علی مہدی کی تمام فریب آمیز باتیں سننے ہی
فرمایا کہ حرام زادے اسی وقت دفتر سے نکل جاؤ ___
کے کرتوت کی اطلاع مجھے مل چکی ہے۔ لہذا یہ بدمزا ہو کر
نیچے آگئے۔

ہماری سی آئی ڈی تحقیقات کرے تو ایک نہیں ہزاروں
ات پردہ اخفا سے باہر آئیں گے۔ جناب ہیم وتی نندن
کہ وہ اُتر پردیش کے وزیر اعلیٰ تھے اور مرکز و حکومت
واصلات تھے تو سلامت علی مہدی نے ان کے نام سے
مندوں کو کیا کیا غلط امیدیں دلا کر کس قدر روپیہ اینٹھا
صاحب کے فرشتوں کو بھی پتہ نہیں کہ ان کے حوالہ سے
لگوانے اور نہ معلوم کیا کیا کرا کے دینے کے سبز باغ دکھا
یہ اینٹھا۔

عیارِ اعظم نے غیر ملکی دورہ کیا (ملک کا نام اگر لکھا گیا
نِ ہند اس شخص پر ہزاروں لعنتیں بھیجیں گے) اور یہ
عیاری کے ہاتھ دکھا کر کیا گیا۔ اگر اس کی بھی تحقیق
آجائے اور مسلمانانِ ہند کو معلوم ہو سکے کہ جس
ظلم کے لئے یہ چندے دیتے ہیں وہ دراصل کیا ہے۔
ہی میں اس عیارِ اعظم نے پھر ایک اپیل شائع کی ہے
علاج کے لئے لندن یا جرمنی جا کر علاج کرانے کا
رچا گیا ہے اور بیس پچیس ہزار روپیہ کی فراہمی کے
ہی معصومانہ استدعا کی گئی ہے۔ اخبار "ہماری زبان"
شمارہ اکتوبر میں یہ اپیل ان الفاظ میں چھپی ہے۔

حامیوں سے ایک اُردو صحافی اور ادیب کی اپیل

"مسلسل چالیس سال تک اُردو ادب اور صحافت کی
کرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں بلکہ اب
بیماریوں میں گزشتہ دو سال سے مبتلا ہو گیا ہوں

کہ نہ موت آتی ہے اور نہ مسلسل علاج کے باوجود اس موذی بیماری سے نجات ملتی ہے۔ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے چھ ماہ قبل میرے معالجہ کے لئے ۵ ہزار روپے روانہ کئے تھے لیکن یہ رقم ۲ ماہ قبل ختم ہو چکی ہے اب ماہر ڈاکٹروں نے مشورہ دیا ہے کہ میں لندن یا جرمنی جا کر اپنے دل کا آپریشن یا مشینی علاج کراؤں کیوں کہ میرے دل کا سائز معمول سے بڑا ہو گیا ہے اس مہنگے علاج پر تقریباً بیس ہزار روپیہ کے اخراجات کا تخمینہ ہے جو ظاہر ہے میرے پاس نہیں ہیں اور میں زندگی اور موت کے دوراہے پر کھڑا ہو کر اپنی طرف موت کے بڑھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سننے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ ملک و قوم میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو میرے معالجہ کے اخراجات میں حصہ لے کر مجھے میری ادھوری زندگی کے عذاب سے نجات دلا سکتے ہیں، اس لئے میں تمام اُردو دوستوں سے اور درد مند مخیر حضرات سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ حتی الامکان میری مالی مدد کریں اور اس کارِ خیر میں کوئی تاخیر نہ کریں کیوں کہ علاج میں مزید تاخیر جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے میں منی آرڈر اور ڈرافٹ بھیجنے کا پتہ تحریر کر رہا ہوں۔ سلامت علی مہدی۔"

سلامت علی مہدی نے اپنی جس بیماری کا ذکر فرمایا ہے اور بیماری کے علاج کے لئے لندن یا جرمنی آنے جانے پر جبکہ ایک شخص یا ان کی بیوی تیمارداری کے لئے ان کے ساتھ ہو تو بیس یا پچیس ہزار روپیہ تو ہوائی جہاز کے کرائے کے لئے ہی ناکافی ہوگا اور پھر لندن یا جرمنی میں اس بیماری کا علاج کھیل تماشا تو نہیں... جواہر لال یا دوار المسک معتدل جواہر والی سے تو ہوگا نہیں اگر انہیں لاوارث وارڈ میں بھی رکھا جائے تو بھی اس بیماری کے علاج کے لئے ہزاروں روپیہ درکار ہیں مگر سلامت علی مہدی عوام کا نبض شناس ہے اگر پچاس ساٹھ ہزار روپیہ کا سوال کرتا تو عوام اس کی اپیل پر دھیان ہی نہ دیتے، بیس پچیس ہزار روپیہ کی فراہمی کے لئے کئی بیوقوف سامنے آ سکتے ہیں۔ کیوں کہ سلامت علی مہدی بھی جانتا ہے اور وہ بار بار اس کا تجربہ کر چکا ہے کہ "ہنوز احمق در جہان باقیست کہ مفلس نہ ماند" یعنی جب تک دنیا میں بیوقوف باقی ہیں کوئی مفلس

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

پینتالیس سال ہوئے کہ شاعرِ رمان (خودساختہ) افضل پشاوری ملتان چھاؤنی میں مقیم تھے اور گورہ پلٹن کے لانڈری کنٹریکٹر تھے۔ افضل صاحب نے ملتان چھاؤنی میں ایک کوٹھی کرایہ پر لے رکھی تھی جس میں رہائش کے علاوہ لانڈری کا کام بھی ہوتا تھا، پچاسوں دھوبی ان کے ہاں ملازم تھے۔ دن بھر گورے فوجی سیٹیاں بجاتے ہوئے آتے اور اپنے کپڑے دھونے یا پریس کرنے کے لئے دے جاتے اور دھلے ہوئے تیار کپڑے لے جاتے۔ افضل صاحب کو خاصی آمدنی تھی چنانچہ شراب، طوائف اور شاعری کی تثلیث نے انہیں اپنی لپیٹ میں ایسا لیا کہ دُنیا وما فیہا سے کافی حد تک بیخبر رہنے لگے۔

احمد یار کا تانگہ انہوں نے مستقل طور پر تین روپیہ یومیہ میں ٹھیک کر رکھا تھا۔ صبح دس بجے کے قریب احمد یار اُن کی کوٹھی پر تانگہ لاکر کھڑا کر دیتا اور جہاں دھوبی برآمدے میں کپڑے پریس کرتے وہاں بیٹھا رہتا۔ افضل صاحب کو جب بھی کہیں صدر بازار میں یا فوجی دفاتر میں جانا ہوتا تو احمد یار کو آواز دی جاتی اور وہ بڑی مستعدی سے جی حضور کہتا ہوا تانگہ کی جھاڑ پونچھ شروع کر دیتا۔ مگر ہر شام کو افضل صاحب بازارِ حسن بیرون حرم دروازہ میں گانا سُننے ضرور جاتے اور ہفتہ میں دو ایک بار حُسین آگاہی سے ذرا آگے باغ سے ملحق سناتن دھرم ہائی سکول (اب معلوم نہیں اس سکول کا کیا نام ہوگا) کے پاس ایک کال گرل کے ہاں بھی پھیرا ڈالتے۔

چھاؤنی میں ایک قالین فروش محمد حسین کشمیری بڑے کینڈے کے چرب زبان اور گپ باز تھے اور جملہ کشمیری صفات خدا نے انہیں وافر عطا کی تھیں انہوں نے افضل صاحب کی شاعری کی بے تحاشا داد دے دے کر ان کا قرب حاصل کر لیا تھا اور ایک نوجوان بزنس مین جو شراب کا رسیا تھا اس نے بھی افضل صاحب سے رسم و راہ بنا رکھی تھی لہٰذا یہ دونوں حضرات افضل صاحب سے مفت کی شراب پیتے تانگہ میں سیر کرتے اور رات کو مفت کا گانا بھی سُنتے۔

افضل پشاوری ان دنوں شاعری کے لحاظ سے فعلن فعلن کی صحیح املا بھی نہیں جانتے تھے، مگر انہوں نے "ترویجِ اُردو" کے نام سے ایک بزم قائم کر رکھی تھی اور دعویٰ یہ کیا جاتا تھا کہ یہ نوآموز اور مبتدی حضرات کے کلام کی اصلاح اُجرتاً کرتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں جو خطوط مُبتدی شعراء کو لکھے جاتے۔ ایک خط بہاول پور کے کسی صاحب کو لکھا ہوا ایڈیٹر شانِ ہند کے ہاتھ لگا تو اس میں افضل صاحب کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی یہ تحریر تھی "ہم تین آنے فی اشعار اصلاح کی اُجرت لیتے ہیں" اُن دنوں شانِ ہند ملتان کا ایک باوقار ہفت روزہ تھا۔ افضل صاحب کا یہ خط شانِ ہند میں شائع کیا گیا تو عوام کو پتہ چلا کہ مبتدی شعرا کے کلام کی اصلاح کرنے والے حضرت "فی اشعار" لکھتے ہیں، چنانچہ اس خط پر ایسی لے دے ہوئی کہ افضل صاحب مجھے اور شانِ ہند کو اپنا مخالف سمجھنے لگے۔

جناب غنچہ امروہوی (مرحوم) جناب قیصر ہوشیارپوری، جناب ظفر ادیب اور راقم الحروف کا ایک الگ محاذ سمجھا جاتا تھا لہٰذا افضل صاحب اور اُن کے شرابی حواری ہم سب کی مخالفت اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ مگر افضل صاحب اور ان کے جملہ حواری سوائے شراب نوشی اور حرام کاری کے ادبی طور پر سب کے سب جاہلِ مطلق تھے لہٰذا میں نے ایک خیالی مشاعرہ لکھا جس کا عنوان تھا "دھوبی گھاٹ کا مشاعرہ" یہ خیالی مشاعرہ شانِ ہند میں چھپا اور اس قدر مقبول ہوا کہ ملتان کے علاوہ جہاں جہاں بھی شانِ ہند جاتا تھا ہر شہر اور قصبہ سے اس کی تعریف میں خطوط آئے۔ اس خیالی مشاعرہ کی اشاعت کے بعد افضل صاحب کی طرف سے محمد حسین کشمیری راقم الحروف سے ملے اور کہا کہ افضل صاحب آپ کے ہاں آنا چاہتے ہیں۔ وقت مقرر ہوا اور افضل صاحب اکیلے ہی غریب خانہ پر تشریف لے آئے۔ اس مُلاقات میں یہ

طے پایا کہ ہم سب کی آپس میں صلح ہو جانی چاہئے اور یہ "ادبی" لڑائی ختم سمجھی جائے۔ دوسرے دن میں نے ظفر ادیب صاحب اور غلام حسین قیصر صاحب سے صلاح مشورہ کیا اور قبلہ غنچہ صاحب کی اجازت سے ہم سب اکٹھے ہو گئے اور افضل صاحب نے محمد حسین کشمیری کو اپنے حواریوں میں سے نکال دیا۔ کیوں کہ یہی محمد حسین کشمیری ہی اپنی چرب زبانی اور غیر ذمہ داری کے باعث ہم سب میں پھوٹ ڈلوانے کی سب سے بڑی وجہ تھا۔

افضل صاحب کا کاروبار بڑا وسیع تھا لہٰذا آمدنی بھی اُسی لحاظ سے نہایت ہی معقول تھی۔ ملتان کی گرمی مشہور ہے لہٰذا گورہ پلٹن موسم گرما میں ڈلہوزی چلی جاتی اور افضل صاحب کو بھی لانڈری کنٹریکٹر ہونے کے باعث گورہ پلٹن کے ساتھ ہی معہ دھوبیوں کے ڈلہوزی جانا ہوتا تھا۔

موسم گرما آیا تو افضل صاحب نے مجھ سے دوستانہ طور پر یہ کہا کہ اُن کی عدم موجودگی میں ہر روز اُن کی کوٹھی پر آ کر ڈاک وغیرہ دیکھ لیا کروں اگر کوئی ضروری خط ہو تو اس کا جواب لکھ دیا کروں اور ان کی عدم موجودگی میں ان کی والدہ صاحبہ سے ہر روز یہ بھی دریافت کر لیا کروں کہ اگر اُنہیں کوئی ضرورت ہو تو اُن کے فرمان کے مطابق تعمیل کر دی جائے۔ ایک ہفتہ میں ہی پتہ چل گیا کہ افضل صاحب جس قدر بے راہ ہیں اُن کی والدہ اُتنی ہی نیک اور خدا ترس خاتون ہیں۔ وہ اپنی بہو (اہلیہ افضل صاحب) اور اپنے پوتے عظمت کا بڑا خیال رکھتیں۔ میں روزانہ ایک گھنٹہ افضل صاحب کی رہائش گاہ پر رہتا۔ ڈاک وغیرہ دیکھتا۔ ان کی والدہ اس عرصہ میں میرے پاس ہی بیٹھی رہتیں اور جو کچھ کہنا ہوتا فرماتیں اور میں ان کے سامنے ہی ملازمین کو بلوا کر ان کی مرضی کے مطابق ہر کام کرا دیتا۔ ایک دن پوسٹ مین دس روپیہ کچھ آنے کا وی۔ پی لایا۔ وی۔ پی جو کہ ایک لفافہ تھا وصول کر لیا گیا اور اسے کھولا تو اس میں ایک غزل تھی جو نازش حیدری صاحب نے دہلی سے بھجوائی تھی جو انہوں نے افضل صاحب کے نام سے لکھی تھی اور اس کی اُجرت دس روپیہ کے عوض وی، پی سے بجھوائی تھی۔ اب افضل صاحب کی شاعری کا حدود اربعہ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ میں نے یہ غزل انہیں ڈلہوزی بھجوا دی اور ساتھ ہی یہ معذرت نامہ بھی لکھ دیا کہ آپ نے جاتے ہوئے مجھے یہ نہ بتایا کہ اگر کوئی وی، پی لفافہ آئے تو اسے بغیر کھولے آپ کے ہاں بجھوا دوں۔ آئندہ میں خود ہی خیال رکھوں گا۔

اس کے بعد ساڑھے پانچ ماہ کے عرصہ میں نازش حیدری صاحب کا کوئی وی، پی لفافہ نہ آیا۔ غالباً افضل صاحب نے انہیں لکھ دیا کہ وہ وی پی وغیرہ براہ راست ڈلہوزی بھجوائیں۔ ملتان کے پتہ پر نہیں۔ موسم سرما شروع ہوتے ہی گورہ پلٹن ملتان واپس آ گئی۔ افضل صاحب اپنی شاعری اور اس کے منبع کا مجھ پر انکشاف ہو جانے سے نادم تو تھے ہی کچھ خائف بھی رہنے لگے۔ اُن دنوں میں شراب کبھی کبھار کسی پارٹی وغیرہ میں پی لیتا تھا۔ چنانچہ افضل صاحب نے آئے دن مجھے بھی اپنے شراب نوشی میں شریک ہونے کی دعوت دینی شروع کر دی۔ اُن دنوں ریڈ لیبل جانی واکر وسکی کا ادھا پونے نو روپیہ کا ملتا تھا اور بیئر کی بوتل آٹھ آنے میں۔ جس طرح نامرد اپنی نامردی پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنی مردمی کی خود ساختہ داستانیں ڈینگیں مار مار کر اپنے احباب کو سُناتا ہے عین اسی طرح متشاعر بھی اپنے شاعر ہونے کا یقین بار بار دلاتا ہے چنانچہ شراب نوشی کے دوران افضل صاحب اکثر و بیشتر اپنا کلام سُناتے اور داد کے طالب ہوتے مگر میں چوں کہ اُن کے متشاعر ہونے کا عملی اور عقلی جواز رکھتا تھا لہٰذا داد دینا تو درکنار ان کے اشعار سُنتے سُنتے میرا نشہ بے کیفی میں تبدیل ہونا شروع ہوتا تو میں احمد یار کو آواز دیتا کہ بھئی اب بہت دیر ہو گئی ہے مجھے بابو محلہ صدر میں پہنچا دو۔ احمد یار مجھے بابو محلہ میں اتارتا ہوا افضل صاحب کو حرم گیٹ کے باہر کسی گانے والی کے ہاں لے جاتا۔ اور جس روز مجھے نشہ کیف و سرور کی حد تک ہوتا تو افضل صاحب دیدہ دانستہ احمد یار کو اشارہ کر دیتے کہ ملتان چھاؤنی اسٹیشن کے راستے تانگہ سیدھا حرم دروازہ لے چلے اور اس طرح مجھے بھی بیسیوں بار ان کے ساتھ گانا سُننے کا اتفاق ہوا۔ ملتان میں اُن دنوں زیادہ تر سرائیکی زبان میں کافیاں اور علاقائی گانے ہی طوائفیں گاتی تھیں جو حسن و عشق کی ایسی داستانیں ہوتی تھیں کہ گردو شاعر

اُن کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔ مگر بُرا ہو افضل صاحب کے مشاعر ہونے کا کہ انہوں نے اکثر گانے والیوں کو اپنی غزلیں جو یقیناً نازش حیدری صاحب کی ہی کہی ہوتی تھیں دے رکھی تھیں اور انہیں ہدایات دے رکھی تھیں کہ جب بھی وہ اپنے ہمراہ کسی ریئس کو گانا سُنوانے لائیں تو اُن کی غزلیں ہی گائی جائیں۔ اور جونہی کسی طوائف نے افضل صاحب کی غزل شروع کی افضل صاحب نے روپیہ روپیہ کے نوٹ برسانے شروع کر دئے (اُن دنوں ایک روپیہ کی وقعت موجودہ روپیہ سے کم از کم بیس گنا زیادہ تھی) اور مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گانے والی غزل نہیں سُنا رہی بلکہ شراب کے کیف و سُرور کے آثار کے لئے کسی عمل کو سُر تال کے ساتھ کانوں میں انڈیل رہی ہے۔ قہرِ درویش برجانِ درویش ایک دو غزلوں کو سُننا ہی پڑتا اور میں افضل صاحب سے یہ بہانا بناتا کہ میں حکیم امین اشرف خاں صاحب کا کرایہ دار ہوں لہٰذا رات کو دیر سے گھر جانے پر صبح وہ مجھ سے باز پُرس کرتے ہیں کہ رات کو اتنی دیر گئے کہاں سے آئے تھے۔ اس لئے مجھے رخصت دیجئے اسد یار مجھے گھر پہنچا کر پھر آ جائے گا۔ ●●

(جاری ہے)

(صفحہ ۵ کا بقیہ)

مُفلس نہیں رہ سکتا۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، کہ سلامت علی مہدی کا ہزارہا ہندوستانیوں کو بے وقوف بنا چکا ہے لہٰذا وہ یہ روپیہ حاصل کرکے پھر شراب نوشی میں برباد کر دے گا۔ سُننے میں آیا ہے کہ کچھ حضرات پھر وزیرِاعظم صاحبہ سے اُن کی مالی امداد کے لئے سفارش کرنے والے ہیں یا کر چکے ہیں۔ مگر ہم وزیرِاعظم صاحبہ سے نہایت ادب کے ساتھ گزارش کریں گے کہ وہ اس عادی اور بدنام زمانہ شرابی اور زانی کو وزیرِاعظم ریلیف فنڈ سے ایک پیسہ بھی نہ دیں۔ اس سلسلے میں ہم خود وزیرِاعظم صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہو کر تمام حالات سے اُنہیں واقف کرائیں گے تاکہ وزیرِاعظم کے اس مقدس فنڈ کو سلامت علی مہدی ایسے عیاش، شرابی نوش اور بدکردار شخص پر صرف نہ کیا جائے ●●

ترتیب: عقیل صدیقی

"انڈوپاک مشاعرہ ناگ پور"

خلیل انجم

یگ مسلم فٹ بال گراؤنڈ ناگپور آج بقعۂ نور بنا ہوا ہے خوبصورت قناتوں سے گراؤنڈ کو چاروں طرف سے گھیر دیا گیا ہے۔ جنوبی حصہ میں بنائے ہوئے اسٹیج کو دُلہن کی طرح سجایا گیا ہے، یہ سب ڈاکٹر ذاکر حسین ایجوکیشن سوسائٹی ناگ پور کے زیرِ اہتمام ہونے والے انڈوپاک مشاعرے کیلئے کیا گیا ہے۔ رات کے ساڑھے دس بج چکے ہیں، بیرونی و مقامی شعرائے کرام اسٹیج کی زینت بنے ہوئے ہیں اور سامعین دھیرے دھیرے مشاعرہ گاہ میں تشریف لا رہے ہیں، سامعین کی تعداد خلافِ توقع بہت کم ہے، سیکڑوں سامعین ابھی تک باہر ہی کھڑے ہیں اور کچھ لوگ مایوس ہو کر اپنے گھروں کو واپس بھی ہو رہے ہیں۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ اس مشاعرے کیلئے پاکستان کے مشہور شاعر قتیل شفائی کے نام کا اعلان کیا گیا تھا لیکن وہ نہیں آسکے۔ اس کے علاوہ بیکل اُتساہی، نسیم نکہت، اور وسیم بریلوی کے ناموں کا اعلان بھی خصوصی طور سے کیا گیا تھا مگر یہ تینوں بھی غائب ہیں۔ ایسا اتفاق ناگپور کے ہر مشاعرے میں ہوتا رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ناگپور کے مشاعرے کامیاب نہیں ہوتے یہاں لوگ مشاعروں کے نام سے بدظن ہو چکے ہیں۔

بہرحال! سامعین آج کے مشاعرے میں یہ امید لیکر آرہے ہیں کہ مشاعرے کی نظامت اردو شعر و ادب کے امین عالیجناب کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب سحرؔ فرمانے والے ہیں اس لئے مشاعرے میں کچھ لطف تو آئے گا ہی۔

اسٹیج پر کنور مہندر سنگھ بیدی صاحب کے علاوہ پاکستان کے شاعر اقبال عظیم بھی تشریف فرما ہیں۔ صدارت کے فرائض ناگپور ہائی کورٹ کے جج عالیجناب ایم ایم قاضی صاحب انجام دے رہے ہیں جن کی صدارتی تقریر کو بڑی دلچسپی اور دلجمعی سے سامعین سماعت فرما رہے ہیں۔ صدارتی تقریر کے بعد مشاعرے کے کنوینر جناب جلیل ساز صاحب مائیک پر آکر اپنی اور اپنی سوسائٹی کی جانب سے اس بات کی معذرت طلب کر رہے ہیں کہ وہ اعلان کے باوجود قتیل شفائی صاحب کو مشاعرے میں نہیں لاسکے کیونکہ شہر ناگپور کیلئے ان کا ویزا نہیں بن سکا۔ اب مائیک کے سامنے کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی آگئے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں اردو زبان اور اس کی ہمہ گیری کے اوصاف حُسن گن گن کر بتا رہے ہیں خاص طور سے وہ اپنی قوم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ ایسی قوم جسے اہلِ سیف کہا جاتا ہے اس کا شمار بھی آج اہلِ قلم میں ہونے لگا اور یہ سب اردو زبان کی سحر انگیزی کا اثر ہے۔ کنور صاحب کی جامع تقریر سے سامعین محظوظ ہو رہے ہیں لیکن اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے کسی شاعر کو آواز دینے سے پہلے اپنی غزل کے کچھ شعر عنایت کر رہے ہیں ؎

محبت ایک ایوانِ تمنا ~~~ مگر گرتی ہوئی دیوار بھی ہے
عجب طرفہ تماشا ہے سحرؔ بھی ~~~ وہ شاعر ہے مگر سردار بھی ہے

سامعین میں سے "واہ واہ" کا شور بلند ہوا۔ دو تین آوازیں "اور سنائیے اور سنائیے" کی ابھریں مگر معذرت طلب کرتے ہوئے کنور صاحب ناگپور کے نوجوان شاعر لطیف یاورؔ کو آواز دے رہے ہیں۔ مقامی شاعروں کیلئے یہ قید لگا دی گئی ہے کہ وہ تین یا چار شعر سے زیادہ نہ پڑھیں۔ بہرکیف! بڑے اعتماد کے ساتھ لطیف یاورؔ صاحب اپنی غزل کے چند شعر تحت میں سُنا کر واپس ہو رہے ہیں۔ اب مختصر سے وقفے کے بعد شہر امراوتی سے آئے ہوئے شاعر انعام داور صاحب کو مائیک پر آنے کی زحمت دی جا رہی ہے۔ لیکن سامعین کی آمد جاری ہے جس کی وجہ سے مشاعرہ میں کچھ بدنظمی پیدا ہو رہی ہے۔ تاہم انعام داور اپنا کلام بڑے اعتماد

کے ساتھ سُنا رہے ہیں اور کامیاب رہے ہیں، کنور صاحب نظامت کے فرائض بڑی خوبی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں ان کی پُر لطف ..... نظامت سے کافی محظوظ ہو رہے ہیں۔ اب ......ایک نوجوان شاعر ساحل مینی تالوی کو آواز دی جا رہی ہے۔ ساحل مینی تالوی مائیک پر تشریف لا کر عنایت کر رہے ہیں ؎

چہرے پہ موسموں کا ہر رنگ مَل کے آؤ
محدود دائروں سے باہر نکل کے آؤ
بزرگوں کے لبادے محفوظ کر کے رکھ دو
ماحول کے مطابق کپڑے بدل کے آؤ

گرچہ ساحل مینی تالوی تحت میں اپنا کلام سُنا رہے ہیں لیکن سُنانے کا اسٹائل بہت اچھا ہے ان کے شعر میں نیا پن بھی ہے اور احساس بھی۔ سامعین برابر داد دے کر اپنی بیدار مغزی اور شعر فہمی کا ثبوت دے رہے ہیں۔ مشاعرے میں زندگی کے آثار نظر آنے لگے ہیں۔ متفرق اشعار کے بعد ساحل صاحب اپنی غزل سُنا رہے ہیں ؎

ہمارے عشق کی تاریخ ہی نرالی ہے
یہ فصل ریت میں سرسبز ہونے والی ہے
کسی کو ہم سے لگاؤ نہ کوئی ہمدردی
مزاج پوچھنا اک رسم سی بنالی ہے

اور جب ساحل اپنے اس شعر پر پہنچے ؎

میں ایسے شہر کے بازار میں سجا کہ جہاں
مجھے خریدنے والوں کی جیب خالی ہے

تو "واہ واہ" کے شور سے مشاعرہ گاہ گونج اٹھی۔ اس شعر کو بار بار پڑھوانے کے بعد جب داد کا شور کچھ کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے ؎

یہ شہر ہے یہاں گاؤں کی بولیاں مت بول
یہاں کی ڈکشنری میں خلوص گالی ہے

ساحل مینی تالوی نہایت کامیاب مائیک سے واپس ہو رہے ہیں اب ہنسانے کیلئے مائیک پر مقامی شاعر جھاپڑ ناگپوری تشریف لا رہے ہیں۔ جھاپڑ صاحب ہنسانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن آج ان کی قسمت میں کامیابی نہیں ہے۔ بہر حال ان کے دو شعر جن میں کچھ طنز کے پہلو بھی ہیں ملاحظہ فرمائیں ؎

پھینکے ہے کہ ببول کے پیڑوں میں اُگتا ہی نہیں ہے آم کو
بدمعاش کا بیٹا راہ پر ہے مُلّا جی کا لڑکا بھٹکا

کم ظرفوں کی بادہ نوشی سے یہ حال ہوا میخانہ
بکھرے ہیں پیالوں کے ٹکڑے چت ساقی ہے اوندھا

اب ناگوٹ کے شاعر اقبال خلش کو زحمت دی جا رہی ہے اقبال خلش اکثر ناگپور کے مشاعروں میں آتے رہتے ہیں بھی اچھا کہتے ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ سامعین حسب معمول انہیں دلچسپی سے سُن رہے ہیں اور داد و تحسین سے نواز رہے ہیں۔ آپ کی ضیافتِ طبع کیلئے چند شعر پیش کئے جا رہے ہیں ؎

دل کے ہر داغ کو ہنس ہنس کے چھپانے والا
کتنا پیاسا ہے یہ دریا میں نہانے والا
پل میں چھٹ جائیں گے بادل یہ گرجنے والے
بولتا کب ہے کوئی کر کے دکھانے والا
میں تو آئینہ صفت بن کے یہاں آیا تھا
کیا یہاں کوئی نہیں آنکھ ملانے والا

اور جب وہ اس شعر پر پہونچے ؎

مرے اللہ مرے دل کو سمندر کر دے
آج پیاسا ہے مری پیاس بجھانے والا

تو ناظم مشاعرہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا "یہ شعر نہیں بلکہ بڑ ہے" تو سامعین میں ہنسی کا فوارہ چھوٹ پڑا۔

اقبال خلش اپنی غزل مکمل کر کے نہایت کامران مائیک سے لوٹ رہے ہیں اور ناظم مشاعرہ صدر صاحب سے اجازت لے کر کسی ضرورت کے پیش نظر تھوڑی دیر کیلئے باہر جا رہے ہیں نظامت کے فرائض عارضی طور پر جلیل ساز صاحب انجام دے رہے ہیں اب ناگپور کے شاعر ظہیر عالم ترنم میں غزل سے نواز رہے ہیں۔ غزل اچھی ہے مگر سامعین توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ گویا "گھر کی مرغی دال برابر" بہر حال ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

کوئی محوِ آرائش کانچ کے مکانوں میں

یاس کی چٹانوں میں دب کے مرگیا کوئی
آ رہی تھیں رہ رہ کر گونیوں کی آوازیں
کھڑکیوں سے ایسے میں کیسے جھانکتا کوئی

ایک اور مترنم شاعر شریف الہ آبادی مائیک پر آکر الاپ رہے ہیں ؎

اُف یہ دُنیا یہ درندوں کی بستی یہ تعصب یہ فرقہ پرستی
زندگی ہے غریبوں کی سستی ظلم کی انتہا ہو گئی ہے

شریف صاحب کا ترنم اچھا ہے مگر اشعار جاندار نہیں اس لئے محظوظ نہیں کر سکے۔ اب پھر ایک مقامی شاعر شاہد کبیر کو آواز دی جا رہی ہے۔ شاہد کبیر نئے لب و لہجہ کے شاعر ہیں تاہم سامعین مطمئن نہیں کر سکے۔

اب کنور صاحب اسٹیج پر دوبارہ تشریف لا رہے ہیں لیکن الٹا قدم پڑنے سے گر پڑے۔ جلیل ساز صاحب کی زبان سے بے ساختہ نکلا "گرتے ہیں شہ سوار ہی میدانِ جنگ میں" کنور صاحب حاضر جوابی میں ماہر ہیں بھلا وہ کب چوکتے۔ منہ سے برجستہ نکلا "حالاں کہ جنگ نہیں تھی پھر بھی گر گیا"۔ اس حاضر جوابی سے پھر شاعرہ گاہ قہقہہ زار بن گیا۔ اب کنور صاحب نے دوبارہ مائیک سنبھال لیا ہے اور بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے نوجوان شاگرد رعنا سحری کو آواز دے رہے ہیں۔ رعنا سحری مائیک پر آکر عنایت کر رہے ہیں ؎

منزل نہ دے چراغ نہ دے حوصلہ تو دے
تنکے کا ہی سہی تو مگر آسرا تو دے

میں نے یہ کب کہا کہ مرے حق میں ہو جواب
لیکن خموش کیوں ہے کوئی فیصلہ تو دے

سامعین پھر اپنی بیداری کا ثبوت دینے لگے۔ رعنا سحری بڑے اعتماد کے ساتھ تحت میں اپنا کلام سُنا رہے ہیں ؎

مجھ سے واقف تو مرے جسم کا سایہ بھی نہ تھا
کیسے ہوجاتا تمہارا میں خود اپنا بھی نہ تھا

جتنا مایوس ہے وہ شخص بچھڑ کر مجھ سے
اتنی شدت سے اُسے میں نے تو چاہا بھی نہ تھا

میں اس سے سر کو جھکا کے ملوں یہ نا ممکن
وہ شخص مجھ سے بڑا ہے مگر خُدا تو نہیں

رعنا سحری مائیک سے واپس لوٹنا چاہتے تھے لیکن سامعین کے اصرار پر رُک گئے ہیں اور ایک نظم "شرمندگی" سُنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں۔ نظم ختم کر کے رعنا سحری نہایت کامیاب مائیک سے واپس ہو رہے ہیں اور اب علی گڑھ کے جناب سید محمد اشرف مائیک پر ہیں اور ایک حمد عنایت کر رہے ہیں جس میں ہمارے لئے غور و فکر کی دعوت بھی ہے۔ حمد کی ٹیپ کا مصرعہ ہے "خدائے برتر کی بارگاہِ عظیم میں سر جُھکا رہا ہوں"۔ سامعین بڑی توجہ کے ساتھ حمد سماعت فرما رہے ہیں اور داد دے رہے ہیں۔ اشرف صاحب کامیاب لوٹ رہے ہیں اور اب مشاعرہ کی واحد شاعرہ نشاط صدیقی اسٹوی کو دعوت دی جا رہی ہے سامعین قدرے سنبھل کر بیٹھ گئے ہیں۔ نشاط صدیقی کچھ سُنا نا ہی چاہتی ہیں کہ ناظمِ مشاعرہ نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا "ذرا ٹھہرو! ایک صاحب اپنا چشمہ صاف کر رہے ہیں"۔ اس پر بھی ایک زور دار قہقہہ بلند ہوا۔ نشاط صدیقی کا ترنم اچھا ہے مگر سطحی ہونے کی وجہ سے وہ سامعین کو متاثر نہیں کر سکیں۔

مشاعرہ کچھ بے جان سا ہو چلا ہے اس لئے اس میں کچھ جان ڈالنے کی غرض سے ناگپور کے مشہور ہزل گو شاعر جناب ناظم انصاری کو زحمت دی جا رہی ہے آپ مائیک پر آکر نہایت سادگی سے فرما رہے ہیں ؎

ہم شریفوں کو تو پہلو میں بٹھائے رکھئے
نمبری لوگوں کو نمبر سے لگائے رکھئے

فیلڈ کوئی ہو مگر اپنا جمائے رکھئے
ٹانگ ترچھی ہی سہی پھر بھی اٹھائے رکھئے

ناظم انصاری صاحب تالیوں کی گونج میں اپنی جگہ واپس آرہے ہیں اور اب خود کنور صاحب کلام مرحمت فرما کر محفل کو گرما رہے ہیں۔ سامعین داد و تحسین سے بے حال ہو رہے ہیں اور کنور صاحب عنایت کئے جا رہے ہیں میں خود بھی اتنا محظوظ ہوا جا رہا ہوں کہ شعر نوٹ کرنا ہی بھول گیا۔ بہرکیف کنور صاحب نے

اپنے باسی اور دل کو چھونے والے اشعار سے آج کے مشاعرے کی لاج رکھ لی ..... کنور صاحب نے ایسے ایسے شعر سنائے کہ ان کے بعد شاداں لکھنوی آئے مگر وہ محفل کو متاثر نہیں کر پائے۔
بہرحال! ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

اس سے نفرت کا سبب کیا ہے پتہ بھی تو چلے
وہ جسے آپ نے اب تک کہیں دیکھا بھی نہیں

اب نہایت احترام وادب کے ساتھ محمود سعیدی صاحب کو زحمت دی جا رہی ہے۔ محمود صاحب محفل کا جائزہ لیکر عطا کر رہے ہیں ؎

نہ رستہ نہ کوئی ڈگر ہے یہاں
مگر سب کی قسمت سفر ہے یہاں

ہواؤں کی انگلی پکڑ کر چلو
وسیلہ یہی معتبر ہے یہاں

بچھا ئیں گے جھوٹی خبروں یہ لوگ
یہی ایک سچی خبر ہے یہاں

ادھر کس لئے کوئی جاتا نہیں
اکیلی سی اک رہ گزر ہے یہاں

پلک بھی جھپکتے ہو محمود کیوں
تماشا بہت مختصر ہے یہاں

محمود سعیدی مائیک سے کامیاب رخصت ہو رہے ہیں اور اب پھر ایک مقامی ہزل گو شاعر جبلوا انصاری کو آواز دی جا رہی ہے جبلوا انصاری پوربی زبان میں شاعری کرتے ہیں اور ایک خاص اسٹائل کو اپنا کر مشاعروں میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح سامعین کو ہنسانے میں کامیاب رہے۔ جبلوا انصاری کے بعد شعر و ادب کے روح رواں ڈاکٹر منشا الرحمٰن خاں منشا صاحب تشریف لا رہے ہیں ان کی آمد سے سامعین میں بیزاری کا پیدا ہو رہا ہے اور کچھ لوگ ادھر ادھر سے اٹھ کر باہر جا رہے ہیں تاکہ پورے مشاعرے شاید ڈاکٹر منشا الرحمٰن خاں منشا کو راس نہیں آ رہے ہیں آج کل وہ جب مائیک پر آتے ہیں تو سامعین ہوٹنگ شروع کر دیتے ہیں آج بھی یہی حال ہو رہا ہے تاہم کچھ اچھے شعر سنا کر منشا صاحب رخصت ہو رہے ہیں اور ناظم مشاعرہ پاکستان کے شاعر اقبال عظیم کو آواز دے رہے ہیں لوگ بڑی بے چینی سے اقبال عظیم کو سننے کے لئے بے چین ہیں۔ اقبال عظیم مائیک پر آکر ترنم میں اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ اقبال عظیم کے متعلق یہ بتا دینا ضروری ہے کہ یہ بینائی سے محروم ہیں۔ بہرحال کلام میں بڑی پاکیزگی اور سادگی ہے سامعین بڑے شوق اور انہماک سے انہیں سن رہے ہیں اور داد دے رہے ہیں۔ پہلے بارگاہِ رسالت مآب میں ایک نعت شریف پیش کی ہے۔ نعت کے بعد کچھ متفرق اشعار عنایت ہیں ایک شعر سماعت فرمائیں ؎

مجھے ملال نہیں اپنی بے نگاہی کا
جو دیدہ ور ہیں انہیں بھی نظر نہیں آتا

اقبال عظیم کا ہر شعر ہمیں دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے۔ تین شعر اور ملاحظہ فرمائیں ؎

جھک کر سلام کرنے میں کیا حرج ہے مگر
سر اتنا مت جھکاؤ کہ دستار گر پڑے

اتر کر قصرِ عالی سے ہمارے روبرو آؤ
بلندی سے ہمارے قد کا اندازہ نہیں ہوتا

آپ کے لہجہ میں پندار کی بو آتی ہے
سرپرستوں کی طرح حال نہ پوچھا کیجئے

متفرق اشعار کے بعد اب غزل عنایت کر رہے ہیں ؎

منصب تو ہمیں بھی مل سکتے تھے لیکن شرط حضوری تھی
یہ شرط ہمیں منظور نہ تھی بس اتنی سی مجبوری تھی
کچھ درد سا ہے تو پہلو میں پہلے سے لیکن ہلکا ہے
یا دستِ جفا کچھ نازک تھا یا شاید ضرب ادھوری تھی
نظریں بھی ملیں کچھ لب بھی ہلے ماتھے پہ شکن بھی اک ابھری
گو منہ سے اس نے بات نہیں کی بات تو لیکن پوری تھی
ہم اہلِ سخن کی قیمت ہے اقبال زبانی داد و دہشت
کل محفل میں جو داد ملی وہ داد نہ تھی مزدوری تھی

اقبال عظیم غزل ختم کر کے نہایت کامیاب لوٹ رہے ہیں، اس وقت رات کے دو بج رہے ہیں سامعین میں سے کچھ لوگ ایک ایک کر کے جا رہے ہیں۔ ناظم مشاعرہ فرما رہے ہیں۔ شاید لوگ اپنی بیویوں کے ڈر سے جا رہے ہیں وہ جائیں میں انہیں منع

نہیں کرتا لیکن یہ بتا کر جائیں کہ وِگّو اور ڈھائی بجے کی جوتیوں میں کیا فرق ہوگا؟" سامعین پھر ہنسی کے طوفان میں ڈوب گئے۔
اب صرف مشاعرہ کے کنوینر اور شاعر جناب جلیل سازؔ صاحب بچ گئے تھے حالاں کہ سازؔ صاحب کو پہلے بھی کنور صاحب نے اپنا کلام سنانے کے لئے فرمایا تھا لیکن سازؔ صاحب ٹال گئے۔ یہ سازؔ صاحب کی انکساری تھی۔ بہرحال! کنور صاحب اور سامعین کی درخواست پر جلیل سازؔ صاحب مائیک پر تشریف لاکر ایک مرصع غزل عنایت کر رہے ہیں جن میں ان کے ٹھوس تجربات اور گہرے مشاہدات شامل ہیں ؎

مات دل کی نیاز مندی سے
صرف اک حرفِ التجا ہے بہت

کج کلاہو سنبھل سنبھل کے چلو
تیز تر آج کل ہوا ہے بہت

کب نہ جانے برس پڑیں آنکھیں
دل پہ چھائی ہوئی گھٹا ہے بہت

تیرے کوچے سے دل کو نسبت ہے
ورنہ دنیا میں راستے ہیں بہت

اس طرح یہ انڈو پاک مشاعرہ کامیابی کی منزل سے ہم کنار ہوا۔ منتظمینِ مشاعرہ بالخصوص جلیل سازؔ صاحب، وکیل پرویز صاحب، ریاض احمد خاں صاحب اور تحسین افسر صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر قتیل شفائی، بیکل اُتساہی، نسیم نکہت، اور وسیم بریلوی بھی اس مشاعرہ میں شریک ہو جاتے تو یہ مشاعرہ یادگار ثابت ہوتا۔ ●●

(صفحہ ۔۔ کا بقیہ)

یہ میرا سرمایہ ہیں ۔ میرا"۔
مُراد کمرے میں داخل ہوا اور ناراض سے لہجے میں بولا
یار کمال کرتے ہو۔ سارا دن کہاں رہے ۔ میں انتظار کرتا رہا۔ صاحب سے کہہ کر ایک سیٹ بڑی مشکل سے روک رکھی ہے۔
وہ مُراد کی طرف پلٹ گیا۔ اس کے چہرے پر تازگی اور چمک تھی۔ اس نے زندگی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ انشاء اللہ! یار کل سہی تو! ●●

ڈاکٹر زار علامی
گروال کلینک
ونڈمال پٹنہ

"غالب کی ایک متنازعہ رباعی"

محترمی سرور صاحب - تسلیم

"شاعر" بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۸۱ء میں مبارک علی صاحب کی طرف سے ایک مضمون بعنوان "غالب کی ایک متنازعہ رباعی" شائع ہوا تھا۔ جس کا جواب "شاعر" بمبئی کو بھیج دیا گیا تھا لیکن نہ معلوم کس مصلحت کے پیش نظر میرا مضمون شاعر نے آج تک شائع نہیں کیا۔ ایک دو بار لکھا بھی گیا مگر آج تک کوئی جواب نہیں آیا۔ آخر آپ کے یہاں بھیج رہا ہوں۔ احقر علامی زار

"شاعر" بابت جنوری، فروری، مارچ ۱۹۸۱ء میں ایک مضمون بعنوان بالا کے تحت نظر سے گزرا۔ اس مضمون کے خالق سید مبارک علی صاحب ہیں۔

اس جدیدیت کے دور میں عروضی بحث کا چھیڑنا واقعی کسی جرأت رندانہ سے کم نہیں ہے۔ سید مبارک علی صاحب نے بزعم خویش جو کچھ لکھا خوب لکھا۔ آیئے میزان عروض پران کے اقوال کو تولیں کہ وہ کہیں حد تک صحیح ہیں۔ غالب کی رباعی جو بحث کا موضوع ہے یہ ہے ؎

> دکھ جی کو پسند ہو گیا ہے غالب
> دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالب
> واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
> سونا سوگند ہو گیا ہے غالب

موصوف یوں رقم طراز ہیں:-

(۱) معترضین کہتے ہیں کہ رباعی کے دوسرے مصرع کے شروع رکن میں ایک سبب خفیف زائد ہے۔

(۲) بیچارے اہواس ملک نے اس رباعی کے مصرع دوم کو خارج از وزن قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر اس مصرع میں بجائے "کر" کے "کے" بنا دیا جائے اور ابتدائی رکن میں تسبیغ کو لایا جائے تو مصرع اعتراض کی گرفت سے نکل جاتا ہے ارکان بتاتے ہیں "مفعولان، فاعلن مفاعی لن فع"

سید مبارک علی صاحب اس قول کے متعلق لکھتے "دل رک رک ک" "مفعولات" "تائے ضمہ کے ساتھ" کے وزن پر ہے۔ مفعولان رکن مسبغ کے وزن پر نہ آتا اس لئے کہ مفعولان بسکون "ن" آتا ہے جب کہ "رک رک" "مفعولات" کے وزن پر ہے جس میں "ت" متحرک ہے جب کہ اصول تقطیع کے مطابق ساکن بالمقابل ساکن آتا ہے۔

دوسری بات صدر و ابتدا میں تسبیغ جائز نہیں شعراء نے تسبیغ کا استعمال حشو اول ہی میں کیا ہے ان اوزان میں کیا ہے جو دو چند پڑھے جاتے ہیں۔ یہ صورت سالم مثمن، بحر ہزج مقبوض مثمن میں اکثر پیش آتی ہے کہ حشو میں ٹھہراؤ یا وقفہ فروذی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں حشو اول کی حیثیت اختتام مصرع کی سی ہو جاتی ہے لے ختم ہو کر پھر شروع ہوتی ہے لہذا وہاں اگر عروض کی وہ تمام اجتماع رکن کی صورتیں برت لی جائیں تو وزن میں کوئی نمایاں فرق نہیں آتا۔

یہ ہیں سید مبارک علی صاحب کے ارشادات اب میں زار علامی کہتا ہوں کہ -

(۱) بلاشبہ غالب کی مندرجہ بالا رباعی کے مصرع دو

دو حرف یعنی ایک سبب خفیف زائد ہے۔

(۲) یہ تو صحیح ہے کہ صدر و ابتدا میں تسبیغ کا استعمال غلط ہے لیکن موصوف نے بھی "مفعولن فاعلن مفاعی لن فع" کے وزن کو سمجھنے میں جے رام داس نلک کی طرح غلطی کھائی ہے رباعی کے صدر و ابتدا میں جب مفعولن (رخرم) ہے ہی نہیں بلکہ مفعولُ نے زحاف تخنیق کے سبب یہ صورت اختیار کی ہے تو تسبیغ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس مفعولن پر تسبیغ کی بات کرنا اس بات پر دال ہے کہ مبارک صاحب دوسرے کم سمجھ عروضیوں کی طرح مفعولن، کو اخرم اور فاعلن، کو (جو کہ مندرجہ بالا وزن کے حشو اول میں نظر آتا ہے) اشتر، سمجھتے ہیں۔ درآں حالیکہ یہ غلط ہے۔ صدر و ابتدا اور حشو اول کے ارکان یہ ہیں "مفعولُ مفاعلن" جو زحاف تخنیق کے سبب "مفعولن فاعلن" بنے ہیں معلوم ہونا چاہیے کہ زحاف شتر خرم اور قبض کا مجموعہ ہے۔ یہ اجتماع تو درست ہے مگر اس سے حاصل شدہ رکن محض صدر و ابتدا سے مخصوص ہوتا ہے۔ حشوین میں داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ رباعی کے "مفعولن" والے اوزان میں جس جگہ بھی، فاعلن، آیا ہے وہ عمل تحقیق کا نتیجہ ہے۔ شجرہ اخرم حقیقت میں کوئی چیز نہیں۔ قطان نے شجرہ اخرم کا نام دے کر لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ اسی نام کے سبب کم فہم عروضی "فاعلن" کو جو کہ اصل میں مقبوض مخنق ہے اشتر سمجھ بیٹھے۔

رہی استاد شعرا کی بات کہ وہ بحر کامل سالم اور بحر رمل مقبوض کے حشو اول میں تسبیغ یا اذالہ کرتے ہیں۔ یہاں بھی میرے دوست نے دھوکا کھایا ہے اور اسی دھوکے کے سبب لمبی چوڑی تاویل فرمادی۔ یہ صورت ربع بحور میں ہو سکتی ہے اس لئے کہ وہاں رکن دوم عروض و ضرب کا رکن ہو جاتا ہے موصوف نے بحر کامل سالم میں تسبیغ کی بات بالکل غلط کہی ہے۔ تسبیغ کا عمل سبب خفیف پر ہوتا ہے وتد مجموع پر نہیں متفاعلن میں "علن" وتد مجموع ہے۔ نیز سالم رکن پر تسبیغ یا اذالہ کا عمل کرنا بھی خلاف قاعدہ عروض ہے۔

آگے چل کر موصوف فرماتے ہیں کہ "مفعولُ مفاعیلُ مفاعی لن فع" میں تسبیغ حشو اول میں ممکن نہیں یہ سبب وتد مفروق رکن "مفاعیلُ" اگر حشو اول میں "مفاعلن" لائیں تو اذالہ کی گنجائش نکل سکتی ہے"

موصوف نے اپنے قول کے ثبوت میں دبیر کی رباعی دی ہے جس کا تیرا مصرع یہ ہے ؎ اس قافیہ و ردیف کا ہے فیض دبیر۔

مجھے تعجب ہے کہ موصوف خود ہی ایک بات پر اعتراض کرتے گیا اور خود ہی اُس غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں جسے رام داس نلک نے صدر و ابتدا میں تسبیغ کا ذکر کیا تھا جس پر اعتراض یہ کیا گیا تھا کہ تسبیغ محض بعروض و ضرب ہے۔ میں مبارک صاحب سے نہایت ادب سے پوچھنا چاہوں گا کہ جب اذالہ بھی (حالاں کہ اس کو تسبیغ ہی کہنا چاہیے جس کی تشریح میں آگے کروں گا) محض بعروض و ضرب ہے تو یہاں کس قاعدہ سے گنجائش نکل سکتی ہے۔

اساتذہ شعرا کے یہاں تسبیغ یا اذالہ مربع مفاعلن میں جائز ہے رباعی کو مربع مفاعلن نہیں کہا جا سکتا لہٰذا دبیر کے مصرع کا جو وزن میرے دوست نے مع اختراع تجویز فرمایا ہے یعنی "مفعولُ مفاعلان مفاعیلُ فعَل" ہرگز صحیح نہیں۔ رہا یہ سوال کہ اس مصرع کو رباعی کے کس وزن سے تقطیع کیا جائے اس کا جواب یہ ہے کہ جب یہ مصرع رباعی کے کسی وزن پر بھی پورا نہیں اترتا تو اس کو کھینچ تان کر اور سراسر غلط اور غیر حقیقی اوزان تراش کر فٹ کرنا کہاں کی عروض دانی ہے فن کے معاملہ میں شخصیتوں کا رعب کوئی معنی نہیں رکھتا غلط کو غلط کہنے کی جسارت ہونا ہی چاہیے خطا پوشی فن کے معاملہ میں ایک بہت بڑا جرم ہے اگر دبیر کا حقیقت میں یہی مصرع ہے تو ہر طرح ناموزوں ہے، میرے نزدیک یہ مصرع اس طرح ہو گا اور وزن یہ ہے ؎ مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعول"

شمس الرحمٰن فاروقی کا غالب کے مصرع کے متعلق ذہانت خرم کے حق میں بولنا ہرگز ان کے دماغ کی اُپج نہیں بلکہ خاتم العروضین استاذی حضرت علام عشق آبادی تیجانی سے سُنی سنائی بات ہے۔ اس رباعی کی تخلیق کا سبب جو مجھے علام نے بتایا تھا اس طرح ہے۔ میرزا ہرگوپال تفتہ نے خرم کی تعریف پڑھ کر غالب سے کہا کہ حضور اردو میں کم از کم ایک آدھ شعر بطور سند اسی قسم کا ہو جانا چاہیے جس میں "خرم" آیا ہو اور مرزا غالب نے یہ رباعی تخلیق کردی۔

مبارک صاحب کا یہ کہنا کہ "غالب کو رباعی کے اس مشہور مصرع "یا می گویم نام تو یا می گویم" سے دھوکا ہوا ہو گا"

مجھے اس سے قطعاً اتفاق نہیں اس لئے کہ "تو" کا واو گرانا ہی افصح ہے اور غالب چوں کہ زبانِ فارسی سے بخوبی آشنا تھا لہٰذا

اس سے یہ معمولی بات پوشیدہ نہ رہی ہوگی ۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس مصرع کے وزن سے جو مبارک صاحب نے فرمایا ہے "مفعولن مفعولن مفعولن فع" نے غالب کو ہرگز دھوکا نہیں دیا (حالاں کہ اس مصرع کا صحیح وزن یہ ہے "مفعولن مفعولُ مفاعی لن فع") اس لئے کہ اگر ہم "دل رک رک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ" سے "دل" کو چھوڑ کر (جو بوجہ خزم لایا گیا ہے) باقی مصرع کی تقطیع کرتے ہیں تو حشو اوّل میں "فاعلن" آیا ہے لہٰذا اس مصرع کی بنیاد پہ مصرع نہیں ہو سکتا ۔

رہی یہ بات کہ عمر بھر مشقِ سخن کرنے والا تمام اوزان پر عبور حاصل کر سکے یہ ضروری نہیں ۔ حقیقی اوزان کا تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ۔ یہ کام صرف وہی کر سکتا ہے جو عروض پر کما حقہ عبور رکھتا ہو ۔ مشقِ سخن کرنا اور بات ہے اور عروض جاننا اور بات اور پھر غالب نے تو گنے چنے چند اوزان ہی میں مشقِ سخن کی ہے ۔

فاروقی صاحب عروض سے کتنے واقف ہیں یہ تو ان کی تصنیف عروض و آہنگ اور بیان کے مطالعہ سے اندازہ ہو جاتا ہے جہاں انہوں نے اپنے ہی موزوں مصاریع کو ناموزوں قرار دیا ہے ۔

یہ درست ہے کہ "خزم" زحاف کی تعریف میں آتا ہی نہیں اور اس کا تقطیع سے بھی کوئی تعلق نہیں اس لئے اب اس کو عرب والے بھی ترک کر چکے ہیں ۔ یہ دورِ جاہلیت کا زحاف تھا ۔ مرزا غالبؔ نے یہ رُباعی ہرگز ہاں تفنن کے طور پر بطورِ مثال تخلیق کی تھی اور بس ۔ میرزا غالب کو نہ کسی وزن سے دھوکا ہوا اور نہ یہ کہ وہ رُباعی کے اوزان سے بے بہرہ تھا ۔

یہاں ضرورتِ شعری کی بات بھی نہیں غالب اگر چاہتا تو اس رُباعی کو حذف بھی کر سکتا تھا لیکن اس کا مدعا تو صرف "خزم" کی مثال پیش کرنا تھا اور وہ بھی تفنن کے طور پر ۔ اب لوگ اسے کو کچھ بھی رنگ دیں ۔

سیّد مبارک صاحب نے سرمد اور خیّام کی جن رباعیوں کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ ٹکسالی اوزان کے دائرے میں نہیں آتی یہ بھی درست نہیں ذیل میں صحیح تقطیع دیکھئے ۔ رُباعی سرمدؔ سے

سرمد گرش دفاست خود می آید
گر آمدنش رواست خود می آید
بیہودہ چہا در پے او میگردی
بینش گر او خداست خود می آید

تقطیع :-

سرما	گ رش دفا	س خودمی آ	ید
گرآم	دنش روا	س خودمی آ	ید
مفعول	مفاعلن	مفاعی لن	فع
بیہودہ	چہادرپ	ے اومیگر	دی
مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلن	فع
بینش گر	او خدا	س خودمی آ	ید
مفعولن	فاعلن	مفاعی لن	فع

۲ رُباعی خیّام سے

بکشائے درم کہ در کشاینده توئی
بنمائے رہم کہ رہ نماینده توئی
من دست بہیچ دست گیری ندہم
کایشاں ہمہ فانی اند و پاینده توئی

بیشتر اس کے کہ اس رُباعی کی تقطیع کی جائے شیخ سعدی کا یہ شعر دیکھئے سے

چہ مسلم چوں شمع باید گداخت ۔ کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

اس شعر میں "نتواں" بروزن فعلن آیا ہے ۔ "نتواں" فعولن کے وزن پہ ہے اسی طرح خیّام کی رباعی میں بکشائے بروزن مفعولُ ، بنمائے بروزن مفعولُ ۔ کایشاں بروزن فعلن آیا ہے جو درست ہے ۔

تقطیع :-

بکشا	درم ک در	کشاینده	تی
بنما	رہم ک رہ	نماینده	تی
من دست	بہیچ دس	ت گیری نہ	دہم
کایشاں ہ	م فانی ان	دپاینده	تی
مفعولُ	مفاعلن	مفاعیلُ	فعل

۳۔ نتواں دل شادرا بغم فرسودن
وقتِ خوش خود سنگ محنت سودن
دردہر کہ داند کہ چہ خواہد بودن
لے باید و معشوق و بگام آسودن

تقطیع:۔

نتواں دل	شادرا	بغم فرسو	دن
مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فع
وقتِ خوش	خودسنگ	محنت سو	دن
مفعولن	مفعولن	مفعولن	فع
دردہر	کِ داندکِ	چہ خواہد بو	دن
مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعیلن	فع
لے بایَ	دمعشوق	بگاماسو	دن
مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فع

عروض کا دامن تو ان لوگوں کے لئے تو تنگ ہی رہے گا جو عروض سے منافرت پر آمادہ رہیں گے اس لئے کہ وہ کسی بحر اور کسی وزن کے پابند ہی نہیں جہاں تک مشہور اساتذہ کا تعلق ہے یہ درست ہے کہ ان کی نظر عروض پر بھی تھی اسی لئے ان کے کلام میں ناموزونیت کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کے فرمودات کو وحی سمجھ کر ان پر ایمان لے آئیں ۔ عروض تو ایک ایسا بیابان ہے جس میں بڑے بڑے بھٹک گئے۔ اساتذہ کے ایسے مصاریع جواز دوئے عروض غلط ہیں وہ غلط ہی رہیں گے ۔ تال اور سم کی بھی اہمیت ہے مگر عروض کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ۔ چوں کہ بہت سے موازین آپس میں اسطرح مشتق ہیں کہ بغیر عروض ان کا فرق ظاہر ہی نہیں ہوتا ۔ وجدان والے ایسے مقامات پر بھٹک جاتے ہیں ۔ اختراعات ہونی چاہئیں مگر قاعدہ سے ۔ بغیر قاعدہ یعنی غیر حقیقی اختراعات بغیر دلیل کوئی معنی نہیں رکھتی ۔

سید مبارک صاحب نے بحر رمل کے جن اوزان کا ذکر کیا ہے (جن میں وہ کہتے ہیں کہ رُباعی کے تمام اوزان سما جاتے ہیں) یہ ہیں ۔

۱۔ فعْلن فَعِلاتن فَعِلاتن فَعِلن / فعْلن
۲۔ فعْلن فَعِلاتُ فاعِلاتن فَعِلن / فعْلن

فرماتے ہیں کہ دو وزن مخلوط صورت میں رُباعی کے کسی بھی مصرع میں آسکتے ہیں ۔

موصوف فرماتے ہیں کہ "رکن اول فعْلن بسکون عین ابتر ہے ۔ میرے نزدیک جو رمل میں عروض و ضرب کے علاوہ صدر و ابتدا میں بھی لایا جا سکتا ہے ۔"

" دلیل یہ ہے ۔ رمل میں ابتر کا عروض و ضرب سے مخصوص کرنا غیر ضروری ہے کیوں کہ عروض و ضرب میں یہی رکن مخبون مسکن محذوف سے بھی حاصل ہو سکتا ہے ۔ فاعلاتن مخبون مسکن ہو کر مفعولن اور پھر رفع سے سبب اول ساقط ہو کر عولن بن جاتا ہے جس کو فعلن بسکون عین سے بدل لیا جاتا ہے "

بیشتر اس کے کہ میں موصوف کے مذکورہ اوزان سے بحث کروں اور یہ لکھوں کہ رُباعی کے اوزان کس قاعدہ سے ظہور میں آئے موصوف کے ان ارشادات کے بارے میں جو انھوں نے فعْلن کے متعلق فرمائے ہیں لکھنا مناسب سمجھتا ہوں ۔

کچھ لوگوں نے زحاف بتر کو "جبّ اور خرم" کا مرکب بتایا ہے جو اس لئے غلط ہے کہ زحاف جبّ مختص بعروض و ضرب ہے اور خرم مختص بصدر و ابتدا ۔ لہٰذا دونوں کا اجتماع ہو ہی نہیں سکتا عدم واقفیت کے سبب ہی لوگوں نے ایسا کہا ہے ۔

مبارک صاحب نے زحاف بتر کو حذف اور قطع کا مرکب قرار دیا ہے یہ درست تو ہے مگر اس زحاف کا عمل فاعلاتن پر ہوتا ہی نہیں اور اس زحاف کا بحر رمل سے کوئی تعلق نہیں یہ زحاف محض فعولن سے متعلق ہے لہٰذا موصوف کا فرمان غلط ۔

فاعلاتن (سبب خفیف + وتد مجموع + سبب خفیف) کا مجموعہ ہے مخبون مسکن ہو کر مفعولن بنتا ہے اس مقام تک صحیح مگر اس مفعولن پر رفع کا عمل ہو ہی نہیں سکتا اس لئے کہ وسطی وتد مجموع نے زحاف سے متاثر ہو کر یہ صورت بنائی ہے اور اصل رکن دو سبب خفیف متوالی نہیں اور زحاف "رفع" کے لئے دو سبب خفیف متوالی کا ہونا شرط ہے ۔ لہٰذا سید مبارک علی صاحب کے تحقیق کردہ

دونوں وزن ازروئے عروض بالکل غلط ہیں اسی لئے ان سے رباعی کے اوزان کی تشکیل کرنا بھی غلط ہے۔

ایک بات اور "فعِلاتُ" مشکول ہے جس پر تسکین کرنے سے مفعولُ حاصل ہوتا ہے فاعلاتن کے مقابل "مفعولُ" رکھنا سراسر خلافِ قاعدۂ عروض ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ "غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گور" یہ رودکی کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے برجستہ تین مصرع چسپاں کردئے۔ وزن یہ ہے :- "مفعولن فاعلن مفاعی لن فع" اساتذہ نے بات کو آگے بڑھایا اور رباعی کے ۲۴ اوزان تخلیق کئے ۱۲ دائرہ اخرب اور ۱۲ دائرہ اخرم۔ اگر رودکی سامنے کے وزن پر اکتفا کرتے تو مصرع بحرِ رمل، بحرِ رجز پر بھی کھینچ سکتا تھا۔

۱۔ رمل :- فعِلاتن فعِلاتُ فعِلاتن فع
غلطاں غل طاں ہمی ر ود تا لب گو

رمل :- ب۔ فعلن فعِلاتُ فاعلاتن فعلن
غلطاں غلطاں ہ می رود تا لبِ گو

۲۔ رجز :- فع مفعولن مفاعلن مفعولن
غل طاغلطاں ہمی رود تا لبِ گو

میں سے زار علامی کہتا ہوں کہ یہ صحیح کہ رباعی کے اوزان اسی مصرع "غلطاں غلطاں ....." کے مرہونِ منت ہیں لیکن جن لوگوں نے رباعی کے دو شجرے (اخرب ، اخرم) مرتب کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ رباعی کی تشکیل میں جو ارکان آئے ہیں ان کا اخراج مندرجہ ذیل زحافات سے ہے۔

۱۔ خرم ۲۔ خرب ۳۔ شتر ۴۔ کف ۵۔ قبض ۶۔ جب ۷۔ بتر ۸۔ ہتم ۹۔ زل۔ ارکان اس طرح بتاتے ہیں

مفاعی لن	مفعولن	مفعولُ	مفاعلن	مفاعیل	فاعلن
سالم	اخرم	اخرب	مقبوض	مکفوف	اشتر

فعَل	فع	فاع
مجبوب	ابتر	ازل

ان لوگوں نے عدم واقفیت کے سبب اس قسم کی گمراہ کن باتیں کی ہیں۔ ۷۔ ابتر کے متعلق لکھا جا چکا ہے ۹۔ زلل اس کو اہم مخنق ... ہے ۳۔ شتر اس کا بیان ہو چکا۔ رودکی کے مصارع

کا جو اس نے برجستہ چسپاں کئے تھے آج تک کہیں کوئی پتہ نہیں۔ مبارک صاحب کا یہ گمان محض قیاسی ہے۔

میرے دوست کا تجویز کردہ پہلا وزن جو بحرِ رمل کا ہے۔ "فعِلاتن فعِلاتُ فعِلاتن فع" یہ وزن تو ہو سکتا ہے مگر جس ڈھنگ سے تقطیع کی گئی ہے بالکل غلط ہے میں دیکھئے :-

طاں ہمی ر ـــ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب "طا" فعِلاتُ الف اور نون غنہ دونوں گرا دئے جائیں نون غنہ تو تقطیع میں گر ہی جاتا ہے مگر اس مقام پر "طا" کا گرانا ہرگز جائز نہیں لہذا تقطیع غلط۔

ود تا لب ـــ یہ تقطیع اسی صورت میں صحیح ہو سکتی مفعولن "لب" کی "ب" پر اضافت نہ ہوتی۔ مقام پر ل اور ب دونوں متحرک ہیں۔

چوں کہ مبارک صاحب کی تقطیع ہی غلط ہے لہذا یہ وزن رباعی کے اوزان کا ماخذ نہیں ہو سکتا۔ رمل کے دوسرے وزن کے متعلق لکھ چکا ہوں لہذا رباعی ہرگز بحرِ رمل سے وا نہیں کی جا سکتی۔

بحرِ رجز کا جو وزن موصوف نے دیا ہے وہ یہ ہے۔
"فع مفعولن مفاعلن مفعولن"

مبارک صاحب کا یہ وزن قطعاً غیر حقیقی ہے جس تقطیع سے "فع" رکھنا سراسر غلط ہے۔

"تا لبِ گو" مفتعلن کے وزن پر صحیح ہے اور مفتعلن مسکن ہو کر مفعولن ہو جاتا ہے لہذا یہاں اعتراض کا محل نہیں۔

یہ ہیں وہ وجوہ جن کے تحت مبارک صاحب کی اختراع صاد نہیں کیا جا سکتا لہذا موصوف کا تمام وزن غلط در غلط اور سید مبارک علی صاحب نے عروضی بحث کے درمیان پنگل کا حوالہ دیا ہے عروضی بحث میں عروض ہی کی بات چاہئے۔ تن فا اور پنگل میں ہم وزن ہوں تو ہوں، عروض کے تحت ہرگز ہم وزن نہیں یہ بھی غلط ہے کہ وتد مفروق اور وتد مجموع اکثر اوزان میں ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں۔ مفتعلن کی جگہ مفاعلن اس اصول کے تحت نہیں بدلا جا جن احباب کو یہ راز سمجھنا ہو وہ ہماری تصنیف "کلید عروض" کا مطالعہ کریں

سرمایہ

عابدہ نرجس

"اس نے کام خاک کرنا ہے۔ موٹے صفحے کالے کر ڈالو اس
۔ کہتا ہے کہانیاں لکھتا ہوں" ماں نے اپنا مخصوص فقرہ پھر کسی
اَن سُننے والے سے کہا۔ جو تیر کی طرح سنسناتا ہوا دوسرے کمرے میں
بیٹھے ہوئے رضی کے وجود میں پیوست ہو گیا، اس نے جھنجھلا کر
سگریٹ کا کش اس زور سے لیا کہ شعلے کی حدت اسے لبوں پر
محسوس ہونے لگی اور حلق میں کسیلا پن گھل گھل گیا۔

وہ اپنے ادبی حلقے میں پڑھنے کے لئے افسانہ لکھ رہا تھا۔
لیکن ماں کے کسیلے ہوئے لفظوں نے اس پر اس طرح یلغار کر دی
کہ اس کے اپنے لفظ پسپا ہوتے چلے گئے۔ تخیلات کی وہ رنگین
دھنک جسے وہ قرطاس پر سجا رہا تھا اپنے سارے چمکتے ہوئے
رنگوں سمیت غائب ہو گئی اور ماں کے لفظ گھٹاؤں کی طرح
اُمنڈ آئے۔ وہ کاغذ قلم ہاتھ میں لئے سوچتا رہا کہ ماں کے
کہے ہوئے لفظوں میں کتنی توانائی ہے کہ اس کے اپنے لفظ
پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ وہ جو ادبی حلقوں میں اپنی منفرد
تحریر اور ترقی پسندی سے پہچانا جاتا تھا ان لفظوں کے
درمیان یوں گھر گیا تھا جیسے کوئی مخبوط الحواس شخص ننھے منے
شریر بچوں میں گھر جائے۔ کوئی اس پر پتھر اُچھال رہا ہو
کوئی اسے چھیڑ کر چھوڑ رہا ہو اور کوئی اسے پاگل پاگل کہہ کہہ
دیوانہ بنا رہا ہو۔

اس نے سر کو کئی بار جھٹکا۔ کیا وہ پاگل ہو گیا ہے؟
اُسے شبہ سا ہوا۔ کہیں وہ پاگل تو نہیں ۔؟ وہ
سوچتا ہی رہا۔ اس کے گھر والے اسے عجیب نظروں سے
دیکھتے تھے یوں جیسے وہ ان میں سے نہیں تھا وہ اس کی بات
نہیں سمجھتے تھے۔ جیسے اس کی زبان سے ناواقف ہوں۔
وہ اپنے ہی گھر میں کتنا اکیلا اور اجنبی تھا۔

ماں بوسیدہ پردہ اٹھا کر اندر آ گئی وہ ابھی تک
قلم ہونٹوں میں دبائے گم سم بیٹھا تھا اس کے چہرے پر
ایک اُلجھی ہوئی سوچ کا بے چین سا سایہ تھا۔ ماں نے اس کا
شانہ ہلایا، تو وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔
"ابھی خلیل کی ماں اُٹھ کر گئی ہے" وہ اتنا کہہ کر خاموش
ہو گئی۔ شاید وہ اس کا ردِ عمل دیکھنا چاہتی تھی۔ رضی
نے بے چینی سے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور خالی خالی نظروں
سے ماں کی طرف دیکھا۔ ماں کو احساس ہو گیا کہ بظاہر وہ
اس کی طرف متوجہ ہے۔ لیکن حقیقت میں کہیں اور ہے
۔ وہ چڑ گئی۔

"تو نے سُنا ۔ کہ میں کیا کہہ رہی ہوں"

"ہاں ۔ ہاں سُن رہا ہوں ۔ وہ جیسے گرد و پیش
میں واپس آتا ہوا بولا۔

"خلیل کی ماں آئی تھی۔ وہ دن مانگ رہے تھے"
ماں نے فقرہ مکمل کر کے پھر اس کی طرف دیکھا۔

"کیسے دن ۔" اس کی آنکھوں کی حیرت سوال بن گئی۔

"تجھے کچھ ہوش ہے کہ نہیں" ماں جھنجھلا گئی۔
تیری بہن کی شادی کے دن اور کیسے دن ۔؟
بہن کو ساری عمر کیا چوکھٹ پہ بٹھائے رکھے گا۔
تو نے کبھی چار پیسے لا کر میرے ہاتھ پر رکھے ہیں۔ ہمارے
گھر کا بوجھ مراد پر ہے۔ کچھ تو بھی اس کا ہاتھ بٹا کوئی نوکری
ڈھونڈ۔ کوئی کام ہی کر لے۔ نرے صفحے کالے کرنے سے
تو پیٹ نہیں بھرتا۔؟"

رضی نے بے دردی سے ہونٹ چبائے اور سر کو جھکا لیا
ماں کا ناقابلِ فہم مطالبہ حشرات الارض کی طرح اس کے سارے
وجود کو چاٹنے لگا۔ اس نے اذیت سے بے حال ہو کر سوچا
کہ وہ کیا کام کرے۔ اُسے تو ایک تخلیقی ذہن ملا تھا

کرب تخلیق نے اس کا رُواں رُواں فریادی بنا دیا تھا۔ اس کی انگلیاں نبضِ زندگی پر تھیں۔ وہ اس کی دھڑکنیں سُنتا تھا۔ وہ اس کے آنسو پونچھتا تھا۔ وہ اس کا تبسم سمیٹتا تھا۔ وہ اس کے نغموں کا رس، اس کی سسکیوں کا کرب، اس کے جذبوں کی صداقتیں اور اس کی حقیقتوں کی بے رحمی کو قلم کی جنبشوں میں مقید کر لیتا تھا۔ اس نے ادب کو نئی سوچ دی تھی۔ اس نے تخلیق کو نئے رنگ دئیے تھے۔ مگر کسی کو اس سے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کیا کرتا ہے؟ وہ کیا سوچتا ہے؟ وہ کیا چاہتا ہے؟ کوئی اس کے اندر نہیں جھانکتا تھا۔ کوئی اس کے قریب نہیں آتا تھا۔

اس نے ماں کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ادھورا افسانہ اٹھا کر جیب میں ٹھونسا اور اُلجھا اُلجھا سا اٹھ کھڑا ہوا۔ دفتر سے آکر مُراد نے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے کہا "یار — ملکی کہانیاں لکھنے والے تو لاکھوں میں کھیل رہے ہیں۔ تم پتہ نہیں کیا جھک مارتے ہو — کچھ فلم کے لئے لکھو۔ کوئی اسٹیج ڈرامہ ہی لکھ لو۔ کچھ ٹی وی کے لئے لکھو۔ تمہارا نام بھی کسی کو پتہ چلے۔ ہم بھی چار لوگوں میں فخر سے تمہارا نام لے سکیں"۔

رضی دروازے کی طرف بڑھتا ہوا رک گیا۔ اس نے پلٹ کر مُراد کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پہ طنزیہ مسکراہٹ تھی اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پا کر وہ یوں ہنسا جیسے اپنی بات کی تائید اس سے چاہ رہا ہو۔ رضی نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس کی بہن نے بُرا سا منہ بنا کر کہا "ہاں بھیا۔ میری سہیلیاں تو میری مانتی ہی نہیں کہ تیرا بھیا کہانیاں لکھتا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ تو جھوٹ بولتی ہے — بھیا جو رسالے سب لوگ پڑھتے ہیں ان میں تمہاری کہانی کیوں نہیں چھپتی؟

رضی کو محسوس ہوا — جیسے اس کی شاہکار تحریریں کسی نے پڑھے بغیر ہی پھاڑ کر پھینک دی ہیں۔ ان کے پُرزے دُور دُور تک بکھر گئے ہیں۔ لوگ انہیں پیروں تلے روندتے ہوئے گزرتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے لئے وہاں ایک پل بھی ٹھہرنا [illegible] اس نے کھسوٹ کر بوسیدہ پردہ ہٹایا اور باہر نکل گیا۔ ماں کے کوسنے دُور تک اس کا تعاقب کرتے رہے۔

وہ بلا مقصد سڑکیں ناپتا رہا۔ تھک گیا تو ایک سستے سے چائے خانے میں بدمزہ چائے کی پیالی سامنے رکھے ادھورا افسانہ مکمل کرتا رہا۔ شام جھکنے لگی۔ تو اس نے ٹھنڈی چائے کے بڑے بڑے گھونٹ حلق میں انڈیل لئے اور اپنے ادبی حلقے میں آن شامل ہوا۔ دوستوں کی پُر مذاق گفتگو نے منہ کا مزہ بدل دیا۔ ذہن پر جو ایک غبار سا چھایا تھا۔ چھٹ گیا۔ تنہائی کا جان لیوا احساس کم ہونے لگا۔ ان شناسا چہروں میں جیسے اسے اپنا سُراغ مل گیا۔ اُن کے پُر تحسین کلمات نے اسے احساسِ کمتری کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جانے سے بچا لیا وہ بڑے اشتیاق سے اپنے فن پر ان کے تبصرے اور توصیف سُنتا رہا۔ لیکن اچانک اسے یہ سب کچھ اُوپرا اُوپرا سا محسوس ہونے لگا۔

اس پر پھر ہجوم میں کھو جانے کی سی کیفیت چھانے لگی اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے بارے میں باتیں کرنے والوں میں سے کوئی بھی اسے نہیں پہچانتا تھا۔ وہ بیکل سا ہو کر ادھوری نشست میں سے ہی بغیر کچھ کہے اٹھ آیا اس کے قریب بیٹھے ہوئے اس کے ایک دوست نے اسے روکنا چاہا مگر وہ جتنی جلدی ممکن تھا وہاں سے نکل آیا۔ ذہن سے چپکی ہوئی تلخ سوچوں کا ذائقہ اس کے رو ئیں رو ئیں میں بے چینی جگاتا رہا۔ وہ شہر کی سڑکوں پر بلا مقصد گھومتا رہا۔ سیاہ تاریک رات اس کے گرد و پیش پھیلتی رہی۔ جاگتے ہوئے شہر کی رونقیں ہولے ہولے اونگھنے لگیں۔ اس کے پاؤں گرد سے اٹ گئے۔ اس کے بوسیدہ جوتے میں ابھرا ہوا کیل مزاحمت کرنے لگا۔ وہ بلا ارادہ ایک گھر کے باہر رک گیا۔

شاید وہ اس کا گھر تھا کہ دروازہ اس کے دستک دینے پر کھل گیا اور وہ ماں کے کوسنے سُنتا ہوا نیند میں

مدہوش ہوگیا۔ صبح دیر سے آنکھ کھلی ۔۔ تو ماں کی بڑبڑاہٹ پھر سنائی دی۔ اس نے ندامت سے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا ۔ "ماں ۔۔ کیا تو ساری رات مجھے کوستی رہی ہے؟"

ماں نے غصے سے منہ پھیر لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی رات کی تھکاوٹ سستی بن کر اس پر سوار تھی۔ وہ بستر میں پڑا ہوا کسلمندی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ سگریٹ کی طلب ہوئی تو وہ بادلِ ناخواستہ بستر سے اٹھا۔ مراد کی پتلون کی جیبوں سے سگریٹ ڈھونڈا اور باورچی خانے میں جھانک کر اپنی بہن سے بولا ۔۔ "صفو ۔۔ چولہے سے ایک کوئلہ تو اٹھانا میں ذرا سگریٹ سلگاؤں۔"

ماں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا ۔ "نہ خدا کا نام، نہ رسولؐ کا نام اور سگریٹ منہ میں . . . ."

اس نے بہن کے پاس بیٹھ کر بڑی بے دلی سے بدمزہ ناشتہ کیا۔ نہ جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی بہن بار بار اس کی طرف دیکھ رہی ہے ہر بار اس کی طرف نگاہیں ایک عجیب سے سوال میں ڈھل جاتی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک التجا سی چپکی تھی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ یوں چپ بیٹھی رہی جیسے کسی متوقع اندیشے نے اس کے ہونٹ سی دیئے ہیں۔ جیسے وہ کسی خوف کے سحر میں اسیر ہے۔

وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا، اس گھر میں اس کے دن کتنے کڑے تھے۔ سارے وجود کو کھُل کھُل کر گزرتے تھے اس کے باسیوں کی خاموشی کتنی سنگین اور شعلوں سے بھری ہوتی تھی ان کے انداز میں کتنے واضح مطالبے تھے ان کی آنکھوں میں کتنے شکوک اور اندیشے تھے۔ مراد نہ جانے ماں سے کیا کہہ رہا تھا۔ ماں بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی ۔۔ اس کی پشت تھپتھپا رہی تھی وہ یک لخت تشنہ سا ہو گیا۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑ گئے اس کے ہونٹوں پر پپڑی کا جم گئی اس کا وجود سلگنے لگا اس کا دم لبوں پر آگیا۔ اس میں اتنی سکت بھی نہیں رہی کہ بگولہ اٹھتے ہوئے گھر کے صحرا سے باہر ہی نکل جائے۔

اچانک اسے اپنے جھلستے ہوئے وجود پر ٹھنڈی پھوار کا احساس ہوا۔ یوں جیسے کڑی دھوپ میں کسی چھتنار درخت کی بھیگی ہوئی چھاؤں میسر آجاتی ہے۔ ماں کا مہربان سراپا قریب آگیا اس کے چہرے پر ملال اور کرختگی کی لکیریں نہیں تھیں، یہ اس کی اپنی ماں کا تر و تازہ اور شگفتہ چہرہ تھا اس نے پیاسی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ اس کا بچھڑا ہوا بچپن اس کے گلے سے آن لگا۔ اس نے بچوں کے سے والہانہ پن سے ماں کے وجود کو محسوس کیا اور ترسے ہوئے لہجے میں بولا۔

"ماں ۔۔! تو کہاں چلی گئی تھی ۔۔؟"

ماں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا کہہ رہا ہے رضی ۔۔ میں تو یہیں تھی"

وہ قدرے چونک گیا۔ ماں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور مسرور لہجے میں بولی ۔ "رضی ۔۔ مراد کے دفتر میں کلرکوں کی بھرتی ہو رہی ہے ۔۔ اس نے اپنے صاحب سے کہہ کر تیرا انتظام بھی کر لیا ہے۔ تو آج اس کے دفتر چلے جانا ۔ وہ کہہ رہا تھا ۔۔ آسامیاں بھی ہیں مگر ایک بار تو اٹک جا۔ آگے وہ آپ سنبھال لے گا۔

رضی نے کرب کی لاانتہا کیفیتوں کو خود پر ٹوٹتا ہوا محسوس کیا۔ گھنے چھتنار درخت نے یکبارگی اپنا سایہ اس پر سے اٹھا لیا اور وہ پھر کڑی دھوپ کے وار سہنے لگا اس نے دھندلائی ہوئی سی نگاہ ماں کے چہرے پر ڈالی لیکن وہ اسے پہچان نہیں سکا ۔۔ ماں نے پھر اسے سمجھایا ۔ "کہ اسے مراد کے دفتر ضرور جانا چاہئے۔" مگر وہ گم صم سا کھڑا کچھ دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔ ماں کو اس کا رویہ بالکل پسند نہیں آیا۔ وہ وہیں کھڑی اسے برا بھلا کہتی رہی۔

اس نے سارا کمرہ الٹ دیا۔ الماریاں کھنگال ڈالیں ٹرنک پلٹ دیئے۔ اپنی شاہکار تحریروں کو کونوں کھدروں میں سے اکٹھا کیا۔ انہیں جھاڑ پھٹک کر بغل میں دبایا اور پُرہجوم دنیا میں گم ہو گیا، اس کے قدموں میں

بیزاری تھی — اُس کے چہرے پر چمک تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خواب تھے۔ اس کی چال میں خود اعتمادی اور تفاخر تھا۔ اُسے گرد و پیش میں کوئی شے قابلِ اعتنا معلوم نہیں ہوتی تھی۔

لیکن شام ڈھلے جب وہ واپس لوٹا — تو اس کا سارا چہرہ ناامیدی کی گرد سے اٹا ہوا تھا — اس کے چاروں طرف ناکامیوں نے جالے تان لیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں سپنا ٹوٹ جانے کا ملال تھا۔ اس کی چال اکھڑی اکھڑی اور شکستہ تھی۔ یوں جیسے پاؤں تلے زمین نہ ٹھہری ہو۔ وہ اجنبی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا تھا۔ جیسے کسی انجانے دیس میں چلا آیا ہو۔ وہ بولنے سے احتراز کر رہا تھا۔ جیسے اس کی زبان سمجھنے والا کوئی نہ ہو۔ وہ شاید کسی پچھلی صدی کا آدمی تھا۔ یا کسی اگلی صدی کا — اور گزرتی ہوئی صدی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔

ماں جیسے اس کے انتظار میں تھی کہ وہ گھر کی چوکھٹ پر پاؤں دھرے اور اس کے لتے لے۔ وہ سخت ناراض تھی کہ وہ مراد کے دفتر کیوں نہیں گیا تھا۔ مگر وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا اس کے برابر سے گزر کر اندر چلا گیا اور بغل میں دبائے ہوئے کاغذوں کے پلندے کو اس نے زور سے زمین پر پٹخ دیا جیسے وہ اس کی شاہکار تحریریں نہیں ردی کا ڈھیر ہو۔

اس کی بہن جو اسے پریشان دیکھ کر فکرمند چہرہ لئے اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔ قریب آ گئی اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب تکنے لگی۔

"ان ردی کاغذوں کو اٹھا کر لے جا اور چولہے میں جھونک دے" وہ چلایا۔

"چولہے میں؟" اس کی بہن کی پریشانی حیرت میں بدل گئی۔

"ہاں چولہے میں" رضی نے خفگی سے جواب دیا۔

اس کی بہن نے ہونٹ کاٹ کر اس کی طرف دیکھا اور زمین پر بیٹھ کر کاغذوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ وہ اتنا پڑھی لکھی تو نہیں تھی لیکن اس نے جان لیا — کہ یہ اس کے بھائی کی تحریریں ہیں جنہیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا وہ صفائی کرتے ہوئے اپنی دانست میں اسے قرینے سے رکھنے کی کوشش کرتی تو وہ آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ کہ اس نے انہیں ہاتھ ہی کیوں لگایا تھا۔

لیکن آج وہ انہیں چولہے میں جھونکنے کو کہہ رہا تھا اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر جھٹکا اور سادگی سے بولی

"پر بھیا، یہ تو تیری کہانیاں ہیں — تیری لکھی ہوئی"

"تو پھر کیا ہے —؟" رضی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا

"ان کو جلا دوں" اس نے یوں ہچکچا کر پوچھا جیسے اعتبار نہ آتا ہو۔

"ہاں — ہاں جلا دے — سنا نہیں تو نے" وہ گرجا

تو اس نے سہم کر سر نیہوڑا لیا اور بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹنے لگی۔ وہ چپ چاپ کھڑا اس کی حرکت دیکھتا رہا۔

یہ وہ شاہکار تھے جنہیں اس کے رتجگوں نے تراشا تھا جن میں اس نے اپنے خونِ جگر سے رنگ آمیزی کی تھی جو اس کے اپنے وجود کا ایک حصہ تھے۔ اسے کاغذ کے یہ ٹکڑے معلوم ہو رہے تھے جن پر لکھے ہوئے سارے لفظ گونگے تھے۔ ابلاغ سے محروم۔ تکلم سے تہی — معنی سے عاری — نارسا ناقابلِ فہم۔ ان کے لئے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہ تھی۔ کوئی ان کا سامع نہیں تھا۔ کوئی ان کا [illegible] نہیں تھا۔ کوئی انہیں قبول کرنے کو تیار نہیں تھا۔

کوئی کہتا تھا کہ ان میں مزاحیہ پن بھی ہونا چاہئے — کسی کا خیال تھا۔ کہ ان میں رومانس کی چاشنی [illegible] کسی نے کہا کہ جنس کے جذبات تیز کرے کے بغیر اس کی تحریریں پھیکی اور خشک ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ وہ انہیں وقت کے تقاضوں کے مطابق لکھے۔ تو وہ کسی خاتون کے نام چھپ سکتی ہیں۔

اُس کا من ٹھنگ اٹھا — اب آتا بھی انہیں اور جا [illegible] "چولہے میں جھونک دو" وہ اپنی بہن کو ہولے ہولے ایک ایک کاغذ اٹھا کر ایک ساتھ رکھتے ہوئے دیکھ کر چڑ گیا۔ وہ چونک گئی، اُس نے گھبرا کر سارے کاغذ سمیٹے

بڑی معصومیت سے بولی ـــ بھیا ــ! میں انہیں جلاؤں گی نہیں ـــ" "کیوں ـــ ؟" وہ تلخی سے بولا۔

"بھیا ـــ انہیں تو نے لکھا ہے۔ کتنی مشکل سے ـــ ان کاغذوں کو اپنے آنچل میں چھپاتے ہوئے بڑے ـــ تو سے کہا ــ میں انہیں اپنے پاس ہی رکھوں گی سنبھال ـــ اپنے پاس ـــ"

رشمی نے بڑے استعجاب سے بہن کی طرف دیکھا ـــ بڑی حیرت سے اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ جس میں بڑی ـــ دگی بھولپن تھا۔ وہ تو اس کی تحریروں کو روانی سے پڑھ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے انہیں کبھی پڑھا نہیں تھا۔ ـــ سے اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ ان میں کیا لکھا ہے۔ ان کی کیا ـــ میت ہے۔ لیکن وہ انہیں سینے سے لگائے ہوئے بڑے ـــ یقین سے کہہ رہی تھی ـــ بھیا ـــ میں انہیں جلاؤں گی نہیں ـــ اپنے پاس رکھوں گی ـــ انہیں تو نے لکھا ہے بھیا ـــ ـــ نے ہے ـــ" اس کی آواز رُندھ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں جل پھیلنے لگا تھا۔

اس نے بہن کی آنسو بھری آنکھوں کی طرف دیکھا ـــ اس کے کہے ہوئے لفظوں کو محسوس کیا ـــ جو بڑے سیدھے در سچے تھے۔ خوشبو کی طرح سارے وجود کو مہکا دینے والے ـــ وہ جیسے پھر جی اٹھا۔ اسے حوصلہ مل گیا۔ اسے یقین ـــ لیا۔ اسے محسوس ہونے لگا یہ لفظ اس کے اپنے تھے اس کے اپنے ـــ لکھے ہوئے، اس کے اپنے ـــ ہوئے، اس کی اپنی واردات ـــ اس کی اپنی شناخت۔ اس کا سرمایہ، اس کی دولت، ـــ وہ انہیں بیچے گا نہیں۔ انہیں کسی کے حوالے نہیں کرے گا، ـــ انہیں دوسروں کے دئے ہوئے معنی و مفہوم نہیں دے گا ـــ وہ کسی کے کہنے پر انہیں بدلے گا نہیں۔ یہ اس کا اپنا اظہار ـــ تھا۔ اس کی اپنی تسکین، اس کا اپنا جمال، اس کی اپنی دلکشی ـــ وہ اسے کسی کا پابند نہیں کرے گا۔

اس نے بہن کی آنسو بھری آنکھوں میں خود کو پہچان لیا۔ اس کا شانہ ہولے سے تھپتھپا کر بڑے دعوے سے بولا ـــ "منّو۔ تو انہیں سنبھال کر رکھ لے ـــ انہیں میں نے لکھا ہے ـــ"

۰ ۔ ۱۳ ـــ ۹ ۔ ۰

ساہتیہ اکاڈمی کی چند قابلِ قدر کتب

کتاب	مصنف	قیمت
تذکرہ	مولانا ابوالکلام آزاد	۲۵/-
خطباتِ آزاد جلد اوّل	"	۳۰/-
ترجمان القرآن مکمل چاروں حصّے	"	۱۲۰/-
آدم خور	نانک سنگھ	۱۵/-
عورت	سیارام سرن گپتا	۴/-
گینجی کی کہانی اول	مراساکی شکیبو	۶/۵۰
ماہی گیر	تکا کاذی شیوا شنکر پلے	۹/-
نرائن راؤ	اڈوی باپی راجو	۲۰/-
دلیہم مائسٹر جلد اوّل I	گوئٹے	۶/-
" جلد دوم I	"	۶/-
" حصّہ دوم II		۸/-
گیلی لیو	بریخت	۵/-
اوتھیلو	شیکسپیر	۵/-
میڈیا	یوری پیڈس	۵/-
تین ناٹک	رابندرناتھ ٹیگور	۷/-
کرال	تروولور	۴/-
چمن زار (فارسی شاعری)	ضیاء احمد بدایونی	۱۲/-
پریم چند	پرکاش چند گپتا	۲/۵۰
تاریخ بنگلہ ادب	سیکو مارسین	۲۵/-
عرشی	پرنسپل تیجا سنگھ	۸/-
بھگوان بدھ	دھرما نند کوسمبی	۷/-
کمال اور زوال	تھوسی ڈائڈس	۲۰/-
ریاست	ارسطو	۱۲/۵۰
گورا	رابندرناتھ ٹیگور	۴۰/-
سنجوگ	"	۱۱/-
۲۱ کہانیاں	"	۳۰/-

دفتر ماہنامہ شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مراجعت

احمد شبیر

وہ دو تین دن سے پہلے بھی کہہ چکی تھی کہ کوئی اسے برف لادے، لیکن کسی نے بھی اس کا کہا نہیں مانا تھا۔ اتنی ایڈوانس سوسائٹی میں کوئی بھی اس کے کہنے پر عمل نہیں کر رہا۔ کیا اس کا انتخاب صحیح نہیں تھا؟"، یہ سوچتے ہوئے وہ کچن کی طرف چلنے لگی۔

تن برتن صاف کر رہا تھا نلکا شہد کا چھتہ بنا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے اور وہ بھی وقفے وقفے بعد قطرہ قطرہ پانی ٹونٹی سے ٹپک رہا تھا۔ اس نے اپنے شہابی رخسار پر ابھری ہوئی پھنسی کو دباتے ہوئے تن کی طرف دیکھا۔

"کیا وہ اسے برف کے لئے کہے یا نہ کہے۔؟" وہ کوئی قطعی فیصلہ نہ کرسکی۔ واپس مڑ گئی۔ صحن میں پہونچ کر یوں ہی بے مقصد ٹہلنے لگی۔

"آخر اس میں حرج ہی کیا ہے، اگر وہ اسے برف لادے" اس نے اپنے سرخ و سفید رخسار پر ابھرتی ہوئی ایک تازہ پھنسی کو دباتے ہوئے سوچا۔ وہ دوبارہ کچن کی طرف چل پڑی۔

وہ عجیب ذہنی کشمکش سے دوچار تھی۔ کچھ وقت اپنی الجھی ہوئی سوچ میں غلطاں رہنے کے بعد اس نے تن سے برف لانے کو کہہ دیا۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا

"بی بی جی! ابھی میں بہت چھوٹا ہوں۔ پھر نیا بھی ہوں کہیں اِدھر اُدھر کسی گلی میں گم ہوجاؤں۔ اور پھر مجھے صرف برتن مانجھنے کے لئے رکھا گیا ہے نہ کہ اوپر کے کاموں کیلئے میں یہ کام ہرگز نہیں کروں گا"

"ملازموں کو مالکوں کا ہر کام کرنا چاہئے۔" لیکن وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور کوئی دوسرا کام کرنے سے صاف انکار کردیا بات بھی صحیح تھی اسے صرف برتن دھونے کے لئے رکھا گیا تھا۔ جواب انکار میں سننے کے بعد وہ بڑی سٹپٹائی۔ ایک چھوٹے شخص نے ایک بڑی شخصیت کی بات کو مسترد کردیا تھا۔ اور یہ ایک فطری امر ہے کہ ایک بڑا شخص اپنے سے بڑے یا اپنے ہم پلہ شخص کی تلخ و ترش بات کو برداشت اور پھر اسے بڑی آسانی سے، ہضم بھی کر لیتا ہے۔ لیکن ایک چھوٹے شخص کی بات نہ تو برداشت ہوتی ہے اور نہ ہی ہضم! خواہ یہ چھوٹا شخص حق پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے انکار کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا جاتا ہے، اسے اپنی بے عزتی تصور کرلیا جاتا ہے، جیسے وہ چھوٹا انسان، انسان نہ موری کا کیڑا ہو۔

انکار پر اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ شرمندگی کے احساس کو کم کرنے کے لئے وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چل پڑی۔ جھنجنی چڑھائی اور سیدھی بستر کی آغوش میں جا گری اسے ہذیان کا دورہ پڑا تھا۔ حواس درست ہونے پر وہ اپنے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

وہ سماج کی انگلیوں سے بنے ہوئے ایک گنبد نما مکان میں رہتی تھی جہاں تازہ ہوا کا گزر بہت کم تھا اس کے کمرے میں چھت کے پاس ایک روشن دان شمال اور دوسرا جنوب کی طرف کھلتا تھا لیکن باوجود اس کے اس کے کمرے میں بلا کی گھٹن تھی۔ خیالات شوریدگی کا شکار تھے اس نے اپنے تپتے ہوئے ذہن سے سوچا

"میرے ہی کمرے میں تازہ ہوا کا گزر کیوں نہیں ہے جب کہ ہر کوئی اس سے فیضیاب ہو رہا ہے۔" اسے اپنی محرومیت کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ "پھر اس کا حل کیا ہونا چاہئے؟" اس نے ایک گہری فکر سے کہا۔ سوچ روشن دان تک گئی کچھ دیر کمرے میں

ناردرن ریلوے

ٹائم ٹیبل نوٹس

یکم اکتوبر ۱۹۸۲ سے عمل میں آنے والے ناردرن ریلوے سسر دیوں کے ٹائم ٹیبل کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :۔

نئی گاڑیوں کا اجراء :

(i) نئی دہلی اور جموں توی کے مابین چلنے والی ہائی ڈے سپیشل کا نام 145 آپ/146 ڈاؤن شالیمار ایکسپریس ہوگا۔ یہ گاڑی اکتوبر تک روزانہ چلا کرے گی اور نومبر سے اپریل تک ہفتہ میں تین روزہ سروس کے طور پر چلا کرے گی یہ جموں توی سے سوموار بدھ وار اور سنیچر وار کو چلا کرے گی اور نئی دہلی سے منگلوار، دیروار اور اتوار کو۔

مقررہ اوقات

145 اپ				146 ڈاؤن
16-15	روانگی	نئی دہلی	آمد	11 - 15
6 - 10	آمد	جموں توی	روانگی	20 - 40

(ii) 507 اپ گورکھپور بارہ بنکی لکھنؤ ایکسپریس
508 ڈاؤن لکھنؤ بارہ بنکی گورکھپور ایکسپریس

مقررہ اوقات

507 اپ				508 ڈاؤن
20 - 30	روانگی	گورکھپور	آمد	8 - 25
2 - 35	آمد	بارہ بنکی	روانگی	0 - 40
3 - 09	روانگی	بارہ بنکی	آمد	0 - 25
4 - 09	آمد	لکھنؤ	روانگی	23 - 30

(iii) 165 اے ڈاؤن لنک ایکسپریس فیض آباد وارانسی (منگلوار اور دیروار کو)
(ہفتہ میں دو روزہ)
165 اے اپ لنک ایکسپریس وارانسی، فیض آباد (سوموار اور بدھ وار کو)

مقررہ اوقات

165 اے				166 اے
10 - 50	روانگی	فیض آباد	آمد	16 - 45
14 - 55	آمد	وارانسی	روانگی	11 - 10

نوٹ :۔ یہ گاڑیاں ہفتہ میں دو دن فیض آباد پر 165 اے اپ/166 اے اپ سابرمتی ایکسپریس سے کنکشن مہیا کریں گی۔

(iv) 127 ڈاؤن کرناٹک ایکسپریس بنگلور نئی دہلی (بدھ وار اور سنیچر وار کو)
(ہفتہ میں دو روزہ) (16-00 بجے آمد، نئی دہلی)

128 -اپ کرناٹک ایکسپریس (ہفتہ میں دو روزہ) — نئی دہلی بنگلور (دیروار اور اتوار کو) (روانگی 15-6 بجے)

نوٹ:- موجودہ 125 ڈاؤن/126-اپ (ہفتہ میں دو روزہ) کرناٹک کیرالا ایکسپریس جو فی الحال تریوینڈرم، بنگلور اور نئی دہلی کے مابین چلتی ہے وہ اب صرف تریوینڈرم اور نئی دہلی کے مابین بطور کیرالا ایکسپریس ہفتہ میں دو روز چلا کرے گی۔
126-اپ نئی دہلی سے منگلوار اور شکروار کو 15-6 بجے چلا کرے گی اور 125 ڈاؤن تریوینڈرم سے سوموار اور شکروار کو چلا کرے گی اور نئی دہلی 00-16 بجے پہنچا کرے گی۔

(v) 708 ای ایم یو سرکلر ٹرین	حضرت نظام الدین	روانگی	20-9 بجے
(گھڑی کی چال کے برعکس)	حضرت نظام الدین	آمد	35-10 بجے
711-ای ایم یو سرکلر ٹرین	حضرت نظام الدین	روانگی	25-18 بجے
(گھڑی کی چال کے ساتھ)	پٹیل نگر	آمد	57 18 بجے

نوٹ: اس کے نتیجہ کے طور پر گاڑیوں کے موجودہ نمبر 709 اور 710 سے تبدیل ہو کر بالترتیب 710 اور 712 ہو جائیں گے۔

گاڑیوں کے ایام میں اضافہ

(i) 143 ڈاؤن/144-اپ کالنگا ایکسپریس اب ہفتہ میں تین دن چلا کرے گی، پوری سے ہر سوموار، بدھ وار اور شکروار کو حضرت نظام الدین سے ہر منگلوار، دیروار اور سنیچروار کو۔
(ii) 123 ڈاؤن/124-اپ آندھرا پردیش ایکسپریس اب ہفتہ میں چار دن چلا کرے گی۔
سکندرآباد سے ہر منگلوار، بدھوار، شکروار اور اتوار کو۔
نئی دہلی سے ہر سوموار، بدھ وار، دیروار اور سنیچروار کو۔
(iii) ای ایم/2 بی ایم پسنجر گاڑیاں جو باڑمیر اور منابا ؤ کے مابین ہفتہ میں چھ دن چلتی تھیں اب روزانہ چلا کریں گی۔
(iv) 151 ڈاؤن/152-اپ راجدھانی ایکسپریس (ہفتہ میں دو روزہ)
مورخہ 19 نومبر 1982ء سے حسب ذیل طور پر ہفتہ میں چار دن چلا کرے گی۔
بمبئی سنٹرل سے ہر سوموار، منگلوار، دیروار اور شکروار کو۔
نئی دہلی سے ہر منگلوار، بدھ وار، شکروار اور سنیچروار کو۔

گاڑیوں کے نامزدہ ایام میں تبدیلی

گاڑی نمبر	موجودہ ایام	تبدیل شدہ ایام
(i) 121 ڈاؤن تامل ناڈو ایکسپریس	مدراس سے سوموار، دیروار اور سنیچروار	سوموار، بدھ وار اور [illegible]

نوٹ:- 122-اپ تامل ناڈو ایکسپریس نئی دہلی سے موجودہ ایام یعنی ہر سوموار، بدھ وار اور سنیچروار کو ہی چلتی رہے گی۔

گاڑی نمبر	موجودہ ایام	تبدیل شدہ ایام
(ii) 67 ڈاؤن اتکل ایکسپریس	پوری سے بدھ وار، دیروار، شکروار اور سنیچروار	منگلوار، دیروار، سنیچروار اور اتوار کو
(iii) [illegible]-اپ اتکل ایکسپریس	حضرت نظام الدین سے سوموار، منگلوار، سنیچروار اور اتوار کو	سوموار، بدھ وار، شکروار اور اتوار کو
(iv) 84 ڈاؤن [illegible] ایکسپریس	مرلی سے سوموار، منگلوار، شکروار	منگلوار، [illegible] سنیچر [illegible]

عمدہ کتابیں: ادارہ شانِ ہند سے منگائیے

عمدہ ناول:

کتاب	مصنف	قیمت
آگ اور دھواں	م۔م راجندر	۵ روپے
اچھی صورت بری نگاہ	ریاض ارشد	۶ روپے
اندھیرے	اختر عادل روپ	۵ روپے
عشق بلاخیز	سید قاسم محمود	۱۰ روپے
ہزاروں راتیں	ش منظر پوری	۱۰ روپے
جلن	کرشن گوپال عابد	۶ روپے
جذبۂ دل	معین شاہد	۱۰ روپے
جاتی ہوئی بہار	وصی محمود آبادی	۸ روپے
کرنیں	شفیق الرحمٰن	۶ روپے
برہن	کرشن گوپال عابد	۱۰ روپے
ننگا شہر	احمد شجاع پاشا	۹ روپے
نئے قدم	ہاجرہ نازلی	۸ روپے
پاگل	رئیس احمد جعفری	۱۰ روپے
پہیلی لڑکی	راز داں ایم اے	۵ روپے
رام محمد ڈیسوزا	علی رضا	۷ روپے
زرینہ	رئیس احمد جعفری	۱۰ روپے
ظالم	سعید امرت	۶ روپے
ٹیڑھی لکیریں	سیما شوری	۱۲ روپے ۵۰ پیسے
اونچی دکان	سیما شوری	۱۲ روپے ۵۰ پیسے
تیسری انگلی	سیما شوری	۱۲ روپے ۵۰ پیسے

دل چسپ افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
نتھ کا بوجھ	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
نتھ اترائی	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
نتھ کا زخم	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
نتھ کا غرور	واجدہ تبسم	۳۰ روپے
کیسے سمجھاؤں	واجدہ تبسم	۱۵ روپے
کیسے کاٹوں رین اندھیری	واجدہ تبسم	۱۵ روپے
جیسے دریا	واجدہ تبسم	۲۵ روپے
فریبِ مسلسل	شفیق بانو	۶ روپے
مجھے تم سے محبت ہے	تقی نور	۷ روپے

تاریخی افسانے

کتاب	مصنف	قیمت
حرم سرا	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
عجائب خانۂ عشق	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
چاند کا خدا	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
راگ کا بدلہ	الیاس سیتاپوری	۱۰ روپے
اندر کا آدمی	الیاس سیتاپوری	۱۰ روپے
بالاخانے کی دلہن	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
شہزادی کا نیلام	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
داستان حور	الیاس سیتاپوری	۱۵ روپے
کشمیر کی کلی	الیاس سیتاپوری	۱۲ روپے

بچوں کے لئے ناول

کتاب	مصنف	قیمت
ستاروں کے قیدی	ظفر پیامی	۴ روپے
خوفناک جزیرہ	سراج انور	۱۰ روپے
بند دروازے	واجدہ تبسم	۱۵ روپے

شعری ادب

کتاب	مصنف	قیمت
ہزار داستاں	فراق گورکھپوری کے شعروں کا مجموعہ	۵ روپے

متفرق کتب

کتاب	مصنف	قیمت
ہندی کے مسلمان شعراء	ابوالبلاغت رتن پنڈوروی	۱۵ روپے
مان سروور	ایمان ادیبی	۲۱ روپے
رباعیاتِ عمر خیام	پروفیسر مہیش پرشاد	۶ روپے
نوائے ازل	ازل دہلوی	۱۰ روپے
متوازی سائے	آزاد بہادر پوری	۸ روپے
صبح و شام	ل۔ احمد اکبرآبادی	۱۲ روپے ۵۰ پیسے
زندگی کے کھیل	ل۔ احمد اکبرآبادی	۱۲ روپے ۵۰ پیسے
ملاحظاتِ نفسی	ل۔ احمد اکبرآبادی	۷ روپے ۵۰ پیسے

عِلمی، ادبی تنقیدی کتب کا جامع اور بہترین انتخاب

عرفانِ اقبال	بشیر مخفی	۳۰ روپے	لاہور کا جو ذکر کیا	گوپال متل	۱۰ رو۔
ذکرِ اقبال	عبدالمجید سالک	۲۰ روپے	راجستھانی زبان و ادب	ڈاکٹر فضل امام	۱۸ رو۔
انتخابِ تیر و نشتر	خوشتر گرامی	۲۰ روپے	قصہ جدید و قدیم	"	۱۸ رو۔
مقاماتِ اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ	۲۰ روپے	نیا اردو افسانہ	کمار پاشی	۱۸ رو۔
میر امن سے عبدالحق تک	"	۲۵ روپے	افکارِ عبدالحق	آمنہ صدیقی	۳۵ رو۔
اشاراتِ تنقید	"	۲۵ روپے	سلمیٰ سے دل لگا کر	اختر شیرانی / نیر واسطی	۱۸ رو۔
اقبال اپنے آئینے میں	رئیس احمد جعفری	۲۵ روپے	ادبی تاثرات	ل۔ احمد اکبرآبادی	۱۸ روپے
انتخابِ معانی	اسلم رفیق ایم۔اے	۶ روپے	روسی فکر اور مفکر	"	۱۲ روپے
اردو تنقید کا ارتقاء	ڈاکٹر عبادت بریلوی	۳۰ روپے	اقبال نامۂ جہانگیری	فارسی	۱۵ رو۔
اردو تنقید نگاری	"	۲۰ روپے	تہذیب القواعد	ظفر حسین عاصی	۱۵ رو۔
اردو کیسے پڑھائیں	مولوی سلیم عبداللہ	۱۲ روپے	صحیفہ تاریخ ادب اردو	مخمور اکبرآبادی	۲۰ رو۔
نادراتِ مرزا دبیر	سید صفدر حسین	۱۰ روپے	دیوانِ مومن مع شرح	ضیاء احمد بدایونی	۲۵ رو۔
قولِ فیصل	مولانا آزاد	۵ روپے ۵۰ پیسے	آئینۂ عروض و قافیہ	طالب ہاتھرسی	۶ رو۔
مقالاتِ آزاد	"	۱۰ روپے	کلیدِ عروض	ڈاکٹر زار علامی	۲۰ رو۔
مختصر تاریخ ادب اردو	ڈاکٹر اعجاز حسین	۱۸ روپے	قتیل شفائی نمبر	فن و شخصیت	۶۰ رو۔
تنقید اور مجلسی تنقید	وزیر آغا	۲۴ روپے	فیض احمد فیض نمبر	"	۷۰ رو۔
چوری سے یاری تک	"	۲۰ روپے	غزل نمبر	"	۶۰ رو۔
نسوانی محاورے	وحیدہ نسیم	۱۸ روپے	کملیشور نمبر	"	۵۰ رو۔
آنکھیں ترستیاں ہیں	جگن ناتھ آزاد	۳۶ روپے	مہندر ناتھ نمبر	"	۵۰ رو۔
اے پیارے لوگو	وارث علوی	۴۰ روپے	راجندر سنگھ بیدی شخصیت اور فن		۲۵ رو۔
میرے خیال میں	نظیر صدیقی	۳۸ روپے	اردو مثنوی شمالی ہند میں	ڈاکٹر گیان چند جین	۴۰ رو۔
ن۔م۔ راشد شخصیت اور فن	ڈاکٹر مغنی تبسم شہریار	۴۰ روپے	" " جلد دوم	"	۴۰ رو۔
منٹو شخصیت اور فن	پریم گوپال متل	۴۰ روپے	زبان، زندگی اور تعلیم	غلام السیدین	۶ رو۔
میراجی	"	۴۰ روپے	غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	۳۰ رو۔
ساحر لدھیانوی ایک مطالعہ	مخمور سعیدی	۳۰ روپے	اردو شاعری میں خود داری	سلام سندیلوی	۶ رو۔
نشانِ منزل	جگن ناتھ آزاد	۴۰ روپے	اردو افسانہ، روایت اور مسائل	گوپی چند نارنگ	۷۵ رو۔
چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی	۳۰ روپے	انیس شناسی	"	۵۰ رو۔
مذہب اور سائنس	مولوی عبدالحق	۱۱ روپے	متاعِ سخن	"	۳۰ رو۔
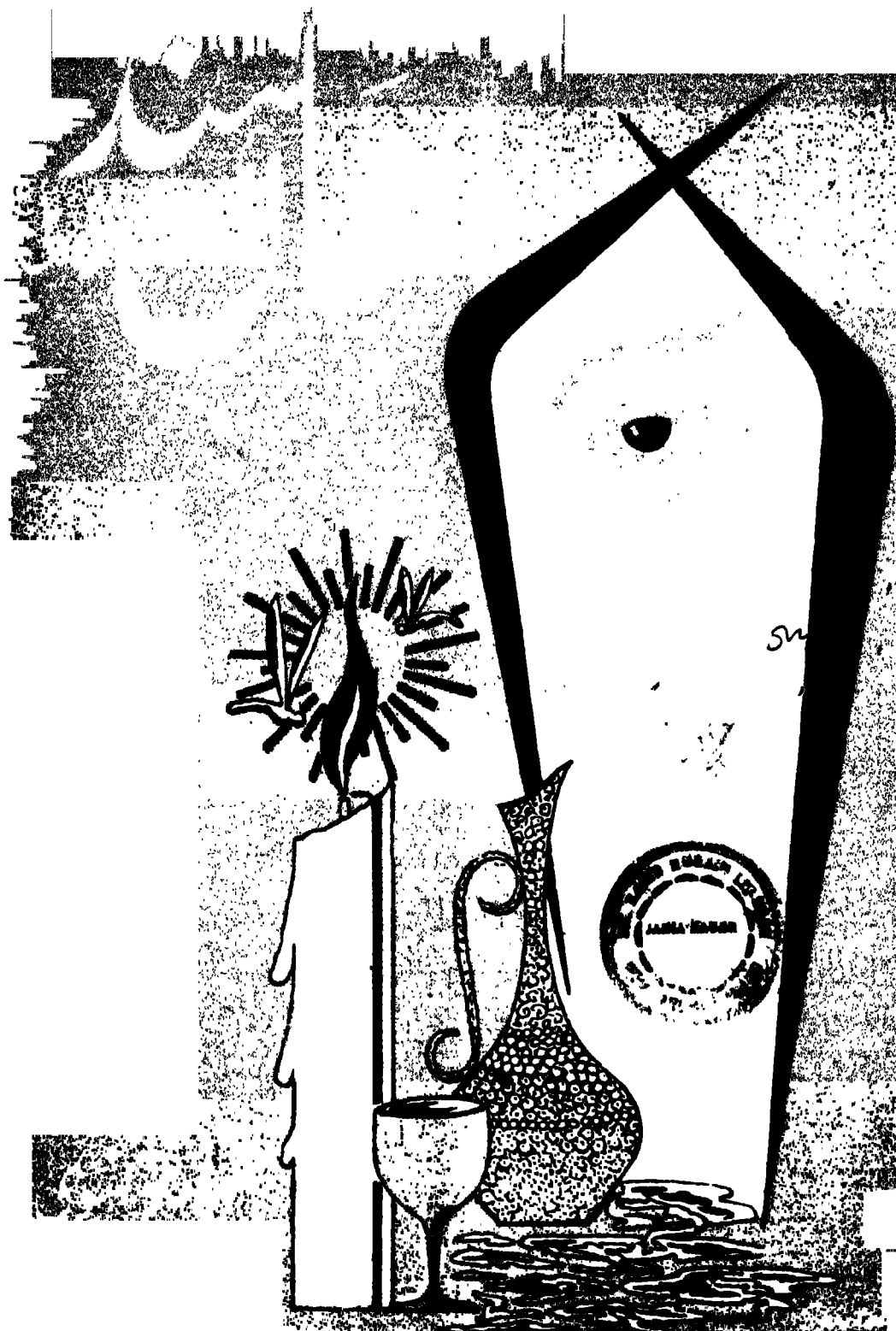
دفتر ماہنامہ شاعر ہند فلیٹ ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲

چاند سا چہرہ مگر مہاسوں اور گرمی دانوں سے ایسا بھر گیا ہے کہ آئینہ دیکھنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے لیکن یہ مہاسے یا گرمی دانے خود بخود تو دُور نہیں ہوں گے۔ انہیں دُور کرنے کا آسان اور سہل طریقہ ہے خون سیر۔ یہ ایک یونانی دَوا ہے جس کا ایک چمچہ صبح شام لیا جاتا ہے۔ کریم، لوشن وغیرہ تو صرف اوپر اوپر سے مہاسوں اور گرمی دانوں کو کچھ دیر کے لئے دبا دیتے ہیں مگر ختم نہیں کر پاتے۔ اسی لئے ان تیز دواؤں سے آپ کی نازک اور ملائم جِلد جل بھی جایا کرتی ہے۔ خون سیر تو خون کے اندر پہنچ کر تمام گندگی دُور کرتی ہے۔ خون کو صاف بنائے رکھنے میں مدد دیتی ہے اور ان تمام وجوہات کو دُور کرتی ہے جن سے مہاسے، گرمی دانے، داغ، دھبّے اور کھُجلی وغیرہ پیدا ہوتی ہے اور پھر آپ کا چہرہ چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ خون سیر کے برابر استعمال سے رنگ بھی خود بخود صاف ہونے لگتا ہے۔

قیمت: چھ روپے

مشرق لیباریٹریز، لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

وزیر موصوف حضرت رتن کی تصنیف لطیف "ہندی کے مسلمان شعراء" کا اجرا کرتے ہوئے رتن صاحب کو کتاب اور اعزاز دے رہے ہیں۔ جناب سورج تویر صاحب مائیک پر اور ان کے ساتھ سرور تونسوی

سرور تونسوی [illegible]

شری جوگندر پال پانڈے وزیر صحت وتعلقات عامہ پنجاب تقریر کرتے ہوئے۔ ستور تونسوی
حضرت رتن پنڈوروی۔ جناب سورج تنویر۔ موگا کے ایک کانگریسی لیڈر اور سردار مینی صاحب
ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز پنجاب تشریف فرما ہیں۔

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۱/۲/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی DN/۴۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرّہ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاضؔ گوالیاری

ماہنامہ
شانِ ہند
نئی دہلی

ایڈیٹر
سرورؔ تونسوی

زرِ سالانہ -/۱۸ روپے
فی پرچہ -/۲ روپے

جلد نمبر ۴۳ | نومبر ۱۹۸۲ء | شمارہ نمبر ۱۱

مُحسنِ انسانیت، امامِ حق و صداقت

حضرت امام حسینؓ

توصیف علوی
عاصی

نازِ خود فطرت کو ہے جس پر وہ حاصل ہیں حسینؓ
زندگی دُنیا کو دی ہے جس نے وہ دِل ہیں حسینؓ

فخر ہے جس پر ہراک بیڑے کو وہ ہیں ناخدا
ہر سفینہ جس پہ نازاں ہے وہ ساحل ہیں حسینؓ

جس سے تابندہ رہے گی حشر تک بزمِ جہاں
نورِ ایمانی کی ایسی شمعِ محفل ہیں حسینؓ

جس کا ہر نقشِ قدم ہے جرأتِ حق کا امیں
راہِ دیں کے وہ حقیقی میرِ منزل ہیں حسینؓ

تا ابد جس پر رہے گا نوعِ انسانی کو فخر
عظمتِ حق و صداقت کے وہ حامل ہیں حسینؓ

جن سے قائم آج بھی ہے دینِ حق کا ہر ستوں
اس بھری دُنیا میں ان قدروں کے حامل ہیں حسینؓ

رہروانِ راہِ حق کی جس سے چمکی منزلیں
زندگی کی راہ میں وہ نورِ منزل ہیں حسینؓ

حق نمائی کا زمانے میں ہیں نقشِ معتبر
اور کلام اللہ کی تفسیرِ کامل ہیں حسینؓ

اُس کا ماتم کیوں نہ ہو دُنیا میں وجہِ احترام
درد سے پُر ہے جو ہر انساں کے وہ دل ہیں حسینؓ

کہہ رہے ہیں آج بھی اوراقِ تاریخِ اُمم
حق پرستی کے ہراک عنوان میں شامل ہیں حسینؓ

جس نے سر دے کر کیا اسلام کا پرچم بلند
وہ علمبردارِ حق وہ مردِ کامل ہیں حسینؓ

زندگی ملتی ہے ہر اک کربلا سے دین کو
اس حقیقت کے صحیح معنوں میں حامل ہیں حسینؓ

پھر کسی عاصی کو کیا طوفانِ عصیاں کی ہو فکر
جب کہ بیڑے ڈوبتی کشتی کے ساحل ہیں حسینؓ

دریا پرکاش سرورؔ تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے [illegible] کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی اور سرورتی پائیلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸ انصاری [illegible] لیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا

اخوت کے چراغ

توصیف علوی عاصی بی۔ اے کیرانوی

جھوم اٹھے صحنِ عالم میں پھر اک شورِ زندگی
ذرّے ذرّے میں نظر آئے نئی تابندگی
پھر سے ہر اک خار و گل پہ ہو نرالی تازگی
ہو زمانے میں ہر اک انسان کا دل باغ باغ
اس طرح روشن کرو ہر سُو اخوت کے چراغ

دُور ہوں دُنیا سے نفرت کے اندھیرے دُور ہوں
دُور یہ تاریکیاں ہوں یہ دھندلکے دور ہوں
دُور ہوں یہ حشر سامانی کے خاکے دُور ہوں
قلبِ انساں سے کدورت کا مٹے ہر ایک داغ
اس طرح روشن کرو ہر سُو اخوت کے چراغ

گوشے گوشے میں جہاں کے ہوں نئی تابانیاں
ہوں فضائے زندگی میں ہر طرف رنگینیاں
گلستانِ آرزو میں ہوں نئی نیرنگیاں
آج کا انساں سکونِ دل کا پائے کچھ سُراغ
اس طرح روشن کرو ہر سُو اخوت کا چراغ

آج ہر اک بام و در کو اک نئی تصویر دو
زندگی کے خواب رنگیں کو نئی تعبیر دو
فکرِ انسانی کی ظلمت کو نئی تنویر دو
پھر سے ہر ویرانہ بن جائے نیا اک صحنِ باغ
اس طرح روشن کرو ہر سُو اخوت کے چراغ

پھر سے ہر اک غمکدہ میں ہو نرالی روشنی
پھر ملے ہر ایک جامِ زندگی سے سرخوشی
پھر سے ہو انسان کو انسان سے وابستگی
فکرِ نو سے ہو منور پھر سے ہر اک دل دماغ
اس طرح روشن کرو ہر سُو اخوت کے چراغ

ایک سب کا میکدہ ہو اور سب کا جام ایک
ایک ہو مینا و شیشہ اور مئے گلفام ایک
ایک تنویرِ سحر ہو اور رنگِ شام ایک
ہو بہارِ گلستاں سب کی وہ بلبل ہو کہ زاغ
اس طرح روشن کرو ہر سُو اخوت کے چراغ

باہمی اُنس و محبت کے ہوں افسانے نئے
زندگی کی شمع پر رقصاں ہوں پروانے نئے
ہاتھ میں چھلکیں ہر اک میکش کے پیمانے نئے
ہو نئی بزمِ مسرّت ہوں نئے جام و ایاغ
اس طرح روشن کرو ہر سُو اخوت کے چراغ
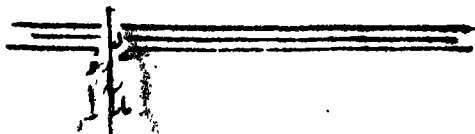
بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

ہندی کے مسلمان شعراء[1]

ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی کی یہ مایۂ ناز تصنیف آپ بھرنش کال یعنی قدیم ہندی کا دور جو سمت ۶۰۰ سے سمت ۱۰۵۰ تک متعین کر لیا گیا ہے۔ ویرگاتھا کال یعنی رزمیہ شاعری کا دور جو سمت ۱۰۵۰ بکرم سے سمت ۱۳۵۰ بکرم تک سمجھا جاتا ہے اور بھگتی کال یعنی عبادت و تصوف کا دور جو ۱۳۷۵ سے سمت ۱۷۰۰ بکرم تک پھیلا ہوا ہے۔ ریتی کال یعنی فنی دور جو سمت ۱۷۰۰ بکرم سے ۱۹۰۰ بکرم تک کا زمانہ کہلاتا ہے اور آدھونک کال یعنی دورِ حاضر سمت ۱۹۰۰ بکرم سے اب تک کی ایسی مفصل اور مکمل ہندی شاعری کی وہ تاریخ ہے جسے مسلمان شاعروں نے اسے انداز سے سنوارا کہ ہندی شاعری زبانِ حال سے پکار پکار کہتی ہے کہ میری آبیاری میں بھارت کے مسلمانوں نے ہندوؤں کے مدِ مقابل بڑھ چڑھ کر عملی حصہ لیا اور اس کے ثبوت میں قریباً تین صد سے زائد ایسے ہندی کے مسلمان شاعروں کا تذکرہ اور اُن کا نمونۂ کلام اس کتاب میں اکٹھا کیا گیا ہے جو واقعی ہندی شاعری کی پختہ کاری کے ضامن ہیں۔

ہندی زبان کی ابتدا پر نظرِ غائر ڈالی جائے تو آج سے ہزاروں سال پہلے ویدوں کے زمانے میں اس کا سُراغ ملتا ہے۔ اس کتاب کا دیباچہ پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندی کی تاریخ سے متعلق سلسلہ وار کن کن غیر ملکی اور اپنے ہاں کے مشہور مصنفین نے روشنی ڈالی۔ اس کتاب میں ہندی زبان کی مختصر تاریخ پر جس عالمانہ انداز سے رتن صاحب نے خامہ فرسائی فرمائی ہے اُس کی داد ہر ذی ہوش دے گا۔ اور یہ دعویٰ کرنے میں کوئی خدشہ نہیں کہ ہندی زبان کی مختصر تاریخ اس قدر جامع انداز میں کہیں اور نظر نہ آسکے گی۔ جب اس کتاب میں آپ ہندی زبان کی خصوصیات ملاحظہ فرمائیں گے تو ڈاکٹر جعفر حسن کے اس فرمان کی تائید فرمائیں گے کہ جو خصوصیت اردو میں میر کو اور جرمن میں دانتے کو حاصل ہے وہ ہندی کے تقریباً ہر باکمال شاعر میں موجود ہے۔ اور مولانا آزاد دہلوی مرحوم کا قول کہ فارسی اور اردو کی انشاپردازی میں جو دشواری ہے وہ ہندی کی انشا میں آسانی ہے۔ اس میں ایک باریک نقطہ غور کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ بھاشا، زبان جس شے کا بیان کرتی ہے اُس کی کیفیت ہمیں ان خط و خال سے سمجھاتی ہے جو خاص اُس شے کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم نہیں ہوتی، مگر سننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا ہے وہ سننے سے آجاتا ہے۔

ہندی ادب کے اساتذہ کا متفقہ طور پر یہی فیصلہ ہے کہ ہندی شاعری کی جانچ پڑتال کے لیئے تین اہم اصول ستیم، شیوم اور سندرم مدِ نظر رکھنے چاہئیں۔ اور آپ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ پنڈت رتن صاحب نے ان اہم اصولوں کی سختی سے پابندی کی ہے۔

اس کتاب کا ایک اہم باب ہندی اور اردو جب آپ پڑھیں گے تو آپ یہ بانگِ دہل کہنے پر مجبور ہوں گے کہ نہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے اور نہ ہندی ہندوؤں کی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اردو کو فروغ دینے میں بڑا حصہ ہندو جماعت کا ہے اور ہندی کو ترقی پذیر کرنے میں مسلمان حضرات پیش پیش نظر آتے ہیں جیسے کہ ڈاکٹر گل کرائسٹ کی وساطت سے یہ حیرت انگیز حقیقت رونما پذیر ہوئی کہ پہلا ہیڈ منشی جو اردو فارسی شعبے کا صدر مدرس تھا وہ ایک بنگالی ہندو "ترنی چندر متر" تھا جسے کالج کے قائم ہونے کے ایک ماہ بعد یعنی مئی ۱۸۰۱ء میں مقرر کیا گیا تھا اور

[1] "ہندی کے مسلمان شعراء" کی رسمِ اجراء کے موقع پر ایڈیٹر شانِ ہند کا تعارفی خطبہ

اسی طرح ہندی کی آسامی کے لئے میر بہادر علی ایک مسلمان کو ستمبر ۱۸۳۰ء میں تعینات کیا گیا۔ اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے یا سمجھنے والے اور ہندی کو محض اور محض ہندوؤں کی جاگیر سمجھنے والے حضرات اس باب کو غور سے پڑھیں گے تو ان کے دلوں میں ہندی اور اردو کے خلاف جو میل تہ در تہ جم چکی ہے وہ اپنے آپ ختم ہو جائے گی۔

اس کتاب کا ایک اور باب ہندی اور مسلمان پڑھنے سے آپ کو پتہ چلے گا بے شک یہ ایک بے نقاب حقیقت ہے کہ اردو ادب کی ترویج و ترقی میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کا بھی بہت بڑا حصہ ہے لیکن ماہرینِ لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ ہندی ادب کی ابتدا اور ارتقا میں مسلمانوں کی لسانی خدمات ہندوؤں سے بھی بازی لے گئی ہیں اور ہر گام پر رواداری، بلند نظری، فراخ دلی اور انسانی ہمدردی کا بیّن ثبوت پیش کر رہی ہیں۔ اور بلا خوفِ تردید کہنا پڑتا ہے کہ یہ مسلمان ہی ہیں جنہوں نے برادرانِ وطن سے بیشتر ہندی زبانوں کی تہذیب و ترقی پر توجہ دی ہے۔ اس ملک کی شمال مغربی زبانیں یعنی پشتو، سندھی، کشمیری اور پنجابی کا قریب قریب تمام ادبی سرمایہ مسلمانوں کی کوششوں کا ممنونِ احسان ہے بنگالی زبان اور اس کے ادبیات کو فروغ دینے والے مسلمان ہیں۔ برج۔ قنوجی اور اودھی کی ترقی میں مسلمانوں نے خاص حصہ لیا ہے۔ اس باب کو توجہ سے پڑھنے والا یہ کلمۂ حق کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندی زبان کی ترویج و ارتقا میں مسلمانوں کا سر اپنے ہم وطنوں سے اونچا نظر آتا ہے۔

"ہندی کے مسلمان شعراء" تشدد اور منافرت کے اس دور میں شانتی اور پریم کی ایک ایسی منہ بولتی دستاویز ہے جو ہر پڑھنے والے کے دل میں اردو اور ہندی دونوں کے لئے محبت اور عقیدت کی ایک ایسی لہر پیدا کرتی ہے کہ جس کی تیز و تند رو میں مذہبی منافرت، بھاشائی جھگڑے، تشدد، منافرت اور لسانی بدگمانیاں اس طرح نیست و نابود ہو جاتی ہیں کہ اگر آپ ان برائیوں کو ڈھونڈھنا بھی چاہیں تو تلاش نہیں کر سکتے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ بھی میری ہم نوائی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اس صدی میں قومی یک جہتی، مذہبی رواداری، لسانی یگانگت اور حب الوطنی پر "ہندی کے مسلمان شعراء" سے بہتر اور کارآمد کتاب یقیناً شائع نہیں ہوئی۔

راجندر بہادر موج کا چیرمین شپ مینی فیسٹو

اتر پردیش اردو اکاڈمی کے عہدہ داران میں غالباً ۱۵ فروری ۱۹۸۲ء کے بعد کافی ردّ و بدل ہو رہا ہے اس لئے چیرمین شپ کے لئے جناب رام لعل صاحب اور جناب راجندر بہادر موج کا نام نامی لیا جا رہا ہے۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی کے خلاف جو جہاد ہوا اس میں رام لعل صاحب نے عام طور پر غیر جانبداری کا وطیرہ رکھا مگر موج صاحب نے اردو اکاڈمی والوں کا نہ صرف ساتھ دیا بلکہ انہیں ڈیفینڈ کرنے کے لئے مضامین بھی لکھے۔ اس لئے امیدوارانِ چیرمین شپ میں موج صاحب سیّاں بھئے کوتوال کے مصداق یہ باور کر چکے ہیں کہ وہ چیرمین بن گئے۔ چنانچہ حال ہی میں لکھنؤ کے "قومی آواز" میں ان کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ اردو اکاڈمی میں کیا کیا ہونا چاہئے چونکہ وہ ابھی یہ تو لکھ نہیں سکتے تھے کہ میں کیا کیا کروں گا۔ مگر انہوں نے اپنا مافی الضمیر اس مراسلہ میں بڑی صفائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ عین اسی طرح جیسے سیاسی جماعتیں الیکشن کے وقت اپنا اپنا مینی فیسٹو پیش کرتی ہیں اسی طرح مراسلہ کی شکل میں موج صاحب نے اردو اکاڈمی کا متوقع چیرمین ہونے کی حیثیت میں اپنا مینی فیسٹو عوام کے سامنے پیش کر دیا ہے حالانکہ مینی فیسٹو محض سبز باغ دکھانے کا دوسرا نام ہوتا ہے۔ اتر پردیش اردو اکاڈمی کی موجودہ حالت کی تمام تر ذمہ داری جناب عمار رضوی وزیر اتر پردیش کی سیاسی چالوں کی رہینِ منت ہے اگر وہ چاہتے ہیں کہ اتر پردیش اردو اکاڈمی ایک فعال ادارہ ہو تو انہیں چیرمین شپ کے لئے ایسے غیر جانبدار ہستی کا انتخاب کرنا ہوگا جنہیں ہند و مسلم عوام نیز دانشوروں میں مقبولیت حاصل ہو ورنہ اردو اکاڈمی حسبِ سابق بے عملی [illegible] رہے گی اور بیداد دستور باقی رہے گی

[illegible]

فلسفۂ مرگ و حیات

ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوروی

عرش سے بالا تریں ہے کرکشیتر کی زمیں
پاک۔ برتر۔ پُرتقدس ہے تقنیر کی زمیں

جس جگہ انجام نیک و بد نمایاں ہوگیا
کرشن کی صورت میں خود بھگوان رتھ باں ہوگیا

اک طرف تھا کوروی فوجوں کا بحرِ بے کراں
ایک جانب پانڈوؤں کا لشکرِ محشر نشاں

عرض کی ارجن نے اے صورت گرِ کون و مکاں
لے چلیں رتھ آپ دونوں لشکروں کے درمیاں

تاکہ اندازہ کروں کس کس سے لڑنا ہے مجھے
واسطہ کس جنگ جو سے آکے پڑنا ہے مجھے

جان کر ارجن کی خواہش کرشن جی اک آن میں
لے گئے رتھ لشکروں کے درمیاں میدان میں

سب یگانے دیکھ کر ارجن کا دِل گھبرا گیا
اور بھیشم دروں سے بحرِ ادب شرما گیا

کہہ اٹھا بھگوان میں اپنوں سے لڑنے کا نہیں
اس خطا سے آتشِ دوزخ میں پڑنے کا نہیں

مار کر ان کو مجھے آرام مل سکتا نہیں
میرے دل کی راحتوں کا پھول کھل سکتا نہیں

حالِ ارجن دیکھ کر بھگوان فرمانے لگے
زندگی و موت کے اسرار سمجھانے لگے

رزم گہ میں یہ تری طرزِ عمل زیبا نہیں
اور یوں بے سود اظہارِ اَلم اچھا نہیں

اہلِ دانش فکرِ مرگ و زندگی کرتے نہیں
محرمِ اسرارِ عرفاں موت سے ڈرتے نہیں

پہلے بھی تھا اب بھی ہے۔ پھر بھی یہی ہوگا نظام
بار بار آئیں گے ہم تم اور یہ دنیا تمام

موت کہتے ہیں جسے وہ ہے فقط نقلِ مکاں
موت تازہ زندگی کی ابتدا ہے بے گماں

جس طرح پوشاکِ کہنہ کو بدل دیتے ہیں ہم
اور اپنا تن لباسِ نو سے ڈھک لیتے ہیں ہم

رُوح ناکارہ بدن کو چھوڑ جاتی ہے یونہیں
اور جسمِ نو میں اپنا گھر بناتی ہے یونہیں

رُوح مرنے مارنے کی سرحدوں سے دُور ہے
غیر فانی ہے۔ دوامی ہے۔ مجسّم نور ہے

ابتدا و انتہا کی قید سے ہے بے نیاز
درحقیقت اس کی ہستی سربسر ہے ایک راز

رُوح ہرگز کٹ نہیں سکتی کسی ہتھیار سے
جل نہیں سکتی کبھی یہ آگ کے آزار سے

بادو باراں کے اثر سے ہر طرح آزاد ہے
قائم و دائم ہے اپنے حال ہی میں شاد ہے

رُوح جب مرتی نہیں انساں بھی مرتا نہیں
موت کی پُرہول وادی میں قدم دھرتا نہیں

رُوح کیا ہے؟ نورِ مطلق کا ہے اک جزوِ لطیف
غیر فانی۔ جاودانی۔ حسنِ ربانی۔ عفیف

اس کا جانا جسم سے ہے موت۔ آنا ہے حیات
چل رہا ہے یوں ازل ہی سے نظامِ کائنات

ہندی کے مسلمان شعراء کی رسمِ اجراء

یکم نومبر ۱۹۸۲ء کی صبح پونے پانچ بجے چنڈی گڑھ کالکامیل سے پہنچا تو تھری وہیلر آٹو رکشا والوں کی لوٹ اور دھاندلی کا تماشہ دیکھتے ہوئے دلی یاد آئی کہ جہاں اس قسم کی دھاندلی کرنے والوں کے لیے محترمہ کرن بیدی نے کافی اچھا انتظام کر رکھا ہے مگر آٹو رکشا یا سائیکل رکشا اور ٹیکسی والوں کا جہاں بھی داؤ چلتا ہے یہ چوکتے نہیں۔ چنڈی گڑھ میں آٹو رکشا والے پلیٹ فارم پر ہی اپنے شکار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک آٹو رکشا والے کے استفسار پر بتایا کہ سیکٹر ۴۲ میں جانا ہے۔ کہنے لگا بابو جی ایک سواری اور بٹھاؤں گا دس روپئے دے دینا۔ میری خاموشی پر کہنے لگا بابو جی! فرسٹ کلاس کے پسنجر سودا بازی نہیں کیا کرتے۔ کیوں کہ ان کے پاس نمبر ۲ کا پیسہ ہوتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کہ عزیزِ من تمہیں کیا معلوم کہ یہاں نمبر دو کا تو ایک طرف نمبر ایک کا پیسہ بھی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ فرسٹ کلاس کا سفر تو مجبوری کے عالم میں کرنا پڑا کیونکہ سیکنڈ کلاس سلیپر میں جگہ نہ مل سکی۔ بہرکیف آٹو رکشا والے کا مطالبہ خاموشی سے منظور کرتے ہوئے سامان اس کے حوالے کیا اور اسٹیشن سے باہر آکر آٹو رکشا میں پہلے سے بیٹھے ہوئے ایک بھاری بھرکم حضرت جو کمبل میں لپٹے ہوئے تھے کے ساتھ بیٹھ گیا۔ قریباً سوا پانچ بجے سیکٹر ۴۲ میں اپنے بھانجے مسٹر کمار کے مکان پر پہنچا۔ ایک گھنٹہ بعد جناب گوپال متلہ واحد تشریف لے آئے۔ پروگرام کے بارے میں کئی باتیں طے کرنے کے بعد واحد صاحب تشریف لے گئے اور میں دس بجے تک سوتا رہا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اپنے بھانجے کے ساتھ جناب سورج تنویر صاحب کے ہاں پہنچا تو وہ موجود نہیں تھے۔ واحد صاحب نے فرمایا تھا کہ جناب وشوا ناتھ طاؤس علیل ہیں لہٰذا ان کی قیام گاہ پر گئے تو کوٹھی کے کمپاؤنڈ میں ایک انتہائی خوفناک کتے کو دیکھا۔ حیرت ہوئی کہ طاؤس صاحب ایسے مرنجان مرنج اور فنا فی الاردو کو اس قسم کے خوفناک کتے کو پالنے کی کیا ضرورت تھی انہیں تو کوئی ایسا طوطا یا مینا پالنی چاہیے تھی جو ہر آنے والے کا خالص اردو میں یوں استقبال کرتی کہ آیئے آیئے یہی عاشقِ اردو کی قیام گاہ ہے۔ طاؤس صاحب کی مزاج پرسی کے بعد جناب رشی پٹیالوی کی عیادت کے لیے سیکٹر ۱۱ میں گئے مگر ان کا مکان نہ مل سکا کیونکہ جو پتہ میرے پاس تھا وہاں سے وہ ایک عرصہ ہوا جا چکے تھے۔ پروفیسر ہارون ایوب شعبہ اردو پنجاب یونیورسٹی کے دولت کدہ پر گئے تو وہ انبالہ گئے ہوئے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ جو خود بھی اردو ڈیپارٹمنٹ میں لیکچرار ہیں نے وعدہ فرمایا کہ اگر ہارون ایوب صاحب تشریف لے آئے تو وہ تقریب میں شریک ہوں گے۔ قریباً دو بجے پنجاب گیسٹ ہاؤس پہنچا تو قبلہ ابوالبلاغت رتن پنڈوروی صاحب کار پر کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ رتن صاحب کے بھتیجے شری نشی کانت (جو ایشیا کے اٹھارہ مشہور جوتشیوں میں سے ایک ہیں) سے ملاقات ہوئی ان کے ساتھ پنڈوری سے کچھ حضرات تشریف لائے ہوئے تھے شری نشی کانت صاحب نے ان سب سے تعارف کرایا۔ جناب سورج تنویر صاحب بھی موجود تھے۔ کچھ ہی دیر میں پٹیالہ سے جناب جگر جالندھری صاحب اور جناب زار علامی صاحب، جناب ابد سرہندی صاحب وغیرہم تشریف لے آئے۔ چنڈی گڑھ کے کچھ ادبی حضرات بھی تشریف لے آئے۔ ان کی قدم بوسی کے [illegible] نصف گھنٹے تک مختلف موضوعات پر بات چیت ہوئی۔ [illegible] ارکلیان سنگھ ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز جناب

رسی صاحب ڈپٹی ڈائریکٹر (فیلڈ) اور دوسرے افسرانِ محکمہ تشریف لے آئے ہیں اور جملہ انتظامات کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ پونے چار بجے سردار منی صاحب ڈائریکٹر پبلک ریلیشنز پنجاب تشریف لائے ہیں اور سردار گورپال سنگھ واحد بھی تشریف لے آئے ہیں اور جملہ حضرات سے کہا گیا ہے کہ جلسہ گاہ میں تشریف لے آئیں۔ دلگیر صاحب خود تو چندی گڑھ سے باہر ہیں مگر ان کی صاحبزادی تشریف لائی ہیں۔ چار بجکر سات منٹ پر شری جوگندر پال پانڈے وزیرِ صحت و پبلک ریلیشنز پنجاب کچھ ساتھیوں کے ساتھ وارد ہوئے تو ان کا استقبال شایانِ شان کیا گیا ہے۔ وزیرِ موصوف کا پنڈت رتن مدظلہ، اور دیگر حضرات سے تعارف کرایا گیا ہے۔

جناب رتن صاحب کی گل پوشی میں جملہ حضرات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور قبلہ رتن صاحب بار بار پھولوں کے ہار اُتار کر مجھے دے رہے ہیں۔ جناب سورج تنویر صاحب نے جلسہ کی کارروائی شروع کرتے ہوئے انتہائی مناسب الفاظ میں قبلہ رتن صاحب اور میرا تعارف کرایا اور جملہ حضرات کو خوش آمدید کہتے ہوئے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ہندی کے مسلمان شعراء سے متعلق تعارفی خطبہ پڑھوں۔ یہ مطبوعہ خطبہ جملہ حاضرین میں تقسیم کیا گیا ہے اور شانِ ہند کی اسی اشاعت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد وزیرِ موصوف نے کتاب کا اجراء فرمایا اور حکومتِ پنجاب کی طرف سے رتن صاحب کو شال اوڑھا کر ان کی عزت افزائی فرمائی اور اس کے بعد جناب گورپال سنگھ واحد کی طرف سے مبلغ گیارہ صد روپیہ نقد اور ایک شال پنڈت رتن صاحب کی خدمت میں وزیرِ موصوف نے پیش کی۔ جناب واحد صاحب خدا کے فضل سے اُردو کی خدمت کے لئے پنجاب بھر میں اپنا واحد مقام رکھتے ہیں۔ اب سورج تنویر صاحب نے وزیرِ موصوف سے استدعا کی ہے کہ وہ چند الفاظ کتاب کے اجراء کے مبارک موقع پر کہیں۔ وزیرِ موصوف نے نہایت [illegible] فرمایا جو درج ذیل ہے۔

مسلمانوں کے حملہ سے پہلے ہندوستان [illegible]

یہاں کی علمی، ادبی اور درباری زبان تھی۔ مذہبی کتابیں اور شعر و شاعری سب ہی اسی زبان کی رہینِ منت تھیں۔ لہٰذا سرکار دربار میں سنسکرت اور سنسکرت بولنے والوں کا ہی عمل دخل تھا۔ لیکن عوام کسی حد تک اس زبان سے کٹ چکے تھے۔ پھر بودھ مت کا دَور دَورہ ہوا اور اسی زمانے میں پالی زبان کو عروج حاصل ہوا اور پالی زبان نے راج پاٹ کا درجہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عوام کی زبان ہونے کا بھی دَم بھرا۔ اس کے بعد ہندوستان کی تاریخ نے ایک نیا موڑ لیا۔ مسلمان جو حملہ آور کی صورت میں یہاں آئے تھے انہوں نے بہت جلد اس سرزمین کو اپنا وطن سمجھتے ہوئے ملک کے عوام کی زبان کو اپنانے کی ہر ممکن جد و جہد میں لگ گئے۔ گویا قومی یک جہتی کا یہ پہلا قدم تھا۔ اس امر کی تصدیق کم و بیش ہر اُس ہستی نے کی جس کا زبان دانی کے سلسلہ میں کوئی مقام تھا۔ اس دَور میں کچھ مسلمان کویوں کے نام ہندی شاعری میں پیش پیش ہیں۔ ہندی کا پہلا نامور صوفی شاعر کبیر یا داس کبیرا ہے جو نانویں صدی ہجری میں پیدا ہوا اور کبیر نے انسانی بھائی چارہ کو جو بڑھاوا دیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ تلسی داس اور بھگت سور داس نے دسویں صدی میں اپنی شاعری کا لوہا منوایا اور بھگتی رس کی یہ شاعری آج تک اپنی مثال آپ ہے۔ ہندی شاعری کے مسلمان کویوں کی صفِ اول میں خواجہ مسعود، شیخ فرید، بوعلی قلندر پانی پتی شمار ہوتے ہیں۔ بوعلی قلندر پانی پتی حضرت نظام الدین اولیاء سے اپنے ہندی دوہوں میں مشورہ کرتے تھے۔ ان کا ایک دوہا سنیئے جو ان کی اعلیٰ شاعری اور پاکیزہ مزاج کی لطافت کی منہ بولتی تصویر ہے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
ودھنا ایسی رین کرو، بھور کبھوں نہ ہوئے

اورنگ زیب عالمگیر کی بابت کہا جاتا ہے کہ جب شاعروں اور سنگیت پریمیوں نے شاعری اور موسیقی کا جنازہ نکالا تو اورنگ زیب نے کہا کہ اسے اتنا گہرا دفن کرنا کہ شاعری اور موسیقی پھر نہ پنپ سکے۔ مگر اس شاعری کش اور موسیقی مخالف [illegible]

دَور میں بھی محمد اعظم شاہ ہندی شاعری سے بے حد رغبت رکھتا تھا اور ... کی ترغیب پر ایک ہندی شاعر نے شکنتلا ناٹک کو ہندی کویتا میں ڈھالا۔ محمد شاہ دلّی کے بادشاہ تھے چونکہ مغلیہ سلطنت ہر لحظہ گھٹتی جا رہی تھی۔ انہوں نے ہندی زبان میں "بارہ ماسا" لکھا جو اب تک عوام میں بے حد مقبول ہے۔ رس خاں ہندی شاعری کے آسمان پر ایک درخشاں ستارے کی طرح نمودار ہوئے۔ ان کا کلام کرشن بھگتی میں اپنا جواب آپ ہے۔ لوگوں نے کہا کہ کرشن تو برج باسی ہیں اور رس خاں برج کے ہی ہو کر رہ گئے۔ ان کی تصنیفِ لطیف "پریم باٹکا" ہندی ساہتیہ کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ ہندی ساہتیہ کی تاریخ امیر خسرو کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتی۔ امیر خسرو جہاں فارسی اور عربی میں طبع آزمائی کرتے تھے وہاں ہندی شاعری پر انہوں نے اپنی امٹ چھاپ چھوڑی ہے امیر خسرو نے ۹۹ کتابیں لکھیں اور چار پانچ لاکھ اشعار کہے جو زیادہ تر ہندی ساہتیہ کی زینت بنیں۔ ان کا یہ سدا بہار اور لامثال شعر تو آپ سب نے سُن رکھا ہو گا۔

گوری سوئے سیج پر، مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ پڑی پر دیس

رحیم ستاون کی پہلی جنگِ آزادی کے بعد ہوئے۔ ذات کے پٹھان تھے دوہوں کے میدان میں خوب نام پیدا کیا۔ عام کی ہندی شاعری میں شنگار رس بدرجہ اتم موجود ہے۔ ہندی ساہتیہ کے ماڈرن دَور میں رسم الخط ضرور بدلا ہے مگر ہمارے اکثر شعراء مثلاً فیض، تپش، میراجی، جعفری اور ساحر نے بھی ہندی الفاظ اور بہت ہی میٹھی زبان میں گیت اور اشعار کہے ہیں۔

جناب رتن پنڈوروی نے جس محنت، لگن اور کثیر اخراجات سے "ہندی کے مسلمان شعراء" کتاب کو ترتیب دیا ہے یہ ان کا ہی حصہ ہے یہ کتاب اس صدی کی یقیناً ایک ا... اپنی نظیر آپ ہے اس کتاب کی اشاعت ... رفقاء کو جن دشوار گزار مراحل سے ... لگن کی میں تعریف کئے بغیر نہیں ... جہاں ہندوستان کو اپنا وطن سمجھ...

... تو وہ موجود ... انا نہ طاؤس ... موجودہ ... اپنی رکھتی ... بھا سکے ...

قابلِ تعریف حصہ لیا ہے وہاں اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی عیاں ہو جائے گا کہ مسلمان شاعروں نے نہ صرف ہندی ادب کی ترقی میں .... ہم وطنوں کا ساتھ دیا بلکہ بعض مقامات پر یہ اپنے ہم وطنوں سے اس میدان میں بہت آگے نکل گئے ہیں۔ میں ان نیک خواہشات کے ساتھ "ہندی کے مسلمان شعراء" کتاب کا اجراء کرتا ہوں اور دعاگو ہوں کہ جناب رتن طویل عمر پائیں اور ادب کے میدان میں اسی طرح اضافہ کرتے ہوئے قومی یک جہتی کو بڑھا دیں۔ (شکریہ)

تالیوں کی جھنکار میں وزیر موصوف اپنی جگہ پر تشریف لے آئے تو قبلہ رتن صاحب سے سورج تنویر صاحب نے استدعا کی کہ وہ بھی کچھ فرمائیں۔ رتن صاحب نے اپنی "تصنیف لطیف" کی تیاری میں جو تکالیف اٹھائی ہیں مختصراً ذکر فرمانے کے بعد ایڈیٹر شانِ ہند کی تعریف فرمانے لگے کہ یہ کتاب جسے ہر سرکاری و غیر سرکاری ادارے نے چھاپنے سے انکار کر دیا تو سردَر تونسوی نے یہ ذمہ داری اپنے ذمہ لی اور انہوں نے اپنے احباب ڈاکٹر اودے سرن صاحب (رتن بلاری)، جناب گوپال سنگھ واحد، جناب راجندر کرشن صاحب، جناب عقیل صدیقی (جدہ) اور حکیم انیس صاحب سنبھلی کے عملی اور مالی تعاون سے اس کتاب کو شائع کیا۔

قبلہ رتن نے ہزاروں دعاؤں کے بعد تقریر ختم کی تو ایک رباعی میں اپنے کفش بردار سردَر تونسوی اور جناب پانڈے صاحب کا شکریہ ادا فرمایا اور پھر چند رباعیات اور ایک بہترین غزل سُنا کر داد و تحسین پائی۔

پنجاب کے محکمہ پبلک ریلیشنز کے ڈائریکٹر جناب مِنی صاحب اور ان کے جملہ رفقاء نے اس تقریب کو کامیاب بنانے میں جس عملی تعاون کا ثبوت دیا وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے پنجاب کا محکمہ تعلقات عامہ جس قابلِ تعریف انداز سے اپنے فرائض کی انجام دہی کر رہا ہے وہ پنجاب کی ... ہزار کالی ایجی ٹیشن کے باوجود اپنا نظیر

●●

عقیل صدیقی

خلیل انجم کامٹی

ہند ویلفیر سوسائٹی کا کُل ہند مشاعرہ

ہند ویلفیر سوسائٹی ناگ پور کے زیرِ اہتمام آج مورخہ ۲۰ مارچ ۸۲ء کی شب میں دھن دٹے رنگ مندر کے ہال میں ایک کُل ہند مشاعرہ زیرِ صدارت عالی جناب مجروح سلطانپوری منعقد ہو رہا ہے، جو ٹکٹ سے ہو رہا ہے۔ اگرچہ مشاعرہ کے انعقاد کا وقت ہو چکا ہے لیکن ہال خالی خالی نظر آ رہا ہے مشاعرے کے کنوینر جناب سازؔ صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں اور بیرونی و مقامی شعرائے کرام کا تعارف پیش کر رہے ہیں اور ہند ویلفیر سوسائٹی کے صدر شعرائے کرام کی گُل پوشی فرما رہے ہیں۔ اعلان کے مطابق آج کے مشاعرے کی نظامت آکاش وانی ناگ پور سے نشر ہونے والے اردو پروگرام "محفل" کی اناؤنسر محترمہ نورجہاں خان صاحبہ فرمانے والی تھیں لیکن وہ ابھی تک اسٹیج پر نہیں آئی ہیں۔ اس لئے ناؤنسنگ کے فرائض کمال جائسی صاحب انجام دے رہے ہیں۔ اپنی مختصر سی تقریر کے بعد کمال جائسی صاحب مشاعرے کے آغاز کے لئے کان پور کے نوجوان شاعر جناب طرزؔ کان پوری صاحب کو زحمت دے رہے ہیں۔ طرزؔ صاحب مائک پر تشریف لا کر نغمگی بکھیر رہے ہیں اور سامعین داد دے کر ثابت کر رہے ہیں کہ مشاعرے کا آغاز اچھا ہوا ہے۔ طرزؔ صاحب کی غزل کے چند شعر ذیل میں پیش کئے جا رہے ہیں ؎

کبھی صبح لکھ رہا ہوں کبھی شام لکھ رہا ہوں
میں کتابِ آرزو میں ترا نام لکھ رہا ہوں

جو دیارِ دل میں آ کر کئی زخم دے گئی ہے
اسی پیکرِ ستم کو میں سلام لکھ رہا ہوں

طرزؔ صاحب کا یہ شعر خاص طور سے پسند فرمایا گیا ؎

تری بکھری بکھری زلفیں تری مست مست آنکھیں
انہیں رات میکدے کی انہیں جام لکھ رہا ہوں

طرزؔ صاحب تالیوں کی گونج میں نہایت کامیاب رہ کر مائیک سے رخصت ہوئے تو کمال صاحب نے پھر کان پور کے ہی ایک اور شاعر جناب تنویرؔ الٰہ آبادی صاحب کو آواز دی۔ تنویرؔ صاحب کان پور کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ چھوٹی بحر میں ایک غزل اپنی مسحور کن مترنم آواز میں پیش کر رہے ہیں۔ غزل تو اچھی تھی مگر مجموعی طور پر داد کی خوشگواری حاصل نہ کر سکی چند شعر آپ بھی سنئے ؎

اپنے لطف و کرم کا اثر دیکھئے
چشمِ تر چشمِ تر چشمِ تر دیکھئے

مستقل حادثوں کا اثر دیکھئے
لوگ افسردہ ہیں کس قدر دیکھئے

قاتلانہ فضا عام ہے ہر طرف
کس کی آتی ہے کیسی خبر دیکھئے

رہزنوں پر نہ تہمت کوئی دیجئے
اب تو بس رہبروں کا ہنر دیکھئے

تنویرؔ الٰہ آبادی کے بعد ایک اور بیرونی شاعر جناب ممتاز احمد ممتازؔ مائیک پر آ گئے ہیں۔ ممتاز صاحب تحت میں اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔ چند متفرق اشعار سُنانے کے بعد ایک غزل پیش کر رہے ہیں لیکن اُن کی غزل کو زیادہ پسند نہیں کیا گیا۔ چند شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

ناسور جس کے سامنے شرما کے رہ گئے
ایسا بھی ایک زخم ہمارے جگر میں تھا

آنکھیں ملیں تو دل کے سبھی درد کھنچ گئے
اللہ جانے کون سا جادو نظر میں تھا

آیا تھا کشتیاں جو ڈبونے کے واسطے
اس ناخداؤں سے اپنی وہ سوچ بھنور میں تھا

اب مقامی مزاحیہ شاعر جناب چھاپڑ ناگ پوری صاحب کے نام کا اعلان کیا گیا ہے نام سن کر سامعین میں ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا ہے۔ لیکن سامعین کی توقع پر چھاپڑ صاحب پورے نہیں اترے اگرچہ انہوں نے سستے اور گندے مذاق پر مشتمل اشعار سنا کر سامعین کو ہنسانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے میرے بازو والی سیٹ پر ناگ پور کے مشہور انگریزی روزنامہ "دی ہتواد" کے نمائندہ جناب این این گپتا صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ یہ مذاق ہے یا پھوہڑ پن — بہرحال! چھاپڑ صاحب بغیر اپنا کوئی تاثر چھوڑے مائیک سے رخصت ہو رہے ہیں اور ان کے بعد شہر گوندیا کے شاعر جناب شفق صاحب تشریف لا رہے ہیں اور غزل کا مطلع عنایت کر رہے ہیں ؎

خندۂ گل سے جب بھی چمن میں حسن کی چاندنی کھیلتی ہے
اپنے ہاں آہنی بیڑیوں سے میری دیوانگی کھیلتی ہے

شفق صاحب کا ترنم گوارا ہے لیکن طویل بحر ہونے کی وجہ سے سامعین بیزاری کا اظہار فرما رہے ہیں۔ بہرحال! شفق صاحب کو بھی سامعین نے جیسے تیسے برداشت کر لیا ہے اور اب میرٹھ کے بزرگ شاعر جناب شوقؔ مرادآبادی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ شوق صاحب شاید مشاعرے کے ماحول کو سمجھ گئے ہیں اور جوان شعر سنا کر نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کر رہے ہیں۔ ان کی پہلی غزل کے مطلع ہی سے شور سا اٹھ گیا ہے ؎

جنت کا پتہ ہے نہ جہنم کا پتہ ہے
ہاں ہم کو تری زلف کے ہر خم کا پتہ ہے

شوقؔ صاحب ماحول کو خوش گوار بنانے کے لئے پورا زور صرف کر رہے ہیں۔ ان کی دوسری غزل بھی کافی جاندار ہے۔ چند شعر آپ بھی سماعت فرمائیں ؎

مندر مسجد اور گرجا گھر
جھگڑوں کے میدان ہیں کتنے

رہبر جنتا واعظ پنڈت
جانچ کرو انسان ہیں کتنے

اور جب آپ اس شعر پر پہنچے ؎

جنت ہے تو ایک ہی نکلا
اور یہاں شیطان ہیں کتنے

تو سامعین نے خوب داد دی ہے۔ شوق صاحب کسی حد تک مشاعرے میں گرمی پیدا کر کے رخصت ہو رہے ہیں — لیجئے! محترمہ نور جہاں خان صاحبہ بھی اسٹیج پر تشریف لا چکی ہیں لیکن نظامت کے فرائض کمال جائسی صاحب ہی انجام دے رہے ہیں۔ اب سامعین کا مزاج بدلنے کی غرض سے گیت کے شاعر جناب یزدانی صدیقی صاحب کامٹی کو زحمت دی جا رہی ہے۔ گیت کا مکھڑا اور اس کے دو بند آپ بھی ملاحظہ فرمایئے اور شاعر کی منظر کشی کی داد دیجئے ؎

ایک تو گوری ندی کے جل میں، دوجے بھری جوانی میں
کنول کھلا ہے پانی میں
ایسا گلابی مکھڑا دیکھے۔ جیسے کلس مندر کا چمکے
کوئی مچھیرا پھول سمجھ کر۔ توڑ نہ لے نادانی میں
کنول کھلا ہے پانی میں
دیکھ کے جل میں چاند کا ٹکڑا۔ شاعر ڈھونڈے گیت کا مکھڑا
چلتی پروا بھجن سنائے۔ سور کبیر کی بانی میں
کنول کھلا ہے پانی میں۔

یزدانی صاحب گیت سنا کر کامیاب رخصت ہوئے تو ناظم مشاعرہ نے بالکل درست فرمایا کہ جس شاعر کا گیت اتنا خوبصورت ہے تو اس کا محبوب کتنا خوبصورت ہوگا اب محترمہ ملک نسیم صاحبہ کو بڑے احترام کے ساتھ مائیک پر آنے کی دعوت دی گئی ہے۔ ملک نسیم تحت میں پڑھتی ہیں۔ ملک نسیم نے کئی اشعار سنائے۔ چند اشعار ذیل میں درج کئے جا رہے ہیں ؎

اہلِ دانش کو اسی بات پہ حیرانی ہے
شہر کاغذ کا ہے شعلوں کی نگہبانی ہے
اب کسی اور کو دیکھوں بھی تو کیسے دیکھوں
تیرے خلدوں کی ان آنکھوں پہ نگہبانی ہے

ذرا اسی غزل کا وہ شعر سنئے جس کی داد سے مشاعرے کے پنڈال کی چھت اڑتی ہوئی معلوم ہوئی ؎

لیجئے لائی ہوں تربیت کا اک سادہ ورق
بس پہ تاریخ وفا آپ سے لکھوانی ہے

کہ نسیم کے وہ شعر بھی سنئے جنہیں نہ صرف سامعین نے بلکہ اسٹیج پر موجود شعرائے کرام نے بھی بے حد پسند فرمایا۔ واہ کیا لہجہ ہے؟ کیا اندازِ بیاں ہے؟ —

محبت کے مراحل سے گزرجانا نہیں آساں
رہِ پُرخار پہ چلنے سے چھالے پھوٹ جاتے ہیں
تیری یادوں کے میرے دل میں گہرے زخم ہیں ایسے
کہ جیسے نقشِ پا گیلی زمیں پہ چھوٹ جاتے ہیں
غمِ دوراں نے مجھ سے میرا ماضی ایسے چھینا ہے
کہ جیسے بھیڑ میں ماؤں سے بچے چھوٹ جاتے ہیں

ملکہ نسیم مائیک سے نہایت کامیاب لوٹ رہی ہیں اب مزاحیہ شاعر بھارت بھارتی کو زحمت دی جا رہی ہے لیکن آپ زیادہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے دو شعر درج کئے جاتے ہیں ۔

دُلہن کی عمر ہے بارہ برس کی
یہاں صورت پہ بارہ بج رہے ہیں
جنتا کے لبوں پہ ہے شرافت کا فسانہ
رشوت میں مزہ گوشت کی بوٹی کی طرح ہے

اب کامٹی کے شاعر رحمت الاختر صاحب تشریف لا رہے ہیں لیکن گھر کی مرغی دال برابر کے مصداق سامعین انہیں بھی خاطر میں نہیں لائے۔ تاہم ان کے دو شعر آپ بھی سن لیں ۔

آئیں گے جو بزرگ کہانی سنائیں گے
اتنی کہیں گے جھوٹ کہ سچ بھول جائیں گے
ساحل کی ساری ریت عمارت میں لگ گئی
اب ہم کہاں سے اپنے گھروندے بنائیں گے

سامعین اب کچھ بوریت محسوس کرنے لگے ہیں کیوں کہ داد بالکل نہیں دی جا رہی ہے بلکہ فقرے کسے جا رہے ہیں۔ ناظم مشاعرہ فرما رہے ہیں کہ یہ مشاعرہ دلوں پہ راج کرنے والے شاعر جناب مجروح سلطان پوری صاحب کی صدارت میں ہو رہا ہے — لیجئے! اب قیوم ناشاد کان پوری مائیک پر آگئے ہیں۔ اپنے دوہے پیش کرنے سے پہلے کچھ کہہ رہے ہیں لیکن سامعین فرما رہے ہیں "تقریر مت کیجئے"۔ بہر حال! قیوم ناشاد صاحب دوہے پیش کر رہے ہیں لیکن سامعین ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں کیا ... صاحب کبھی

سامعین کی خاموشی پہ ناشاد صاحب فرما رہے ہیں، میرا خیال ہے آپ دوہے کے ساتھ زیادہ دور تک نہیں چلیں گے۔ لیجئے میں اپنا راستہ بدل رہا ہوں — سامعین میں سے ایک آواز ابھری "بارہ بج رہے ہیں صاحب"۔ ناشاد صاحب راستہ بدل کر ایک گیت پوربی زبان میں پیش کر رہے ہیں لیکن سامعین کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ آوازیں لگ رہی ہیں کہ صاحب بیٹھ جائیے بیٹھ جائیے، لیکن ناشاد صاحب آسانی سے ہٹنے والے نہیں تھے وہ سامعین سے الجھنے لگے تو مجبوراً مجروح صاحب کو مائیک پہ آنا پڑا۔ مجروح صاحب بہت غصہ میں دکھائی دے رہے ہیں۔ آتے ہی سامعین پہ برس پڑے۔ فرمانے لگے "آپ کو غزل پسند نہیں ہے۔ قطعات پسند نہیں، گیت پسند نہیں، تو پھر آپ کو کیا پسند ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ داد نہیں دے رہے ہیں بلکہ غنڈہ گردی پہ اتر آئے ہیں۔ اگر آپ کسی شاعر کو سننا پسند نہیں کرتے تو جائیے، کیوں خواہ مخواہ اپنا اور ہمارا وقت برباد کر رہے ہیں؟ — اتنا کہہ کر مجروح صاحب اسٹیج چھوڑ کر جانا چاہ رہے ہیں لیکن منتظمین کی درخواست پہ پھر اپنی جگہ بیٹھ گئے ہیں اور مشاعرہ پھر چلنے لگا ہے۔ لیکن جم نہیں پا رہا ہے۔ لکھنؤ کے بشیر فاروقی آئے اور وہ بھی متاثر نہیں کر پائے۔ مقامی شاعر پروفیسر یونس صاحب بھی اس ماحول میں بھلا کیا جمتے وہ بھی ایک غزل کے چند اشعار سنا کر بیٹھ گئے۔

اب مائیک پہ محترمہ نورجہاں خاں آگئی ہیں اور سامعین سے درخواست کر رہی ہیں کہ شور نہ مچائیں اور احترام و ادب کے ساتھ شعرائے کرام کو سماعت فرمائیں۔ لیجئے اب مشاعرے کی دوسری اور آخری شاعرہ محترمہ سلک شنا انجم میر ٹھی صاحبہ کو نہایت ادب کے ساتھ آواز دی جا رہی ہے۔ انجم صاحبہ پہلی بار تشریف لائی ہیں اس لئے سامعین نے ان کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انجم چند قطعات کے بعد ترنم میں غزل پیش کر رہی ہیں۔ آپ موسیقی کی لکچرار ہیں اس لئے ترنم کے زیر و بم سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی غزل کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں، ۔

سوزِ غم کیا ملا زندگی کے لئے
شمع جلنے لگی روشنی کے لئے

مُشکلیں مُشکلیں دوستی کے لئے
کتنی آسانیاں دشمنی کے لئے

پھول شبنم کی ٹھنڈک میں جلتا رہا
اُف یہ مایوسیاں دلکشی کے لئے

فطرتاً کمزور ہے آدمی
دل کشی ہی نہیں گمرہی کے لئے

عقل و دانش یہ مانا بڑی چیز ہیں
دل بھی درکار ہے شاعری کے لئے

شگفتہ انجم صاحبہ غزل ختم کرکے جانا ہی چاہتی تھیں کہ سامعین میں سے "ایک اور ایک اور" کی آواز بلند ہوئی۔ انجم صاحبہ سامعین کی فرمائش پر دوبارہ مائیک پر حاضر ہیں اور پھر ایک مختصر بحر میں غزل سنا رہی ہیں۔ لیجئے چند اشعار اس غزل کے بھی سن لیجئے ؎

غم چھپاتی رہی زندگی	مسکراتی رہی زندگی
بیوفائی کے الزام پر	تلملاتی رہی زندگی
مشکلوں سے بھرے دور میں	گیت گاتی رہی زندگی
آئینے آئینے آئینے	منہ بناتی رہی زندگی

انجم صاحبہ نے اپنی غزلوں سے محفلِ مشاعرہ کو کچھ زندگی دی لیکن ان کے بعد مشاعرہ پھر اونگھنے لگا۔ داغ جون پوری صاحب آئے لیکن زیادہ متاثر نہیں کر سکے تاہم ان کے دو شعر کم از کم سن لیجئے ؎

ہم نشیں اتنا بھی سوچا چاہئے
زندگی میں غم بھی تھوڑا چاہئے

جان بھی دیدی وفا کی راہ میں
باغباں کو جانے اب کیا چاہئے

اب ناظمِ مشاعرہ جناب کمال جائسی صاحب خود مائیک پر آگئے ہیں اور اپنی پرانی غزل "درد کے شعلوں میں یوں عشق کا گلشن جلے" سنا رہے ہیں حالاں کہ سامعین میں سے کچھ آوازیں آئیں کہ یہ غزل بہت پرانی ہے کوئی نئی غزل سنائیے لیکن کمال صاحب سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے پرانی غزل سُنا رہے ہیں اور داد وصول کر رہے ہیں آپ نے ایک غزل اور سُنائی جس کا مطلع ؎

کس موڑ پہ آنکلے ہیں ابرو کی کمانوں والے
سہمے نظر آتے ہیں شیشے کے مکانوں والے

اب قبلہ مُشیر جھنجھانوی صاحب کو نہایت ادب کے ساتھ زحمت دی جا رہی ہے۔ مشیر صاحب اپنی مختصر مگر جامع بعد غزل کا یہ مطلع پیش کرنے سے پہلے فرما رہے ہیں کہ اسکے اعتبار سے بدنام بھی ہے ؎

جب وہ مرے قریب سے ہنس کر گزر گئے
کچھ خاص دوستوں کے بھی چہرے اُتر گئے

داد ہے کہ اس مطلع کا جائز حق ہے۔ اب وہ شعر بھی سُ[illegible] سامعین نے بار بار پڑھوایا ؎

حالاں کہ ان کو دیکھ کے پلٹی ہی تھی نظر
محسوس یہ ہوا کہ زمانے گزر گئے

مشیر صاحب بڑے اعتماد کے ساتھ اپنے اشعار سنائے جا رہے ہیں اور سامعین اپنی بیداری کا ثبوت دئے چلے جا رہے ہیں [illegible] صاحب کے پاس ترنم کا جادو تو نہیں ہے لیکن اپنے [illegible] شعر سے سامعین کو مسحور کر رہے ہیں۔ اور جب وہ اپنی ایک [illegible] کے اس شعر پہ پہنچے تو آپ خود اندازہ لگالیں کہ اس کا سا[illegible] کیا اثر ہوا ہوگا ؎

جس ہاتھ سے اس شوخ کی زلفوں کو چھوا تھا
چھُپ چھُپ کے اسی ہاتھ کو ہم چوم رہے ہیں

مشیر صاحب مائیک سے رخصت ہونا چاہتے تھے لیکن [illegible] کی محبت نے ان کے پیروں میں بیڑی ڈالنے پر مجبور کر [illegible] ایک مرصع غزل کے چند اشعار سنا رہے ہیں آپ بھی سنئے ؎

موسمِ بہاراں کی ہر ادا ستاتی ہے
پھول زخم دیتے ہیں چاندنی جلاتی ہے

میکدے میں رہ کر بھی اب سکوں نہیں ملتا
میکدے کے باہر بھی زندگی ستاتی ہے

کارواں سے منزل تک کچھ نظر نہیں آتا
جب کسی مسافر کی آس ٹوٹ جاتی ہے

برق سے گلا کیسا آندھیوں سے کیا شکوہ
آشیاں بناتا ہوں شاخ ٹوٹ جاتی ہے

اے [illegible]شیر ہم بھی تھے آبروئے میخانہ
آ[illegible] مجبوری پارسا بناتی ہے

مشیر صا[illegible] آبروئے میخانہ ضرور رہے ہوں گے [illegible]

پریم چند کا ذہنی ارتقاء

سری نیواس لاہوٹی

اردو نثر کا جائزہ لیتے وقت ہمارے سامنے جو چند اہم نام آتے ہیں ان میں پریم چند کی شخصیت اور ان کے نثری کارنامے کا مقام بہت اہم ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان کی نثری تخلیقات کا جائزہ لینے سے قبل ان کی زندگی اور شخصیت پر مختصراً روشنی ڈالی جائے تو ان کے ادب کو سمجھنے میں ہمیں بڑی مدد ملے گی۔ پریم چند کو زندگی میں کن کن مشکل مراحل سے گزرنا پڑا ان کا عکس ان کی تخلیقات میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

آج سے تقریباً (۸۰) سال قبل بنارس کے پاس "لمہی" گاؤں میں پریم چند ایک کسان خاندان میں پیدا ہوئے لیکن اور بہت سے کسانوں کی طرح جب ان کے والد کی گزر بسر کھیتی باڑی کے ذریعہ نہ ہو سکی تو انہوں نے نوکری کر لی۔ جب پریم چند پیدا ہوئے اس وقت ان کے والد کی تنخواہ صرف بیس روپیہ ماہانہ تھی۔ جب یہ سات سال کے ہوئے اس وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ جب یہ پندرہ برس کے ہوئے تو ان کی شادی کر دی گئی اور سولہویں سال میں ان کے والد رحلت فرما گئے اور سارے گھر کا بوجھ پریم چند کے کندھوں پر آن پڑا۔ اس وقت یہ نویں جماعت کے طالب علم تھے اور ان کے زیر پرورش دو بھائی، سوتیلی والدہ اور بیوی تھیں۔ پریم چند گاؤں میں رہتے اور ٹیوشن کیا کرتے تھے اور گاؤں سے پانچ میل دور پڑھنے جایا کرتے تھے۔ مدرسہ سے واپس آنے کے بعد مٹی کے تیل کے دیئے کی روشنی میں مطالعہ کیا کرتے تھے۔ ہائی اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد جب کالج میں شریک ہونے کا سوال پیدا ہوا تو ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا اور بغیر فیس معاف ہوئے یہ تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے تھے اس وجہ ... اس عہد میں ان کی دوستی ایک ایسے لڑکے سے ہوئی جس کا باپ ... تجارت کیا کرتے تھے۔ وہیں پر انہیں حقہ پیتے ... سے ...

کی جلدیں پڑھنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل یہ رتن ناتھ سرشار اور مرزا رسوا کے ناول پڑھ چکے تھے۔ "طلسم ہوشربا" پڑھتے وقت انہیں بار بار یہ خیال آتا کہ میں بھی ایسی چیزیں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ مگر انہوں نے "طلسم ہوشربا" کا راستہ نہیں اپنایا بلکہ اسی زمانے میں انہیں بھارتیندو ہریش چندر اور رادھا کرشن داس کی تخلیقات کے پڑھنے کا موقع ملا اور انہوں نے اپنا راستہ "طلسم ہوشربا" سے الگ بنانے کی کوشش کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ پریم چند اس قدر تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے کہ انہوں نے گاؤں کے ایک درزی سے کپڑے سلوائے تھے اور اس کی اجرت ڈھائی روپیہ ہوئی تھی لیکن ان ڈھائی روپیوں کو ادا کرنے کے لئے انہیں تین سال تک سخت محنت کر کے اس قرض سے سبکدوش ہونا پڑا۔ یہ انیسویں صدی کا آخری سال تھا۔ ایک روز غلّہ کی خریدی کے لئے ایک کتاب فروخت کرتے وقت ان کی ملاقات ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے ہوئی جس نے ان کو اٹھارہ روپیہ ماہانہ پر اپنے اسکول میں ملازم رکھ لیا۔ اس طرح پریم چند کو بیسویں صدی میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ اپنی ملازمت کے دوران انہوں نے سنہ ۱۹۱۰ء میں انٹر اور سنہ ۱۹۱۹ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ اس وقت بحیثیت ادیب نامور ہو چکے تھے اور ان کا قلمی نام "پریم چند" پڑھی لکھی جنتا کے سامنے آ چکا تھا۔ پھر بھی غربت اور افلاس کا سایہ ہمیشہ ان کے سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ پریم چند نے اپنا سب سے پہلا ناول سنہ ۱۹۰۱ء میں لکھا جب کہ ان کی عمر مشکل سے اکیس سال کی تھی۔ کا ہتھیہ: اس ناول کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے بعد اسی سال کا یہ ناول نے ایک اور ناول لکھا ان کا دوسرا ناول ۱۹۰۴ء ایسا چھپ ہوا۔ اس دوران میں انہوں نے ٹیگور کی کہانیاں ...

کا ترجمہ بھی کیا ۱۹۰۱ء سے انہوں نے کہانیاں لکھنا شروع کیے
اور آخری وقت تک لکھتے رہے۔ زندگی کی جدّوجہد میں
ان کٹھن مراحل سے گزرنے کی وجہ سے ان کی تحریروں میں سچائی
اور سادگی کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے اور جس کسی نے بھی
پریم چند پر لکھنے کے لئے قلم اٹھایا وہ ان کی سچائی اور سادگی
کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ پریم چند ایک ایسے فنکار
تھے جو ہمیشہ آگے بڑھنا چاہتے تھے اسی لئے ان کی تخلیقات
میں خود اعتمادی کی جھلک جا بجا نظر آتی ہے اور یہی ایک
سچے فن کار کی معراج ہے جیسا کہ ان کے ایک تنقید نگار نے
بتلایا ہے کہ "پریم چند ہندوستان کی قومی بیداری کے نمائندہ
ادیب تھے" اور اس میں کوئی مبالغہ کی بات نہیں ہے۔

پریم چند کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نہ صرف
اپنے عہد کی نمائندگی کرتے تھے بلکہ اس سے آگے کی بات بھی
سوچتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان کی ترقی پسند
قوتوں کا ساتھ دینے میں جانبداری سے کام لیا۔ ان کی یہ
جانب داری صرف "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ نہیں تھی
بلکہ انہوں نے ڈیمی ترات کے اس قول کو پورا کیا تھا کہ ادیب کا
یہ کام نہیں ہے کہ وہ صرف انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کرکے
خاموش ہو جائے بلکہ ادیب کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ انقلابی
طاقتوں کے سنوارنے میں مدد دے تاکہ اس کا ادب اور فن
نکھر سکے اور وہ حقیقی معنوں میں انقلابی فن کار کہلایا جا سکے
جب کہ ہم ان کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس بات کو
بھی دھیان میں رکھنا پڑے گا اس لئے کہ پریم چند نے اپنی
تخلیقات میں اپنی نجی زندگی کے واقعات کو اجتماعی زندگی
سے ہمکنار کرکے اس عہد میں فرد اور سماج کے درمیان جو مصنوعی
خلا پیدا ہو گیا تھا اس کو پُر کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔

میں نے اس پس منظر پر اس لئے زور دیا ہے کہ پریم چند
کے بارے میں سب سے عجیب بات یہ کہی جاتی ہے کہ وہ اپنی
تخلیقات میں اتنے باشعور نہیں تھے جتنا کہ ان کو ہونا چاہئے
تھا۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے اگر ہم ان کی ابتدائی تخلیقات
کا بھی مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ ابھرتی ہوئی
طاقتوں کا ساتھ دیا اور ان کی کامیابی کی دعائیں مانگی
ان کا آخری شاہکار "گودان" تو اس لحاظ سے بہت
بلند ہے اور تمام نقادوں نے اس کو صحیح تسلیم کیا
کہ وہ اس میں گاندھی ازم سے ہٹ کر سوشلزم کی جانب
تھے۔ یہ موقع نہیں ہے کہ تفصیل کے ساتھ ان کے ذہنی ار
پر روشنی ڈالی جائے۔ اس لئے مختصراً چند باتیں بی
کی جاتی ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پریم چند اپنی ابتدائی تخلیقات میں
کے ساتھ گاندھی ازم کا ذکر کرتے رہے اور یہ ان کے
ضروری بھی تھا اس لئے کہ ۱۹۲۰ء سے ۱۹۳۰ء تک کی د
میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے لیکن مشکل ہ
ہندوستانیوں کو ان کی واضح تصویریں ملی ہوں گی
روس میں اشتراکی انقلاب رونما ہوا لیکن سامراجیو
لوٹ اور غارت گری کا نام دیا اور ہندوستانی عوام کے د
میں اس اشتراکی انقلاب سے متعلق نفرت کے جذبات
کئے۔ یہ دور ایسا تھا جب کہ لوگوں کے دلوں میں عدم مساوا
خلاف جذبات پیدا ہو چکے تھے لیکن ان جذبات کی بن
کسی سائنسی فلسفہ پر نہیں۔ ایسے ماحول میں گاندھی
ہندوستانی سیاست میں داخل ہو کر فوری ایک مقام
حاصل کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ یہاں ان تفصی
میں جانے کا موقع نہیں ہے کہ گاندھی جی کو اتنی جلدی یہ بلند
کیوں کر حاصل ہو گیا اس لئے کہ ہندوستان میں جو حالات
ان کا یہ لازمی نتیجہ تھا پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوست
عوام یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اگر انہیں آزادی نہیں تو
وسیع تر مراعات سے مستفید ہونے کا موقع ضرور ملے گا لیکن
ان کی آرزوؤں اور تمناؤں کے خلاف انہیں "رولٹ ایکٹ"
جیسا تحفہ ملا۔ اس وقت کانگریسی سیاست تقریباً د
مایوسی پر کاربند تھی ایسے وقت میں گاندھی جی نے عدم ت
ار سب کے سامنے رکھا اور موقع کی نزاکت کے
اس شہر کا اثر بھرپور پڑا۔
آد... ماحول میں جب کہ پورے ہندوستان میں گاندھی

طوطی بول رہا تھا پریم چند جیسے حساس ادیب کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ ذہنی طور پر گاندھی ازم کی راہ پر چلتے کیونکہ بھی شخص کے لئے جو یہ سمجھنے کے لئے کوشاں تھا کہ غریبی کیا ہے اس عہد میں اگر وہ اشتراکی نہیں بن سکا۔ تو کم از کم گاندھی وادی تو ضرور بن گیا تھا یہی وجہ ہے کہ پریم چند اس عہد میں خارجی طور پر گاندھی وادی تھے یہ ان کے فن کے لئے بہت اچھا ہوا، اگر وہ اس طرح سے گاندھی وادی نہ ہوتے تو ان کی تخلیقات میں اس عہد کی جھلکیاں ہمیں نہیں مل سکتی تھیں۔ لیکن ہمیں یہاں اس نکتہ کو نہیں بھولنا چاہئے کہ صرف گاندھی وادی ہو جانے سے کوئی پریم چند نہیں بن سکتا تھا اگر وہ تخلیقی صلاحیتوں کا حامل نہ ہو۔ اسی وجہ سے وہ اپنی تخلیقات میں یعنی "پریم آشرم" "رنگ بھومی" اور "میدانِ عمل" میں بظاہر گاندھی وادی نظر آتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے ان تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انہوں نے ان تخلیقات میں گاندھی ازم کی فتح کا اظہار تو ضرور کیا ہے لیکن وہ حقیقی معنوں میں گاندھی ازم کی فتح نہیں ہے بلکہ ایک بڑھتے ہوئے عوامی قافلہ کی فتح ہے جو گاندھی ازم سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر پریم آشرم کو لیا جائے۔ اس ناول میں پریم چند نے دیہاتی زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ مسائل بالکل معاشی اور سیاسی ہیں۔ ایک سلسلہ مشترکہ خاندان کے رواج کا بھی ہے جو ہندوستان میں صدیوں سے چلا آرہا ہے لیکن یہ رواج اپنے زمانہ کی ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ جس عہد میں زمین ہی سب کچھ تھی اور پیداوار کا خاص ذریعہ سمجھی جاتی تھی اس عہد میں مشترکہ خاندان کا تصور بالکل درست ہو سکتا تھا لیکن جس عہد میں تمام لوگوں کے روزگار مختلف ہوں اور کوئی کم اور کوئی زیادہ کماتا ہو اس کی رواج کی کامیابی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس ناول میں پریم چند نے یہ بتلایا ہے کہ مشترکہ خاندان کے رواج کا اب چلنا ممکن نہیں ہے اور انہوں نے اس میں رواج کے ختم ہو جانے کی وجہ بیان کی ہے اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو پریم چند اس عہد میں معاشرتی مسائل کے تعلق سے ہیں دوسروں سے سبقت

سوچنے کے عادی تھے۔ اسی طرح سے ہم "رنگ بھومی" میں یہ دیکھتے ہیں کہ اس کے ہیرو سورداس کی تخلیق گاندھی ازم کے بنیادوں پر ہوتی ہے لیکن اس میں دیہاتوں اور کارخانہ داروں کی لڑائی کی بڑی اچھی عکاسی کی گئی ہے۔ گاؤں سے گاؤں والوں کو بھگا دیا جاتا ہے اور گاؤں میں چاروں طرف آگ لگا دی جاتی ہے لوگ کراہتے ہوئے گاؤں سے بھاگتے ہیں اور تھوڑے دنوں بعد یہاں کارخانوں کی بنیاد پڑتی ہے یہ اس ناول کا انجام ہے۔ کیا ہم اس کو گاندھی ازم کی فتح کہہ سکتے ہیں؟ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی ابتدائی تخلیقات میں پورے طور پر اشتراکی نقطۂ نظر کو بیان نہیں کر سکے لیکن ان کے بارے میں یہ بیان کرنا کہ وہ گاندھی وادی ادیب تھے بہت زیادتی کی بات ہوگی۔

اس پہلو سے ہٹ کر اگر دوسرے پہلو سے بھی غور کیا جائے تو اس امر کو ماننا پڑتا ہے کہ پریم چند کا مرتبہ صرف ہندی اور اردو بلکہ پورے ہندوستانی ادب میں بہت بلند ہے۔ میں اس امر پر اس لئے زور دے رہا ہوں کہ پریم چند ایک طرح سے مولانا حالی اور شبلی کے ہم عصر رہے ہیں تو دوسری طرف انہیں ٹیگور اور سرت چند کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اردو ادب میں بلا شبہ حالی ہماری قومی بیداری کے بڑے رہنما رہے لیکن ان کے بعد پریم چند ہی کا نام ہمارے سامنے آتا ہے جنہوں نے اپنے ادب کے ذریعہ قومی زندگی کو استوار کرنے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ٹیگور کے ناولوں میں بھی قومی بیداری کی جھلک نظر آتی ہے ان میں بھی جدوجہد کی عکاسی کی گئی ہے لیکن طبقاتی جدوجہد ہمیں ٹیگور کے ناولوں میں بھی نہیں ملتی۔ ٹیگور کا پورا ادب ایک ایسے طبقہ کا ادب ہے جسے روٹی روزگار کی زیادہ فکر نہیں حالانکہ اس عہد میں روٹی اور روزگار کے لالے پڑے ہوئے تھے لیکن ٹیگور نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی اس کے برعکس سرت چندر اپنی تخلیقات میں نیچے کے طبقات کو لے کر چلتے ہیں لیکن وہ زیادہ تر ان کے سماجی مسائل خاص طور پر شادی بیاہ کے

مسئلوں پر روشنی ڈالتے ہیں لیکن ان کے مقابلہ میں جب ہم پریم چند کی تخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے پورے ادب میں ہمیں طبقاتی جد و جہد کی دہکتی ہوئی جوالا نظر آتی ہے۔ کسان، زمیندار، مزدور اور سرمایہ دار کی لڑائیوں کا ذکر ان کی ہر تخلیق میں موجود ہے۔ ان کے ادب میں عوام کو ظفرمند بتلایا جاتا ہے کیوں کہ یہی ایک ایسا ناگزیر راستہ ہے جس پر چل کر ہندوستانی عوام خوشحال زندگی سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں۔

یہ ہمارے لئے بدقسمتی کی بات ہے کہ پریم چند نے اشتراکی نقطۂ نظر کی بنیادوں پر لکھا ہوا صرف ایک ناول "گودان" ہی دیا لیکن بعد میں بھی یہ اکیلا ناول ہندوستانی ادب میں مینارۂ روشنی کا کام دیتا ہے اس میں ہم ان کے فن کو پورے طور پر گاندھی ازم سے جھٹکارا پاتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس ناول میں ایک ایسے فن کار کی روح ملتی ہے جو پورے طور پر باشعور ہو کر طبقاتی عدم مساوات پر وار کرتا ہے۔ پریم چند نے ہمیشہ بول چال کی بھاشا کو اپنی تخلیقات میں اپنایا تھا۔ لیکن "گودان" میں انہوں نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اتر پردیش کی عام بول چال کی زبان ہے اور یہی ان کی سب سے بڑی خصوصیت رہی ہے جس طرح تلسی داس نے اپنی تخلیقات میں "لوک بھاشا" کو اپنایا تھا اسی طرح سے ان کے بعد پورے ہندوستانی ادب میں نظیر اکبرآبادی کو چھوڑ کر پریم چند ہی کی ایک ایسی مثال ملتی ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات میں نہ صرف عوامی رجحانات کو پیشِ نظر رکھا بلکہ زبان بھی وہی استعمال کی جو ان کے کردار بولتے تھے اور یہی وہ وجہ ہے جو ان کی یاد کو ہمیشہ جوان رکھے گی۔

اور اب جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو رہی ہے کہ جن لوگوں نے گاندھی ازم کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا ان کے سامنے آزادی کا کیا تصور تھا اور اب یہ بات لوگوں کے سمجھ میں آ چکی ہے اس لئے ۱۹۳۶ء میں "گودان" کی اشاعت سے پہلے ہی اس بات کو تاڑ لیا اور اس سے اپنا رشتہ توڑ کر ادب کی تخلیق کرتا

پریم چند کے باشعور ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے لوگ پریم چند پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ باشعور ادیب تھے، وہ نہ صرف پریم چند کے متعلق زیادتی سے کام ہیں بلکہ اپنے شعور کو بھی اندھیرے میں رکھنے کی کوشش [illegible] ہیں۔ اگرچہ پریم چند نے اپنی تخلیقات میں ایک نئے [illegible] کو جنم دیا تھا اور جس تعلیم کو انہوں نے اپنایا تھا اس [illegible] کو خود انہوں نے ہی ختم کر دیا۔ پریم چند کے بعد بہت افسانہ نگار اور ناول نویس سامنے آئے لیکن کوئی [illegible] بلند مرتبہ کو حاصل نہیں کر سکا جہاں پریم چند پہنچ چکے تھے

(صفحہ ۲۷ کا بقیہ) صبح نو بجے جب چپراسی آیا اور اسے پتہ [illegible] نورن اور میراں بھی ڈرامہ دیکھ رہی تھیں تو وہ ایک بار [illegible] انداز سے ہنس پڑا جیسے اس دن صاحب کی میم کا ذکر کرتے [illegible] ہنسا تھا۔

"مجھے بھی پہچانا تھا تم نے؟"

"ہم نے تو تمہیں دیکھا تک نہیں"

"میں تو ڈرامہ کھیل رہا تھا"

"کیا بنے تھے تم؟"

"تھانہ دار"

"ارے تم بنے تھے تھانہ دار، میں کہتی ہوں اس وقت منہ پر ایک داغ بھی تو نہیں تھا — وہی وردی کیوں نہ پہنی اور تم بھی تو ہمیں بہت غور سے دیکھ رہے تھے، تمہارے [illegible] ہی تو ہم بیٹھے تھے تیسری قطار میں!"

"نہیں نہیں، میں اپنی میم صاحب کو دیکھ رہا تھا، اس رات میں وہ مجھے صاحب سے بھی اچھا سمجھ رہی تھیں، ویسے تو ہم سے وہ مجھے........" چپراسی کہتے کہتے رک [illegible] اور دیوار کے ادھر میراں شرما گئی ادھر نورن کو پسینہ آ [illegible]

چل پڑوسن میلہ دیکھیں

کوثر چاند پوری

نورن اور میراں ایک ہی مکان میں رہتی تھیں جس کو ایک دیوار نے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا اس دیوار میں ایک جگہ اتنا بڑا موکھلا تھا کہ وہ آمنے سامنے کھڑے ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھ کر باتیں کر لیا کرتی تھیں، سوراخ میں ٹین کا چھوٹا سا ڈبہ رکھا رہتا تھا جس کے اندر تین چار سنگریزے ڈال دئے گئے تھے ضرورت کے وقت پتھر پہ کھڑے ہو کر ڈبہ ذرا ہلا دیا جاتا یا نورن کی طرف سے ڈبہ بجایا جاتا تو میراں سارا کام دھندا چھوڑ کر اپنی طرف کے پتھر پہ آ کھڑی ہوتی اور میراں کی طرف سے بجایا جاتا تو نورن اس کی آواز سنتے ہی دوڑ پڑتی اور جب وہ دیوار کے اِدھر اُدھر کھڑی ہوتیں تو ایک دوسرے کے ہونٹ ہلتے ہوئے دیکھتیں۔ منہ، ناک اور چہرے کا درمیانی حصہ بھی صاف نظر آتا۔ دونوں میں سے کوئی ایک پوچھتی۔

"کیا کہہ رہی ہو بہن؟"

"کہتی کیا ہوں ذرا باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے طبیعت اُلجھنے لگتی ہے۔"

"بس یہی میرا حال ہے، میں بھی گھڑی دو گھڑی میں ڈبہ بجانے ہی والی تھی۔"

"کیا کر رہی تھیں؟"

"سر دھونے جا رہی تھی اور تم؟"

"میں تو یوں ہی پلنگ پر پڑی تھی۔"

مکان ایک ہی آدمی کا تھا اس نے زیادہ کرایہ وصول کرنے کے لالچ میں صحن میں دیوار کھڑی کر دی تھی، نورن پہلے آ کر بس گئی تھی وہ پندرہ روپے مہینہ کرایہ دے رہی تھی میراں سال بھر بعد آئی تھی اس وقت کرائے بڑھ چکے تھے، اس نے آدھا حصہ بیس روپے پر لیا تھا۔ نورن کا شوہر عزیز محمد خاں ایک کارخانہ میں مستری تھا اور میراں کا میاں دفتر میں چپراسی تھا وہ سویرے ہی سر پہ کھدر کی ٹوپی لگا کر صاحب کے بنگلہ پہ چلا جاتا اور دس بجے تک وہاں کام کرتا رہتا، بازار سے سبزی لاتا، چکی پر آٹا پسوانے جاتا۔ صاحب نے کبھی اسے نہ بتایا تھا کہ چپراسیوں سے ذاتی کام لینے کی سخت ممانعت ہے، مگر میراں کے شوہر دھنا لال چپراسی کو ہیڈ کلرک نے بتا دیا تھا کہ صاحب اس سے گھر پہ کوئی ڈیوٹی نہیں لے سکتے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ ضابطہ کی ممانعت کوئی چیز نہیں، شہر میں کتنی ہی جگہ پیشاب کرنے کی ممانعت کے بورڈ لگے ہوئے ہیں مگر خود اس نے کبھی ان کی پرواہ نہیں کی ہمیشہ وہیں پیشاب کیا ہے جہاں بورڈ لگا دیکھا ہے، پھر صاحب بھی تو اسی جیسے آدمی ہیں وہ کیوں ان احکام کی طرف توجہ کرنے لگے۔

دھنا روز ہی صبح شام صاحب کے بنگلے پر مصروف رہتا دس بیس منٹ کے لئے میم صاحب کے پاس رسوئی گھر میں بھی جا بیٹھتا، کبھی پیاز چھیل کر انہیں دے دیتا، اور کبھی بینگن کاٹ دیتا۔ میم صاحب اس سے بہت خوش تھیں اور اکثر ذرا سی چھالیہ اور سونف دے دیا کرتی تھیں، دھنا بازار کا مسالہ دار پان کھانے کا بہت شوقین تھا مگر یہ چھالیہ اور سونف چبا کر بھی اس کا دل خوش ہو جایا کرتا تھا۔

دس بجتے ہی وہ فائلوں کا بستہ اور آفس بکس لیکر صاحب کی موٹر میں ڈرائیور کے برابر بیٹھ جاتا اور آفس پہنچ جاتا، دن چھپتے چھپتے اپنے گھر واپس آتا اور دفتر کی ساری باتیں میراں کو اتنی اونچی آواز سے سناتا کہ نورن بھی پلنگ پر لیٹی سنتی رہتی اور [illegible] بڑی توجہ کے ساتھ

دھنا کی باتیں سنتا۔

صاحب نے فائن کر دیا بڑے بابو پر! وہ یونین کا ممبر بن گیا تھا۔

ایک نیا بابو نوکر ہو کر آیا ہے بیڑی اور چائے بہت پیتا ہے کام کم کرتا ہے میگزین پڑھتا ہے، کسی دن صاحب سے بولنا پڑے گا۔

دفتر کی باتیں وہ اکثر کرتا، گھر کی کوئی بات اب تک نہیں کی سونف اور چھالیہ کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ ایک دن وہ آیا تو کاغذات کا بڑا سا پلندہ پلنگ پر ڈال کر خوب قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔

"کیوں ہنس رہے ہو ایسی بات؟"

"ایسی بات نہیں باولی، بہت بڑی بات پر ہنس رہا ہوں تو بھی سنے گی تو لوٹ جائے گی مارے ہنسی کے۔"

"کہو نا آخر کیا ہوا؟"

"کیا کہوں بڑے مزے کی خبر ہے۔"

"کیا خبر ہے؟"

"ارے وہ صاحب کی شریمتی ہیں نا جنہیں ہم میم صاحب کہتے ہیں، دیکھا ہے تو نے اسے؟"

"دیکھا کیوں نہیں، کئی دفعہ دیکھا ہے۔"

"کیا عمر ہوگی بھلا۔۔؟"

"ہوگی تیس تیئیس برس کی۔"

"ہاں اتنی ہی ہوگی، وہ کسی سے پریم کر رہی ہے۔"

"پریم کر رہی ہے! کس سے۔۔؟"

"اس کا مجھے کیا پتہ، آج صاحب کو بھی معلوم ہوگیا، خوب لڑائی ہوئی، میم صاحب بولیں زیادہ باتیں کہیں تو کپڑوں پر تیل چھڑک کر آگ لگا لوں گی، یہ سنتے ہی وہ چپ ہوگئے کرتے بھی کیا عورت ذات سے منہ ملانا ٹھیک نہیں، کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے تو آبرو پر بٹہ لگ جائے جو بھید اب تک کسی کو معلوم نہیں ہے اس کی سب کو خبر ہو جائے۔

دفتر میں ان کی اتنی عزت ہے کہ بابو لوگ انہیں آتا دیکھ کر کرسیاں چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں، ذرا گھنٹی بجا دیتے ہیں تو سب چوکنا ہو جاتے ہیں بس میں ہی ایک آدمی ہوں کہ ان کے رعب میں نہیں آتا۔ وہ بگڑ جائیں تو جرمانہ بھی کر سکتے ہیں اور نوکری سے الگ بھی کرا سکتے ہیں، بول کیسی خبر سنائی۔"

"بہت اچھی۔۔۔! اور یہ سونف کیوں چبا رہے ہو، یہاں تک باس آ رہی ہے۔"

"ارے ایک مدراسی بابو سونف اور چھالیہ بہت کھاتا ہے اسی نے ذرا سی مجھے دے دی تھی۔"

آٹھ بج چکے تھے مستری ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا ادھر اُدھر کی مشینیں ٹھیک کرنے میں اکثر اسی طرح دیر ہو جایا کرتی تھی اور دیر میں آنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ دو چار روپے جیب میں ڈال کر لائے گا، نورن اکیلی بیٹھی دھنا کی باتیں سن رہی تھی، اسے بڑا لطف آیا، ایسا لگا جیسے اس کے سامنے کوئی نئی شاہراہ کھل گئی ہو جو دور تک ان دیکھی منزلوں اور وادیوں تک پھیلتی چلی گئی ہو۔

ان وادیوں کی بہت سی کہانیاں اس نے سنی تھیں، وہ سب عشق و محبت پر مشتمل تھیں، اس کے نزدیک یہ چیزیں صرف کہانیوں تک محدود تھیں، مگر دھنا کے صاحب کی بیوی کوئی کہانیوں کی عورت نہ تھی وہ تو اسی کی طرح ایک دیوی تھی، یہ بات الگ تھی کہ سرخی اور پاؤڈر لگاتی تھی، کچھ اسی طرح کی باتیں میراں بھی سوچ رہی تھی وہ بار بار اپنے گھر والے کی صورت دیکھ رہی تھی جیسے اس کے چہرے پر ان چیزوں کو ڈھونڈ رہی ہو جن کے اندر سے پریم کی جوالا کھول اٹھتی ہے۔۔۔

میراں کبھی دھنا کی آنکھوں کو دیکھتی کبھی ہونٹوں کو اور کبھی اس کے چیچک کے داغوں سے بھرے چہرے کو، ان میں اسے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی، اس کے بیاہ کو پانچ برس ہو گئے تھے اب تک دل میں یہ پریم اور محبت کی بات نہ آئی تھی اس وقت پہلی مرتبہ اس کی چھاتی دھڑکی اور جی چاہا وہ بھی کسی سے محبت کرتی، کسی ایسے مرد سے جو اس کا شوہر نہ ہوتا، اس طرح اس کے اندر بھی وہ ہمت آ جاتی کہ آگ کی لپٹوں سے ڈر نہ لگتا اور شعلوں سے کھیلنے کی جرأت پیدا ہو جاتی اور جب اگلے دن نورن ڈبہ بجا کر میراں کو بلایا تو میراں نے پلکیں جھپکاتے ہوئے سب سے

پہلے یہی کہا ۔

"نورن سُنا تم نے، صاحب کی میم ایک اور آدمی سے پریم کر رہی ہے ۔"

"ہاں میں جیجا جی کی باتیں سن رہی تھی ۔!" اس نے میراں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا اور دونوں کو محسوس ہوا جیسے بہت دُور کہیں ڈبّہ بج رہا ہو اور کوئی نورن اور میراں کو ساتھ ساتھ بلا رہا ہو ۔

وہ دونوں آمنے سامنے کھڑی ایک دوسرے کے دل میں جھانک رہی تھیں جن میں بالکل انوکھے جذبات مچل رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خاموش جھیل میں کسی نے پتھر پھینک دیا ہے اور اس میں لہروں کے دھارے بنتے جا رہے ہیں، ہزاروں لاکھوں گول چکر بن گئے ہیں اور آہستہ آہستہ پوری جھیل میں پھیلتے جا رہے ہیں۔

اس دن زیادہ باتیں نہیں ہوئیں نہ جانے کیوں ان کی زبانیں بوجھل ہوگئیں، وہ اپنا راز فاش کرنا نہیں چاہتی تھیں اور لہروں کے ان چکروں کو دل ہی دل میں چھپا لینا چاہتی تھیں، حالاں کہ وہ آنکھوں تک آ گئے تھے ۔

انہیں دنوں بہت بڑی نمائش لگی، دُور دُور سے دوکانیں آئیں، دن بھر سڑکوں پہ اعلان ہوتا رہا، نورن کہیں گئی ہوئی تھی میراں نے کئی مرتبہ پتھر پہ کھڑے ہو کر ڈبّہ بجایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ چار بجے کے قریب کواڑ کھلنے کی آہٹ کان میں آئی اور فوراً میراں نے روشن دان کے پاس آکر زور سے ڈبّہ ہلا دیا، ایک ہی پل میں نورن سامنے آ کھڑی ہوئی ۔

اس کی آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا، ہونٹ ہلکے سُرخ تھے۔ گالوں پہ تمتماہٹ تھی۔ اس وقت سچ مچ وہ کہانیوں کی عورت بن گئی تھی ۔

"کہاں چلی گئی تھیں ؟"

"کہیں دور نہیں گئی تھی، محلہ میں ہی ایک جگہ جا بیٹھی تھی ۔"

"چلو میلہ دیکھ آئیں ۔"

"جی تو یہی چاہتا ہے، مستری بھی ذرا دیر ہی سے آئیں گے ۔"

"پھر جلدی سے کپڑے نئے پہن لو ۔"

"تم پہن لو میں نے دو پہر ہی کو بدل لئے تھے ۔"

"کیوں ــــ کہیں جانا تھا ؟"

"جانا وانا کہیں بھی نہیں تھا یوں ہی دل چاہا تھا کہ آج تو کوئی عمدہ سا جوڑا پہن لوں ــ اور ...."

"صاحب کی میم بن جاؤں ۔"

"وہ تو تم ہی ہوگی، میرا کیا حق ہے ؟"

دونوں تیار ہو کر گھر سے نکل آئیں، میراں نے نئی ساری پہنی تھی جو گہرے ہرے رنگ کی تھی ماتھے پہ ٹیکہ بھی لگا لیا تھا وہ بہت حسین معلوم ہو رہی تھی مگر نورن نے اسے زیادہ غور سے نہیں دیکھا وہ اپنے ہی وجود میں اتنی محو تھی کہ میراں کو دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی، اس کا لباس بہت زیادہ شوخ تھا ۔

وہ برابر برابر سڑک پہ چل رہی تھیں جو شخص بھی قریب سے گزرتا نورن سمجھتی وہ اسے خاص نگاہوں سے دیکھ رہا ہے حالاں کہ اس کی نگاہیں میراں پہ بھی ہوتیں، چلتے چلتے میراں بولی:

"نورن میں کیسی لگ رہی ہوں ؟"

"بہت اچھی، اور میں ؟"

"تم بھی ایسی بُری نہیں لگ رہی ہو، بس دوپٹہ ذرا بھڑکیلا ہے ۔"

نورن جھنجل گئی، پہلی مرتبہ اس کے دل پر میراں کی بات سے چوٹ لگی اسے یقین تھا کہ وہ میراں سے زیادہ خوبصورت ہے اس کی آنکھیں بہت بڑی ہیں، ہونٹ پتلے نہیں تو بہت موٹے بھی نہیں، اور مستری تو اس کی ہر چیز کو پسند کرتا ہے حالاں کہ وہ سینما بھی دیکھتا ہے اور بڑے گھروں میں بھی مشینیں ٹھیک کرنے جاتا ہے، روز ہی نت نئی صورتیں اس کی نگاہوں سے گزرتی ہیں مگر اس نے اب تک اس کی برائی نہیں کی، الٹی تعریف ہی کی ہے ۔

"یہ تم نے کیا کہہ دیا اس وقت، تم بھی ایسی بُری نہیں لگ رہی ہو ۔ میراں تم سچ نہیں بول رہی ہو، میں بہت اچھی لگ رہی ہوں ۔"

"ہاں مجھ سے بھول ہوگئی۔ چھیا کرو مگر دیکھنا یہ ہے کہ میں بھی نہیں کون پسند کرتا ہے ؟"

"نہ کرے گا تو کیا کہنے آئے گا ہم سے ۔"

"نگاہوں سے سب کچھ معلوم ہو جاتا ہے"

وہ ٹکٹ لینے کے بعد گیٹ سے اندر داخل ہوئیں تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، چپہ چپہ بجلی کی روشنی سے جگمگا رہا تھا ہر طرف دن سا نکلا ہوا تھا جگہ جگہ ریکارڈ بج رہے تھے ریڈیو کھلے ہوئے تھے فضا میں فلمی گیتوں کے میٹھے بول گھلتے جا رہے تھے، دکانیں خوب سجی ہوئی تھیں۔

ذرا دیر وہ یوں ہی ادھر اُدھر گھومتی رہیں اس درمیان میں جو بھی عورت نظر آئی وہ اسے دیکھ کر شرما سی گئیں، نمائش میں پہنچنے کے بعد نہ تو وہ حسین رہی تھیں نہ ان کے کپڑوں میں کوئی کشش باقی رہی تھی بلکہ ان کا لباس بہت ہی گھٹیا لگ رہا تھا اور مردوں کے تیور دیکھ کر تو بہت ہی مایوسی ہوئی تھی ایک آدمی نے بھی نگاہ بھر کر انہیں نہ دیکھا تھا اور اب تو وہ خود بھی اپنے آپ کو ان کی نگاہوں کے قابل نہ سمجھ رہی تھیں میلہ میں ایک سے ایک حسین و جمیل عورت موجود تھی اور اس کا یہی پہلوان کو سب سے زیادہ ناپسند تھا، وہ ان میں سے کس کس کا مقابلہ کرتیں۔

جلد ہی انہوں نے اپنا خیال بدل لیا اور اب وہ خود ہی مردوں کو پسند کرنے لگیں، اِدھر اُدھر آتے جاتے آدمیوں کو دیکھتیں، انھیں دھنا اور مستری سے ملاتیں اور آگے بڑھ جاتیں جس طرح نمائش کی ہر عورت ان سے زیادہ خوب صورت تھی اسی طرح ہر مرد مستری اور دھنا سے لاکھ درجہ بہتر تھا بلکہ صحیح معنی میں ان کے آگے وہ آدمی ہی نہ تھے صرف مستری اور چپراسی تھے، جن کو حسن و جمال سے کوئی نسبت ہی نہیں ہوا کرتی، گھومتے گھومتے انہوں نے دوکانوں کا رُخ کیا بعض چیزوں کی قیمت پوچھی، یوں ہی انگلی سے اشارہ کرکے پوچھ لیا۔

"وہ صابون کتنے کا ہے؟"

"اس بنیائن کی کیا قیمت ہے؟"

سب کچھ معلوم کرکے وہ اس انداز سے آگے بڑھ جاتیں جیسے کوئی چیز پسند نہ آئی ہو، دُوسری عورتیں بے تحاشہ خریداری کر رہی تھیں، ایک دوکان سے وہ اسی طرح چلنے لگیں تو دوکاندار نے ہنس کر سوال کیا۔

"کوئی چیز پسند آئی؟"

"نہیں" نورن بولی

"کوئی بھی نہیں؟"

"بالکل نہیں"

"مجھے بھی دیکھ لیا؟" اس نے شرارت سے پوچھا

میراں نے سرسری نگاہ سے دوکاندار کو سر سے پاؤں دیکھا اور یہ کہہ کر آگے کو چل دی۔

"ہاں خوب دیکھ لیا۔ کوئی بات ڈھنگ کی نہیں۔

دوکاندار جھینپ گیا اور نورن کو میراں کی اس بات پر ہنسی آگئی۔

"تم نے تو غضب ہی کر دیا میراں!"

"اور آئے کیوں ہیں یہاں، خریداری کے لئے تو میں ایک پیسہ بھی نہیں"۔

"کیا اسی لئے آئی ہو؟"

"اور کس لئے آئے ہیں ـــــ ہمیں کوئی نہیں دیکھے کیا ہم بھی کسی کو نہ دیکھیں، ہمیں تو اتنے بہت سے آدمیوں کسی کو پسند کرنے کا حق ہونا چاہئے"۔

"ضرور ہونا چاہئے"

"اسی حق سے میں نے اس دوکاندار کو ناپسند کر دیا۔

نورن پھر ہنس پڑی۔ صرف میراں ہی کے اندر اتنی دلیری نہیں آگئی تھی خود وہ بھی کافی بیباک ہو گئی تھی۔

ذرا دیر بعد پتہ چلا کہ نمائش میں تھیٹر، سینما اور ڈرامہ کا انتظام بھی ہے۔ ڈرامہ مختلف دفتروں کے کلرکوں کی طرف سے ہو رہا تھا، اس کا ٹکٹ سب سے کم پیسوں کا تھا، اور میراں نے ڈرامہ دیکھنے ہی کا منصوبہ بنا لیا اور دو دو کے ٹکٹ لے کر جیب میں ڈال لئے۔ ابھی ڈرامہ شروع ہونے میں تھوڑی دیر تھی، وہ موت کا کنواں دیکھنے چلی گئیں ان کے پاس پیسے اتنے نہیں بچے تھے کہ ٹکٹ لے کر اندر جائیں باہر کھڑی دیکھتی رہیں، یہاں بڑی بھیڑ تھی۔ ایک شخص موٹر پر بیٹھ کر کنوئیں میں اُترنے والا تھا۔ تماشہ بہت دلچسپ مگر وہ اسے دیکھ نہیں سکتی تھیں، وہیں کھڑی اندر جانے و

یتی رہیں اور یہ آرزو ان کے دل میں مچلتی رہی کہ وہ بھی انہیں دیکھیں
ب نہیں ان میں سے کوئی تو دیکھے، مگر دیکھتا کون! ان سب ہی کے
ساتھ ان کی بیویاں تھیں، بعض کے ساتھ بیویاں نہ ہوں گی محبوبائیں
گی، ورنہ بہنیں ہی سہی۔ بہت دیر کے بعد ایک بیٹھیر سے نوجوان نے
د قلی یا ٹھیلا چلانے والا مزدور معلوم ہو رہا تھا نورن کی طرف دیکھا
ور ذرا گنگنایا بھی۔ نورن کو ڈر معلوم ہونے لگا اس کے سر پر
لمبے لمبے بال کھڑے تھے کپڑے بالکل میلے اور چکٹ تھے۔ گالوں پر
یک ایک انگل لمبے بال اُگے ہوئے تھے۔

"اس سے تو مستری لاکھ درجہ اچھا ہے"

اور میراں بیچاری اس کی نگاہوں کو ترستی رہ گئی اس بیوقوف
نے ادھر نظر بھی نہ اٹھائی، یقیناً دھنلے وہ اچھا نہ تھا پھر بھی محبت
سے اس کی طرف دیکھتا تو اسے بڑی خوشی ہوتی کہ اتنی بڑی نمائش
ن اسے ایک نوجوان نے تو دیکھا، پھر ایک اور آدمی نے نورن کو
یکھا مگر اس کی نگاہوں میں چمک نہ تھی نہ کنپٹیوں کی رگوں میں
ڑپ تھی اور نہ چہرے پر تمتماہٹ تھی، ایسی ٹھنڈی نگاہیں
سے تو پچاس سال کے کتنی بوڑھے اور ادھیڑ نہ جانے کتنی بار اسے
یکھ چکے تھے وہ سمجھ گئی اسے کوئی مغالطہ ہوا ہے اور یہ خیال
الکل ٹھیک تھا کیوں کہ جلد ہی وہ ایک اور عورت کی طرف متوجہ
ہو گیا۔ جس کا دوپٹہ بالکل اسی کا تھا غالباً وہ اسی کو ڈھونڈ رہا تھا
ورن کو مایوسی ضرور ہوئی مگر یہ سوچ کر سکون بھی ہو گیا کم سے کم
ہ شکل و صورت کے اعتبار سے ایسی تو ہے کہ لوگ دھوکہ کھا سکیں
یکن جلد ہی اس کا یہ سکون بھی برباد ہو گیا اس نے عورت سے کچھ
س طرح بات چیت کی جیسے وہ اس کی نوکرانی ہو۔

"اری یہ میلا کوئی تھیلا بھی لے آئی ہے تو؟"

"ہاں بابو جی لے آئی ہوں"

ضرور، وہ اس کی نوکرانی ہی تھی! اس مغالطے سے تو اس کی
زت ہی خاک میں مل گئی تھی۔

اب ڈرامہ کا وقت ہو گیا تھا انھوں نے ادھر کا رخ کیا،
روازے پر ٹکٹ دیکھنے کے بعد انہیں اندر دیا جانے دیا گیا اور
ہ قریب قریب پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئیں، دو منٹ کے
ندر ہی ڈرامہ شروع ہو گیا، بڑا دلچسپ تھا وہ بالکل محو ہو گئیں،

ایک شخص سب انسپکٹر بن کر اسٹیج پر آیا اچھا خاصہ خوب صورت
معلوم ہو رہا تھا، بڑی بڑی کالی مونچھیں، لمبا قد، بھرا ہوا چہرہ
آنکھوں میں بلا کا تیکھا پن، اس نے کئی بار نورن اور میراں کی طرف
دیکھا، وہ انھیں دیکھ کر کچھ مسکرایا بھی، دونوں کے دلوں کی
دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ نورن نے میراں کو متوجہ کر کے کہا۔

"میراں کتنا اچھا ہے، تجھے کیسا لگ رہا ہے؟"

"نورن سچ کہتی ہوں میری اور تیری پسند بالکل ایک ہے
میں اسی کو دیکھ رہی ہوں"

"وہ بھی تو ہمیں دیکھ رہا ہے؟"

"سچ ـــــ، کوئی اور تو نہیں بیٹھی ہے ہمارے پاس؟"

"اور کون ہے دونوں طرف دور تک بڑھیوں کی لائن لگی
ہوئی ہے"

"اصلی روپ تو یہ نہ ہوگا اس کا!"

"پھر بھی یہ برا نہیں ہو سکتا، مونچھیں نقلی بھی ہوں گی تو
کوئی فرق نہیں پڑتا"

جب وہ اسٹیج سے چلا جاتا تو دونوں کو ایک خلا سا معلوم
ہوتا، ڈرامہ کی ساری دلچسپی اور رنگینی کہیں غائب ہو جاتی اور
جس وقت پھر وہ بیت ہلاتا ہوا آجاتا تو چہروں پر رونق آجاتی
بالکل ایسا لگتا جیسے چاند بدلی کی اوٹ سے نکل آیا ہو، اس نے
ڈرامہ میں کام بھی زیادہ کیا تھا۔ ڈرامہ کچھ جاسوسی قسم کا تھا جسے
بار بار آنا ہی پڑتا تھا۔

نورن اور میراں دو بجے کے قریب گھر واپس آئیں وہ بہت
خوش تھیں انہیں اپنی خوب صورتی اور جوانی کی پوری قیمت وصول
ہو گئی تھی اور دل میں فخر نہیں غرور کے جذبات مچلنے لگے تھے،
مستری اور چپراسی ان کے نزدیک زیادہ قد آور نہیں رہے تھے
وہ بہت چھوٹے چھوٹے بونوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے،
خود ان کا اپنا قد بہت لمبا اور اونچا ہو گیا تھا، جب یہ گھر پہنچیں
مستری آچکا تھا اس نے بتایا کہ چپراسی نے زبانی کہدیا تھا کہ میں
رات کو گھر نہیں آؤں گا، نمائش میں میری ڈیوٹی لگا دی
گئی ہے، تم لوگوں میں سے کوئی آئے گا تو نمائش مفت
دکھا دوں گا۔ اس اطلاع کا ایک حصہ اب بیکار ہو چکا تھا،

(بقیہ ص ۲۴ پر)

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری

نظریات اور عمل کا تضاد یا سماجی ڈپلومیسی

بنی عباسی چریا کوٹی
ایم اے۔ ایل ایل بی
دہرہ دون

اکبر الٰہ آبادی کو اردو زبان میں طنزیات اور مزاح لطیف کا صاحب طرز فن کار تسلیم کیا جاتا ہے اور متفقہ طور پر ان کے مزاح کے انداز میں جو انفرادیت تسلیم کی گئی ہے وہ اردو زبان میں نقشِ اوّل اور حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے اس میں شک نہیں کہ اکبر الٰہ آبادی نے طنزیات اور مزاح لطیف کو اپنے فن سے جو درجہ بخشا ہے وہ قیامت تک ایک الگ طرز اور شاعری کی ایک علیحدہ صنف کی حیثیت سے زندۂ جاوید رہے گا۔ لیکن اکبر الٰہ آبادی کو جو دوسری حیثیتیں عام طور پر بخشی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ وہ ایک مصلح تھے یا یہ کہ وہ ایک ایسے محبِ وطن تھے جو ملک کی قدیم تہذیب قدیم روایات اور پرانی قدروں کے دلدادہ تھے یا یہ کہ وہ ہندوستانی سماج کو مغربیت کی ہر آمیزش یا تقلید سے پاک دیکھنا چاہتے تھے یا یہ کہ وہ انگریزوں کے بدترین دشمن تھے وغیرہ وغیرہ۔ اگر حقائق اور واقعات کی روشنی میں ان دعوؤں کا تجزیہ کیا جائے تو نہ صرف یہ کہ یہ دعوے غلط ثابت ہو جائیں گے بلکہ نتیجہ ان دعوؤں کے بالکل برعکس برآمد ہوگا۔

اکبر الٰہ آبادی اپنی شاعری کے آئینے میں انگریزی تعلیم کے سخت مخالف ضرور دکھائی دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ ان کے بیٹے سید عشرت حسین نے لندن سے آئی سی ایس پاس کیا اور ساتھ ہی ایک انگلش لیڈی سے شادی کر کے ہندوستان واپس تشریف لائے۔ ایک طرف تو اکبر سر سید احمد خاں کی جدید اور انگریزی تعلیم کی تحریک کے سخت مخالف تھے اور علی گڑھ تحریک پر انہوں نے سخت نکتہ چینی کی تھی۔ مگر دوسری طرف ہندوستان کے وہ مسلم گھرانے جنہوں نے سب سے پہلے انگریزی تعلیم اور جدید تہذیب کو بڑی تیزی سے اپنایا، ان میں سب سے پہلا گھرانہ خود اکبر الٰہ آبادی کا تھا۔ پردے کو جن مسلم گھرانوں میں خواتین نے سب سے پہلے خیرباد کہا وہ خود اکبر کا تھا۔ ان کی بہو ایک انگریز خاتون تھیں۔ اسی طرح انگریزوں کی ملازمت کرنے کو اکبر نے اپنے کلام اور اپنی تخلیقات کے ذریعے سب سے زیادہ نشانۂ ملامت بنایا جب کہ وہ خود انگریزی سرکار کے ملازم تھے اور ججی کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائر ہو کر عمر بھر پنشن بھی انہیں نے لی۔ اکبر کے گھرانے کے کسی فرد نے اپنی اعلیٰ تعلیم کسی مدرسہ دینیہ یا مدرسہ عربیہ میں حاصل نہیں کی بلکہ بڑے فخر کے ساتھ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نئے دور کی جدید تہذیب کی دوڑ میں ان کا گھرانہ پیش پیش رہا، ہندوستان کی قومی تحریکوں میں اکبر الٰہ آبادی یا ان کے گھر والوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ قوم کے ان دانش وروں کو جو انگریزی اور جدید علوم کی دولت سے مالا مال تھے اکبر نے سچا اور صحیح رہبر تسلیم نہیں کیا کہ ہندوستان میں صحیح قومی جذبہ پیدا کرنے والے ہمارے دانش ور اور رہبر جو بھی آگے بڑھے وہ سب جدید تعلیم اور انگریزی دور کی نئی تہذیب کے علم بردار اور مفکرین تھے اور ان میں سے کوئی بھی عربی مدرسے

کا یا سنسکرت پاٹھ شالہ کا پڑھا ہوا نہ تھا۔ ان نئے رہبروں نے ہندوستان کی جنگِ آزادی میں شریک ہو کر تن من دھن کی بازی لگادی اور بڑی بڑی قربانیاں دیں اور آخر کار انہیں لوگوں کے ہاتھوں ہندوستان آزادی کی منزل سے ہم کنار ہوا۔

جہاں تک انگریزی داں طبقے کے سچے محبِ وطن ہونے کا سوال ہے ساری دنیا نے یہ دیکھ لیا اور تاریخ میں سنہری حروف سے یہ لکھ دیا گیا کہ ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا محبِ وطن اور سچا دیش بھگت نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر سی آر داس۔ راجہ رام موہن رائے۔ مہاتما گاندھی۔ تلک۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ موتی لال نہرو۔ جواہر لال نہرو۔ آصف علی۔ سر سید احمد خاں۔ بھگت سنگھ۔ چندر شیکھر آزاد۔ علامہ کیفی چریا کوٹی۔ سبھاش چندر بوس۔ علامہ اقبال۔ رفیع احمد قدوائی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ فخر الدین علی احمد۔ شیخ عبد اللہ۔ سر شیخ بہادر سپرو۔ کیلاش ناتھ کاٹجو۔ حکیم اجمل خاں۔ مدن موہن مالویہ۔ ڈاکٹر امبیڈکر۔ سنکرو دیارتھی۔ سردار پٹیل۔ پرشوتم داس ٹنڈن۔ سرت چندر بوس۔ سر رادھا کرشنن۔ بھولا بھائی ڈیسائی۔ راج گوپال اچاریہ۔ اچاریہ کرپلانی۔ کرشنا مینن۔ آسو توش مکرجی۔ ایم این رائے۔ سوامی ویویکا نند اور سوامی شاردا نند وغیرہ اور اس طرح کے ہزاروں دانش ورانِ قوم و ملک کا نام اس سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا ہمارے ملک اور قوم کے زعماء، دانش وران اور رہبرانِ قوم ہمارے ملک کے وہ آفتاب اور ماہتاب بن کے چمکے جو قیامت تک تمام دنیا کو روشنی بخشتے رہیں گے اور یہ سب انگریزی دور کی دین ہیں اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی مدرسۂ عربیہ یا سنسکرت پاٹھ شالہ کا فارغ التحصیل نہ تھا۔ انگریزی دور اور جدید تعلیم نے ہمارے ملک کو وہ لاثانی اور ترقی پسند قیادت بخشی جس نے ہمارے ملک کو ابدی روشنی عطا کی۔ یہ حقیقت بھی تسلیم کی جانی چاہئے کہ ہندوستان کی ایکتا اکھنڈتا اور ہر ہندوستانی میں سچی قومیت کے جذبے کو انگریزی دور کے ہمارے دانش وروں نے جس طرح پروان چڑھایا وہ انگ اور جدید دور سے پہلے کبھی نہ ہو سکا تھا۔ ہندوستانی قو کا تصور بھی انگریزی دور کی دین ہے بلکہ انڈین نیشنل کا کا بانی بھی ایک انگریز ہی تھا۔

اگر غدارانِ وطن کی فہرست پر نگاہ ڈالی جائے جعفر اور صادق، جے چند اور میر قاسم کے نام نامی سر چمکتے ہوئے نظر آئیں گے جن میں سے کوئی بھی انگریز یا جدید تعلیم یافتہ نہ تھا۔ اکبر نے انگریزوں کی دعوتوں اور انگریز پرستی کی تقریبات اور جلسوں شرکت کرنے پر اس دور کے لوگوں کی بہت خبر لی۔ بلکہ اسے وطن دشمنی اور ضمیر فروشی سے تعبیر کیا ہے وہ خود انگریز افسروں کی جی حضوری کے بڑے دلدادہ۔ اور اسی وجہ سے جج کا اعلیٰ عہدہ ان کو نصیب بھی تھا۔ وہ انگریزوں کے جلسوں اور دعوتوں میں بھی بہت سے شرکت کرتے تھے مگر دوسروں کو اس سے منع فرما۔

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہمارے ملک کے کچھ دانہ اپنے بچوں کو انگلش اسکولوں میں یا بعض اوقات امریکا انگلینڈ بھیج کر تعلیم دلواتے ہیں اور دوسروں کو مندی میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کی تلقین فرما ہیں۔ اکبر الہ آبادی خود تو انگریزوں کی ملازمت تھے مگر دوسروں کے لئے اسے انتہائی شرمناک بتا تھے۔ خود اپنے گھر والوں کو انگریزی تعلیم میں ہندوستہ کے کروڑوں لوگوں سے آگے رکھتے تھے۔ مگر دوسروں۔ لئے یہ طریقہ پسند نہیں کرتے تھے۔ عربی زبان مذہبی تعد مذہب کی پابندی عورتوں میں پردہ اور مشرقی تہذیب قدروں کا راگ الاپتے تھے مگر خود اپنے گھر ان کا ہوتے ہوئے دیکھنا پسند کرتے تھے۔

ایک بار انگریز افسروں کے کسی بڑے اجتماع میں اکہ الہ آبادی شرکت کرنے گئے۔ مگر ان کے حلئے اور وضع قد دیکھ کر منتظمین نے انہیں اندر جانے سے روک دیا لیکن انہوں نے یہ بتایا کہ وہ سید عشرت حسین آئی سی ایس

والا ہیں تو ان کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ اس واقعہ پر اکبر نے اسی وقت یہ لطیفہ سُنا ڈالا کہ ایک بار اللہ میاں دنیا میں آئے اور کسی گرجا میں جانا چاہتے تھے مگر لوگوں نے جانے نہیں دیا مگر جب اللہ میاں نے بتایا کہ وہ یسوع مسیح کے باپ ہیں، تو ان کو گرجا میں جانے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح اگر حقائق کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اکبر الہ آبادی کی پوری شاعری ان کی عملی زندگی اور ان کی روشن خیالی اور ان کی ذاتی اور نجی پالیسیوں سے کسی طرح ہم آہنگ نہیں ہے اور ان کے افکار و افعال میں اس تضاد کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس دور میں چوں کہ ہندوستانی عوام انگریزوں کے اور انگریزوں کی ہر چیز کے شدید مخالف تھے اور ملک کا کٹر مذہبی اور قدامت پرست طبقہ جس کی اکثریت تھی، اس مخالفت میں آگے آگے تھا اور اکبر الہ آبادی ایسے ماحول میں اتنی اخلاقی جرأت سے کام نہ لے سکے ہوں گے کہ وہ اپنے دل کی اصل بات ان کے سامنے رکھتے اور پھر سستی شہرت اور واہ واہ ان کو اسی صورت میں اپنے ہم وطنوں سے مل سکتی تھی جب وہ قدامت پرست عناصر کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے جو اس دور کی ہندوستانی سوسائٹی اور سماج پر چھائے ہوئے تھے اور یہ ایک طرح پر اکبر الہ آبادی کی سماجی ڈپلومیسی رہی ہوگی کہ "رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"، یہ بھی ممکن ہے کہ اکبر اپنے مزاح اور طنز میں سنجیدہ قطعی نہ رہے ہوں اور ان کا مقصد صرف لوگوں کو وقتی طور پر تفریح کا سامان مہیا کرتے ہوئے ہنسنے اور ہنسانے کا موقع فراہم کرنا ہی رہا ہو۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، مصلح اور محبِ وطن یا ترقی پسند یا رہبر بننے سے پہلے انسان کو اپنے نظریات اور عمل میں ہر قسم کے تضاد کو دور کرنا ہوگا اور اسے یہ کرنا ہوگا کہ وہ نجی و سماجی زندگی یا قومی زندگی میں جو کچھ کہے وہی کرے۔ گھر میں کچھ اور سماج میں کچھ اور سیاسی میدان میں کچھ اور بننے سے آدمی کچھ بھی نہیں بن سکتا اور صرف تماشہ بن کے رہ جاتا ہے۔ چکبست۔ دیا شنکر نسیم جاکی۔ میر انیس۔ اقبال۔ ٹیگور اور نذر الاسلام محبِ وطن مصلح جدیدیت پسند، انسانیت پرست اور ترقی پسند سب کچھ تسلیم کئے جا سکتے ہیں اس لئے کہ ان کی زندگیاں اُن کے کلام کی آئینہ دار تھیں اور ان کا کلام ان کی زندگیوں اور طرزِ فکر کی عکاسی ہے۔

اکبر الہ آبادی کی عملی زندگی سے ان کے افکار اور اُن کی تخلیقات کے تضاد نے انہیں صرف ایک طنز نگار اور مزاح نگار بنا کر رکھ دیا ہے اور اس کے علاوہ کچھ نہیں ——— انگریزی زبان کی طنز نگاری اور مزاحِ لطیف اس قدر وسیع میدان اپنے میں سموئے ہوئے ہیں کہ دُنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی مگر انگریزی زبان کے طنز نگار کے فکر عمل نظریات اور اس کی زندگی میں اتنی ہم آہنگی ہوتی ہے کہ اس کی پوری شاعری ایک پیغام بن جاتی ہے اگر اکبر کے افکار۔ نظریات عمل اور زندگی کے درمیان ایسی ہی ہم آہنگی ہوتی تو ان کی شاعری بھی ایک آفاقی پیغام بن جاتی۔

اکبر کو مسلمانوں کے عام طور پر نمازی نہ ہونے کی شکایت تھی جب کہ وہ خود بھی نماز کے بہت زیادہ پابند نہ تھے۔ انہوں نے اپنے کلام میں نئی ایجادات سائنسی ترقی اور جدید سامانِ آسائش پر بھی سخت نکتہ چینی کی ہے جب کہ وہ خود سرکاری بنگلوں میں رہتے تھے جہاں پر اس دور کے اعتبار سے سامانِ آسائش کا پورا پورا اہتمام ہوتا تھا۔ وہ نئی وضع قطع اور نئے اور جدید لباس کے بھی خلاف تھے اور قدیم لباس و تہذیب و تمدن کے بہت بڑے علم بردار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بیرونی تہذیب و لباس پر ہر حالت میں ہندوستانی لباس کو ترجیح دی جانی چاہیئے جب کہ وہ خود جو لباس پہنتے تھے یعنی لمبا اوور کوٹ اور ترکی ٹوپی۔ وہ کسی طرح بھی ہندوستانی نہیں کہے جا سکتے۔ قدامت پرستی اور رجعت پسندی ایسی بھی کیا جو انسانی تہذیب کو پتھروں کے دور میں پیچھے دھکیل دے اور اگر اکبر کے اصولِ قدامت پرستی اور رجعت پسندی کو ملک تسلیم کر لیتا تو آج ہندوستان جو دنیا کی پانچویں بڑی

طاقت بن گیا ہے اور ابھی دور میں داخل ہو گیا ہے ایسا نہ ہوتا [illegible] اگر کہیں پوری دنیا میں یہ اصول صحیح تسلیم کر لیا [illegible] آج چاند ستاروں اور آسمانوں کی سیر کرتا ہوا [illegible] دیتا۔ انسانی تمدن تو ہر لمحہ ترقی پذیر ہے اور [illegible]ں میں تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے اور متحرک انسان [illegible] متحرک تمدن تیزی کے ساتھ ارتقائی منزلوں پر گام زن ہے جو فطرت کے عین مطابق بھی ہے۔

اکبر دوسروں کو رجعت پسندی کی ان منزلوں پر دیکھنا چاہتے تھے جہاں پر ہر شے پر جمود طاری ہو اور وہ جمود ایسا ہو [illegible] طرح کا جمود صرف موت ہی فراہم کر سکتی ہے جو زندگی کی قدروں کے قطعی منافی ہے۔ جدید تعلیم کی مخالفت میں اکبر کی پوزیشن بڑی مستحکم ہوتی اگر وہ خود علوم مشرقیہ کے فارغ التحصیل انسان ہوتے اور انہوں نے اپنے لڑکوں اور لڑکیوں کو جدید تعلیم سے نا آشنا رکھا ہوتا۔ قول وعمل میں تضاد کسی مفکر، مبلغ، مصلح، شاعر، دانش ور، فلسفی اور رہبر کو زیب نہیں دیتا اور نہ اس سے اس کی عظمت ثابت ہو سکتی ہے بعض حلقوں میں چوں کہ اکبر کو شاعر کے ساتھ ساتھ مصلح اور دانش ور بھی تسلیم کیا جاتا ہے اس لئے ان کی شاعری کا پیغام بے معنی ہے اگر خود یہ اپنے بتائے راستوں سے گریزاں ہیں۔ ملک کو سیکڑوں اور ہزاروں سال پیچھے لے جانا اور انسانی تمدن کو رجعت پسندی کے جمود سے ہم کنار کرانے کی تمنا اور خواہش رکھنا کسی طرح حُبّ الوطنی کا جذبہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قدیم اخلاقی اور روحانی قدروں کا احترام کرنا قطعی ایک دوسرا راستہ ہے جو رجعت پسندی کی طرف نہیں لے جاتا اور اس کے قطعی یہ معنی نہیں کہ انسان جدید تمدنی اور تعلیمی قدروں سے اپنے کو نا آشنا رکھے جو اس کی خودکشی کے مترادف ہو۔ بہرحال واقعات اور حقائق کی روشنی میں اکبر الٰہ آبادی کی شاعری کو اصلاحی شاعری اور قوم وملت کے لئے ایک پیغام تصور نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ طنزیات کے لئے اکبر نے نئی راہیں متعین کی ہیں، اردو زبان میں اضافے کئے ہیں اور مزاحِ لطیف کا ایک شعبہ اردو کو دیا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکبر قافیہ پیمائی کے بادشاہ تھے مگر ان کے فن کا کمال صرف طنز اور مزاح بغرضِ تفریح کا حامل تھا اس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ تعمیری نصب العین۔ ہنسنے ہنسانے اور مسخرہ پن کے لئے اسے نیا طرز اور نیا اسلوب ضرور تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اکبر نے اپنی شاعری میں جو کچھ کہا ہے اپنے عمل سے خود ہی اس کی نفی بھی کر دی ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ کوئی نظریہ جو صرف منفی پہلو پر قائم کیا جائے اور اس کا کوئی افادی پہلو نہ ہو، کسی طرح بھی انسانی زندگی کے لئے تعمیری تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اکبر کے سارے نظریات منفی بنیادوں پر قائم ہیں جن کا انسانی زندگی کے اصل مسائل سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ان میں افادیت اور مقصدیت ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کی شخصیت، نظریات، شاعری اور ان کی عملی زندگی کے مختصر تجزیے کے بعد ان کے چند اشعار بھی ہدیۂ قارئین کئے جا رہے ہیں تاکہ حقائق اور اصلیت کا فیصلہ قارئینِ کرام خود ہی کر لیں۔

عورتوں کے پردے کے بارے میں اکبر نے کہا ہے:۔

بے پردہ نظر آئیں مجھے چند بیویاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

انگریزی لباس کے بارے میں کہتے ہیں:۔

اک شیخ نے یوں لاڈ سے لڑکے کو ابھارا
اک شیخ نے یوں پیار سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں وہ تن گیا یہ سائے میں پھیلی
پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

نئی تہذیب کے بارے میں ہے:۔

حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پانی پینا پڑا ہے پائپ کا

نئی تعلیم پر یوں طنز کیا ہے:۔

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

موجودہ سوسائٹی کے بارے میں ہے :—

کریما بہ بخشائے بر حالِ بندہ
کہ ہستم اسیر کمیٹی و چندہ

لڑکیوں کی جدید تعلیم پر یوں طنز کیا ہے :—

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب وہ شمع بزم ہے پہلے چراغِ خانہ تھی

بے نمازیوں پر یوں تنقید کی ہے :—

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور یہ بھی :—

کونسل میں تو ہیں سید، مسجد میں فقط جمّن

انگریزوں کی ملازمت کرنے پر یوں نکتہ چینی کی ہے :—

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

مولانا حالی اور سر سید احمد خاں کی ترقی پسندی پر کہا ہے :—

سید کے کارناموں کو حالی سے پوچھئے
غازی میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے

علی گڑھ یونیورسٹی پر یوں چوٹ کی ہے :—

خدا علی گڑھ کے مدرسے کو تمام امراض سے شفا دے
بھرے ہوئے ہیں امیر زادے رئیس زادے شریف زادے

غیر مسلموں کی مذہبیت کا یوں ذکر کیا ہے :—

دیکھو حضور جارج ہیں کتنے خدا پرست
گرجا میں سر جھکا ہے دسمبر ہو یا اگست

اسی طرح :—

بابو گریجویٹ ہیں کالج کے ساتھ ہیں
اور آپ ہیں کہ ہوٹلوں والی کے ساتھ ہیں

زمانے کی طاقت پرستی کا یوں ذکر ہے :—

بلا طاقت نہیں افلاک اف ان کی نہیں چلتی
وہاں تو ریل چلتی ہے یہاں روٹی نہیں چلتی

اپنے ایک منظوم خط میں اپنے بیٹے سید عشرت حسین کو اس بات کی بڑی نصیحت کی ہے کہ لندن کی تہذیب و تمدن اور وہاں کے معاشرے سے قطعی متاثر نہ ہونا۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے کہ جب ان کے بیٹے عشرت حسین لندن میں آئی سی ایس کا امتحان دینے گئے تھے۔

اسی طرح نئی صنعتی ترقی پر یوں طنز کیا ہے :—

میں نے اک مضمون لکھا ڈاسن کا اک جوتا بنا
میرا مضمون رہ گیا ڈاسن کا جوتا چل گیا

نئی روشنی کے لوگوں پر ایک اور چوٹ یوں کی ہے :—

رپٹ لکھوائی ہے یاروں نے یہ جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اسی طرح پورا کلامِ اکبر جدید تعلیم جدید تمدن ترقی پسندی اور وسیع النظری پر سخت تنقید ہے جس کا کوئی افادی یا تعمیری پہلو نہیں ہے اور اس طرح کے منفی نظریات جن کا کوئی مقصد نہ ہو، قوم و ملک کے لئے پیغام کا درجہ نہیں پا سکتے ہاں اگر کلامِ اکبر سے وہ اشعار منتخب کئے جائیں جو اکبر نے اپنے طنزیہ انداز سے ہٹ کر سنجیدگی کے ساتھ کہے ہیں تو میرے مطالعے اور خیال کے مطابق وہ افادی پہلو کے ساتھ ساتھ کسی نصب العین کی نشان دہی ضرور کرتے ہیں اور وہ قوم اور ملک کے لئے بے شک ایک پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اکبر الہ آبادی کے یہاں ایسے اشعار کی بہت کمی ہے مثال کے طور پر مندرجہ ذیل شعر کلامِ اکبر سے وہ منتخب شعر ہے جو قیامت تک ہر دور میں زندہ رہے گا اور قوموں کو جب تک دنیا قائم ہے ہمیشہ ایک پیغام دیتا رہے گا مثلاً

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

دیدہ زیب، روح پرور ناول ہی ناول

دلیلہ	رضیہ بٹ	۲۵/-
شینہ	"	۱۵/-
خاندان	"	۲۰/-
میرے ندیم	"	۳۰/-
سعب	"	۱۲/-
ناہید	"	۱۳/۵۰
شبنم	"	۷/۵۰
شائینہ	"	۳۰/-
سارہ	"	۲۰/-
رفاقتیں کیسی	"	۱۵/-
ریشم	"	۱۵/-
آئیڈیل	"	۱۵/-
ماہ رخ	"	۸/۵۰
شادی	"	۲۵/-
نائلہ	"	۱۴/-
صائقہ	"	۲۵/-
عاشی	"	۱۴/-
ایک لڑکی	"	۳۰/-
ناجیہ	"	۳۵/-
نفرت	مینا ناز	۱۲/-
انتظار	"	۲۰/-
وفا کیسی	"	۱۸/-
خوشبو	"	۲۰/-
البدر	"	۱۹/-
شب تنہیر	"	۱۴/-
عزت	"	۱۲/-
ایک طوفان اور	"	۱۶/۵۰

مہرباں کیسے کیسے	مینا ناز	۱۷/-
تیرے سنگ	"	۱۶/-
میرے حضور	"	۱۲/-
عاشق	"	۱۸/-
کانچ کے ٹکڑے	"	۱۰/-
بشریٰ	"	۱۰/-
یہ بھی ایک کہانی	"	۱۲/-
ریت پریت	"	۱۲/-
پھول کھلے چمن چمن	"	۱۲/-
پکار	"	۱۳/-
صنم	"	۱۲/-
بدنام	"	۱۳/-
سنگ آستاں	"	۱۸/-
سپنوں کے پھول	"	۱۸/-
پہاڑی چاند	"	۱۸/-
بہار آنے تک	"	۱۵/-
چاہت	دیبا خانم	۱۸/-
سپنوں کی شہنائی	"	۱۷/-
پیاسے کو شبنم	"	۱۵/-
آندھیاں	انیس مرزا	۸/۲۵
صائمہ	حمیدہ جبیں	۹/-
تجھ بن جیا کیا کیا	ممتاز انجم	۱۶/-
بت ارمنی	ناز کفیل گیلانی	۲۴/-
صبح و شام	ل۔ احمد اکبر آبادی	۱۲/۵۰
زندگی کے کھیل	"	۱۲/۵۰
ملاحظات نفسی	"	۷/۵۰
سہاگن	سلمیٰ کنول	۱۸/-

(بقیہ صفحہ کا)

کے مشاعرے کی آبرو منیر صاحب ہی رہے حالاں کہ ابھی صدرِ مشاعرہ جناب مجروح سلطان پوری صاحب کی باری آنے والی ہے منیر صاحب نہایت کامیاب مائیک سے رخصت ہوئے تھے کہ محترمہ نورجہاں خان مائیک پر تشریف لا کر بڑے دل نشین انداز میں صدرِ محترم جناب مجروح سلطان پوری صاحب کا تعارف پیش کر رہی ہیں۔ محترمہ نورجہاں خان اپنی جادو بھری آواز کی بدولت مشہور ہیں سامعین ہمہ تن گوش ہو کر ان سے صدرِ محترم کا تعارف سماعت فرما رہے ہیں۔ لیجئے انتظار کی گھڑیاں ختم اور مجروح صاحب تالیوں کی گونج میں مائیک پر آ رہے ہیں۔ نہیں! بلکہ مائیک ان کے سامنے لایا جا رہا ہے۔ سامعین بڑی امید لے کر آئے تھے لیکن جوں ہی مجروح صاحب غزل سرا ہوئے تو سامعین بیزاری کا اظہار فرمانے لگے کیوں کہ وہ ایک بہت ہی پرانی اور مشہور غزل پڑھ رہے تھے۔ اس غزل کے دو شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیں

ہم کو جنوں کیا سکھلاتے ہو ہم تھے پریشاں تم سے زیادہ
چاک کئے ہیں ہم نے عزیزو تارِ گریباں تم سے زیادہ
جاؤ تم اپنے بام کی خاطر ساری لویں شمع کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشنِ چراغاں تم سے زیادہ

سامعین کے اصرار پر مجروح صاحب ایک غزل اور پیش کر رہے ہیں لیکن بغیر ترنم کے۔ یہ غزل بھی بہت ہی پرانی ہے اور فلم "دستک" میں اسے فلمایا بھی گیا ہے۔ اس غزل کا صرف مطلع ہی لکھ دینا کافی ہو گا۔

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

ایسا لگتا ہے مجروح صاحب کچھ بے دلی سی دکھا رہے ہیں کیوں کہ غزل ختم کرنے کے بعد جب سامعین زوردار آواز میں گیت کی فرمائش کرنے لگے تو مجروح صاحب اپنا پیچھا چھڑانے کی غرض سے یوں گویا ہوئے۔ "میں گیت لکھتا ہوں۔ میوزک ڈائرکٹر اس کی دھن تیار کرتا ہے اور لتا منگیشکر اسے گاتی ہیں۔ اگر آپ گانا چاہتے ہیں تو اسٹیج پر آ جائیے۔" اتنا کہہ کر مجروح صاحب اپنی جگہ سے کھسک گئے جس کا مطلب تھا کہ مشاعرہ ختم ــــ ابھی رات صرف ایک ہی بجا تھا لیکن چونکہ مشاعرے میں کچھ بدنظمی پیدا ہو گئی تھی اس لئے دوسرا دور شروع کرنے سے بہتر یہ سمجھا گیا کہ مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر دیا جائے ــــ

●●

(صفحہ ۲۳ کا بقیہ)

کوئی اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔ یہ مشاعرہ ٹورانٹو کی تاریخ میں ایک یادگار مشاعرہ رہے گا۔ اس مشاعرہ میں فیض اور سردار جعفری کے ساتھ جمیل الدین عالی اور احمد فراز بھی تھے اور انگلینڈ سے ایک تازہ دم اور تازہ فکر نوجوان شاعر افتخار عارف۔ ان کی شاعری نے دلوں میں کچھ ایسی ہلچل مچا دی تھی اور زبان و بیان کی کرشمہ سازی نے محبت اور انقلاب کی ایسی راہیں کھولی تھیں جن پر ان کے سامعین لپک پڑے۔ مشاعرہ کیا تھا اردو تہذیب کا ایک یادگار جشن تھا۔

۲۶ ستمبر بروز اتوار دو بجے سے مذاکرے شروع ہوئے پہلا جلسہ وراثتی تہذیب کے موضوع پر پروفیسر ملٹن اسرائیل کی صدارت میں ہوا جس میں مسز مبارکہ عالم، ڈاکٹر فضل عباس اور دیگر لوگوں نے حصہ لیا۔ اس کے بعد چار بجے کانفرنس کے مقالات پر دوبارہ بحث ہوئی۔ منظور بیگ قریشی کی صدارت میں پینل ڈسکشن میں گوپی چند نارنگ، جمیل الدین عالی، سردار جعفری اور افتخار عارف نے حصہ لیا۔ گوپی چند نارنگ اور سردار جعفری میں ترقی پسند ادب اور جدید ادب کے سلسلہ میں کچھ سخن گسترانہ باتیں بھی ہوئیں جو ہر لحاظ سے تاریخی اہمیت پر مبنی ہیں۔ شام میں ہارون صدیقی کے ہاں ڈنر ہوا جس میں تقریباً سارے مہمان ادیب و شعراء کے علاوہ ڈاکٹر جمال نقوی، عرفانہ عزیز، طلعت اشارت، نورجہاں بھی شریک تھیں۔

۲۷ ستمبر بروز پیر کو ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے جوش کی شاعری پر ایک نہایت دلچسپ پُرمغز اور معلوماتی مضمون پڑھا اس جلسہ کی صدارت علی سردار جعفری نے کی اس جلسہ میں خلافِ توقع اس قدر تکان اور پے در پے کئی تقریبات کے باوجود بڑی تعداد لوگ شامل ہوئے۔ مقالہ کے بعد دلچسپ بحث بھی ہوئی۔ اور علی سردار جعفری نے جوش کے ذاتی کوائف بتائے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور علی سردار جعفری نے اس کانفرنس کے ذریعہ جوش کی اہمیت و عظمت کو ایک مسلّم حقیقت میں تبدیل کر دیا۔ احمد فراز نے اس کے خلاف آواز ضرور اٹھائی لیکن حاضرین کو جیت نہ سکے۔

غرض کہ اس جلسہ کے بعد اس جشنِ اردو کی تمام تقریبات مکمل ہو گئیں اس کانفرنس سے شمالی امریکہ میں اردو تہذیب کا ایک نیا باب وا ہوا۔

●●

سلام

(ابو البلاغت)
رتن پنڈوروی

آکے دریا پہ رکا آلِ نبیؐ کا پانی ... آج تک بھی ہے اسی شرم سے دریا پانی
موج بن بن کے ہے دریا میں اُچھلتا پانی شاہِ کونین کے دیدار کا پیاسا پانی
ننھے اصغرؑ نے جو روتے ہوئے مانگا پانی تیرِ بدخواہ نے کوثر کا پلایا پانی
مالکِ کوثر و تسنیم ہیں پیاسے مولا! اپنی درگاہ سے ایسے میں تو برسا! پانی
آہ میدانِ شہادت کی یہ رنگ آمیزی خون تو سر پہ چڑھا اور نہ برسا پانی
مشک بھرنے پہ جو افواج نے گھیرا ڈالا تیغِ عباسؓ نے اعدا کو پلایا پانی
پیاس سے ماہیٔ بے آب بہتّر جانیں اے خدا تو نے بھی قسمت میں نہ لکھا پانی
شاہ کی تشنہ لبی اور شہادت توبہ کثرتِ غم سے ہے پانی کا کلیجا پانی
شمرِ سفاک نے سجدے میں چلایا خنجر حشر میں آپ ہی رو رو کے بھرے گا پانی
دل میں عابدؑ کے یہ حسرت ہی رہی آخر تک کاش میں دیکھتا اعدا میں ہے کتنا پانی
تیغِ قاسم نے بھی کیا خوب دکھائے جوہر برق وش جس پہ گری اُس نے نہ مانگا پانی
ہائے میدانِ وغا۔ قہر و جفا۔ دشتِ بلا اور پھر اس پہ ستم یہ کہ ہے عنقا پانی
جنگ میں کود پڑا ضد سے دلاور اکبر جامِ تسنیم پیا اور نہ پایا ... پانی
جا کے دریا پہ بھی عباسؓ یہ فرماتے ہیں تشنہ لب سب ہیں تو ہم کیوں پئیں تنہا پانی

تشنگی شرط تھی فرمانِ شہادت میں رتن
ورنہ خود خدمتِ شبیر میں آتا... پانی

کینیڈا میں اُردو کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس

محمد حفظ الکبیر قریشی

ستمبر ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتہ میں انجمن اُردو کینیڈا اور ساؤتھ ایشین سٹڈیز، یونیورسٹی آف ٹورانٹو کے باہمی تعاون سے اُردو زبان اور اس کی پیدا کردہ تہذیب کا ایک عظیم الشان جشن منایا گیا جس میں شمالی امریکہ میں اردو بولنے والے ایک کثیر تعداد میں شریک ہوئے اور اردو ادب اور اس کی تہذیب کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ تقریبات کا سلسلہ کوئی چار دن تک چلتا رہا اور ہر تقریب میں لوگ اپنے ذوق و شوق کا اظہار کرتے رہے۔ شمالی امریکہ کی تہذیبی زندگی میں یہ جشن ایک مثال قائم کر گیا۔ اُردو زبان کے بولنے والوں نے ایک ایسی شمع روشن کر دی جس کی روشنی میں دیگر زبان بولنے والے بھی اب آگے قدم بڑھا سکتے ہیں۔

انجمن کی دن رات کی انتھک جد و جہد، اس کے کارکنوں کا ایثار، پیہم اردو زبان و تہذیب کے قیام اور اشاعت کا جذبہ بالآخر رنگ لا کر رہا اور ہفتہ وہ ادبی گہما گہمی اور تہذیبی رونق لگی رہی کہ یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ ہم لکھنؤ یا دلّی میں ہیں، ٹورانٹو میں نہیں۔ ۲۱ ستمبر ہی سے ملک کے گوشہ گوشہ سے شاعر اور ادیب آنا شروع ہو گئے تھے۔ سب سے پہلے ۲۱ ستمبر کو فیض آئے۔ ۲۲ کو انگلینڈ سے احمد فراز اور بمبئی سے علی سردار جعفری پہنچے۔

اسی شام انجمن کے وائس پریذیڈنٹ کرشن ہاکسر صاحب کے ہاں شعرائے کرام کو ڈنر دیا گیا جس میں فیض احمد فیض، احمد فراز اور سردار جعفری کے علاوہ انجمن کے عہدیدار موجود تھے۔ ہر طرح کی گفتگو ہوتی رہی لیکن چوں کہ شعراء تھکے ہوئے تھے اس لئے احمد فراز کی ایک دو نظموں کے بعد محفل ختم ہو گئی۔

۲۳ ستمبر بروز جمعرات وقّی بیگ سے عزیز تشریف لائیں کراچی سے جمیل الدین عالی پچھلی رات ہی قدرے دیر سے پہنچ چکے تھے۔ اسی شام گوپی چند نارنگ کو بھی آنا تھا۔ ان تمام شعراء کی شان میں پاکیزہ انٹرنیشنل کی صہباج کی جانب سے ایک ڈنر تھا۔ ٹورانٹو کے پاکستانی ریستوران شالیمار میں پاکیزہ والوں نے پُرتکلف دی۔ اتفاق سے شہر میں ان دنوں کراچی کے حکیم سعید صاحب بھی تشریف فرما تھے سو وہ بھی شریک ہوئے۔ پاکیزہ انٹرنیشنل کی جانب سے صبیح الدین منصور صاحب نے ایک استقبالیہ تقریر کی۔ اس کے بعد کانفرنس کے مقاصد اور انجمن کی کارروائیوں پر حفیظ الکبیر قریشی نے روشنی ڈالی۔ پھر ڈنر ہوا جس میں مہمان شعراء اور شہر کے معززین اور ادب دوست مہمان ایک دوسرے سے گفتگو کرنے لگے۔ فیض احمد فیض نے اس موقع پر اپنی مختصر سی تقریر میں حکیم سعید صاحب کو اس بات پہ توجہ دلائی کہ وہ حکومتِ پاکستان کو ٹورانٹو میں اردو زبان و ادب کی توسیع و اشاعت کے مسئلہ پر آمادۂ تعاون کریں جس کا حکیم صاحب نے وعدہ کیا۔ غرض کہ یہ پُرتکلف محفل ۱۱ بجے ختم ہوئی جس کے بعد فیض، فراز، علی سردار جعفری قریشی صاحب کے مکان پر گئے اور کچھ حضرات اور بھی وہاں پہنچ گئے جنہوں نے قریشی صاحب کے مکان کا پتہ لگا لیا تھا۔ ۲۴ ستمبر بروز جمعہ ٹورانٹو کی سنٹرل لائبریری میں کتابوں کی نمائش ہوئی اور اسی موقع پہ احمد فراز کے نئے مجموعۂ کلام "بے نام گلی کوچوں میں" کی رونمائی ہوئی۔ اس جلسہ میں اُردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اب شعراء و ادباء کی فہرست میں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور ادا جعفری کا بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ نیویارک سے افتخار سحر اور ضمیر رحمٰن پہنچ چکے تھے۔ واشنگٹن سے حسین امام بھی آ گئے۔ لاس اینجلز سے نیر جہاں پہلے ہی آ چکی تھیں شام میں انجمن کے صدر بیدار بخت کے ہاں ڈنر دیا گیا جس میں تقریباً سارے ہی ادیب و شاعر شریک ہوئے۔

۲۵ ستمبر بروز سنیچر کو یونیورسٹی کے اگنیاٹف ہال میں کانفرنس منعقد ہوئی ۹ بجے تک ہال تین چوتھائی بھر گیا تھا۔ موسم قدرے ابر آلود اور خنک تھا ہلکا ترشح بھی ہو رہا تھا ٹورانٹو میں موسم خزاں کی بالکل ابتدائی کیفیت تھی۔ اِکّا دُکّا درخت اپنے رنگ بدل چکے تھے۔ اس پُرفضا صبح کے سیشن کی صدارت فیض احمد فیض فرما رہے تھے اب تک باقی ماندہ ادیب و شعراء بھی تشریف لا چکے تھے مانٹریال سے فاروقی حسن، واشنگٹن سے اعجاز احمد اسد بریلی سے ڈاکٹر ضیا احمد نیویارک سے ہارون نظیر، ڈاکٹر مظفر شکوہ۔ آٹوا سے شاہین اور نوا اسکاشیا یونیورسٹی سے مسز اور مسٹر اے گر (انہوں نے جدید شعراء کے

اردو میں ترجمہ کئے ہیں) غرض کہ سارے لوگ مجتمع تھے ۔

صبح کا پہلا مقالہ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے پڑھا اور آتے ہی پورے جلسہ کی توجہ اپنے موضوع پہ مبذول کرالی ۔ پاکستان اور ہندوستان کی جدید شاعری پہ آپ نے سیر حاصل بحث کی، تمام جدید شعراء اور ان کے ہاں جو رجحانات پائے جاتے ہیں ان پہ روشنی ڈالی اور جدید ادب کا تعمیر و تشکیل جن بنیادوں پہ ہوئی ہے ان پہ تفصیل سے بحث کی ۔

مقالہ طویل ہونے کے باوجود نہایت غور اور توجہ سے سُنا گیا، شمالی امریکہ میں رہنے والوں کے لئے کئی باتیں نئی تھیں ۔ کئی جدید شعراء کے نام انہوں نے پہلی مرتبہ اس مضمون کے ذریعہ سُنے ۔ اس لئے مقالہ کی دلچسپی آخیر تک قائم رہی ۔ نارنگ صاحب نے اپنی علمیت اور شیریں گفتاری دونوں سے محفل لوٹ لی ۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کے بعد جمیل الدین عالی تشریف لائے ان کا موضوع اردو غزل تھا جس پہ انہوں نے جان توڑ کر لکھا تھا ۔ غزل کی مدافعت میں ایک چوکھی لڑائی لڑی اور کلیم الدین احمد کو بے نقط سُنائیں جمیل الدین عالی کا مقالہ طویل تھا اس لئے انہیں کہیں کہیں سے چھوڑنا پڑا لیکن اس کے باوجود مقالہ دلچسپی سے سُنا گیا ۔ کافی کے وقفہ کے بعد حفظ الکبیر قریشی نے کلاسیکل غزل میں جدیدیت کے موضوع پہ ایک مختصر سا مضمون پڑھا جس میں اردو کی کلاسیکل شاعری میں جو ترقی پسندانہ اور جدیدیت پسند عناصر پائے جاتے ہیں ان کی نشان دہی کی ۔ اور میر کے مشہور شعر ؎

موسم آیا تو نخلِ دار پہ میر
سرِ منصور ہی کا بار آیا

کا حوالہ دیا کہ ہماری کلاسیکل شاعری ہر زمانہ میں جدیدیت لئے ہوئے تھی ۔ یہ مقالہ لنچ کے وقت تک جاری رہا ۔ لنچ کے وقفہ میں شائقینِ ادب، مہمان شعراء اور ادیب ایک دوسرے سے ملنے ملانے میں مصروف ہو گئے ۔ کوئی گلے مل رہا ہے تو کوئی مصافحہ کرنے میں لگا ہوا ہے کئی دوست ایک دوسرے سے برسوں کے بعد مل رہے تھے ۔ کسی کو کسی سے ملنے کا اشتیاق تھا سو آج پورا ہوا ۔ کھانا کینیڈین تھا لیکن لذیذ ۔ کام و دہن کی لذت کا سلسلہ کوئی ڈیڑھ بجے تک چلتا رہا ۔ اس کے بعد قریشی صاحب کی صدارت میں دوپہر کا سیشن شروع ہوا ۔ پہلا مقالہ علی سردار جعفری کا تھا جسے انہوں نے بڑی توجہ اور محنت سے لکھا تھا ۔ مقالہ طوالت کے باوجود نہایت غور و خوض سے سُنا گیا ۔ سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے تاریخی ارتقاء اور فکر و فلسفہ پہ اپنے زندگی بھر کے تجربوں کا نچوڑ پیش کیا ہے اس مقالہ کو اس اعتبار سے ہمیشہ تاریخی اہمیت حاصل رہے گی ۔ ڈاکٹر منیب الرحمٰن نے مشاعرہ کے موضوع پہ ایک لطیف پیرایہ میں پڑھا اور ڈاکٹر گوپال متل نے ترقی پسند تحریک کے ارتقاء پر مضمون پڑھ کر سُنایا جسے حاضرین نے بہت پسند کیا ۔ کچھ سوالات جوابات اور بحث و مباحثہ کے بعد ۵ بجے یہ نشست بھی ختم ہوئی ۔

کانفرنس میں انجمن کے کارکنوں نے عمدہ تنظیم اور رفاقت کا ثبوت دیا اور ہر کام جس سلیقہ اور خوبصورتی سے کیا اسے دیکھ کر خود امریکہ کے تنظیمی کارکن حیران رہ گئے ۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر نقوی، پنڈت ہاکسر ، ڈاکٹر فضل عباس، کریم انور، احمد صابرہ اسحٰق، اور پبلسٹی کے انچارج ہارون صدیقی واقعی قابلِ مبارکباد ہیں کہ ان کی شب و روز کی محنت رنگ لائی اور اتنی شاندار اور تاریخ ساز ادبی بلکہ علمی و ادبی اعتبار سے ایسی وسیع کانفرنس منعقد پذیر ہوئی ۔ حاضرین جو ایک بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے اخیر تک بیٹھے رہے اور ہر مقالہ کو دلچسپی سے سُنتے رہے ۶ بجے انجمن کی جانب سے ڈنر دیا گیا جو ساڑھے سات بجے تک چلتا رہا۔ اس ڈنر میں مہمان شعراء کے علاوہ شمالی امریکہ سے تمام آئے ہوئے ادیب و شاعر بھی شریک تھے ۶ بجے انجمن کی جانب سے ڈنر دیا گیا جو ۸ بجے تک چلتا رہا شام کو ٹھیک ۸ بجے سے مشاعرہ کا آغاز ہوا ۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور لوگ بے چینی سے اپنے مہمان شعراء کے منتظر تھے سیکڑوں لوگ ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے مایوس ہو کر واپس لوٹے۔ مشاعرہ کا آغاز پہلے لوکل شعراء سے ہوا ۔ افضل امام، جعفر نقوی، اور نزہت صدیقی نے اپنا کلام سُنایا ۔ شمالی امریکہ سے فاروقی شاہین، عرفانہ عزیز، ڈاکٹر ضیاء، طلعت اشارت، منیر حمیرہ رحمٰن، مامون ایمنی، حسین امام کے علاوہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند بھی شریک ہوئے ۔ ان کے بعد مہمان شعراء کو زحمتِ کلام دی گئی ۔ منیب الرحمٰن، محترمہ سرور، ادا جعفری، افتخار عارف، جمیل الدین عالی، احمد فراز، سردار جعفری اور فیض احمد فیض ۔ جو کلام پڑھا اس نے حاضرینِ جلسہ کو کچھ اس طرح مسحور کیا اور افتخار عارف، جمیل الدین عالی اور خصوصاً احمد فراز کی نظموں نے وہ جوش و خروش اور ہیجان پیدا کیا کہ رات کے تین بجے تک

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۵۷/۲۴۴۴۶ — رجسٹرڈ نمبر ڈی ۔ ۲۴۰/[illegible]

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
امن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
فیاض گوالیاری

ایڈیٹر
سرور تونسوی

زر سالانہ [illegible]
فی پرچہ [illegible]

جلد نمبر ۳۷ — دسمبر ۱۹۸۳ء — شمارہ نمبر ۱۲

غزل

ڈاکٹر ایس ۔ پی ۔ تفتہ
کورو کشیتر

بظاہر دل پہ کچھ لکھا نہیں ہے
مگر کاغذ تو یہ کورا نہیں ہے

کسی جوگی کا اب پھیرا نہیں ہے
کریں کیا ایک بھی دھندا نہیں ہے

خلوص و مہر جس سے ہو نہ ظاہر
مکھوٹا ہے فقط چہرہ نہیں ہے

سبھی رشتے ہیں اُس کے ہم قدم سے
ہمارا جس سے کچھ رشتا نہیں ہے

مقفل ہیں حصارِ ذات کے در
نکلنے کا کوئی رستا نہیں ہے

مجھے لے جائے جو قربت میں اُن کی
کوئی بھی ہاتھ میں ریکھا نہیں ہے

مری باتیں ہیں سیدھی اور بھولی
مری باتوں میں دم چھلا نہیں ہے

کرے سیراب جو کشتِ تمنا
وہ بادل آج تک برسا نہیں ہے

مرے دل نے کیا مجھ کو پریشاں
کسی سے بھی کوئی شکوا نہیں ہے

قلانچیں جو بھی ہیں من کی ہیں پیارے
کسی مارِیچ کی مایا نہیں ہے

صلیب و دار کی باتوں سے حاصل؟
یہاں تو کوئی بھی عیسیٰ نہیں ہے

بشر تو چاہتا ہے سچ ہی بولے
کرے بھی کیا مگر گردا نہیں ہے

یہ مانا اک بڑی طاقت ہے پیسہ
سبھی کچھ تو مگر پیسا نہیں ہے

مبارک آپ ہی کو ضبط کرسی
مرے سر میں تو یہ سودا نہیں ہے

سبھی کرتے ہیں باتیں ایکتا کی
کسی بھی گھر میں اک چولہا نہیں ہے

زمانے بھر کے غم ہیں ساتھ ہر دم
ترا تفتہ کبھی تنہا نہیں ہے

پرنٹر پبلشر عاشق سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی اور سرورق [illegible] پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۵ اندرا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ وصبا چہ کرد؟

آکاش وانی اور دوردرشن

(شری سالوے کی خدمت میں چند معروضات)

اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ ایشیائی کھیلوں کے دوران دوردرشن نے اپنی بساط سے بڑھ چڑھ کر خدمات انجام دیں۔ انسیٹ اے کی ناکامی کے باعث سرکار کو تقریباً دو کروڑ روپے کے بھاری اخراجات کا متحمل ہونا پڑا۔ اور انٹرنیشنل سٹیلائٹ کی خدمات حاصل کرنی پڑیں اور اس سلسلے میں بھی ہمیں وزیر اعظم صاحبہ کی دوررس نگاہوں کی داد دینی ہوگی کہ انہوں نے جب مناسب سمجھا تھا کہ بجائے وزارتِ اطلاعات ونشریات کا قلمدان جناب سالوے کو سونپا، عین اسی طرح جیسے کہ راجدھانی کا نظم ونسق سنبھالنے کے لئے فوری طور پر جناب جگموہن کو پھر سے دلی کا لفٹیننٹ گورنر مقرر کیا گیا اور یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ایشیائی کھیلوں کے دوران دلی کا نظم ونسق اس قدر قابلِ تعریف رہا کہ جس کی مثال بڑے بڑے بیرونی ممالک میں بھی ملنا محال ہے ریڈیو اور دوردرشن ملازمین نے ایشیائی کھیلوں سے عین پہلے ہڑتال کر دی مگر حکومت کی سختی اور سالوے صاحب کی سوجھ بوجھ نے ملازمینِ ریڈیو و دوردرشن پر فوری طور پر یہ ظاہر کر دیا کہ مطالبات منوانے کا انہوں نے موقع تو خوب تلاش کیا تھا مگر ان تلوں سے تیل نکالنا دور رہا بلکہ اپنے آپ کو ملازمت سے سبکدوشی پانے کی راہیں کھول دی گئی ہیں۔

ہمارے راجاؤں اور نوابین کے زمانے میں ہر ریاست میں وزارتِ تشریفات ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا بر اس وزارت کے ذمّے معزز مہمانوں کے کھانے پینے اور ٹھہرانے کے انتظامات کی ذمہ داری ہوتی تھی مگر دراصل وزارت تشریفات کے ذمہ دار افسران کے ذمے یہ ذلیل کام ہوتا تھا کہ وہ اپنے راجہ یا نواب کے لئے دادِ عیش کی لوازمات کا انتظام کریں اور اس سلسلے میں بڑے بڑے خوش پوش جغادری وہاں مالامال ہوئے۔ مرحوم سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" وزارتِ تشریفات کو وزارتِ ...... کہا کرتے تھے اگر ذوقِ سلیم پر گراں نہ گزرے تو ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل محسوس نہیں ہو رہا کہ ہمارے ہاں کی وزارتِ نشریات واطلاعات نوابین و مہاراجوں کے وقت کی وزارتِ تشریفات کے مقابلہ میں زیادہ سہل اور وسیع تر ایسے ذرائع رکھتی ہے کہ اس وقت کے راجاؤں اور نوابین کو یہ سہولیت اور وسیع ذرائع حاصل ہی نہ تھے وہ اس لئے کہ اس وزارت کے سربراہوں کو مہاراجوں اور نوابین ایسے مخرب اخلاق ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور وہ یوں کہ اکثر خواتین میں حسد کا جذبہ، اپنے مدِمقابل کو نیچا دکھانے کی ضد، ترقی کے مراحل جلد از جلد طے کرنے کا شوق تو ہوا کرتا ہے اور بعض اوقات اچھی بھلی نیک خواتین کو بھی اپنی ضد کو پورا کرنے یا حسد کی آگ میں جلنے کے باعث اور اپنے مدِمقابل کو نیچا دکھانے کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے سے بھی گریز نہیں ہوتا۔ محترمہ زاہدہ تبسم صاحبہ کا ایک افسانہ "اُترن" اگر آپ نے نہ پڑھا ہو تو ضرور پڑھئے تو آپ کو

پڑھنے اس دعوے کی تصدیق بہت اچھے انداز میں ہو سکے گی، اس افسانے کا مختصر لبِ لباب یہ ہے کہ ایک رئیس زادی اپنی آیا کی (گھر دھندہ کرنے والی خاتون) کی بیٹی کو اپنی اُترن پہننے کو دیا کرتی تھی اور اسی کی بیٹی اسے اپنی توہین سمجھتی تھی اور اس کے دل و دماغ پر یہ بھوت سوار رہتا تھا کہ کاش وہ اپنی اُترن کسی طرح اس رئیس زادی کو پہنا سکے۔ بظاہر اس غریب لڑکی کا یہ خواب پورا ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ بہرکیف اس غریب لڑکی نے حسد، ضد اور رئیس زادی کو نیچا دکھانے کے لئے اس رئیس زادی کے ہونے والے شوہر پر بھی رئیس زادی کی شادی سے ایک روز پہلے از خود اپنا سب کچھ نثار کر دیا اور اسے تسکین ہوئی کہ اب ساری عمر رئیس زادی اس کی "اُترن" پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہوگی۔

اور یہاں تو یہ حالت ہے کہ جس قدر اس وزارت میں خواتین کی بھرمار ہے کسی دوسرے محکمے میں نہیں ہے۔ ریڈیو، دور درشن، ڈرامہ، فلم ڈویژن۔ اور نہ معلوم کیا کیا اس وزارت کے اختیار میں ہے اور یہ سب محکمے ہیں جو خواتین کے بغیر چل ہی نہیں سکتے۔ باقاعدہ سرکاری ملازمت کے علاوہ ہزارہا خواتین ایسی ہیں جنہیں ان محکموں سے روپیہ کمانے کی فکر رہتی ہے اور حضور حوّا کی بیٹیوں میں ایسی بھی کچھ ضرور ہیں جو اس "اُترن" والی مثالی لڑکی کو بھی کوسوں پیچھے چھوڑنے پر آمادہ رہتی ہیں۔ (ہم ان محترم خواتین سے معذرت خواہ ہیں جو ان محکموں میں پورے نسوانی وقار اور نسوانی حقوق پر چلتے ہوئے حیا اور قابلِ تعریف حد تک اخلاقی قدروں کی ضامن ہیں)

ساوے صاحب سے تو ہماری واقفیت نہیں ہے مگر سابقہ صاحب کے بارے میں تو ہر روز ان کی سچی یا جھوٹی خوش فعلیوں سے متعلق باقاعدہ ایک بلیٹن خفیہ طور پر شائع ہوتا تھا جو ممبرانِ پارلیمنٹ، وزرائے حکومت کے علاوہ اخبارات کے دفاتر میں پہنچتا تھا (اس بلیٹن کے بارے میں مسٹر راج نرائن نے لکھا بھی تھا) اس وزارت کا

کون سا ایسا مردِ وزیر ہوگا جس کے گھر ریڈیو، دُور درشن اور ڈرامہ آرٹسٹوں نے پرائیویٹ پروگرام نہ دئیے ہوں۔ دلّی کے معزز ترین شرفاء میں لالہ شام لال صاحب کا نام نامی سرِ فہرست تھا جب انہیں اس وزارت کا ڈپٹی منسٹر بنایا گیا تو کچھ دنوں بعد ایک مخصوص نشست میں جس میں ایڈیٹر شانِ ہند بھی موجود تھا فرمانے لگے کہ اس وزارت کو تو اُسے سونپنا چاہئے جو کنجروں سے زیادہ میل جول رکھتا ہو۔ ڈاکٹر کیسکر بڑے لئے دئے رہتے تھے مگر پُرانی ریڈیو آرٹسٹوں میں سے اب بھی یہ شہادت دینے والی موجود ہیں کہ ان کے ہاں بھی محفلِ رقص و سرود منعقد ہوا کرتی تھی یہ دو نام تو وہ ہیں جو کافی حد تک محتاط تھے اور اگر خدا کے فضل سے کسی خوش نظر، خوش ذوق اور خوش مذاق وزیر کو یہ محکمہ دے دیا جائے تو پٹیالہ کے اس روایتی مہاراجہ کی روح بھی منہ دیکھتی رہ جائے جن کے بارے میں لاکھوں قصے کہانیاں اب تک زبان زدِ عوام و خواص ہیں۔

محکمہ ریڈیو کے اعلیٰ افسران دلّی یونیورسٹی کے سرکردہ حضرات اور ہزارہا طلبائے یونیورسٹی یہ واقعہ بھولے نہیں کہ یونیورسٹی کی ایک تقریب میں اُس وقت کے وزیرِ اطلاعات و نشریات نے اس وقت کی ایک معمولی سی ایکسٹرا ریڈیو آرٹسٹ مس ثروت خاں (اس وقت یہ "مس" تھیں) سے اس خضوع و خشوع سے ہاتھ ملایا تھا کہ بڑے بڑے حضرات اس عزت افزائی پر رشک کرنے لگے تھے۔

ہم جناب ساوے کی خدمت میں حسبِ ذیل معروضات محض اس لئے رکھ رہے ہیں کہ وہ ابھی نئے نئے اس وزارت کے سربراہ بنے ہیں لہٰذا اُن سے کسی حد تک امید کی جاسکتی ہے کہ وہ خصوصاً محکمہ ریڈیو اور دُور درشن کے طریقِ کار میں مناسب طور پر تبدیلی لانے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ ریڈیو اور دُور درشن کے ذمہ دار حضرات کسی نہ کسی خاص حلقے کے رہینِ منت ہو کر رہ گئے ہیں انہیں کسی بھی موضوع پر کوئی ٹاک کرانی ہو یا مشاعرہ کرانا ہو یا نشر و دیز کرانا ہو تو انہیں اس مخصوص حلقے سے باہر کچھ نظر نہیں آتا، پہلے

یہ ہوا کرتا تھا کہ ریڈیو والے اچھے اچھے مقررین اچھے سے اچھے آرٹسٹوں کی تلاش میں رہتے تھے اور اب حالت یہ ہے کہ پروگرام کے طالب شراب پلانے اور دعوت کھلانے کی ترغیب دیتے ہیں تا کہ انہیں پروگرام مل سکیں۔ ہم ایک ایسے شاعر کو جانتے ہیں جن کو اپنے معاوضہ کی رقم کی شراب پروگرام دینے والے کو پلانی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال جب ولایت میں تھے تو انہیں دنوں دیوان آنند کمار صاحب بھی ولایت میں تھے ڈاکٹر اقبال کے سلسلے میں ریڈیو والے دیوان صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا مدعا بیان کیا تو انہوں نے فرمایا کہ معاوضہ کی مجھے ضرورت نہیں۔ لہٰذا آپ ریکارڈنگ مشین لے کر آجایئے اور جو کچھ مجھ سے پوچھنا ہو پوچھتے جایئے اور ریکارڈنگ کر لیجئے۔ اب ریڈیو والوں کا کہنا تھا کہ ہم بغیر معاوضہ دئے آپ کی ریکارڈنگ بھی نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایڈیٹر شانِ ہند کی موجودگی میں ریڈیو والے حضرت علامہ دتاتریہ کیفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے کچھ یادیں ریکارڈ کرانے کو کہا تو انہوں نے بھی اپنی رہائش گاہ پر ریڈیو والوں کو بلایا اور ریکارڈنگ کرا دی۔ مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ یعنی ریڈیو یا دُور درشن والوں کی یہ ہرگز کوشش نہیں ہوتی کہ وہ کسی خاص موضوع کے ماہر کی تلاش کریں۔ انٹرویو لینے والے ایسے حضرات ہوتے ہیں جنہیں انٹرویو کی الف۔ ب سے بھی واقفیت نہیں ہوتی۔ محترمہ شاکر پروین پاکستانی شاعرہ کا انٹرویو ایک ایسے صاحب نے لیا جو پروین کے اشعار صحیح طور پر پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ حال ہی میں عید میلادالنبیؐ پر خواجہ حسن ثانی نظامی سے جو صاحب بات چیت کر رہے تھے وہ مسلمان ہونے کے باوجود حضور رسول اکرمؐ کی تعلیمات سے کماحقہ طور پر ناواقف تھے اور ان کا تلفظ تو مضحکہ خیز حد تک غلط تھا۔ اکثر و بیشتر انٹرویو لینے والے اپنی شخصیت کو صاحب معاملہ کی نسبت زیادہ نمایاں کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتے ہیں اور محض اس لئے کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ انٹرویو لینے والے صاحب کس قدر اثر و رسوخ کے مالک ہیں

اور انہوں نے بڑے سے بڑے افسروں کی انٹرویو میں خوب بے عزتی کی۔

ساٹھے صاحب ریڈیو اور دُور درشن کو ایسے سنگ بند حلقوں سے آزادی دلایئے۔ پروگرام دینے والے اپنے آپ کو ریڈیو اور دُور درشن کا مالک سمجھے ہوئے ہیں انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ یہ پروگرام بہتر انداز میں پیش ہوں تاکہ عوام میں دُور درشن اور محکمہ ریڈیو کی تعریف ہو بلکہ انہیں اپنی دوست نوازی یا حلقہ بندی کی حدود کے اندر رہنے کی فکر ہوتی ہے اور بس۔

ساٹھے صاحب آپ سے کوئی اور کہے یا نہ کہے مگر ہم نہایت کھلے الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ ٹی۔ وی دیکھنے والے مسٹر کملیشور کی کمی بہت بُری طرح محسوس کر رہے ہیں کملیشور صاحب نے کسی سیاسی یا دوسری وجہ سے استعفیٰ دیا ہو مگر عوام یہی سمجھتے ہیں کہ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ دُور درشن سے الگ ہو جائیں۔

اور یہ بھی کھلے الفاظ میں سن لیجئے کہ کملیشور جی کے جانے کے بعد دُور درشن کے پروگراموں کا معیار گھٹ گیا ہے۔ کملیشور کی "پریکیا" کا جواب تو آج تک دُور درشن نہیں دے سکا اور عوام ہیں کہ کملیشور کی "پری کریا" کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہے ہیں۔ اور نہیں تو آپ انہیں مہینہ میں ایک دو بار اپنے مخصوص پروگرام پیش کرنے کے لئے ضرور رضامند کیجئے۔

ریڈیو اور دُور درشن کے ذمہ دار حضرات کو ہدایات دیجئے کہ وہ کنوئیں کے مینڈک نہ بنیں، اپنی ذاتی دوستی، سفارش اور مالی منفعت میں بھائی بھتیجہ واد کو خیرباد کہہ کر دیانت داری کے ساتھ ان قومی اداروں کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنائیں۔

دلی دُور درشن کی تنزّلی کا ایک تازہ ترین نمونہ اس سال کی آخری شب کا پروگرام "ہنگامہ" ہے جسے سارا ملک دیکھنے کے لئے بے تاب تھا اور رات کے سوا بارہ بجے تک جاگتا رہا مگر کیا اس سے گھٹیا پروگرام جب سے دلی دُور درشن کی ابتدا ہوئی ہے اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں آیا؟ اگر غلام علی پاکستانی گلوکار کی پہلی غزل کو اس پروگرام سے نکال دیا جائے

(بقیہ صکے پر)

بہ کوئے یار بہ اندازِ زمانہ گزر

محمود لکھنوی

افضل پشاوری ملتان کو خیرباد کہہ کر دہلی چلے آئے۔ چونکہ ان کے تایا صاحب کو دہلی چھاؤنی اور مسوری میں تعینات ان پلٹنوں کا لانڈری کنٹریکٹ مل گیا تھا۔ دلّی آکر خواجہ حسن نظامی صاحب والی اُردو منزل افضل صاحب نے کرایہ پر لے لی اور یہاں انہوں نے ہوٹل کھول دیا۔ اسی دوران انہوں نے شادیوں ختم نہ ہونے والا سلسلہ جاری کیا۔ ملتان میں ہی ایک اخبار نظر سے گزرا کہ افضل صاحب نے ایک دعوت میں اپنی بیوی اور سب سسرال والوں کو زہریلا کھانا کھلا کر ختم کر دیا افضل صاحب پر مقدمہ چلا اور یہ حوالات اور جیل میں بھی مہینوں بند رہے مگر ثبوت مہیا نہ ہونے کے باعث صاف بچ گئے۔

۱۹۴۷ء میں جب میں دہلی آیا تو ایک روز افضل پشاوری صاحب سر پہ فیلٹ لگائے اور اعلےٰ درجے کا سوٹ پہنے میرے سامنے سے گزرے مگر مجھے کس مپرسی کی حالت میں بھی انہوں نے اُردو بازار میں پہچان کر پیچھے سے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ماسٹر قدر بھائی کب آئے۔ اور میرے پاس کیوں نہیں آئے۔ دوسرے ہی دن انہوں نے اپنا دفتر میرے سپرد کر دیا۔ مگر اب افضل صاحب میں وہ بات نہیں رہی تھی چنانچہ میں نے دوسرے ہی دن ان کی میزبانی اور مہربانی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی کہ میں اپنا ہی کام کروں گا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس وقت تک اپنا ہی کام کر رہا ہوں حالانکہ اس وقت فاروقی صاحب نے اپنے کتب خانہ کا انتظام مناسب تنخواہ پر سونپنے کی پیش کش کی اور دوسرے کچھ اداروں نے بھی اپنے ہاں ملازمت کے لئے بلایا مگر دل میں یہی خواہش تھی کہ اپنا کام کرتے آئے ہیں اور اب بھی اپنا ہی کام شروع کریں گے۔ اور خدا کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اب بھی اپنا ہی کام کر رہا ہوں۔ استاد حیدر نے بڑھاپے میں ایک تیرہ چودہ سالہ مصیبت زدہ مسلمان لڑکی سے شادی کر لی۔ حیدر صاحب کی گزر اوقات یہی تھی کہ وہ افضل پشاوری ایسے شاگردوں کو غزلیں کہہ کر دیں اور ان کی روٹی چلتی رہے۔ نازش حیدری صاحب پاکستان چلے گئے تھے۔ حیدر صاحب نے اپنی دال روٹی کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے افضل صاحب سے ایک ماہنامہ "عظمت" جاری کرایا اور اس رسالہ میں بڑے بڑے شعرا پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیا، مرحوم مولانا ابرار حسنی کسی مشاعرے میں دہلی تشریف لائے اور میرے ہاں ہی قیام فرما ہوئے تو میں نے ان سے گزارش کی کہ میں فن عروض سے واقفیت نہیں رکھتا ویسے تو میں ہر صحافی شاعر اور ادیب کی حرام زدگی کا جواب بطریقِ احسن دے سکتا ہوں مگر جہاں عروضی معاملہ آجاتا ہے وہاں میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں لہٰذا اس سلسلہ میں اگر آپ میری مدد کریں تو میں اُستاد حیدر کی اُستادی کا حدود اربعہ ناپنا پسند کروں گا مولانا ابرار حسنی صاحب نے میری گزارش پر آمنّا و صدقنا کہا اور استاد حیدر کے مضامین کا جواب لکھنا شروع کر دیا لہٰذا شانِ ہند میں ایک مستقل عنوان قائم کیا گیا۔

"بی حیدری اور افضلی بیگم"

قبلہ ابرار حسنی گنوری ادبی اور عروضی بحث کا جواب بخوبی دیتے تھے مگر بڑی نرم زبان میں جو میرے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ میں ان کے مضامین میں ردّ و بدل کر کے اپنے مزاج کے مطابق سخت الفاظ استعمال کرتا چنانچہ ایک مرتبہ میں نے افضل صاحب کو "ہتھیلی ٹیک" لکھ دیا۔ افضل صاحب تو اس ترکیب کے معنی سے ناواقف تھے مگر اُستاد حیدر نے جب انہیں اس کے معنی بتلائے تو افضل صاحب بڑے جز بز ہوئے اور کتب خانہ عزیزیہ پہ ملے تو کہنے لگے میں چاہوں تو آپ کو دلی کے بدمعاشوں اور ہوٹل کے بیروں سے پٹوا سکتا ہوں۔ میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا

نہ ایسی حرکتیں کسی ہتھیلی ٹیک ”سے شکر تکب ہو سکتی ہیں وگرنہ کسی صحافی، شاعر یا ادیب کا ان سے کیا واسطہ۔ شرمندہ ہوئے اپنے ہوٹل میں لے گئے چائے پلائی۔

ایک دن میں کشمیری گیٹ پوسٹ آفس سے ڈاک لے کر آرہا تھا کہ کتب خانہ عزیزیہ پر افضل صاحب مل گئے اور فرمانے لگے سرور صاحب رات میرے بڑے ابا (تایا صاحب) کا انتقال ہو گیا۔ مگر افضل صاحب نے یہ خبر اس انداز میں سنائی جیسے ان کی لاٹری نکل آئی ہو اور وہ حد درجہ خوش ہوں۔ میں نے سردار دیوان سنگھ مفتون کی جوتیاں سیدھی کی تھیں فوراً بھانپ گیا کہ معاملہ کیا ہے چنانچہ افضل صاحب کو ایک طرف لے جا کر رازدارانہ لہجہ میں کہا۔ استاد پرسوں تمہارے تایا صاحب ملٹری سے اپنی دی ہوئیں سیکورٹیوں کی رقم پچاس ہزار روپے لائے ہیں اور دو دنوں میں وہ پاکستان جانے والے تھے اور تم کہتے ہو کہ رات ان کا انتقال ہو گیا۔ سالے تو نے انہیں زہریلا انجیکشن دے کر موت کی نیند سلا دیا اور چپکے چپکے ان کی لاش بھی صبح سویرے دفن کر دی۔ میں تو پولیس میں رپورٹ کرتا ہوں کہ قبر کھود کر تمہارے تایا کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔ میرا یہ کہنا تھا کہ افضل صاحب کے چہرے پر مردنی چھا گئی اور وہ گھبرا کر کہنے لگے سرور تو میرا یار ہے ایسا مت کرنا۔ خدا کی قسم ان کی موت ویسے ہی ہوئی ہے۔ حالاں کہ حقیقت وہی تھی جو میں نے کہا تھا کیوں کہ چند دنوں میں ہی افضل صاحب نے ماہنامہ کے ساتھ ساتھ ایک روزنامہ بھی جاری کر دیا اور شادیوں کی تو لائن لگا دی کسی مذہب کی ہو کافی ہو۔ لولی ہو لنگڑی ہو یہ مردِ خدا شادی کرنے کو تیار رہتا۔ چنانچہ خدا جھوٹ نہ بلوائے عید بقرعید پر جب یہ بیویوں کو جوتے پہنانے لے جاتے تھے تو نصف درجن بیویاں ان کے پیچھے ہی پیچھے نظر آتے تھے۔

دن گزرتے رہے اور قدرت نے مجھے افضل صاحب کا کرایہ دار بنا دیا یعنی میں نے ان کے ہوٹل میں ایک کمرہ لے کر دفتر شانِ ہند قائم کیا ان دنوں افضل صاحب نے چھوکری جانس عیسائی لڑکی سے شادی کی تھی۔ جانس کے والد صاحب گورنمنٹ پریس میں ملازم تھے۔ جانس ایک ایسے گروہ کی ممبر تھی جو کسی کھاتے پیتے راہ چلتے شخص سے جانس کو بھڑا دیتا اور یہ شور مچاتی کہ اس شخص نے مجھے چھیڑا ہے اور آس پاس سے گروہ کے ممبران نکل آتے اور پھنسے ہوئے شخص کو ذرا دھمکا اور پولیس کا ہوا دکھا کر رقم بٹورتے جانس کی رہائش کا کمرہ میرے کمرے سے بالکل ملحق تھا اور پھر ان کے والد صاحب سے میری واقفیت تھی اس لئے وہ اکثر اوقات مجھے اپنے حالات سناتی اور اس بدقماش طرزِ زندگی سے اپنی بے زاری کا حال کہتی۔ افضل صاحب کی زندگی میں ہی یہ لڑکی ان سے علیحدہ ہو گئی اور نرسنگ کی ٹریننگ لیکر آج کل دہلی سے باہر ایک بہت بڑے ہسپتال میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر رہی ہے۔

افضل پشاوری زندہ سانپ کو کچھ اس انداز سے جھٹکا دیتے تھے کہ سانپ کئی جگہوں سے ٹوٹ جاتا تھا۔ اور سانپ کا سر چھوڑ کر وہ تمام سانپ کچا ہی کھا جاتے تھے اس کا مظاہرہ انہوں نے کئی بار جامع مسجد پر بھی کیا اور یہی وجہ تھی کہ جنسی ہیجان کے باعث وہ کئی شادیوں کا خطرہ مول لے لینے پر مجبور رہتے۔

(جاری ہے)

(صٓ کا بقیہ)

تو باقی [illegible] میں کیا رکھا تھا؟ ہو سکتا ہے کہ دور درشن والے اور ریڈیو والے ہڑتال کی ناکامی کے باعث اب یہ پروگرام بنانے ہوئے ہوں کہ گھٹیا سے گھٹیا پروگرام پیش کیا جائے تاکہ سننے اور دیکھنے والے اکتا کر اپنا اپنے ریڈیو اور ٹی وی سیٹ محض خبروں یا کبھی کبھار آدھ اچھے ڈرامے کے موقع پر ہی کھولیں۔

اس ”ہنگامہ“ کے مقابلہ میں دوسرے دن محترمہ سلمیٰ سلطان کا ترتیب دیا ہوا پروگرام ”کئی رنگ“ ہی کسی حد تک غنیمت تھا کہ اس پروگرام میں ابھرتی ہوئی گلوکار جسپندر نرولا نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اس نے گلوکاری میں مہارت حاصل کرنے کی بجائے اب ڈسکو اپنانے اور اپنی کافرانہ ادائیں دکھانے میں کمال حاصل کر لیا ہے۔

دلّی کی چھوٹی صنعتیں

دلّی کے صنعتی فروغ میں ان کا زبردست حصّہ

دلّی نے آزادی کے بعد ملک میں جدید چھوٹی صنعتوں کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے اپنا نمایاں مقام بنالیا ہے آج دلّی میں ، ۸۶ کروڑ روپے کے سرمایہ کی حامل تقریباً ۴۵ ہزار صنعتی اکائیاں مصروفِ پیداوار ہیں ان میں مختلف قسم کا ۲۱۹۶ کروڑ روپے قیمت کا جدید ساز و سامان ہر سال تیار کیا جا رہا ہے ، ان صنعتوں سے تقریباً ۴ لاکھ ۵۰ ہزار افراد وابستہ ہیں دلی کی کل آمدنی کا ۵ء۱۷ فیصد حصّہ پیداوار سے حاصل ہوتا ہے ۔

صنعتی فروغ پر خاص توجہ، صنعتی ترقیاتی پروگرام اور ان کی نمایاں خصوصیات

★ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں مصارف ۲۱۶۱ لاکھ روپے سال ۸۱-۱۹۸۰ء کے دوران اخراجات ۵ء۳۵۵ لاکھ روپے سال ۸۳-۱۹۸۲ء کے دوران مصارف کے لئے ۵۹۸ لاکھ روپے ۔

★ اوکھلا صنعتی بستی میں الیکٹرانکس سازی کے لئے صنعتی پلاٹ تیار الیکٹرانکس کی جانچ و اصلاح مرکز کی عمارت کی تعمیر مکمل ۔

★ رانی جھانسی روڈ پر ۶۰۰ فیکٹریوں کے لئے کئی منزلہ صنعتی کمپلیکس زیرِ تعمیر ہے اگلے سال ان کی الاٹمنٹ عمل میں آجائے گی اس کی تعمیر مکمل ہونے پر تقریباً ۱۲۵۰۰ اشخاص کو روزگار دستیاب ہوگا ۔

★ پٹ پڑ گنج میں ۱۶۰ ایکڑ اراضی پر ۹ صنعتی بستیاں تعمیر کی جا رہی ہیں ان کی تعمیر آئندہ سال میں مکمل ہو جائیگی اس پروگرام کے پورا ہو جانے پر ۲۵ ہزار لوگوں کو روزگار میسّر ہوگا مزید ۱۰۰ ایکڑ اراضی اور ڈیولپ کرنیکی اسکیم زیرِ عمل ہے ۔

★ جھلمل طاہر پور میں چھ اجتماعی کئی منزلہ فیکٹریوں کی تعمیر جلد ہی شروع کی جا رہی ہے ان کی تعمیر پر تقریباً ۲۰۰ لاکھ روپے صرف ہوں گے اراضی پہلے ہی حاصل کر لی گئی ہے تعمیرات کا کام شروع کیا جانے والا ہے ۔

★ دلی کی چھوٹی صنعتوں کی ترقیاتی کارپوریشن کے توسط سے نریلہ میں تیار کئے گئے ایک ہزار پلاٹوں کی تقسیم کا کام جلد ہی کیا جا رہا ہے اس سے تقریباً ۱۵ ہزار لوگوں کو روزگار ملے گا ۔

★ منڈنگوی میں دستی گرگھوں کے لئے چھ نئے ورک شیڈوں کی الاٹمنٹ کا کام تقریباً مکمل ۔

کم شرح سود پر قرضوں کی فراہمی

★ اس سال چھوٹی اور گھریلو صنعتی اکائیوں کے لئے ۴ فیصد شرح سود پر ۱۸ لاکھ روپے کی رقم دستیاب ہے ۔

★ انجینئر صنعت کاروں کو مالی معاونت پر شرح سود میں کافی کمی کر کے یعنی ۷ فیصد شرح سود پر قرضوں کی فراہمی ۔

جاری کردہ :- محکمہ اطلاعات واشاعت
دلّی انتظامیہ دلّی

ڈی آئی پی منصوبہ بندی ۶/ – ۸۲/۸

ترقیاتی و صنعتی نمائش متھرا کا مشاعرہ

سرور تونسوی

آج ۲۴ دسمبر ۲۰۰۲ء منگل وار ہے، شام کے ساڑھے چار بجے نئی دلی ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو جناب رعنا بھی سیکنڈ کلاس کی کھڑکی پر ٹکٹ خرید رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ میرے لئے بھی ٹکٹ خرید لیجئے گا، رعنا ٹکٹ خرید کر کھڑکی سے ہٹ ہی رہے تھے کہ استنے میں جناب جگن ناتھ آزاد معہ بیگم صاحبہ تشریف لائے، میں نے آزاد صاحب سے دریافت کیا کہ کیا بھابی بھی متھرا چل رہی ہیں۔ فرمانے لگے میری بیوی شاعرہ نہیں ہے یہ تو اسٹیشن تک چھوڑنے آئی ہیں۔ آزاد صاحب کا ٹکٹ ساغر نظامی نے خریدنے کی ذمہ داری لے لی تھی، اس لئے ہم سب ساغر صاحب کا پندرہ منٹ تک انتظار کرنے کے بعد پلیٹ فارم نمبر ۲ پر آئے تو جی۔ٹی ایکسپریس میں تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ میں نے اور رعنا صاحب نے کافی دھکم پیل کے بعد بیٹھنے کی جگہ بنائی تو آزاد صاحب فرمانے لگے میں ساغر صاحب کو تلاش کرتا ہوں۔ گاڑی چلنے میں دو منٹ رہ گئے تھے، آزاد صاحب نے اطلاع دی کہ ساغر صاحب اور ان کی اہلیہ صاحبہ جہاں بیٹھے ہیں اسی ڈبہ میں وہ بیٹھ رہے ہیں گاڑی متھرا اسٹیشن پر ساڑھے سات بجنے سے پہلے ہی پہنچ گئی۔ منتظمین مشاعرہ میں سے کوئی بھی رہبری کے لئے موجود نہ تھا جس پر ساغر صاحب فرمانے لگے شمیم صاحب سے ایسی امید تو نہیں تھی آزاد صاحب فرمانے لگے منزلِ مقصود کا بھی کسی کو پتہ ہے یا نہیں، اس پر میں نے عرض کیا کہ گھبرائیے نہیں میں آئی۔ پی سنگھ صاحب شمیم کی رہائش گاہ بھی جانتا ہوں اور جہاں مشاعرہ ہوگا وہ جگہ بھی جانتا ہوں چونکہ گاڑی وقت سے کافی پہلے متھرا پہنچ گئی تھی اس لئے یہ طے ہوا کہ کچھ دیر انتظار کیا جائے، چنانچہ دس منٹ کے بعد جناب آئی۔ پی سنگھ شمیم اور مولانا شفا نذدی تشریف لائے اور انہوں نے معذرت کرتے ہوئے فرمایا کہ گاڑی وقت سے پہلے آگئی اس لئے آپ کو یہ زحمت گوارہ کرنی پڑی، اسٹیشن سے باہر نکلے تو ایک اسٹیشن ویگن میں ہم سب کو کوالٹی ہوٹل میں لے جایا گیا، ایک کمرہ میں سامان وغیرہ رکھوانے لگے منہ ہاتھ دھو کر چائے پی، دیکھا تو سامنے والے کمرے میں جناب شوق بہرائچی لحاف اوڑھے بیٹھے ہیں اور تاش کے پتوں کو الٹ پلٹ رہے ہیں، میں نے ان کی خدمت میں حاضری کا علیک سلیک کے بعد بیٹھا ہی تھا کہ سامنے والی چارپائی سے ایک صاحب جو کمبل اوڑھے ہوئے تھے نہایت پھرتی سے نکلے اور بڑی گرمجوشی سے معانقہ کرتے ہوئے فرمانے لگے سرور صاحب کیا حال ہے مزاج تو اچھے ہیں، میں نے ان کی سب باتوں کا جواب اچھے انداز سے دیا مگر میں اپنے حافظے پر کافی سے زیادہ زور دینے کے باوجود یہ نہ جان سکا کہ یہ صاحب کون ہیں، مجھے میری آنکھوں نے یقین دلا دیا کہ انہیں اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھا۔ مگر میں نے اتنے پر بھی ان پر یہ بات ظاہر نہ ہونے دی۔ اتنے میں ساغر نظامی، جگن ناتھ آزاد، واثق جونپوری، وغیرہم شعرا تشریف لے آئے اور ان سب نے ان صاحب سے بڑی گرمجوشی سے معانقہ کیا اور علیک سلیک کی، میں نے آزاد صاحب سے سرگوشی کے لہجے میں دریافت کیا یہ کون صاحب ہیں تو وہ فرمانے لگے کیا آپ خمار بارہ بنکوی کو نہیں جانتے، اس پر میں نے خمار صاحب سے معافی چاہی اور انہوں نے مجھے گرمجوشی سے لپٹاتے ہوئے اپنے پاس بٹھلایا اور فرمانے لگے آپ مجھے نہیں پہچانتے تھے مگر میں آپ کو پہچانتا ہوں کیونکہ شانِ ہند شکیل بدایونی کے ہاں آتا ہے اور شانِ ہند میں دو تین مرتبہ آپ کی تصویر چھپی جس سے میں آپ کو فوراً پہچان گیا۔ خمار صاحب سے کچھ دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد فرہاد صاحب متھراوی نے چتاونی دی کہ کھانا کھا لیجئے ورنہ بعد میں اچھا کھانا نہیں ملے گا، کھانے کی میز پر آیا تو ساغر صاحب معہ بیگم صاحبہ، رعنا۔ آزاد تشریف فرما تھے۔ پرتکلف کھانا دیکھ کر ساغر صاحب فرمانے لگے سرور صاحب شمیم صاحب نے ہمیں غلط بتایا کہ ان کے پاس فنڈز بہت کم ہیں کھانا دیکھ کر تو پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں نے شاعروں کو روپیہ کم دینے کے لئے ایسا بتایا ورنہ روپے کی انہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ آزاد فرمانے لگے کہ ہم تو سرور صاحب کے کہنے پر آ گئے، میں نے عرض کیا کہ ساغر صاحب

[illegible] صاحب صدر نے [illegible]
کلام سنانے کے لیے [illegible] آثر صاحب [illegible]
[illegible] شروع [illegible] کی زیادتی
کہ انہوں نے [illegible] میں لکھا
[illegible] ہیں ؎

[illegible]
[illegible]

بلا دیا ترے [illegible] حیات
کہاں [illegible] یہ پیاسے
ہو [illegible] ایک غزل
ہر ایک گام پہ ہونا پڑا نثار مجھے

آثر صاحب غزل سنانے اور اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف
لے گئے ہیں اور اب ساغر صاحب نے جناب شہاب لکھنوی کو پکارا ہے
لیجئے شہاب صاحب مائیک پر تشریف لے آئے ہیں معمولی قسم کے
ترنم سے کلام سنانا شروع کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یہ ایک بادہ جام شراب کیا ہوگا کسی کی حسرت نظر کا جواب کیا ہوگا
چراغ کر دنے روشن وفا کی راہوں میں [illegible] کوئی خانہ خراب کیا ہوگا

شہاب صاحب بغیر داد پائے کلام سنا کر اپنی جگہ چلے گئے ہیں
اور صاحب صدر نے جمالی فتح پوری کو کلام سنانے کے لئے کہا ہے
سنئے جمالی صاحب چار مصرعے ارشاد فرما رہے ہیں ؎

جو چاہو خوشی سے وہی چھین لینا تمہاری ہنسی ہے خوشی چھین لینا
نظر سے مرے دل کی دنیا بنا کر تم ہی میری زندگی چھین لینا

اس کے بعد غزل کے اشعار ارشاد فرما رہے ہیں ؎

خود نمائی کے سلیقے ابھی کم آتے ہیں
آئینہ ہاتھ سے رکھ دیجئے ہم آتے ہیں
[illegible] معلوم تو ہوگی مرے گھر کی قیمت
کعبہ جاتا ہے جب ان کے قدم آتے ہیں
دل کی دھڑکن میں اک آواز سنی ہے میں نے
بیٹھے تم اللہ سے کہتے ہو کر ہم آتے ہیں

جمالی صاحب غزل پر اچھی داد پا گئے ہیں۔ لیجئے اب نجم مظفر نگری
ایک قطعہ سنانے کے بعد غزل سنا رہے ہیں ؎

عالم عشق میں جب ہجر کی رات آئی ہے
دیکھ کر حال مرا شمع بھی شرمائی ہے
[illegible] حادثے پھولوں کو سپرد کے دام
میں نے گلشن ہی میں رہنے کی قسم کھائی ہے

نجم صاحب کو اس شعر پر بہت زیادہ داد ملی ہے سنئے نجم صاحب
فرما رہے ہیں ؎

[illegible]
حسن کے [illegible] کی بات آئی ہے
لاکھ سجدوں سے ہے اک اشک ندامت بہتر
نغمہ ساز ازل سے یہ صدا آئی ہے
اس حقیقت سے بھلا کون کرے گا انکار
نجم نے جلوۂ شاہد سے جلا پائی ہے

نجم صاحب غزل پر اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف
لے گئے ہیں اور صاحب صدر نے جناب مبین فریدی فتح پوری کو کلام
سنانے کے لئے پکارا ہے، سنئے مبین صاحب فرما رہے ہیں ؎

جنوں بڑھتے بڑھتے وسعت تنگ ہوئی ہے بیاباں کی
کوئی تقدیر تو دیکھے ذرا محروم زنداں کی
انہیں اجزا کو میں ترتیب دے کر دل بناؤں گا
مرے آنسو، تری معصومیت وحشت بیاباں کی
ہمارے دل کی بے تابی پہ اتنی برہمی کیوں ہے
شرارت دیکھئے اپنی نگاہ فتنہ ساماں کی

مبین صاحب نے بھی مناسب داد پا کر اپنی راہ لی ہے اور جناب
ساغر نظامی نے جناب فراز [illegible] سے کلام سنانے کی درخواست
کی ہے فراز صاحب جو کہ منتظمین مشاعرہ میں سے ہیں [illegible]
پر شعراء کی خاطر مدارات کر رہے تھے کہ اپنے نام کا اعلان سن کر
تیز قدموں سے مائیک پر تشریف لائے ہیں، اپنی مخصوص ادا سے
غزل شروع کی ہے ؎

مجھے بحر غم میں آخر وہ نہ دے سکے سہارا
جنہیں میں نے اپنا سمجھا وہی کر گئے کنارا
مرا عشق گر نہ ہوتا ترا حسن بھی نہ ہوتا
مرے عشق سے ہوا ہے ترا حسن آشکارا

فرہاد صاحب [illegible] کے مقامی شاعر ہیں اس لئے سامعین کی اکثریت اُن سے متعارف ہے، فرہاد صاحب کے بعض بے تکلف شہری اس شعر پر کچھ رندانہ انداز سے داد دے رہے ہیں اور فرہاد صاحب بھی اسی بے تکلفی سے فرما رہے ہیں ؎

مجھے دیکھنا ہے آئے مرے دل میں آ کے دیکھے
سرِ طور جو ہوا تھا کبھی جلوہ آشکارا !

مرے دل کی دھڑکنوں میں اٹھا ایک ایک تلاطم
شبِ غم یہ کس نے آ کر مجھے دُور سے پکارا

فرہاد صاحب غزل سُنانے اور بہت اچھی داد پانے کے بعد پھر مہمانوں کی سیوا میں لگ گئے ہیں اور عتیق صاحب کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ یہ حقیقت کہ غنی صاحب اور فرہاد صاحب مہمانوں کی خدمت گزاری دلی طور سے کر رہے ہیں۔ فرہاد صاحب کے بعد ساغر صاحب نے مشاعرے کے کنوینر جناب آئی، پی سنگھ شمیم متھراوی سے کلام سُنانے کی گزارش کی ہے، سُنئے شمیم صاحب فرما رہے ہیں ؎

مجسم نشاط و خوشی بن کے آؤ — پرستار کی زندگی بن کے آؤ
حریمِ بہاراں کی کیفیتوں میں — تم اک نغمۂ سرمدی بن کے آؤ

اس کے بعد غزل ارشاد فرماتے ہیں ؎

کسی کی راہ میں ہستی مٹا کے دیکھوں گا
غمِ حیات کو جینا بنا کے دیکھوں گا

جو بزمِ ناز میں رہ کر بھی کچھ سکون نہیں
تمہاری بزم سے اب دُور جا کے دیکھوں گا

شمیم صاحب اچھی داد پاتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

جو شاخ برق کی زد ہی میں رہ کے بیٹھی ہے
اسی پہ اب تو نشیمن بنا کے دیکھوں گا۔

شمیم گر نہ ملا بحرِ عشق کا ساحل
ہر اک موج کو ساحل بنا کے دیکھوں گا

شمیم صاحب کلام سُنا چکے تو جناب صدر ساغر نظامی نے جناب کباب علی گڑھی کا تعارف نہایت اچھے انداز سے کرانے کے بعد کباب صاحب سے کلام سُنانے کی گزارش کی ہے کباب صاحب کا نام [illegible] ہی سامعین میں تازگی آ گئی ہے۔ کباب صاحب مائک پر تشریف لے آئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

اتنے احمق نہیں ہیں دیوانے — جتنا سمجھے ہوئے ہیں فرزانے
مطمئن ہیں جو آج دیوانے — ہو گئے کیا الاٹ ویرانے
ہم مئی جون میں ٹہلتے ہیں — وہ مسوری گئے ہوا کھانے
آگرہ ہے نہ یہ بریلی ہے — ہم کہاں آ گئے خدا جانے
مل ہی جائیں گے اصلی گھی کے کباب — آپ آئیں تو روٹیاں کھانے

کباب صاحب کو داد کافی ملی ہے غزل سُنا کر کباب صاحب اپنی جگہ پر جانے لگے تو آزاد صاحب فرمانے لگے کباب صاحب یہ کباب پرانے دس سال سے باسی نہیں ہوئے کوئی اور چیز سنائیے سنئے کباب صاحب دوسری غزل سُنا رہے ہیں ؎ ۔

تمہارے لئے کتنے پیسے گنوائے — نیازیں دلائیں مٹھائی کھلائے
وہ بیٹھے رہے بزم میں منہ پُھلائے — نہ ہوں کی نہ ہاں کی نہ دیدے ملائے
نگاہوں کے فوکس میں وہ آ گئے ہیں — الٰہی تصور یہیں ٹھہر جائے
وہ ریڈیو میں دشمن کے گھر جا رہے ہیں — مرے گھر پہ بابا دھرا ٹوٹ جائے

کباب صاحب یہ غزل سُنانے اور خاصی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر جانے لگے تو ساغر نظامی فرمانے لگے میاں ایک غزل اور سناؤ، سنئے کباب صاحب تیسری غزل سُنا رہے ہیں ؎

وہ ایک شب جو ترے پاس تیرے گھر گزری
قسم خدا کی مزیدار تر بہ تر گزری . . . .

ہماری عمر ڈنر پہ نہ لنچ پہ گزری
چچا چچا کے ہمیشہ چنے مٹر گزری

داد اور ہنسی کا ریلا کچھ تھما تو کباب صاحب فرمانے لگے ؎

تو ہی بتا کہ بڑھاپے کے دن کہاں کاٹیں
ہماری اصلی جوانی تو تیرے گھر گزری

اس شعر پہ داد اور ہنسی کا طوفان اس شدت کا تھا کہ کباب صاحب کے دو تین شعر اس شور میں دب کر رہ گئے اور کباب صاحب اس ڈر سے کہ کہیں ان سے چوتھی غزل کی فرمائش نہ کر دی جائے نہایت تیزی سے مائک چھوڑ کر اپنی جگہ پر آ گئے ہیں۔ صاحب صدر نے ارشاد فرمایا ہے کہ محمود آفندی صاحب اپنا کلام ارشاد فرمائیں گے۔ سنئے آفندی صاحب بھی [illegible] میں فرما رہے ہیں ؎

بیچ کا بن گیا جب نشانہ — تب بڑھی قیمتِ آشیانہ
بن گئی بات میری جبیں کی — مل گیا آپ کا آستانہ

واقعی میں خوب [illegible]

مجھے جلوہ دکھا کر کیوں کوئی روپوش ہو جاتا
سرِ محفل تماشہ ہے مرا بے ہوش ہو جاتا

یہ کیا اندازِ الفت تھا یہ کیا حسنِ تکلم تھا
کہ تیرا سامنے آنا مرا خاموش ہو جانا

اسی پر انحصارِ رونقِ جذباتِ الفت ہے
نظر آنا کبھی تیرا کبھی روپوش ہو جانا

وہ چشمِ کیف پرور تھی کہ تھا اک میکدہ ظالم
کہ تیری اک نظر سے بزم کا مے نوش ہو جانا

جناب نوؔر کی غزل پر خوب داد دی گئی ہے اب صاحبِ صدر نے مولانا شفاؔ گوالیاری سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے، سنئے شفاؔ صاحب ندرت فرما رہے ہیں ؎

بہت مشکل حصولِ مدعا معلوم ہوتا ہے
کہ اب ہر نقش ان کا نقشِ پا معلوم ہوتا ہے

جوانی اور کیفِ عشق کا ازہر ارے توبہ
کبھی اس حال میں اچھا برا معلوم ہوتا ہے

ابھی اس شیخ کو رندانِ بادہ خوار سے پوچھو
بظاہر تو نہایت پارسا معلوم ہوتا ہے

شفاؔ صاحب بہت اچھی داد پاتے ہوئے فرما رہے ہیں ؎

جنابِ خضر یہ راہِ فنا یہ عشق و الفت ہے
یہاں کھوئے ہوؤں کو راستہ معلوم ہوتا ہے

سرِ منبر بیانِ خلد میں اور ذکرِ مے توبہ
مجھے واعظ بھی کچھ بہکا ہوا معلوم ہوتا ہے

فرشتوں سے عدالت دور ہی سے دیکھ کر بولی
وہ دیکھو حوضِ کوثر پر شفاؔ معلوم ہوتا ہے

شفاؔ صاحب اچھی داد پانے اور غزل سنانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں اور جناب صدر نے اعلان فرمایا ہے کہ اب جناب عشرت اکبرآبادی سے کلام سنئے، ان کے بھی دو شعر سنئے فرماتے ہیں ؎

شوق کا رنگ آنکھوں میں لئے ہیں
یہ حضرت آج شاید سے پئے ہیں

مرنے بعد آئینہ دیکھا تو ہم نے
خود اپنے آپ ہی بوسے لئے ہیں

معمولی ترنم، معمولی کلام اور معمولی داد کے بعد عشرت صاحب اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں تو محترمہ ذکیہ سلطانہ صاحبہ نیرؔ ساغرؔ نظامی مائیک پر تشریف لائی ہیں، سنئے ارشاد فرماتی ہیں ؎

ہجر کی شب تری تصویر بنا لیتی ہوں
سامنے رکھ کے اسے اشک بہا لیتی ہوں

میں تو بیدار رہا کرتی ہوں عادت ہے مری
کتنی گستاخ ہوں تجھ کو بھی جگا لیتی ہوں

"کتنی گستاخ ہوں تجھ کو بھی جگا لیتی ہوں"، پر داد پلٹ سے دی گئی ہے اور داد کا شور اس قدر بے ہنگم ہے کہ کچھ سنائی دے رہا ہے۔ ساغرؔ صاحب فرما رہے ہیں حضرات خاموش رہئے اور محترمہ نیرؔ صاحبہ کا کلام سنئے۔ فنا نظامی فرمانے لگے، "تو یہ ساغرؔ صاحب کی محترمہ بھی ہیں"، سنئے محترمہ فرما رہی ہیں ؎

نویدِ شوق سہی پر کسے گوارہ ہے
یہ غم جو آپ کے چہرے سے آشکارا ہے

ہوائیں لاکھ پیامِ بہار دیں لیکن
ترے بغیر یہ موسم کسے گوارا ہے

عورت، موسیقی اور شاعری کی تثلیث بے انتہا داد پاتے ہوئے نغمہ سرا ہے ؎

زمانہ جس کو تغافل شعار کہتا ہے
بہت قریب سے اس نے مجھے پکارا ہے

یہ ناخدا سے کہو میری جستجو نہ کرے
میں اب وہاں ہوں بھنور میں جہاں کنارا

تری نگاہِ کرم کے شہید ہیں ہم تو
وہ اور ہیں جنہیں تیری وفا نے مارا ہے

محترمہ نیرؔ صاحبہ غزل سنانے اور بے انتہا داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے جانے لگیں تو سامعین نے اتنا شور برپا کیا کہ محترمہ پھر کلام سنانے بیٹھ گئی ہیں اور ایک بہت پرانی غزل سنائی ہے اس غزل کا بھی ایک شعر سن لیجئے ؎

وہ فضا میں برق چمکی وہ جلا مرا آشیانہ
مجھے راس ہی نہیں ہے یہ بہار کا زمانہ

محترمہ ذکیہ سلطانہ نیرؔ کلام سنا چکیں تو ساغرؔ صاحب

اچھے تعارف کے بعد جناب شوقؔ بہرائچی کو کلام سنانے کی تکلیف
دیجئے شوقؔ صاحب مائیک پر تشریف لائے ہیں فرماتے ہیں ؎

شیخ و برہمن کا چرچا　　　کیا گورے ہیں کیا کالے ہیں
بھی سمجھے بوجھے ہیں　　　یہ لوگ بھی دیکھے بھالے ہیں
غرض یہ دنیا میں　　　سرمایہ پرستی کا عالم!
ن کا کوئی بہنوئی نہیں　　　زردار کے لاکھوں سالے ہیں

ہنسی اور داد کا یہ عالم ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی
شور کچھ کم ہوا تو حضرت فرمانے لگے ؎

... کی لغزش کا امکان ارے توبہ
میں زاہد کا چالان ارے توبہ

انسانوں کو دن دن بھر اب کھانا نہیں ملتا
مدت سے فرو کش ہے رمضان ارے توبہ

پردہ نگاہی نے بدنام کیا ان کو!
ے گئے چوری میں کپتان ارے توبہ

داد کا وہی عالم ہے، اس غزل کے بعد شوقؔ صاحب فرماتے
ہیں اب بحر شیر خوار بھی سنئے۔ فرماتے ہیں ؎

رزار ارے واہ　　　پُر بہار ارے واہ
سیٔ ناز پر اک　　　گنوار ارے واہ
شیخ اور برہمن!　　　دیندار ارے واہ
یہ نگاہِ کرم　　　ہفتہ وار ارے واہ

کے بعد کباب صاحب کی فرمائش پر شوقؔ صاحب فرما رہے ہیں ؎

ہم زندوں سے مُردے اچھے رہنے کا کہیں امکان تو ہے
ہم ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں ان کے لئے قبرستان تو ہے
دُنیا کو تسلی ہو جس سے، وہ پیشِ نظر عنواں تو ہے
پائے کہ نہ پائے اب پبلک، راشن کی مگر دوکان تو ہے
نقصان کسی صورت بھی نہیں، ایماں کی تجارت میں واعظ
کچھ نقد نہ ہاتھ آئے گا اگر، نوابوں کا دسترخوان تو ہے
یہ آتشِ فرقہ وارانہ کافی ہے گنہگاروں کے لئے
دوزخ میں نہ گنجائش ہو اگر؟ اتنا بڑا ہندوستان تو ہے

ہر سو ہنسی اور داد کا ملا جلا شور ختم ہوا تو صاحب صدر نے اعلان
کیا کہ اب جناب نظامؔ اکبرآبادی سے ان کا کلام سنئے۔ لیجئے

نظامؔ مائیک پر تشریف لے آئے۔ فرماتے ہیں ؎

ہمارا کیا ہے اگر ہم نظر جما نہ سکے
بڑے بڑے تیرے جلووں کی تاب لا نہ سکے

گلوں کا رنگ ہوا کا مزاج پا نہ سکے
وطن جتا نا تو چاہا مگر بتا نہ سکے

پھر اس کی دید کی امید اے معاذ اللہ
نظر تو خیر خیالوں میں بھی جو آ نہ سکے

بسا کے لائے ہو آنکھوں میں برق تند مزاج
غرض یہ ہے کوئی تم سے نظر ملا نہ سکے

نظامؔ ان کی نگاہِ کرم کا صدقہ ہے
کہ ساری عمر کبھی ہوش میں تو آ نہ سکے

نظامؔ صاحب اپنے اچھے کلام پر مناسب داد کے بعد اپنی
جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور ساغرؔ صاحب نے نشورؔ واحدی
صاحب سے کلام سنانے کی گزارش کی ہے، نشورؔ صاحب مائیک پر
تشریف لائے ہیں۔ نشورؔ اب بوڑھا اور کمزور ہو گیا ہے۔
سنئے ہندوستان کا یہ قابلِ فخر شاعر اپنے مخصوص انداز و ترنم
میں نغمہ سرا ہے ؎

اس دل کی مصیبت کون سنے جو غم کے مقابل آ جائے
کس نے یہ کہا تھا تنکے سے بجلی سے وہ ٹکرا جائے

ہستی کا نظارہ کیا کہئے جیتا ہے کوئی مرتا ہے کوئی
جیسے کہ دیوالی ہو اور دیا جلتا جائے بجھتا جائے

گزرے ہوئے دن کے لمحوں کی، بھولی ہوئی یاد ایسی آئی
جیسے کوئی یتیم پردیسی روتے میں اچانک آ جائے

اک آس جو دل کی ٹوٹ گئی پھر دل کی خوشی باقی نہ رہی
جیسے کہ اندھیرے گھر کا دیا گُل ہو تو اندھیرا چھا جائے

آغازِ محبت ہے اے دل یوں ہاتھ سے نکلا جاتا ہے
جیسے کسی الھڑ کا آنچل سرکا جائے ڈھلتا جائے

یوں عہدِ جوانی بیت گیا اور یادِ جوانی دل میں رہی
جیسے کوئی جائے چھوڑ کے گھر اور دیپک جلتا رہ جائے

غم وہ ہے جو دو انسانوں کی کشتی میں حائل ہو جائے
جیسے کہ ہوں خشک لبِ ساحل اور بیچ میں دریا لہرائے

نشورؔ واحدی صاحب کی اس بہترین غزل نے مناسب داد پائی ہے اور جناب نشورؔ اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں ابھی وہ آکے بیٹھے ہیں اور شفقا صاحب نے ساغرؔ صاحب سے کہا کہ عالمؔ صاحب کو بُلا لیجئے چنانچہ ساغرؔ صاحب نے عالمؔ فتحپوری سے کلام سُنانے کی گزارش کی ہے، عالمؔ صاحب عالمِ رعنا میں تاہم مائیک پر تشریف لائے ہیں اور ایک اچھی غزل سُنانے کے بعد اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے گئے ہیں اور ساغرؔ صاحب نے اعلان کیا ہے کہ اب پروفیسر مغیث الدین فریدی فتحپوری سے کلام سُنئے، پروفیسر صاحب غزل سنا کر اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں اور صاحبِ صدر نے بہت اچھے الفاظ میں تعارف کرانے کے بعد جناب خمارؔ بارہ بنکوی سے گزارش کی ہے کہ وہ اپنا کلام سُنائیں۔ لیجئے ہندوستان کا یہ عظیم فنکار مائیک پر لحنِ داؤدی میں نغمہ سرا ہے ؎

مجبور رشتے لگے سب مری کہانی کو
نظر لگے نہ کسی کی تری جوانی کو

مطلع پر بے انتہا داد ملی ہے اور یہ مطلع تین بار سُنانے کے بعد خمارؔ صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

سبب نہ پوچھ مرے گریۂ مسلسل کا
بہت قریب سے دیکھا تھا شادمانی کو

بُرا وہ عیش جو لائے پیامِ غفلت کا
بھلا وہ رنج جو چونکائے زندگانی کو

اس شعر پر تو داد اپنی انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ خمارؔ صاحب مقطع فرما رہے ہیں ؎

کسی کی رنجشِ بیجا کا شکوہ کر نہ خمارؔ
محبت اور بڑھاتی ہے بدگمانی کو

اس کے بعد دوسری غزل شروع کی ہے ؎

درد بے کیف اور غم بے مزا ہو گیا | ہو نہ ہو کوئی مجھ سے خفا ہو گیا
بعد ترکِ تعلق یہ کیا ہو گیا | ربط پہلے سے بھی کچھ سوا ہو گیا
التفاتِ مسلسل بلا ہو گیا | خود میں گھبرا کے ان سے خفا ہو گیا

ہر شعر پر داد بے انتہا مل رہی ہے اور خمارؔ صاحب نہایت پسندیدہ ترنم سے فرما رہے ہیں ؎

اس طرح کن گرو ہکے بسلے لئے | مسکرانا بھی اک حادثہ ہو گیا
دل کو ترکِ محبت پہ کیا کیا ہے ناز | لیکن اس کا اگر سامنا ہو گیا

اور بھی عشق کی جان پر بن گئی | حُسن جب مُبتلائے وفا ہو گیا

داد بے حد قابلِ رشک حد تک مل رہی ہے اور خمارؔ صاحب بہت اچھے انداز سے فرما رہے ہیں ؎

زندگی کا یہ عالم ہے تیرے بغیر | شاخ سے پھول گو یا جُدا ہو گیا
دل کچھ اس طرح تڑپا تری یاد میں | میں یہ سمجھا ترا سامنا ہو گیا
عشق میں جان بھی میں نے دیدی خمارؔ | آج حق زندگی کا ادا ہو گیا

خمارؔ بارہ بنکوی بہترین کلام سُنانے اور قابلِ رشک داد پانے کے بعد اپنی جگہ پر تشریف لے آئے ہیں اور صاحبِ صدر نے حضرت فناؔ نظامی کانپوری سے استدعا کی ہے کہ اب وہ کلام سُنائیں فناؔ نظامی کانپوری مائیک پر تشریف لے آئے ہیں، تو ساغرؔ صاحب پیشاب خانے میں چلے گئے، نجمؔ صاحب فرمانے لگے صدر صاحب کو آنے دیجئے پھر کلام سُنائیے گا، اس پر فناؔ صاحب فرمانے لگے کوئی بات نہیں صدر بہر حال نشینِ صدارت، اور غزل شروع کی ہے ؎

اہلِ دیر و حرم رہ گئے | تیرے دیوانے کم رہ گئے
مٹ گئے منزلوں کے نشاں | صرف نقشِ قدم رہ گئے
میں نے ہر شے سنواری مگر | ان کی زلفوں کے خم رہ گئے
دیکھ کر تیری تصویر کو | آئینہ بن کے ہم رہ گئے

اچھی داد پانے پر فناؔ صاحب کا ترنم اور بھی نکھر آیا ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

رند جنت میں بھی جا چکے | ناصحِ محترم رہ گئے
بے تکلف وہ اوروں سے ہیں | ناز اٹھانے کو ہم رہ گئے
بن سکے جو نہ پیرِ مغاں! | ہو کے شیخِ حرم رہ گئے
حق بہاروں پہ گلچیں کا ہے | باغبانی کو ہم رہ گئے
منزلیں دُور تر ہو گئیں | فاصلے کم سے کم رہ گئے
جب بھی خط لکھنے بیٹھے انہیں | صرف لے کر قلم رہ گئے

جناب نجمؔ مظفر نگری فرما رہے ہیں ؎

پان کھا کے وہ چلتے بنے | سونف کھانے کو ہم رہ گئے

اس پر شعرا میں قہقہہ بلند ہوا اور فناؔ صاحب سامعین کے اصرار پر دوسری غزل شروع فرما رہے ہیں ؎

جھوٹی ہی تسلی دو کچھ دل تو بہل جائے
دُھندلی ہی سہی اک شمع تو جل جائے

ہم کو تو محبت ہے ہر اہلِ گلستاں سے
چین کا جو دشمن ہو گلشن سے نکل جائے

مجبوریٔ ساقی بھی اے تشنہ لبو سمجھو
واعظ کا تو منشا ہے میخواروں میں چل جائے

اے جلوۂ جانانہ اک ایسی جھلک دکھلا
حسرت بھی رہے باقی ارمان بھی نکل جائے

مے کش وہی مے کش ہے جو عالمِ مستی میں
سنبھلے تو بہک جائے بہکے تو سنبھل جائے

ان کی ہی توجہ تک افسانہ حقیقت ہے
پھر جائیں اگر نظریں مفہوم بدل جائے

ہم نے تو فنا اتنا مفہومِ غزل سمجھا
خود زندگیٔ شاعر اشعار میں ڈھل جائے

فنا صاحب بہت اچھی داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے آئے ہیں اور صاحبِ صدر نے اعلان فرمایا کہ اب شمیم کرہانی صاحب سے کلام سنیئے سہ

شمیم کرہانی صاحب نے ایک طویل نظم سنائی ہے جو ہر لحاظ سے بہترین ہے مگر افسوس کے طویل ہونے کے باعث اور پھر ان کی تیز رفتاری سے نقل نہ ہو سکی، شمیم کرہانی کے بعد جناب وامق جونپوری مائیک پر تشریف لائے ہیں اور سامعین نے تالیوں سے ان کا خیر مقدم کیا ہے آپ نے پہلے بلینک ورس کے جدید صنف میں کچھ شعر سنائے ہیں اور اس کے بعد "تقسیم پنجاب" کے عنوان سے ایک نظم سنا کر بے انتہا داد پائی ہے۔ وامق جونپوری کے بعد حضرت آزاد مائیک پر تشریف لائے ہیں اور آپ نے اپنا پرانا کلام سنایا ہے سامعین نے اصرار سے آپ کی دو غزلیں ؎

"تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں" اور ؎

"نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گذری"، سنی ہیں انہیں داد خوب ملی ہے اب اعلان کیا گیا کہ جناب وحشی صاحب کی غزل زخمی صاحب سے سنیئے ۔ وحشی صاحب بھی زخمی صاحب کے پاس مائیک پر بیٹھ گئے ہیں۔ وحشی کی غزل بہت اچھی تھی مگر انہوں نے فنا صاحب کی غزل والی زمین میں غزل سنوا کر کوئی قابلِ تعریف معرکہ نہیں کیا۔ اگر وحشی صاحب یہ غزل خود سناتے تو وہ بہترین داد

پاتے مگر انہوں نے یہ سمجھا کہ گانے سے شاید غزل اچھی داد پا جائیگی اور ہوا یہ کہ جس قدر ہوٹنگ اس غزل پر ہوئی اور پر نہیں کیوں کہ جب بھی داد ملتی تو سلام وحشی صاحب کرتے اور سامعین اس حرکت پر دل کھول کر قہقہے لگاتے، وحشی کی غزل اچھی ہے چار اشعار آپ بھی سن لیجئے سہ

گر ضبط کے سانچے میں غمِ عشق کا ڈھل جائے
ممکن ہے مسرت کا مفہوم بدل جائے

تم کچھ تو کہو آ کر جھوٹی ہی تسلی دو
شاید کہ دلِ ناداں باتوں میں بہل جائے

مدہوشِ محبت کو ہر حال پہ قابو ہے
جب چاہے بہک جائے جب چاہے سنبھل جائے

دیکھو میری حالت پہ ہنستے ہیں مہ و انجم
آنا ہے تو آ جاؤ یہ رات نہ ڈھل جائے

جناب شفا مائیک پر تشریف لائے ہیں، اور جناب ساغر نظامی کا تعارف کم اور ادھر ادھر کی باتیں زیادہ کیں تو ساغر صاحب غصے میں آگئے اور فرما رہے ہیں، مولانا آپ جانیے میں اپنا تعارف خود ہی کرائے دیتا ہوں، مولانا شفا، شعراء اور سامعین کا شکریہ ادا کر کے اپنی جگہ پر آگئے ہیں اور ساغر صاحب فرمانے لگے میرا نام ہے ساغر نظامی، ہندوستان کا بہت مشہور آدمی ہوں اور میں نے اردو شاعری میں بہت سی راہیں نکالی ہیں اور اکیاون سال میری عمر ہے میں دو سال کم بتا رہا ہوں تاکہ آپ کے ذوقِ سلیم کو ٹھیس نہ لگے۔ اس پر انور صابری فرمانے لگے کہ متھرا والوں کا ذوقِ سلیم اتنا گھٹیا نہیں کہ وہ اکیاون سال کی عمر والوں کے لئے باذوق ہونے کا ثبوت دیں اس پر قہقہوں کا سلسلہ ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آتا کچھ دیر بعد جب یہ قہقہے تھمے تو ساغر صاحب نے وہی غزل ؎

"کل یہ ذوالاصفات ہو کہ نہ ہو"، سنائی ہے جو ۸ دسمبر کے "شانِ ہند" میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے بعد ۲ بجکر ۵ منٹ پر یہ محفلِ شعر و ادب ختم ہو گئی -

---

(صفحہ کا بقیہ) لیکن ہو بہو اس وقت آیا جب شاہین کی سرخ [illegible] فضا میں بکھر رہی تھی، صبح کا سہانا وقت تھا، نیلے سر کا ہلکی [illegible] طرح چمک [illegible] برف پوش چوٹی پر سیاہ بادل چھایا [illegible] سیاہ بادل کی شکل ایک گھوڑے کی طرح تھی اور اس [illegible] اور وہ جیسے سیاہ پوش دونوں سوار تھے میرے [illegible] وہ سیاہ بادل آسمانوں کی وسعت میں غائب ہو گیا -

شاہسوار

ایم۔ اسلم

جھکی جھکی سی نگاہیں اُس کی وہ سہا سہا حجاب اُس کا
سیاہ آنکھوں میں اُس کے مستی وہ جاگا جاگا شباب اُس کا
ابھی کے پردے سے ہلکے ہلکے وہ ماہِ تاباں کے پیارے جلوے
دکھا رہا تھا وہ نقرئی رے اُٹھا اُٹھا سا نقاب اُس کا
وہ زیرِ لب اُس کا مسکراتا کلی سی گویا چٹک رہی تھی
مگر اب اس بزمِ رنگ و بُو میں نہیں ملے گا جواب اُس کا

میرے مکان کے سامنے چیڑ کے دو چار ہرے ہرے پیڑ تھے، ان میں پھل آئے ہوئے تھے۔ کسی میں کالے، کسی میں سرخ۔ سرسبز ٹہنیوں میں گول گول پھل اس طرح لٹک رہے تھے جیسے کسی حسینہ کے کانوں میں بُندے۔ ایک چھوٹی سی ندی پیڑوں کے پاس سے کسی لعبتِ نازک کی طرح رقص کرتی ہوئی گزرتی تھی، پانی آئینے کی طرح صاف اور برف کی طرح سرد تھا۔ یہ "بوٹے سروِ نافریں" پھولوں کے بستر پر کسی بے قرار حسینہ کی طرح کروٹیں بدلتی سڑک کے ساتھ ساتھ بہتی ہوئی گاؤں کا طواف کرتی میدانوں میں لہراتی اور بل کھاتی چلی گئی تھی۔

صفیہ اسی گاؤں کی رہنے والی تھی۔ اور ان ہی پیڑوں میں اُس نے جھولا ڈال رکھا تھا۔ کبھی جو پانی بھرنے آتی تو گھڑا کنارے پر رکھ کر جھولے پر جا بیٹھتی اور گاتی، گاتی، جھولتی۔

سجنوا! تم بن چاندنی راتیں!
نیلا امبر نوری تارے   چھوٹے چھوٹے پیارے
ہائے جو بنوا کو ترسائیں
سجنوا! تم بن چاندنی راتیں!

⁂

صفیہ کو قدرت سے حُسن بھی عطا ہوا تو جہاں سوز اور بانکپن بھی ملا تو دلفریب، چاند سا چہرہ، سرو قد، خمار آلود مست آنکھیں، رفتار کبک کو شرمانے والی، شبابِ سرشار میں اپنے مکان کے برآمدے میں بیٹھا اسے دیکھا کرتا۔ وہ جب جھولے پر بیٹھ کر جھولتی تو میرا دل بھی ہچکولے کھانے لگتا۔ کبھی جو مجھ سے آنکھیں چار ہوتیں تو وہ شرما کر دوسری طرف دیکھنے لگتی اور جو میں دوسری طرف دیکھتا تو وہ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتی لیکن میں اس کے اندازِ تکلم سے ابھی تک آشنا نہ ہوا تھا۔

طبیعت کی لاابالی نے مجھے وطن سے نکال کر یہاں پردیس میں لا بٹھایا تھا۔ نیا ملک، نئے رسم و رواج، ہر جگہ ایک اجنبیت، قدم قدم پر ایک جھجک سی۔ لیکن وقت مزے سے کٹ رہا تھا۔ کتاب خوانی کا شغل، کہسار کے دلفریب مناظر، چپے چپے پر قدرت کی حسن شائستگی کے نظارے۔ ایک طرف پہاڑ اور دوسری جانب میدان۔ دریا اور ندی نالے۔ اور قدرت کے وہ پاک نظارے جن کی زیارت سے دل و جان کو تازگی اور فرحت حاصل ہو۔ میرے لئے یہ ایک دُنیا نو خیز تھی اور اس دنیائے نوخیز میں صفیہ کے جلوے حورِ جناں کی یاد دلاتے تھے۔

⁂

بستی سے کچھ دُور پہاڑوں کے دامن میں جنگل کا راستہ طے کرنے کے بعد ایک چھوٹی سی جھیل کا نام "نیل سر" تھا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا کہ صانعِ قدرت نے پہاڑ کے دامن میں بلور کا فرش کر دیا ہے کہنے کو تو پانی کا ایک تختہ لیکن آئینۂ سیال کی طرح چمکتا ہوا، جس میں جنگل کے نونہال اور کہسار کی چوٹیاں خاموش کھڑی اپنا عکس دیکھتیں۔ انہی پہاڑوں کی ایک چوٹی ثریا سے ہم کلام معلوم ہوتی تھی۔ پیرِ فلک نے اسے دوسروں سے سرفراز کرنے کے لئے برف کی دستار اس کے سر پہ باندھ رکھی تھی۔ قدرت کے یہ خاموش نظارے بزمِ جہاں کی بے ثباتی کی داستان ہر نظارہ کو سُناتے رہتے تھے۔ میں عموماً گھر سے نکل کر "نیل سر" کے کنارے آ بیٹھتا۔ وقت کیسے کٹتا اور کیوں کر کٹتا، یہ نہ مجھے معلوم تھا اور نہ

مجھے اس کی پرواہ تھی۔ ہاں! اس بات کا مجھے اقرار ہے کہ کبھی کبھی
ایسا بھی ہو جاتا کہ ؏
تصویرِ یار آنکھ کی پُتلی میں کھنچ گئی !

اور یار بھی وہ یار جس سے آج تک بات کرنا تو رہا درکنار
آنکھ ملانے کا بھی موقع نہ ملا تھا لیکن اگر یہ سچ ہے کہ دل را بہ دل
راہ است! تو جب مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ میرے دل میں اُس کی
چاہ تھی تو پھر آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ اس جذبہ سے تہی دست
وہ بھی نہ ہوگی۔ اور میں اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلّی دیتا کہ میرے
نہاں خانۂ دل میں جو اُس کی محبت مستور ہے تو اس کے لئے مجھے
اسی کا منت پذیر ہونا چاہئے کیوں کہ ؏
عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود !
لیکن اس کا کیا کیجئے کہ ؏
باتیں ہیں عاشقوں کی دُنیا سے سب نرالی !

نہ جان نہ پہچان اور دل میں رقابت کے سامان ابھی سے موجود
نظر آنے لگے۔ گاؤں میں بیسیوں خوش رو جوان تھے۔ کون جانے ان
میں سے کسی کو صفیہ دل دے بیٹھی ہو، اگر کسی کو دل دیا نہ ہوتا تو ؏
سمجھو تم بن جاندنی راتیں !
آلا پنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ تو میرا نیل سر کے کنارے جا کر بیٹھنے
کا باعث کہیں یہی پریشانی تو نہ تھی ۔

٭٭٭

شام کا وقت تھا اور شفق کے ساحر نے نیل سر اور سلیسر کے
گردو پیش کے مناظر کو سونے کی قبا پہنا کر زر نگار بنا رکھا تھا
گائے اور بھیڑوں کا ریوڑ کو ہسار کی ڈھلانوں پر سے اُتر رہا تھا
اور گوالا لاٹھی کندھے پر رکھے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ ریوڑ بھی صفیہ
کے گاؤں ـــــ کا تھا اور گوالا بھی صفیہ کا ہم وطن، گائیں گردنیں
جھکائے چل رہی تھیں اور بھیڑیں بھائیں بھائیں کرتی آ رہی تھیں
اور نوجوان گوالا اپنے وطن کی تانیں اُڑاتا چلا آ رہا تھا اور میں
نیل سر کے کنارے ٹانگ پر ٹانگ رکھے خیالوں کی دُنیا بسا رہا
تھا اور یہ خیال کیا تھے۔ صفیہ کا خیال! یا وطن کی یاد! نہیں!
بلکہ دُنیا کی بے ثباتی اور انسان یعنی اپنی بے مائگی پر غور کر رہا تھا
لیکن اس نوجوان گوالے کو دیکھ کر خیالات کی ناؤ کسی اور ہی طرف
بہنے لگی۔ گوالے کی جوانی گوالے کی آزادی اور شاید ان سے زیادہ
گوالے کی بے فکری کتنی عجیب تھی اس کی زندگی کی سادہ پُرکاریاں
کتنی قابلِ رشک تھیں۔ اس کے چلنے کا انداز صاف بتلا رہا تھا
کہ نہ اسے گھر پہنچنے کی جلدی ہے اور نہ تاریکی چھا جانے کا خوف
ہاں! مویشیوں کی تیز روی ان بچوں کی کشش کی شاہد تھیں
جنہیں وہ پیچھے چھوڑ آئی تھیں ۔

پگڈنڈی تو مجھ سے ذرا فاصلے سے گزرتی تھی لیکن گوالا
راستہ چھوڑ کر میری طرف آیا۔ کتنا تنومند جوان تھا۔ چوڑا چکلا
سینہ، کھلی کھلی پیشانی، کندھے پر لٹھ، تندرستی اور جوانی کی
تصویر۔ لیکن میرے پاس پہنچتے ہی اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے
وہ ذرا اکڑ کر بولا۔ "کیوں جناب! یہ آپ ہماری ہی چھاتی پر
مونگ دَلنے لگے؟"

مَیں نے ذرا دلچسپی کے انداز میں اس گنوار کی طرف دیکھا
اس کے اس گنوارپن پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی:
"یہ لٹھ دیکھتے ہو نا؟" اُس نے لٹھ کو پتھریلی زمین پر مارتے
ہوئے کہا "اور میرا نام بھی شاید آپ کو معلوم ہو گا؟"
"نہیں!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو معلوم نہیں"۔
"میرا نام شیر علی ہے" اس نے ذرا قہر آلود نگاہوں سے
دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "سُن لیا؟"
"ہاں!" میں نے پھر ہنس کر کہا۔ "سن لیا میاں شیرو ..... ؟"
لیکن وہ بات کاٹ کر بولا "شیرو نہیں شیر علی۔ یہ ہنسی آپ
کو مہنگی پڑے گی"
اتنا کہہ کر وہ اپنے ریوڑ کی طرف تیز قدم اُٹھاتا ہوا چلا گیا
اور میں حیران کہ اس کم بخت کا میں نے بگاڑا کیا۔ ریوڑ نگاہوں
سے اوجھل ہو چکا تھا لیکن بھیڑوں کی بھائیں بھائیں ابھی تک
سُنائی دے رہی تھی اور کہیں کہیں سے کبک کی مست آواز
نیل سر کے منظر میں رومانیت پیدا کر رہی تھی اور کہسار کسی بیاہتا
کی طرح اپنے دامن میں حسرت اور ارمان لئے کھڑا نظر آ رہا تھا۔
کائنات کی خاموشی سے معلوم ہوتا تھا گویا کسی فکر میں ہے۔
آسمان پر ہلکی ہلکی سیاہی پھیل رہی تھی نیل سر کا پانی جو ابھی ابھی
سُنہری جھلک دکھا رہا تھا نیلگوں ہو چلا تھا اور ہوا اپنی نظرے

اوجھل رہنے والے پاؤں سے اس کے سینے پر رقص کر رہی تھی۔ ایک ٹنڈ منڈ درخت کی سوکھی شاخ پر شاہین خاموش بیٹھا قدرت کی اس عجیب تفسیر پر فلسفیانہ انداز سے غور کر رہا تھا اور خرگوش کا ایک بچہ ڈرا شاہین کے خوف سے جھاڑیوں میں سہما سہما سا بیٹھا تھا۔ یہ خاموشی، یہ سکوت اور اس پر شام کا سہانا وقت اور گرد و پیش کے دلکش مناظر طبیعت میں ایک چٹکی سی لے رہے تھے لیکن اس کمبخت شیرو کی باتوں نے کچھ بدمزہ سا کر دیا تھا۔ بھلا میں اس کے سینے پر کیوں مونگ دَلنے لگا۔ اس کی ڈگر الگ میری راہ الگ نہ مجھے اس کے مشاغل سے سروکار نہ کسی کو میری راہ روی سے واسطہ ہاں صفیہ! لیکن مجھے تو آج تک اس سے بات کرنے کا موقع بھی نصیب نہ ہوا تھا۔ لیکن شیرو کو صفیہ سے کیا واسطہ! مانا کہ دونوں ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے اور شاید ایک ہی فضا میں پل کر جوان بھی ہوئے ہوں۔ لیکن شیرو تو گوالا تھا اس کا باپ بھی گوالا اور خاندان بھی گوالوں کا۔ لیکن صفیہ! زمیندار کی لڑکی گھرانا بھی اچھا اور گاؤں میں عزت اور توقیر بھی اور شاید شیرو ہی کے کنبے کا گوالا اس کے باپ کے ٹکڑوں پر بھی پیٹ پالتا ہو جوشِ رقابت! لیکن مجھے اپنے اس خیال پر ہنسی آگئی اور وہ بدمزہ کرنے والے احساسات سب کافور ہو گئے۔ بدن میں زندگی کی نمو محسوس ہونے لگی، بجھی ہوئی طبیعت میں جولانی کی جھلک نظر آنے لگی اور شام کی ہلکی ہلکی تاریکیوں میں رومانیت مستور معلوم ہونے لگی۔ شاہین نے بیٹھے بیٹھے دو ایک بار کرخت سی آواز نکالی اور کہسار کی طرف پرواز کر گیا اور خرگوش خطرہ دور ہو جانے کے بعد جھاڑیوں میں اِدھر اُدھر اچھلنے کودنے لگے۔ یہ چھوٹے چھوٹے چوپائے کیفِ حیات لئے اس وقت سرشار معلوم ہوتے تھے لیکن افسوس ؎

کوئی نہیں غمگسارِ انساں
کیا تلخ ہے روزگارِ انساں

عام طور پر تو میں سرِ شام ہی گھر لوٹ آیا کرتا تھا لیکن آج کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح اسی پتھر پر لیٹ رہا رات کی سیاہ چادر ہر چیز پر پھیلی ہوئی تھی۔ سازِ قدرت خاموش ہو چکا تھا۔ ہوا اتنی سرد تھی کہ وہ پتھر جس پر میں لیٹا تھا اس کی ٹھنڈک میرے بدن کو بھی محسوس ہونے لگی تھی آخر ماہِ منیر طلوع ہو کر ہویدا ہونے لگا اور وہ خوبصورت مناظر جو تاریکیوں میں روپوش ہو چکے تھے اُن کے اوپر سے اس طرح سیاہی اُٹھنے لگی جیسے کوئی حسینہ چہرے سے آہستہ آہستہ نقاب اُلٹ رہی ہو۔ میرے دیکھتے دیکھتے کہسار کی وہ چوٹی جسے قدرت نے برف کی دستار دے کر دوسروں سے سرفراز بنا رکھا تھا کسی سیمیں تن کی طرح چمکنے لگی۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ چاندی کی طرح چمک اٹھا۔ درختوں کے ہلنے سے شاخوں کے اندر سے چاندی کی روپہلی کرنیں اس طرح جلوہ ریز ہوتیں جیسے آسمان کے رہنے والوں نور کی پچکاریاں ایک دوسرے پر چھوڑ رہے ہوں اور شعاعیں نیلی نہر کے پانی سے بوس و کنار کرتی نظر آنے لگی۔ اس وقت عقب میں سے اچانک صفیہ کی دلکش آواز نے

سجنوا! تم بن چاندنی راتیں!

سُنائی دی۔ وہ اِدھر ہی کو گاتی چلی آ رہی تھی ؎

رات موہنی نہیں ہے جین من کو | برہا آگ لگی ہے من کو
اور اِک ٹیس لگی ہے تن کو | ساون کی ہیں راتیں

سجنوا! تم بن چاندنی راتیں!
بالے جوبنوا کو ترسا ئیں

یہ پیاری آواز کان میں پڑتے ہی چونک سا پڑا۔ لیکن اس وقت میں صفیہ کی آواز کہاں؟ اس سے تو مجھے انکار نہیں کہ اس وقت میں تصوّرِ جاناں ہی کئے بیٹھا تھا لیکن آواز کا تصوّر؟ کچھ نہ کہہ سکتا۔ ممکن ہے کہ میرے کانوں نے مجھے دھوکا دیا ہو۔ لیکن نہیں یہ صفیہ ہی تو تھی جو رات کی خاموشی کو اپنے لحنِ داؤدی سے پُر کر رہی تھی۔ صفیہ! چاندنی سے زیادہ خوبصورت اور برگِ گُل سے نازک تر، کسی شاخِ نہال کی طرح لچکتی، کبک کی طرح جھومتی وارفتگی کے عالم میں گاتی چلی آ رہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں تھیں اور میں انہی جھاڑیوں میں سے قدرت کے خاموش مناظر بھول کر قدرت کی اس جیتی جاگتی اور خوبصورت تصویر کو جھانک رہا تھا۔ جب صفیہ جھاڑیوں میں سے نکلی تو اس نے بھی مجھے دیکھ لیا اور ٹھٹک کر جہاں تھی وہیں کی وہیں رہ گئی "صفیہ!"، بے اختیار میرے مُنہ سے نکلا اور میں اُٹھ کر ...

ڈر گئیں کیا؟"

"نہیں! نہیں!" اس نے کہا "میں آپ سے کیوں ڈرنے لگی"

٭٭٭٭٭

ہم دونوں ایک ہی پتھر پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ آج پہلی مرتبہ مجھے اُس کا قُرب حاصل ہوا تھا۔ وہ نیچی نظریں کئے بیٹھی تھی اور میری نظریں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ ایک چاند تو آسمان پر چمک رہا تھا اور دوسرا میرے سامنے بیٹھا جگمگا رہا تھا آسمان کے چاند سے تو کائنات چمک رہی تھی اور زمین کے چاند نے میرے نہاں خانۂ دل کو منوّر کر رکھا تھا۔

"صفیہ!"

"جی!"

"چُپ کیوں ہو؟"

"آپ چپ کیوں ہیں؟"

"میں تو بول رہا ہوں"

"میں بھی بول رہی ہوں"

"آج گھر سے کیسے نکل آئیں" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں!"

میں تعجب سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ ہنسکر بولی "آپ میری طرف کیوں دیکھا کرتے ہیں؟"

"کب؟"

"جب میں ندی پر آتی ہوں"

"تم پانی بھرنے آتی ہو یا جھولا جھولنے!" میں نے پوچھا۔

"کیوں؟" اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہاں!" میں نے کہا۔

"ہاں!" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ہاں کیا؟" میں نے اس کا خوبصورت ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

"آپ کو پڑھنے کا بہت شوق ہے" صفیہ نے ہنسکر پوچھا۔

"نہیں!" میں نے کہا "صرف تمہیں دیکھنے کا!"

"لیکن آپ تو ہر وقت کتاب ہاتھ میں لئے ہوتے ہیں" اس نے کہا

"کتاب ہاتھ میں ہونے سے کیا ہوتا ہے" میں نے پوچھا۔

"پھر؟" اس نے پوچھا۔

"پھر کیا؟" میں نے پوچھا۔

وہ گلِ نوبہار کی طرح ہنسنے لگی۔

"صفیہ!"

"گاؤں والے تو مجھے صافی کہتے ہیں" اس نے کہا۔

"میں گنوار تو نہیں" میں نے کہا۔

"میں تو ہوں" صفیہ نے ہنسکر کہا۔

"میں تو نہیں سمجھتا" میں نے کہا۔

"آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟" صفیہ نے پوچھا۔

"خوبصورت!"

"یہاں آج کیوں بیٹھے رہے؟" اس نے پوچھا۔

"پہلے تم میری بات کا جواب دو" میں نے کہا۔

"کیا؟"

"تم ندی پر پانی بھرنے آتی ہو یا جھولا جھولنے؟" میں نے پھر وہی سوال کیا۔

"بتلاؤں؟" اس نے شرارت آمیز آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "سچ کہدوں"

"تو کیا جھوٹ کہو گی؟" میں نے کہا۔

"آپ کو دیکھنے!" یہ کہتے ہی اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور میں نے جانا شاید چاند ہالے میں آگیا۔

"صفیہ!" میں نے چہرے سے اُس کے ہاتھ ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں مجھ سے محبت ہے"

"کیا؟" اس نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہے صفیہ!" میں نے پھر پوچھا۔

"وہ کیا ہوتی ہے" اس نے شرارت آمیز تبسم سے پوچھا۔

"بتلاؤں؟" میں نے کہا۔

"دیکھئے!" وہ بولی "کتنی پیاری چاندنی ہے"

"لیکن تم تو چاند سے بھی زیادہ پیاری ہو" میں نے اس کی ٹھوڑی ہلا کر کہا۔

"اسی لئے آپ مجھے دیکھا کرتے ہیں" اس نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے کہا "ان آنکھوں سے بھی اور دل کی آنکھوں

سے بھی "

"دل کی آنکھوں سے کیسے ؟" اس نے پوچھا

"تم اپنے دل سے پوچھو" میں نے جواب دیا۔

"نہیں !" وہ مسکرا کر بولی "آپ ہی تبلا دیجئے"

"تبلادوں" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"ہاں تبلا دیجئے" صفیہ بولی "ابھی تبلا دیجئے نا، تبلائیے بھی"

میں نے ایک ہاتھ اس کی پتلی سی کمر میں ڈال کر اسے اپنی طرف کھینچا ہی تھا کہ عقب سے کسی نے گرج کر کہا "بدمعاش چھوڑ دے"

میں نے صفیہ کی کمر سے ہاتھ ہٹائے بغیر پلٹ کر دیکھا تو شیر علی کندھے پر لٹھ رکھے کھڑا تھا غصے سے اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے وہ جست لگا کر آگے آیا اور صفیہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا

"اب لگیں تم بھی پر پرزے جھاڑنے، اٹھ گھر چل"

"تم ہو کون ؟" صفیہ اس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔ "دور ہو یہاں سے"

"مجھے نہیں جانتی !" شیرو دانت پیس کر بولا۔

"جانے میری پیزار !" صفیہ نے غصے سے کہا۔

"راتوں کو چھپ چھپ کر عشق بازیاں ہوتی ہیں" شیرو بولا "کیوں کیسا پکڑا"

بدمعاش کا لفظ سن کر مجھے غصہ تو آیا تھا لیکن ان دونوں کی نوک جھونک کچھ ایسی پر لطف تھی کہ میں چپکا بیٹھا رہا۔

"دور دفعان نہیں ہوتے" صفیہ نے پھر کہا۔

"میں دور دفعان ہو جاؤں" شیرو بولا "اور تم عاشق کے ساتھ گلچھرے اڑاؤ"

"بکواس بند نہیں کرو گے" کہتے ہوئے صفیہ نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

"صافی !" شیرو غضبناک ہو کر بولا "تیری قضا آئی جو...."

لیکن پیشتر اس کے کہ وہ فقرہ پورا کرے اس نے اچانک ایک خوفناک چیخ ماری اور "شاہسوار شاہسوار" کہتا ہوا گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔

صفیہ بھی یہ نام سنکر گھبرا سی گئی اور خوفزدہ نگاہوں سے جھیل کی طرف دیکھنے لگی۔ میں بھی اسی جانب دیکھ رہا تھا۔ جھیل کے دوسرے کنارے ایک سیاہ پوش نوجوان ایک مشکیں رنگ کے گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نیزہ تھا۔ گھوڑا بار بار سم مار رہا تھا۔ پتھریلی زمین پر سم جب پڑتا تو چنگاریاں نکلتیں اسے دیکھتے ہی صفیہ نے خوفزدہ ہو کر ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر گئی۔ لیکن میں نے لپک کر اسے تھام لیا اور اپنی آغوش میں لے لیا لیکن جب میں نے جھیل کی طرف دیکھا تو وہاں چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ خوبصورت صفیہ میری گود میں بیہوش پڑی تھی اور کہیں دور فاصلے پر سے شاہین کی کرخت آواز سنائی دے رہی تھی۔

٭٭٭٭٭

اس واقعے کے بعد دو روز تک صفیہ کہیں نظر نہ آئی، میں نے دو تین بار گاؤں کا چکر بھی لگایا۔ پوچھتا تو کس سے پوچھتا۔ کیا پوچھتا ؟ صفیہ کہاں ہے ! مجھے اس سے کیا مطلب ؟ ہاں شیرو ! ریوڑ لیکر آتا جاتا صبح اور شام نظر آتا لیکن اب وہ بنگلے کی جانب نہیں جاتا تھا۔ شاہسوار سے ڈر گیا ہوگا شاید۔ لیکن یہ شاہسوار کون تھا ؟ کوئی ڈاکو واکو ہوگا۔ یا ممکن ہے میرا وہم ہی ہو۔ لیکن وہم کیسے ہو سکتا ہے میں نے تو اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔ بہر کیف ڈاکو ہو یا بھوت، شیرو کا ڈر کر بھاگ جانا اور خوبصورت صفیہ کا دیکھتے ہی بیہوش ہو جانا تعجب سے خالی نہ تھا دل میں آیا کہ کسی طرح یہ راز معلوم کرنا چاہیئے۔ لیکن وہ تو چودھویں کی چاندنی رات تھی اور اب رات اندھیری، لیکن شوق بری بلا ہے۔ جب دوسرا روز بھی ختم ہوا اور صفیہ ! محبوب صفیہ کہیں نظر نہ آئی تو میں شام ہوتے ہی نیل سر کی راہ پہ ہو لیا۔ وہی سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی، اور پگڈنڈی کے دونوں جانب جنگل اور جنگل کے عقب میں پہاڑ اور پہاڑوں پر تفکر کا عالم، نہ کوئی آواز نہ کہیں کوئی کھٹکا بس ایک جھینگر تھا جس کی آواز ادھر سے ادھر سنائی دے رہی تھی۔ مجھے نہ جلدی تھی نہ خوف، آہستہ آہستہ قدم اٹھائے چلا جا رہا تھا پگڈنڈی ختم ہوئی تو سامنے برف پوش چوٹی نظر آنے لگی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اسے برف پوش دختر کہسار نیلم پری کی طرح نیلے لباس میں ملبوس نظر آتی تھی۔ کچھ اور آگے جا کر آج بھی اسی درخت کے ٹھنڈ پر شاہین خاموش بیٹھا نظر آیا۔ اس روز بھی کچھ ایسا تھا

اور آج بھی اکیلا۔ شاید میری طرح یہ بھی دُنیا میں اکیلا ہی تھا۔ میں نیل سَر کے کنارے اسی پتھر پر جہاں میں ہمیشہ بیٹھا کرتا تھا جا بیٹھا۔ نیل سَر پر بھی نیلگوں رنگ چھایا ہوا تھا۔ ہوا بند تھی نہ ہر دنیلے نیلے آسمان پر اپنی جھلک دکھا رہی تھی۔ ایک جگنو جھیل کے دوسرے کنارے پر ایک جھاڑی میں اس طرح چمک رہا تھا جیسے کسی حسینہ کے ماتھے پر بندیا۔

میرے بیٹھے بیٹھے آسمان تاروں سے جگمگانے لگا۔ ہوا کی سرسراہٹ بھی معلوم ہونے لگی۔ لیکن جس چیز کی جستجو میں میں بیٹھا تھا وہ کہیں نظر نہ آئی۔ کب تک بیٹھتا۔ کب تک انتظار کرتا۔ کچھ یقین ہو چلا تھا کہ اس روز جو کچھ دیکھا تھا محض وہم تھا۔ آخر واپس لوٹا۔ اگر راستے سے واقف نہ ہوتا تو شاید اندھیرے میں چلنا دشوار ہوتا۔ پگڈنڈی پر پہونچا ہی تھا کہ اچانک گھوڑے کے سموں کی آواز سنائی دی۔ پہلے دُور سے پھر ایسا معلوم ہوا کہ کوئی کہیں قریب ہی سے گھوڑا دوڑاتا گزر گیا ہے۔

ہنسئے گا نہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ بن دیکھے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اندھیرے میں تیزی سے قدم اٹھنے لگا۔ دل کی دھڑکن بھی کچھ تیز ہی تھی۔ کیوں؟ دیکھا تو کچھ بھی نہ تھا۔ بہرکیف جب گاؤں کے قریب پہونچا تو اطمینان سا ہوا۔ ابھی مکان سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ کتے بھونکنے لگے۔ کتا بھی کتنا وفادار حیوان ہے۔ روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دیجئے اور شبانہ روز خدمت لیجئے۔ کوئی دس بجے ہوں گے لیکن گاؤں ابھی سے سنسان سا نظر آتا تھا۔ گاؤں والوں کی بھی کیا قابلِ رشک زندگی ہے۔ دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر کیا مزے سے پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ میں مکان سے ابھی کچھ فاصلے ہی پر تھا کہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے کسی کا سایہ نظر آیا۔ استغفراللہ۔ جانے آج مجھے کیا ہو گیا تھا۔ ایسے ہی دل دھڑکنے لگا۔ پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا۔ میں نے آج تک خطرے کو خطرہ نہ جانا تھا۔ خیر! یہ سایہ جلدی سے میری طرف آیا۔ اوہو! یہ تو صفیہ تھی۔

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں اس وقت؟" اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

"گھوم پھر کر۔" میں نے جواب دیا۔

"نیل سَر کی جانب گئے تھے آپ" صفیہ نے پوچھا۔ "اندھیرے میں کیوں چلے گئے آپ؟"

"کچھ ہرج ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مت جایا کیجئے" صفیہ ذرا میرا ہاتھ دبا کر بولی۔

"تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں!"

"ہاں تم بہ شیر و سے ملنے آئی ہو گی۔"

"میں؟"

"اور کون؟"

"جہنم میں جائے موا" صفیہ میرا ہاتھ جھٹک کر بولی۔ میرے ہاتھ کو یوں جھٹک دینا اُس کے دلی خیالات کا ترجمان تھا۔ "مجھے اس سے کیا غرض!"

"اسے تو ہے!" میں نے جواب دیا۔

"مجھ سے!" صفیہ نے پوچھا۔

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔

"کیا؟"

"یہ تم جانو!" میں نے جواب دیا۔ "میں پردیسی کیا جانوں۔"

یہ سُن کر صفیہ اندھیرے میں میری طرف دیکھنے لگی۔ اُس کی آنکھوں کی دلآویز چمک اندھیرے میں بھی اپنی دلکشی دکھا رہی تھی۔ اُس نے ایک لانبا سانس لیا اور بولی۔ "وہی دن کچھ اچھے تھے جب میری آپ سے بول چال نہ تھی۔"

"صفیہ!" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ "تم ناراض ہو گئیں کیا؟"

"چھوڑ دیجئے میرا ہاتھ!" وہ ہاتھ چھڑانے کی کچھ ایسی ہی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

ساتھ ہی درختوں کی جانب سے کسی نے کہا "کیونکہ تم بدمعاش ہو۔" یہ میاں شیر علی کی آواز تھی۔ یہ کہنے کے ساتھ ہی وہ جھپٹ کر درختوں کے سائے سے نکلا اور میرے پاس آ کر گھونسہ تان کر بولا "میں تو تمہیں بہت شریف آدمی سمجھتا تھا لیکن......"

"لیکن" میں نے بات کاٹ کر کہا "اس روز میں نے تمہیں معاف کر دیا تھا اور آج......"

"اور آج بھی" صفیہ بیچ میں آ کر اور میری بات کاٹ کر

"ہاں!" میں نے جواب دیا۔ "کوئی راہ گیر ہوگا۔"
"راہگیر نہیں!" صفیہ بولی "وہ ہی تو شاہسوار تھا۔"
"یہ شاہسوار ہے کون؟" میں نے پوچھا۔ "کوئی ڈاکو ہے کیا؟"
"توبہ! توبہ!" صفیہ بولی۔ "ایسا مت کہئے!"
"کون ہے آخر؟" میں نے پھر پوچھا۔
"شاہسوار!" صفیہ نے جواب دیا۔
"لیکن یہ شاہسوار ہے کون بلا؟" میں نے پھر پوچھا۔
"یہ تو کسی کو بھی نہیں معلوم" صفیہ نے اپنا خوبصورت سر میرے شانے سے لگاتے ہوئے کہا۔
"تم اس سے ڈرتی کیوں ہو؟" میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پوچھا۔
"ایک دنیا ڈرتی ہے" صفیہ بولی "میں تنہا تو نہیں ڈرتی۔"
"لیکن کچھ وجہ بھی؟" میں نے پوچھا۔
"آپ نے آنکھوں سے سب کچھ دیکھ بھی لیا" صفیہ بولی۔
"اور پھر بھی مجھ سے پوچھتے ہیں۔"
"میں نے تو کچھ دیکھا نہیں" میں نے کہا۔
"ابھی ابھی تو آپ کہہ رہے تھے" صفیہ نے کہا "کہ جھیل پر آپ نے بھی دیکھا تھا۔"
"ہاں! ہاں!" میں نے جواب دیا "کوئی مسافر تھا تو تھا۔"
"خیر!" صفیہ اپنا نرم نرم رخسار میرے شانے پر ملتے ہوئے بولی "چھوڑیئے اس ذکر کو اس وقت کوئی اور بات کیجئے۔"
"تمہیں مجھ سے محبت ہے صفیہ؟" میں نے پوچھا۔
"کوئی اور بات کیجئے!" صفیہ نے ہنس کر کہا۔
"مجھے تم سے محبت ہے صفیہ" میں اپنا سر اس کے خوبصورت سر کے ساتھ ملا کر کہا۔
"کوئی اور بات کیجئے" صفیہ نے پھر ہنس کر کہا۔
"صفیہ! تم بہت حسین ہو" میں نے کہا۔
"بس!" صفیہ نے ہنس کر کہا "اس کے علاوہ اور کوئی بات تو آپ کو آتی ہی نہیں۔"
"صفیہ!" میں نے کہا "تم میری ہو جاؤ تو میری دنیا بھی تمہاری طرح خوبصورت بن جائے۔"

"پھر کیا ہو؟" صفیہ نے پوچھا۔
"تو زندگی کے یہ چار دن مزے سے کٹ جائیں" میں نے جواب دیا۔
"زندگی کا کیا بھروسہ!" صفیہ نے ایک آہ بھر کر کہا۔
"دم کا کھیل ہے اور بس۔"
"ٹھیک ہے" میں نے کہا "لیکن جو دم مزے سے گزر جائے وہی غنیمت ہے۔"
"مزے سے گزرے کیسے؟" صفیہ بولی "اپنے بس کی بات تھوڑی ہے — !"
"صفیہ!" میں نے ہنس کر کہا کہ
"تم جو چاہو تو میرے درد کا درماں ہو جائے"
"میں کوئی حکیم تو نہیں" صفیہ نے ہنس کر کہا۔
"تم حکیم نہیں ہو" میں نے کہا "لیکن تم مسیحا تو ہو۔"
"مجھ سے سیدھی سیدھی باتیں کیجئے!" صفیہ بولی "میں کیا جانوں مسیحا کیا ہوتا ہے میں آپ کی طرح پڑھی لکھی تو نہیں۔"
"میرے لئے تم تو مسیحا ہو صفیہ" میں نے کہا "تم میرے پاس ہوتی ہو تو میری دنیا بدل جاتی ہے۔"
"اور جب میں پاس نہ ہوں تب؟" صفیہ نے شرارت آمیز تبسم سے پوچھا۔
"پھر ہجوم غم" میں نے کہا۔
"آپ بھولے ہوئے ہیں" صفیہ بولی۔
"تم مجھے راہ پر ڈال دو صفیہ!" میں نے کہا۔
"جسے خود اپنی ہی راہ معلوم نہ ہو" صفیہ نے ایک آہ بھر کر کہا "وہ دوسرے کو کیا راہ پر ڈالے گا۔ آپ مجھے بھول جانے کی کوشش کیجئے۔"
"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"یہ مت پوچھئے!" صفیہ نے جواب دیا۔
"سمجھ گیا" میں نے کہا "یہاں شیر علی ....."
"دیکھئے!" صفیہ بات کاٹ کر بولی "مجھ سے بات کرنا چاہتے ہو تو وہ نہ کہئے۔"
[illegible]

"میں کہیں نہیں جاؤں گا صفیہ، لیکن شاید آپ کو یقین نہ آئے"
"اچھا صفیہ!" میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔
"مت جاؤ"

"نہیں جاؤں گی آپ؟" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا خوبصورت سر میرے سینے پر رکھ دیا اور اپنی مرمریں بانہیں میری گردن میں ڈال کر میری طرف دیکھنے لگی۔ لیکن آنکھیں آنکھوں میں وہ جو کچھ مجھ سے کہنا چاہتی تھی اس نے کہہ دیا۔ اس نے میری گردن کو ذرا اپنی طرف کھینچا، میرا سر کچھ جھک گیا۔ پھر اس نے سر تا پیر ہونٹ سے ہونٹ۔ یہ کیفیت کب تک رہی معلوم نہیں۔

آخر صفیہ نے میری آغوش سے علیحدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہو گئی نا دیر آپ کو معلوم ہے"
"تو پھر بھول کیوں جاؤں؟" میں نے پوچھا۔
"چپ رہئے" صفیہ نے میرے زانو پر سر رکھ کر اور لیٹتے ہوئے کہا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔ بس اب سونے دیجئے"

لیکن اس وقت مرغ سحر سونے والوں کو پیغام بیداری دینے لگا اور درختوں میں پرندوں کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ صفیہ جو آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اور مانگ کر بولی "میری قسمت میں آرام کہاں؟ اٹھئے آپ بھی"
"گھر چلو گی؟" میں نے پوچھا۔
"میرے لئے گھر اور باہر سب یکساں ہے" اس نے ایک آہ بھر کر کہا۔

جب ہم ندی پر پہنچے تو صفیہ نے ہاتھ منہ دھویا پھر دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے بولی "میں نے آپ کی نیند بھی خراب کی معاف کر دیجئے"
"خدا کرے" میں نے کہا "اس طرح روز میری نیند خراب کرے"

"بھول جائیے یہ باتیں بھول جائیے" کہتی ہوئی صفیہ گھر کی سمت چل دی۔

٭٭٭

صفیہ کی ہر بات اس کی شاہد تھی کہ اُسے مجھ سے محبت ہے۔ میں اتفاق سے میرے پاس بیٹھنا بہت پسند ہے۔ وہ میری باتوں کو

دلچسپی سے سنتی۔ لیکن جب بات ختم ہوتی تو اس کا خیال چلا جاتا "بہت بھلا چلئے" میرے سامنے ایک شخص تھا۔ شیرو کے نام سے اسے چڑ تھی اور شاہسوار کے متعلق کچھ کہنا سننا اسے پسند نہ تھا۔ لیکن مجھے یہ کرید لگی تھی کہ یہ شاہسوار ہے کون۔ شیرو بظاہر خاموش تھا لیکن چپکے چپکے لوگوں میں میری اور صفیہ کی ملاقاتوں کا چرچا کرتا رہا۔ صفیہ کو اس کی کمینگی کا علم تھا لیکن چنداں پرواہ نہ تھی۔ مجھے شیرو سے تو کچھ واسطہ نہ تھا لیکن شاہسوار کے خیال سے طبیعت میں کچھ الجھن سی پیدا ہو جاتی میں چاہتا تھا کہ کسی طرح اس عقدے کو حل کروں۔ پھر بھی مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس رات کو جنگل کے پاس بھی ایک گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز میں نے اپنے کانوں سے سنی تھی اور اس روز جب میں نے شیرو کے ایک گھونسا مارا تھا ایک گھوڑا کہیں ہمارے پاس ہی ہنہنایا تھا۔

میں چاہتا تھا کہ اسے اپنے وہم کی تخلیق کہوں لیکن واقعات کو کیسے جھٹلاتا جسے آنکھوں سے دیکھا ہو کس طرح کہتا کہ نہیں دیکھا۔ آخر ایک روز میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ صفیہ سے ضرور پوچھ کر چھوڑوں گا میرا خیال تھا کہ صفیہ کو بتلانے میں عذر ہو گا۔ لیکن یہ خیال تو بالکل ہی غلط نکلا اور اس کا مجھے تعجب بھی ہوا۔

٭٭٭

ایک روز ہم دونوں گاؤں سے بہت دور دھان کے کھیتوں کے کنارے بیٹھے تھے۔ کھیت لہلہا رہے تھے اور کھیتوں میں پانی چمک رہا تھا فصل پکنے کو تھی اور دھانوں کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے والے دن بھر کا کام کاج ختم کر کے گاؤں کو جا چکے تھے یہ مشرقی ممالک سے نیر اعظم کی رخصت کا وقت تھا۔ آسمان پر سفر کے سامان ابھی سے ہو رہے تھے۔ ہم دونوں پتھروں پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے ایک ننھی سی ندی ہمارے پاؤں چھوتی، لہراتی اور بل کھاتی کھیتوں کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی ہم دونوں میں نباہ کے وعدے ہو چکے تھے، اب کچھ اطمینان کی باتیں ہو رہی تھیں۔ شیرو نے گاؤں میں ہم دونوں کو خوب بدنام کر دیا تھا اور اب صلاح یہ تھی کہ جتنی جلدی ہو اس گاؤں کو چھوڑ دیا جائے مجھے جلدی پر اصرار تھا لیکن صفیہ اس پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔
مجھے معلوم تھا کہ صفیہ کی ماں مر چکی ہے اور اس کے باپ نے

دوسری شادی کر رکھی ہے اور اس دوسری بیوی سے بھی اس کے دو بچے ہو چکے ہیں۔ دوسری بیوی کی ریشہ دوانیوں کے باعث نامہرباں باپ بھی اب دل سے یہ چاہتا ہے کہ اُسے صفیہ سے جلدی چھٹکارا ہو جائے۔ اور غالباً اسی وجہ سے اس نے صفیہ سے آج تک میرے متعلق کچھ کہا سنا بھی نہ تھا اور یہ تو خود صفیہ مجھ سے کئی بار کہہ چکی تھی کہ گھر اس کے لئے جہنم ہے۔ اور سوتیلی ماں کو اس سے بات تک کرنا گوارا نہیں۔ یہ سب باتیں صفیہ ہی نے مجھے بتلائی تھیں۔ لیکن جب میں گاؤں جلدی چھوڑنے کا ذکر کرتا تو وہ کچھ کشمکش و پیچ میں پڑ جاتی۔

”صفیہ!“ میں نے کہا ”اگر تم ناراض نہ ہو تو ایک بات کہوں؟“

”کیا؟“

میں نے کہا ”یا تو تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں یا تمہیں گاؤں چھوڑنا پسند نہیں۔“

صفیہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی ”مجھے آپ پر اعتبار بھی ہے اور گاؤں چھوڑنا بھی ناپسند نہیں۔ لیکن.......“

”لیکن کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”کیا کروں میں؟“ وہ اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیر کر بولی ”اس زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔“

”صفیہ!“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ”یہ کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں جو کچھ کہہ رہی ہوں“ وہ بولی ”اس کا مطلب میں ہی سمجھتی ہوں۔“

”مجھے نہ بتلاؤ گی؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے دو ایک بار سر ہلایا۔ اس وقت وہ یاس کی تصویر بنی بیٹھی تھی اور کچھ اس انداز سے سامنے کی جانب دیکھ رہی تھی جیسے کوئی مسافر منزل سے دور بیٹھا منزل کی سمت دیکھ رہا ہو۔ پھر خود بخود بولی ”کیا اچھا ہوتا کہ آپ اسے صرف ایک کھیل ہی سمجھتے۔“

”کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

”جو کچھ ہو رہا ہے۔“ صفیہ نے جواب دیا۔

میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اور اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا ”ہوتا کیا ہے صرف دو دل آپس میں مل رہے ہیں یہ

”لیکن آپ نے کبھی انجام پر بھی نظر کی؟“ صفیہ نے پوچھا۔

”انجام؟“ میں نے کہا ”یہی کہ زندگی کے یہ چار دن مزے سے بسر ہو جائیں گے۔“

”سنئے!“ صفیہ بولی ”آپ کی محبت نے مجھے آپ سے بات کہنے پر مجبور کر دیا ہے، جو میں نے آج تک آپ سے چھپا رکھی۔ میری ماں کے بطن سے پے در پے تین بیٹے ہوئے لیکن تینوں سال سال بھر کے ہونے کے بعد مر گئے۔ آخر میری ماں نے منت مانی کہ اب اگر بچی پیدا ہوئی تو وہ شاہسوار کی نذر کر دیگی اور“

”لیکن!“ میں نے بات کاٹ کر پوچھا ”یہ شاہسوار ہے کون؟“

”گاؤں والوں میں مشہور ہے کہ ان پہاڑوں میں کسی زمانے میں ایک درویش رہتا تھا اپنی ساری عمر اس نے عبادت میں گزاری اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ زندگی بھر عورت کی شکل نہ دیکھے گا وہ دن بھر غاروں اور جنگلوں میں چھپا رہتا صرف رات کو باہر نکلتا۔ آخر وہ بہت ضعیف ہو گیا۔ ایک روز گوالوں کا ایک ریوڑ اس جنگل میں آیا ایک جوان لڑکی جو خاصی مقبول صورت تھی اس جگہ جہاں وہ عابد رہتا تھا جا نکلی۔ اس لڑکی کو دیکھتے ہی بوڑھے کو افسوس ہوا کہ اس نے اپنی تمام عمر ضائع کر دی اور زندگی کا لطف نہ اٹھایا۔ اس نے ایک آہ بھر کر کہا کہ آج اسے اگر کوئی چند دن کے لئے گئی ہوئی جوانی دیدے تو وہ اپنی تمام عمر کی عبادت اس کی نذر کر دے گا۔ ادھر الفاظ اس کے منہ سے نکلے ادھر ایک خبیث روح اس کے پاس آئی اور ابدی جوانی کے بدلے اس سے عمر بھر کی عبادت لے لی۔ یہ شاہسوار اصل میں وہی عابد ہے۔ جس عورت کے گھر بچے ہو کر مر جاتا ہے وہ ایک بچہ اس کی نذر کرنے کی منت مانتی ہے۔ جب کوئی عورت اس قسم کی منت مانتی ہے تو عموماً اس کے ہاں لڑکی ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور جب یہ لڑکی جوان ہوتی ہے تو یہ شاہسوار کسی نہ کسی طرح اسے لے جاتا ہے۔“

”کہاں لے جاتا ہے؟“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”ہنسئے نہیں آپ!“ صفیہ بولی ”ایک مدت سے یہاں ایسا ہی ہو رہا ہے۔“

”کیا لڑکی کہیں غائب ہو جاتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

"غائب کر دیتے یا کچھ اور" صفیہ بولی "پرکہتے شاہسوار
ت کا پھیرے ہی جاتا ہے"
"کبھی کوئی ایسی لڑکی ہو یوں غائب ہوگئی ہو پھر کبھی کسی کو ملی
" میں نے پوچھا۔
"آج تک تو نہیں" صفیہ نے جواب دیا۔
"تو تمہاری پریشانی کا بھی یہی باعث ہے" میں نے اسے
غوش میں لیتے ہوئے پوچھا۔
صفیہ نے جواب دینے کی بجائے سر جھکا لیا۔
میں نے کہا "صفیہ! ڈرو نہیں اگر شاہسوار نے ہمارے
ن کبھی دخل دیا تو یہ سودا اسے مہنگا پڑے گا"
"نہیں! نہیں!" اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
کے لیے ایسا مت کہئے"
"تم تو پگلی ہو" میں نے کہا "محض وہم ہے تم لوگوں کا۔ گھبراؤ
میں لوں گا میں اس سے"
یہ الفاظ میرے منہ سے نکلے ہی تھے کہ عقب میں کسی کے
کی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں نے پلٹ کر دیکھا لیکن ایک
ی کوتے کے سوا آس پاس کوئی چیز نظر نہ آئی۔ تاہم صفیہ نے
سے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔
سورج اونچے اونچے پہاڑوں کے عقب میں چھپ چکا تھا
فضا میں ایک اداسی سی چھا رہی تھی۔

*****

میاں شیر علی گوالے کی غمازیاں اور ریشہ دوانیاں اب اپنا
ملا رہی تھیں۔ اب جو میں کبھی گاؤں میں سے گزرتا تو لوگ انگلیاں
تے۔ ادھر صفیہ کو اس کی سوتیلی ماں نے بہت پریشان کر رکھا
شاہسوار کے خوف سے صفیہ گو کچھ کھوئی کھوئی سی رہتی لیکن
ی تسلیوں اور دلداریوں نے کچھ اس کی ہمت بھی بندھا دی تھی
کچھ یقین سا ہو چلا تھا کہ شاہسوار اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا
ی باتوں سے اس کی کچھ تسلی سی ہو چلی تھی کہ شاہسوار محض
کے وہم کی پیدا کردہ چیز ہے۔ آخر ان باتوں کا نتیجہ یہ نکلا
صفیہ نے ایک روز خود ہی مجھ سے گاؤں چھوڑ دینے کا ذکر کیا۔
جھا کیا چاہیے دو آنکھیں۔ میں نے اسی روز اپنا بوریا بستر
باندھ لیا۔ راستہ اسی نیل سر کے پاس سے گزرتا تھا جس روز چلنے
کا ارادہ تھا میں نے اس سے ایک روز پیشتر ہی اپنا اسباب
روانہ کر دیا۔ صفیہ نے مجھ سے نیل سر کے پاس ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

*****

چاندنی رات تھی، شجر حجر چاندی میں ملبوس نظر آتے تھے
آسمان سے نور کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر چیز چمک رہی تھی۔ چھوٹی
چھوٹی جھاڑیاں، سر بفلک پہاڑ، دیو قامت اشجار اور سبزہ زار
دریائے نور میں نہائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ خشک درخت
جس پر شاہین شام کے وقت بیٹھا کرتا تھا اس ویرانے میں
کسی سپید پوش کی طرح خاموش کھڑا تھا۔ اور نیل سر کا پانی
سیماب کی طرح چمک رہا تھا چاروں طرف خاموشی اور سکوت
سا چھایا ہوا تھا اور کہسار کی چوٹیاں اس میں اس طرح جھکی ہوئی
نظر آتی تھیں جیسے بادہ خوار صبوحی پینے کو جھک جھک کر ہاتھ بڑھا
رہے ہوں اور اس سلسلۂ کوہستان کی وہ سر بلند چوٹی جس پر
گاؤں والوں کے عقیدے کے مطابق شاہسوار کا مسکن تھا، بقعۂ
نور بنی ہوئی تھی۔

***

میں صفیہ کے انتظار میں کبھی جھیل کے کنارے ٹہلنے لگتا، کبھی پتھر پر
بیٹھ کر گنگنانے لگتا۔ آخر وہ جانِ تمنا سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ کبک کی طرح
رقص کرتی چلی آ رہی تھی، وہ سنبل کی طرح لچک لچک کر قدم اٹھا رہی تھی،
جیسے کوئی گھر سے سیر کرنے کو نکلا ہو۔ وہ ابھی مجھ سے کچھ فاصلے پر ہی تھی کہ
میں نے آواز دی۔ "صفیہ!"
"آ گئی!" اس نے جواب دیا۔
وہ میری طرف بڑھ رہی تھی اور میں اس کی طرف۔ میں نے راستے
ہی میں اسے جا لیا۔
"ذرا جلدی قدم اٹھاؤ" میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے
ہوئے کہا "رات کا سفر ہے اور منزل دور ہے"
وہ ہنس کر بولی "جب آپ ساتھ ہیں تو منزل کی دوری کیسی!"
"صفیہ!" میں نے بھی ہنس کر کہا "جب صبح شیرو کو تمہارے چلے
جانے کا علم ہوگا تو خوب پیچ و تاب کھائے گا"
"کس منحوس کا آپ ذکر لے بیٹھے" صفیہ نے جواب دیا۔

اس وقت ہم اس پتھر کے پاس سے گزر رہے تھے جہاں اُس نے پہلی بار مجھ سے اقرارِ محبت کیا تھا۔

"آئیے!" وہ ہاتھ تھام کر بولی "ذرا اس سے بھی رخصت ہولیں"

"کس سے؟" میں نے پوچھا۔

"اس پتھر سے" صفیہ ہنس کر بولی "یہی تو ہماری محبت کا پہلا شاہد ہے"

ہم دونوں اس پتھر پر جا بیٹھے لیکن پتھر کسی بے وفا حسینہ کے دل کی طرح ٹھنڈا تھا۔ ہمارا عکس نیل سر میں پڑ رہا تھا۔ نیل سر کے پانی میں ننھی ننھی سی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور ہم دونوں کے سائے جھومتے نظر آ رہے تھے۔

صفیہ ہنس کر بولی "دیکھئے نا! آج نیلا سر بھی ہمیں جھولا جھلا رہی ہے"

"جھولا کیسے جھلائے!" میں نے صفیہ کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اور اُسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا "ہمیں مسرور دیکھ کر وہ بھی مسرور ہو رہی ہے"

صفیہ ہنس کر بولی "دیکھئے نا! کیا چاندنی کھلی ہوئی ہے"

اور میں نے اُسے سینے سے لگا لیا۔

اس وقت صفیہ کوہستان کی اس سربلند چوٹی کی طرف جس نے برف کی قبا پہن رکھی تھی دیکھ رہی تھی اچانک اُس کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکلی۔ اور وہ خوف سے کانپتے ہوئے میرے سینے سے چمٹ گئی۔

"کیا ہے؟" میں نے پوچھا "صفیہ! ڈر گئیں کیا؟"

"وہ دیکھو! وہ دیکھو!" اُس نے اُسی برف پوش چوٹی پر اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کچھ بھی نہیں وہاں تو!" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اٹھو چلیں"

"آپ دیکھتے تو ہیں نہیں" صفیہ نے خوفزدہ آواز سے کہا "وہ دیکھئے! وہ!"

"کون ہے کہاں ہے؟" میں نے کہا۔

"شاہسوار!" اُس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا "وہ دیکھئے وہ نیچے آ رہا ہے"

یہ کہہ کر اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور خوف سے اُس کا پسینہ چھوٹ گیا۔

اب میں نے بھی دیکھا۔ ہاں! اسی برف پوش چوٹی کی طرف سے ایک سیاہ پوش آدمی جو سیاہ گھوڑے پر سوار تھا نیچے آ رہا تھا اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور جہاں گھوڑے کا قدم پڑتا وہیں سے چنگاریاں نکلنے لگتیں۔

اس وقت میرے دل میں خوف بھی تھا اور غصہ بھی۔ شاہسوار پہاڑ سے اُتر کر نیل سر کی طرف آ رہا تھا اور صفیہ خوف سے نیم جان بنی میرے سینے سے چمٹی ہوئی کانپ رہی تھی۔ وہ سیاہ پوش جھیل کے کنارے آ کر رُک گیا۔ اب وہ ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے غصہ سے چلّا کر کہا "ملعون دُور ہو جا!"

اس کا جواب گھوڑے کا ہنہنانا تھا، لیکن کیسا ہنہنانا! جیسے سینکڑوں خبیث ارواح چلّا رہی ہوں۔ یہ آواز سنتے ہی صفیہ میری آغوش سے اٹھی ــــ!

"کہاں چلیں صفیہ!" میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"چھوڑ دیجئے مجھے" صفیہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی۔

"کہاں جاؤ گی؟" میں نے اُسے روکتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھتے نہیں آپ!" وہ غصے سے بولی "وہ مجھے بلا رہا ہے"

"صفیہ ہوش میں آؤ!" میں نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا "آنکھیں تو کھولو صفیہ!"

لیکن میرے روکنے کے باوجود وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور جھیل کی طرف چلی۔ میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن اس نے غصے سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔

"صفیہ!" میں نے پھر اُسے روکتے ہوئے کہا "ہوش میں آؤ آنکھیں تو کھولو"

لیکن اس وقت اس میں بلا کی طاقت معلوم ہوتی تھی، اس نے مجھے ایک ہاتھ سے پیچھے دھکیل دیا اور نیل سر میں چھلانگ لگا دی۔ میرے دیکھتے دیکھتے جھیل نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کنارے پر بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے دوسرے کنارے سے ایک قہقہے کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر جو دیکھا تو صفیہ شاہسوار کے پیچھے گھوڑے پر بیٹھی قہقہے مار رہی تھی۔ میں بے تحاشا دوسرے کنارے کی طرف بھاگا لیکن ٹھوکر کھا کر گرا۔

کب اُٹھا کیسے اٹھا، کتنی دیر پتھروں پر پڑا رہا کچھ معلوم نہیں

(باقی صفحہ ...)